BAHS401CCT

تاریخ ہندوستان

(1526 تا 1750)

History of India

(1526 – 1750)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(چوتھا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© **Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad**

Course: History of India (1526 – 1750)
ISBN: 978-93-95203-73-9
First Edition: June, 2023

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2023
Copies	:	3500
Price	:	320/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Karshak Art Printers, Hyderabad

History of India (1526–1750)

for

B.A. 4th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad – 500032 (TS), India

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ
Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Honorary Professor, Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
اعزازی پروفیسر، مرکز مطالعات اردو ثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر
Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کو آرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

لینگویج ایڈیٹر
Language Editor

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت
Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College
Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
صدر، شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی) / گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mr. Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

جناب محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی) / گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
جناب سعید احمد	اکائی 1،6،7
ڈاکٹر اکرام الحق	اکائی 2
ڈاکٹر احمد	اکائی 3
جناب محمد عاصم	اکائی 4،8،9
ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	اکائی 5
پروفیسر علاؤالدین خان	اکائی 10، 12،11
ڈاکٹر سمانہ ظفر، ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	اکائی 14،13
ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا، ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	اکائی 15
ڈاکٹر ضیاء الحق	اکائی 16،17
ڈاکٹر منصور احمد صدیق	اکائی 22،21،20،18،23،24
ڈاکٹر سید میر ابو الحسین	اکائی 19

پروف ریڈرس:

اول	:	جناب محمد عاصم
دوم	:	ڈاکٹر سید میر ابو الحسین
فائنل	:	ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9
بلاک I	**مغلوں کی آمد**	
اکائی1	سولہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات	13
اکائی2	مغل سلطنت کا قیام: بابر اور ہمایوں	27
اکائی3	سور خاندان	45
اکائی4	شیر شاہ اور اس کا نظم ونسق	65
بلاک II	**مغل سلطنت کی تعمیر: توسیع اور استحکام**	
اکائی5	اکبر	84
اکائی6	جہانگیر	108
اکائی7	شاہجہاں	120
اکائی8	اورنگزیب	132
اکائی9	آخری مغل حکمران	160
اکائی10	مغل سلطنت کا زوال	182
بلاک III	**مغل انتظامیہ**	
اکائی11	مرکزی نظم ونسق	194

اکائی12	علاقائی نظم ونسق	207
بلاک IV	**سماج اور ثقافت**	
اکائی13	سماجی ماحول	219
اکائی14	ثقافت	237
اکائی15	مذہب	255
بلاک V	**معیشت**	
اکائی16	زرعی معیشت	273
اکائی17	غیر زرعی معیشت	285
بلاک VI	**علاقائی طاقتیں**	
اکائی18	مراٹھا اقتدار کا عروج	301
اکائی19	مراٹھا: ریاست اور انتظامیہ	317
اکائی20	بنگال	331
اکائی21	اودھ	349
اکائی22	میسور	363
اکائی23	حیدرآباد	379
اکائی24	سیاست، سماج اور معیشت	389
نمونہ امتحانی پرچہ		406

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی ۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔

پروفیسر محمد رضاءاللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز متعلمین! آداب۔ کورس 'ہندوستان کی تاریخ 1526-1750' میں خوش آمدید۔ اس کورس میں آپ ہندوستان کی سولہویں سے اٹھارویں صدی تک کی تاریخ کو سمجھیں گے۔ اس عرصے کے دوران ہندوستان نے مغلوں اور کئی دیگر کی حکمرانی دیکھی۔ یہ کورس آپ کو ہندوستان کے ان سیاسی حالات کو سمجھنے کے قابل بنائے گا جن کی وجہ سے مغل سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مختلف مغل بادشاہوں کے کارناموں اور ناکامیوں کے مطالعہ سے آپ مغل سلطنت کی توسیع استحکام اور زوال کو سمجھ سکیں گے۔ آپ نہ صرف مغل بلکہ شیر شاہ کے دور میں فروغ پانے والی ریاست کی نوعیت اور انتظامی ساخت کو سمجھیں گے۔ آپ ہندوستان کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی حالات اور خاص طور پر ان مشترکہ ثقافتی بنیادوں کے بارے میں گہری بصیرت حاصل کریں گے جنہوں نے مغل دور میں مضبوط جڑیں پکڑیں۔ مغل دور میں ہندوستانی معیشت خوشحال تھی اور یہ کورس آپ کو اس اہم پہلو کو بھی سمجھنے میں مدد دے گا۔ آپ شیواجی کے عروج اور اس کی کامیابیوں کو بھی سمجھ سکیں گے۔ آپ اٹھارویں صدی میں بنگال، حیدرآباد اور میسور جیسی دیگر مختلف ریاستوں کے ظہور کے بارے میں بھی جانیں گے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کورس آپ کو فرقہ واریت کے کووڈ وائرس، جو ہندوستانی سماج کے بڑے حصے کو تیزی سے متاثر کر رہا ہے، کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ براہ کرم یاد رکھیں: ایک فرد کووڈ سے تو بچ سکتا ہے لیکن فرقہ واریت سے نہیں، جو ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں / بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیا واچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ میٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

تاریخ ہندوستان

(1526 تا 1750)

History of India

(1526 – 1750)

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 1۔ سولھویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات

(Political Conditions of India during the 16th Century)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 سولھویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات

1.2.1 سکندر لودی

1.2.2 ابراہیم لودی

1.2.3 بابر

1.2.4 ہمایوں

1.2.5 شیر شاہ سوری

1.2.6 شیر شاہ کے جانشین

1.2.7 جلال الدین محمد اکبر

1.3 دکن

1.3.1 تلوا خاندان

1.3.2 اراویڈو خاندان

1.4 مالوہ

1.5 گجرات

1.6 بنگال

1.7 آہوم

1.8 اکتسابی نتائج

1.9 کلیدی الفاظ

1.10 نمونہ امتحانی سوالات
1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

سولہویں صدی کا ہندوستان عبوری دور کا حامل ہے۔ اس دور میں کسی ایک طاقتور مرکزی حکومت کے بجائے مختلف علاقوں میں مختلف حکومتیں موجود تھیں جن کے ہندوستان کی سرزمین پر دوررس اثرات پڑے۔ آج بھی ان کے نقوش بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس صدی میں شہروں کے ارتقا کے ساتھ ہی صنعت اور تجارت کا فروغ ہوا اور سماجی ڈھانچہ میں کئی اہم تبدیلیاں آئیں۔ لیکن یہ تمام تبدیلیاں کئی صدیوں تک شمالی ہندوستان یا یوں کہئے کہ جوگنگا کے میدانوں تک مخصر رہے۔ سولہویں صدی لودی حکومت، مغل سلطنت، سوری سلطنت اور علاقائی حکومتوں کی کش مکش کا زمانہ تھا۔ اس دور میں جہاں لودی، سور اور مغل شمالی ہند میں تھے اسی طرح ملک کے دیگر علاقوں میں متعدد علاقائی حکومتوں کا قیام تھا جو ہر لحاظ سے اپنے علاقوں کو ترقی دے رہی تھیں اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس اکائی میں آپ لودیوں، سوریوں اور ابتدائی مغلوں کے علاوہ گجرات، بنگال، وجے نگر اور آہوم (آسام) کی سلطنتوں کو جانیں گے اور ان کے آپسی تعلقات سے بھی واقف ہوں گے۔ سماج میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ یہ حکومتیں کس طرح کام کر رہی تھیں؟ کاروباری سرگرمیوں میں ان کا کیا کردار تھا؟ ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے ذریعہ جاننے کی کوشش کریں گے ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشان دہی کر سکیں گے۔ تجارت اور صنعت کی ترقی سے شہرکاری کا عمل کس طرح متاثر ہوا اور سیاسی حالات پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا اندازہ لگا سکیں گے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- لودی حکومت اور مغل سلطنت کے قیام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- شیر شاہ سوری اور دوسری افغان سلطنت کا مختصر تجزیہ کر سکیں گے۔
- گجرات، بنگال، وجے نگر اور آہوم حکومتوں سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- علاقائی حکومتوں کے اہم سیاسی کردار کو جان سکیں گے۔
- اس دور کی اہم سیاسی تبدیلیوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔

1.2 سولہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی حالات

(Political Conditions of India in the Sixteenth Century)

1.2.1 سکندر لودی (Sikander Lodi, 1489 –1517)

سولہویں صدی میں شمالی ہند میں سب سے اہم سلطان سکندر لودی تھا جو گجرات کے محمود بیگھڑا اور میواڑ کے رانا سانگا کا ہمعصر تھا۔ سکندر لودی نے دہلی کی حکومت کو ان دونوں طاقتوں کی طرف سے دہلی پر منڈلاتے خطرے سے نمٹنے اور آئندہ کشمکش کے لیے مضبوط کیا۔ انہوں نے ان افغان سرداروں کو بھی کسی حد تک دبانے یا قابو میں رکھنے کی کوشش کی جو قبائلی آزادی اور خود مختاری کا شدید احساس رکھتے تھے اور سلطان کو کچھ برابر حیثیت والوں میں صرف پہلا مان لینے کے عادی تھے۔ سکندر نے امراء کو اپنے سامنے کھڑے رہنے پر مجبور کیا تا کہ اس کی اعلیٰ حیثیت اور اقتدار کا اثر ان کے دلوں پر بیٹھ جائے۔ جب کوئی فرمان یا شاہی حکم پہنچتا تھا تو شہر کے تمام امراء کو اسے اعزاز و احترام کے ساتھ وصول کرنے شہر سے باہر آنا پڑتا تھا۔ اس طرح سکندر نے اپنے امراء کے ذہن میں سلطان کی اعلیٰ حیثیت کو مستحکم انداز میں قائم کر دیا۔ جن جن امراء کے پاس جاگیریں تھیں انھیں پابندی سے ان کا سالانہ حساب پیش کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی روپے پیسے میں غبن یا کسی قسم کی بد عنوانی کرتا تھا تو اسے بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ بہر حال اپنے امراء پر مکمل گرفت قائم کر لینے کے سلسلے میں سکندر لودی کو صرف محدود کامیابی نصیب ہوئی۔ اپنی موت کے وقت بہلول لودی نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور عزیزوں میں تقسیم کر دیا تھا لیکن سکندر نے بڑی سخت جدوجہد کے بعد اس تقسیم کو ختم کر دیا تھا لیکن افغان سرداروں کے دماغ میں سلطنت کی تقسیم کا خیال بہر طور باقی تھا۔

سکندر لودی اپنی حکومت میں ایک چست اور مستعد انتظامیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عدل و انصاف پر وہ بہت زور دیتا تھا اور سلطنت کی ساری شاہراہوں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ تمام ضروریات زندگی کی قیمتیں کافی کم تھیں۔ سلطان نے زراعت میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اس نے اناج پر محصول ختم کر دیا اور گز کا ایک نیا پیمانہ رائج کیا جسے گز سکندری کہا جاتا تھا جو مغل عہد تک جاری رہا۔ جو لگان کھاتے اس کے دور میں تیار کیے گئے تھے بعد میں شیر شاہ سوری کے زمانے میں انہی کی بنیاد پر لگان کھاتے تیار کیے گئے۔ سکندر لودی کو ایک قدامت پرست بادشاہ مانا گیا ہے۔ اس نے ان تمام کاموں پر مسلمانوں کے لیے پابندی لگا دی۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ دوبارہ عائد کیا اور ایک برہمن کو اس لیے قتل کروا دیا کہ اس کا ماننا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مقدس کتابیں یکساں طور پر قابل احترام ہیں۔ اپنی فوجی مہموں کے دوران اس نے کئی مشہور و معروف مندروں کو بھی منہدم کروا دیا جیسے نگر کوٹ کا مندر وغیرہ۔

سکندر لودی نے عالموں، فلسفیوں اور دانشوروں کو بہت قیمتی عطیات سے نوازا جس کی وجہ سے عرب اور ایران سمیت ہر سمت اور ہر ملک کے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ لوگ اس کے دربار میں بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ سلطان کی کوششوں سے سنسکرت کی بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ اسے موسیقی میں بھی دلچسپی تھی چنانچہ سنسکرت کی موسیقی پر کچھ نادر اور نایاب کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کروایا گیا۔ اسی دور میں بہت بڑی تعداد میں ہندوؤں نے فارسی سیکھی اور انہیں بہت سے انتظامی عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ اس طرح سے اس کے دور میں

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی مصالحت یا قربت کا ماحول متواتر آگے بڑھتا رہا۔ سکندر لودی نے دھولپور اور گوالیار کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ ان فوجی مہموں کے دوران احتیاط سے سروے کرواکر اور گفت وشنید کے بعد 1506ء میں آگرہ کو مرکز کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہیں سے دوآب کے باغی امراء پر بھی گرفت رکھنا آسان تھا۔ کچھ عرصے میں آگرہ ایک بڑا شہر ہوگیا اور اسے ہی لودیوں کا دوسرا پایہ تخت بنادیا گیا۔ سکندر لودی کی دلچسپی متواتر مشرقی راجستھان میں بڑھ رہی تھی جس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ پہلے اس نے ناگور کے خان کو اپنی حفاظت میں لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ رنتھمبور اپنی وفاداری کا الحاق مالوہ کے بدلے دہلی سلطنت سے کرلے۔ اس کا جانشین ابراہیم لودی تو میواڑ کے خلاف ایک فوجی مہم بھی لے کر گیا جو پسپا کردی گئی۔ مالوہ میں رانا کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کی فوج کے آگرہ اور بیانا کی طرف بڑھنے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی تھی کہ میواڑ اور لودیوں کے درمیان ٹکراؤ کے امکانات مستقبل میں بڑھ رہے تھے۔ اگر بابر نے اس بیچ مداخلت نہ کی ہوتی تو اس ٹکراؤ کے نتائج کیا ہوتے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔

1.2.2 ابراہیم لودی (Ibrahim Lodi, 1517–1526)

یہ سکندر لودی کا بیٹا تھا۔ اس کی دوبار تاج پوشی ہوئی۔ سرداروں کے ایک گروپ نے ابراہیم کے بھائی جلال خاں کو جونپور کا حکمراں بنا کر حکومت کو تقسیم کردیا، لیکن بعد میں ابراہیم نے اسے شکست دے دی۔ ابراہیم لودی 1517ء میں میواڑ کے رانا سانگا سے ختولی کی جنگ میں شکست کھا گیا۔ ابراہیم نے گوالیار کے حکمراں وکرم دتیہ کو شکست دے کر گوالیار کو سلطنت میں ملا لیا۔ وکرم دتیہ بھی پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر سے شکست کھا کر میدان جنگ میں مارا گیا۔ تاریخ خان جہانی و مخزن افاغنہ کے مصنف نعمت اللہ کے مطابق میدان جنگ میں مرنے والا وہ دلی سلطنت کا پہلا سلطان تھا۔ سولہویں صدی میں شمالی ہند میں مغل سلطنت کا قیام ہوا جو کہ بابر کا حیرت انگیز کارنامہ تھا۔

1.2.3 بابر (Babur, 1526–1530)

مغل سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر کو اس کے وسطی ایشیائی وطن فرغانہ سے دشمن ازبکوں نے نکال باہر کیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر 1526 میں علاقوں اور وسائل کی تلاش میں ہندوستان آیا۔ بابر نے ابراہیم لودی اور رانا سانگا کو شکست دے کر بنگال کی سرحد تک پورے شمالی ہند پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس نے آگرہ اور دیگر مقامات پر کئی باغ اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔ 1530 میں جب اس کا انتقال ہوا تو اسے آگرہ میں دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر خود اس کے تعمیر کیے ہوئے باغ میں دفن کیا گیا۔ بعد میں اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کابل پہنچادی گئی اور وہاں بابر ہی کے تعمیر کردہ باغ میں دفن کردی گئی۔

1.2.4 ہمایوں (Humayun, 1556–1530)

بابر کا بیٹا ہمایوں باپ کی طرح شریف، نیک اور رحم دل تھا۔ میدان جنگ میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ باپ کے ساتھ بیشتر لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پانی پت اور کنواہہ کی جنگ میں تھا۔ آگرہ اسی نے فتح کیا تھا، لیکن سست اور آرام طلب تھا اور اپنی فوج اور سرداروں کو وہ بابر کی طرح پوری طرح قابو میں نہیں رکھ سکا۔ اس کے ابتدائی چند سال کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اس نے افغانوں کو لکھنؤ کے پاس شکست

دے کر مشرق کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔اس کے ایک باغی سردار نے جب گجرات کے سلطان بہادر شاہ کو شکست دے کر 1535ء میں مالوہ اور گجرات پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد ہمایوں نے بنگال کا رخ کیا جہاں ایک افغان سردار شیر خاں قابض ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے بنگال کے دارالحکومت کو آسانی سے فتح کرلیا لیکن وہ آرام طلبی کا شکار ہو گیا۔اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا حریف شیر خاں صلاحیت، بہادری اور جفاکشی میں دوسرا بابر ہے۔ شیر خاں نے اس کی واپسی کے سب راستے بند کر دیئے۔اور جب ہمایوں گھبرا کر واپس ہوا تو شیر خاں نے چوسا کے مقام پر اس کو شکست دی،اس کے بعد دوسری شکست فاش قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے دی۔ ہمایوں نے اپنی جان بڑی مشکل سے بچائی۔ ہمایوں اب آگرہ کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا لیکن شیر خاں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ہمایوں اور اس کے ساتھیوں نے اب ملک چھوڑنے ہی میں عافیت سمجھی۔اس کے دو بھائی کامران اور عسکری کابل چلے گئے اور تیسرا بھائی ہندال قندھار چلا گیا۔ ہمایوں نے کچھ مدت سندھ میں قیام کیا۔اس کے بعد وہ بھی 1545ء میں قندھار کے راستے ایران چلا گیا۔تاکہ ایران کے فرمانروا شاہ طہماسپ سے مدد حاصل کر سکے۔ ہمایوں تقریباً دو سال ایران میں رہا۔قزوین کے قریب شاہ طہماسپ سے اس کی ملاقات ہوئی اور طہماسپ نے اس خواہش کے تحت تیرہ ہزار سواروں سے ہمایوں کی مدد کی کہ وہ شیعہ عقیدہ اختیار کرلے گا اور بارہ اماموں کے نام خطبے میں شامل کر دیگا۔ ہمایوں نے ایرانی فوجیوں کی اس مدد سے 1545ء میں قندھار اور کابل واپس لے لیے جن پر اس کے بھائی عسکری اور کامران قابض ہو گئے تھے، لیکن دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اس کو دس سال اور انتظار کرنا پڑا اور یہ اس وقت ہی ممکن ہوا جب شیر شاہ اور اس کے بیٹے سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

1.2.5 شیر شاہ سوری (Sher Shah Suri, 1545–1540)

شیر شاہ تاریخ کے ان لوگوں میں سے ہے جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بادشاہت تک پہونچا۔بلند حوصلہ رکھنے والے لوگوں کے لیے شیر شاہ کی زندگی ایک نمونہ ہے۔اس کا اصلی نام فرید خاں تھا۔ صوبہ بہار میں سہسرام کے علاقے کے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ یہ علاقہ اس زمانہ میں دہلی کے لودی بادشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ شیر خاں بڑا ہونے کے بعد جونپور چلا گیا جو اس زمانہ میں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں اس نے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سہسرام واپس آگیا اور باپ کی موت کے بعد اپنی جاگیر کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ اس کی دور دور شہرت ہو گئی۔اس نے اپنے علاقے سے چوری، ڈکیتی، رہزنی ختم کر دی۔ کاشتکاروں پر محصول لینے والے جو ظلم کرتے تھے اس کا خاتمہ کر دیا۔اس کے اس انتظام سے پیداوار بڑھ گئی اور لوگ خوش حال ہو گئے۔اس نے جوانی میں اپنی تلوار سے شیر کو مارا تھا،اس لیے اس کو شیر خان کا لقب ملا۔ شیر خاں اپنی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا کہ اسی زمانہ میں بابر نے دہلی پر قبضہ کر کے لودی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور مغلوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ شیر خاں اگرچہ صرف ایک جاگیر کا مالک تھا۔ لیکن اس کو اپنی قابلیت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع ملا تو ایک دن مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔ایک مرتبہ وہ بابر کی ایک دعوت میں شریک ہوا۔ کھانے میں ایک ایسی چیز بھی تھی جسے چھری سے کاٹ کر کھانا ہوتا تھا۔ شیر خاں کے پاس دسترخوان پر کوئی چھری نہیں تھی لیکن اس نے چھری مانگنے کے بجائے کمر سے پیش قبض نکالا اور کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ بابر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیر خاں کی یہ جرأت وہمت دیکھ کر بابر کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ جوانمرد اس کی حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائے، چنانچہ بابر نے اپنے وزیر کو ہدایت کر دی کہ شیر خاں

خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے اس پر نظر رکھی جائے۔ بابر کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ شیر خاں اس دعوت کے بعد سہسرام واپس آگیا اور جب بابر کا انتقال ہو گیا تو اس نے صوبہ بہار اور بنگال پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں سے لڑائیاں شروع ہو گئیں جس میں ہمایوں کو شکست ہوئی اور شیر خاں نے سلطنت پر قبضہ کر کے شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ شیر شاہ نے لاہور اور سرگودھا تک ہمایوں کا تعاقب کیا۔ اس کی فوجوں نے ملتان اور سندھ پر بھی قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے ہمایوں کو ایران جاکر پناہ لینی پڑی۔ اس کے بعد شیر شاہ اجمیر، چتوڑ اور مالوہ پر قابض ہو گیا اور اس طرح ایک ایسی سلطنت کا حکمراں بن گیا جو لودی سلطنت سے بڑی اور خلجی سلطنت کے برابر تھی۔ شیر شاہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ ایک توپ کا گولہ پھٹنے سے اس کا انتقال ہو گیا۔

1.2.6 شیر شاہ کے جانشین (Successors of Sher Shah)

شیر شاہ پٹھانوں کے قبیلے سور سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے لیکن سوری خاندان کی یہ حکومت زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ نہ تو شیر شاہ کے جانشیں لائق ثابت ہوئے اور نہ اس کے پٹھان امراء جو حکومت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ شیر شاہ کے بعد صرف اس کے لڑکے اسلام شاہ نے کامیابی سے نو سال حکومت کی۔ اسلام شاہ کے بعد اس کا لڑکا فیروز بارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا، لیکن اس کا ماموں مبارز خاں اس کو قتل کر کے محمود شاہ عادل کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ پنجاب میں شیر شاہ کے بھتیجے سکندر شاہ نے بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ محمد شاہ سوری نے بنگال میں اور دوسرے سرداروں نے بہار اور دہلی میں تخت کے دعوے شروع کر دیے۔ ہمایوں نے جب ہندوستان کے حالات کو پراگندہ پایا، تو موقع سے فائدہ اٹھایا اور کابل کی طرف سے حملہ کر دیا۔ نومبر 1554ء میں اس نے پشاور پر اور فروری 1555ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکندر شاہ سوری نے سرہند کے قریب مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور جولائی 1555ء میں ہمایوں دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس طرح ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لی۔ لیکن ابھی وہ اپنی حکومت کو مستحکم نہیں کر پایا تھا کہ فتح دہلی کے چند ماہ بعد وہ دہلی میں اپنے کتب خانہ کے زینے سے گر کر 24 جنوری 1556ء کو انتقال کر گیا۔

1.2.7 اکبر (Akbar, 1605–1556)

ہمایوں کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا اکبر دہلی میں نہیں تھا۔ وہ اپنے اتالیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں باقی ماندہ افغانوں کے خلاف کارروائی میں مصروف تھا۔ جب ہمایوں کے انتقال کی خبر ملی تو بیرم خاں نے وہیں ضلع گورداسپور کے ایک گاؤں کلانور میں اکبر کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ ہمایوں اگرچہ دہلی پر قابض ہو گیا تھا لیکن سوری افغانوں کی طاقت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ ہمایوں کے انتقال کے بعد عادل شاہ سوری کے ہندو سپہ سالار ہیمو نے آگرہ اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ پانی پت کے تاریخی میدان جنگ میں جہاں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تھی، اکبر اور ہیمو کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اکبر کی فوج نے جس کی قیادت بیرم خاں کر رہا تھا ہیمو کو شکست فاش دی اور اس کو قتل کر دیا گیا اور دہلی اور آگرہ پر ایک بار پھر تیموری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اکبر سندھ کے امرکوٹ میں 1542ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہمایوں

شیر شاہ سے شکست کھا کر ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ اسی پریشانی کی حالت میں اکبر پیدا ہوا۔ اکبر جس وقت کلانور میں تخت نشیں ہوا تو اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اکبر کی نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام کئی سال تک اس کے قابل اور وفادار اتالیق بیرم خاں نے سنبھالا۔ اس کی کوششوں سے چند سال ہی میں اکبر کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور 1560ء میں جب اکبر نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی حکومت اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ ملک کی صوبائی حکومتوں کے خلاف فوجی کاروائی کر سکے۔ چنانچہ اکبر نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو تیزی سے بڑھانا شروع کر دیا۔ فتوحات کا یہ کام زیادہ تر اس کے سپہ سالاروں نے انجام دیا، لیکن اکبر خود بھی ایک اچھا فوجی اور سپہ سالار تھا۔ وہ جفاکشی اور سخت کوشی میں بابر سے کم نہیں تھا۔ اکبر نے ایک ایک کر کے شمالی ہند کی ان تمام حکومتوں کو ختم کر دیا جو سلطنت دہلی کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ اکبر کی فوجوں نے 1564ء میں مالوہ، 1569ء میں راجپوتانہ، 1573ء میں گجرات، 1575ء میں بنگال اور پھر کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ 1591ء میں سندھ 1592ء میں اڑیسہ اور 1595ء میں بلوچستان اور قندھار پر بھی تیموری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

1.3 دکن (Deccan)

شمالی ہند پر قبضہ ہو جانے کے بعد اکبر نے دکن کا رخ کیا۔ دکن میں خاندیس کی فاروقی ریاست اور احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کی سرحدیں مغل سلطنت سے ملتی تھیں۔ ان میں خاندیس کے حکمراں راجا علی خاں فاروقی نے اکبر کی طاقت کا اندازہ کر کے پہلے ہی دہلی کی بالادستی قبول کر لی تھی لیکن احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور راجا علی فاروقی کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا بہادر خاں بھی اکبر کی اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ اکبر نے 1600ء میں برہان پور اور قلعہ اسیر گڑھ فتح کر کے خاندیس میں فاروقی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور احمد نگر فتح کر کے برار اور احمد نگر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن احمد نگر کے جنوب مغرب کا علاقہ نظام شاہیوں کے قبضہ میں رہ گیا۔ اکبر نے کل پچاس سال حکومت کی اور اس عرصہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کر دی جو وسعت میں تقریباً دہلی کی سلطنت کے برابر تھی۔ سولہویں صدی میں شمالی ہند میں مذکورہ بالا حکومتیں تھیں تو جنوبی ہند میں تلوا خاندان اور اس کے بعد اراوید و خاندان نے حکومت کرنے کی کوشش کی۔

1.3.1 تلوا خاندان (Tuluva Dynasty)

1505ء میں نرسانایک کے لڑکے ویر نرسنگھ نے عمادی نرسنگھ کو قتل کیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ ویر نرسنگھ نے سلوا خاندان کا خاتمہ کیا اور تلوا خاندان کی بنیاد رکھی۔ ویر نرسنگھ نے اپنی رعایا کی بھلائی میں دلچسپی لی۔ ویر نرسنگھ کی موت کے بعد کرشنا دیورائے حکمراں بنا۔ ویر نرسنگھ نے اپنی گھڑ سوار فوج کو طاقتور بنانے کے لیے پرتگالی گورنر المیڈا سے پرتگالیوں کے ذریعہ گھوڑوں کو خریدنے کے لیے ایک سمجھوتہ کیا۔

کرشنا دیورائے (Krishnadeva Raya)

کرشنا دیورائے وجے نگر کا سب سے عظیم حکمراں تھا۔ 1509ء میں بیدر کے سلطان محمود شاہ نے بیجاپور کے عادل شاہ کے ساتھ مل کر وجے نگر پر حملہ کیا، لیکن انہیں شکست ہوئی اور اس جنگ میں یوسف عادل شاہ مارا گیا۔ 1512ء میں کرشنا دیورائے نے بیجاپور کو شکست

دے کر پورے رائے چور دوآب کو فتح کر کے اسے وجے نگر ریاست میں ملالیا۔1520ء میں اس نے بیجاپور کے سلطان اسماعیل عادل شاہ کو رائے چور میں پھر شکست دی۔اس لڑائی میں پرتگالی فوج بھی شریک تھی۔ باغیوں کا خاتمہ کر کے 1513ء میں اڑیسہ کے گجپتی حکمراں پرتاپ رودر دیو سے ادے گیری، تلنگانہ، وارنگل، راجمندری وغیرہ فتح کر کے اپنی ریاست کی توسیع کی۔پرتاپ رودر دیو نے اپنی لڑکی کی شادی کرشنا دیو رائے سے کر دی۔اس عظیم فتح کی خوشی میں کرشنا دیو رائے نے ایک وجے استمبھ (منارہ ظفر) تعمیر کروایا۔کرشنا دیو نے گلبرگہ اور بیدر پر حملہ کر کے بہمنی سلطان محمود شاہ کو قید سے آزاد دلائی اور اسے بیدر کے تخت پر بیٹھایا جس کے بعد اس نے 'یون راج استھاپنا چاریہ' کا لقب اختیار کیا۔اس کے علاوہ اس کے وزیر تماراسو نے گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ کو شکست دی۔کرشنا دیو رائے کے پرتگالیوں سے اچھے تعلقات تھے اور اس نے گوآ فتح کرنے میں ان کی مدد کی۔اس نے پرتگالیوں سے معاہدہ کیا کیونکہ وہ گھوڑوں کی تجارت پر اجارہ داری رکھتے تھے اور وجے نگر کی طرح بہمنی سلطنت کے دشمن تھے۔پرتگالی گورنر البقرق نے 1510ء میں فادر لوئی کی صدارت میں ایک تجارتی مشن وجے نگر بھیجا۔کرشنا دیو رائے نے اس پرتگالی مشن کو بھٹکل میں ٹھکانہ بنانے کی اجازت دی۔

اچیوتا دیو رائے (Achyutadeva Raya)

کرشنا دیو رائے کے بعد اس کے مقرر کردہ جانشین اچیوتا دیو رائے کی تاج پوشی تروپتی مندر میں ہوئی۔اس نے وزیر رام رائے کے ساتھ مل کر حکومت کی۔اس کے دور حکومت میں حکومت کی باگ دوڑ ترومال نامی دو بھائیوں کے ہاتھ میں تھی جو اچیوتا کے سالے تھے۔اچیوتا دیو رائے نے مہامنڈ لیشور نامی افسر کو مقرر کیا۔پرتگالی سیاح اور گھوڑوں کے تاجر نونیز نے اس کے دور حکومت میں سفر کیا۔

سداشیو (Sadashiva Raya)

سداشیو تلوا خاندان کا آخری اور برائے نام حکمراں تھا۔ حقیقی اقتدار وزیر رام رائے کے ہاتھ میں تھا۔رام رائے نے فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کی اور پرتگالیوں کے ساتھ کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں جیسا رویہ اپنایا۔رام رائے نے دکن کی سلطنتوں کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھایا۔1558ء میں رام رائے نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے ساتھ مل کر احمد نگر کو لوٹا۔جلد ہی دکنی سلطنتیں رام رائے کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی کو سمجھ گئیں۔ برار کو چھوڑ کر دیگر چار بہمنی ریاستوں (بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر اور بیدر) نے وجے نگر کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔بیجاپور کا علی عادل شاہ اس اتحاد کا قائد تھا۔ برار اس اتحاد میں گولکنڈہ سے دشمنی کے سبب شامل نہیں ہوا۔جنوری 1565ء میں حسین نظام شاہ کے ماتحت متحدہ فوج نے تالی کوٹا کی جنگ میں وجے نگر کی فوج کو بری طرح شکست دی۔ وجے نگر کی فوج کا سپہ سالار رام رائے جنگ میں کام آیا۔اس جنگ کے ساتھ ہی جنوب میں وجے نگر کے شاندار دور کا خاتمہ ہو گیا۔

1.3.2 اراویڈو خاندان (Aravidu Dynasty)

تالی کوٹا کی جنگ کے بعد رام رائے کے بھائی ترومال نے وجے نگر کی جگہ پر پنو گونڈا کو اپنی راجدھانی بنایا۔اس نے تلوا خاندان کے سداشیو کو برخواست کر کے 1570ء میں اراویڈو خاندان کی بنیاد ڈالی۔ترومال کو زوال پذیر وجے نگر ریاست کو بحال کرنے والا بھی کہا جاتا

ہے۔ تروماں کے بعد اس کا لڑکا وینکٹ ثانی حکمراں بنا۔ وینکٹ ثانی نے راجدھانی پینگونڈا سے چندر گری منتقل کر دی۔ وینکٹ کا اسپین کے حکمراں فلپ سے رابطہ تھا۔ 1598ء میں وینکٹ نے عیسائی پادریوں کا اپنے دربار میں استقبال کیا۔ اسے فن مصوری میں دلچسپی تھی۔

1.4 مالوہ (Malwa)

سولہویں صدی ء میں مالوہ میں خلجی حکومت کا دور تھا۔ یہ ایک قسم کی علاقائی حکومت تھی اس کا سب سے مشہور حکمراں محمود خلجی اول تھا جس نے مالوہ کو ایک عظیم ریاست میں تبدیل کیا

ناصرالدین شاہ (Nasiruddin Shah)

اس نے 1500ء سے 1510ء تک مالوہ پر حکومت کی۔ یہ ایک خود سر اور عیاش حکمراں تھا۔ اس کا تعمیر کردہ محل بعد میں باز بہادر اور رانی روپ متی کا محل کہلایا۔ اس نے حبشی اور ترک غلاموں کی ایک فوج بھی منظم کی تھی۔

محمود خلجی ثانی (Mahmood Khalji II)

محمود ثانی مالوہ کا آخری حکمراں تھا۔ اس نے باغی امیروں کو کچلنے کے لیے چندیری کے راجپوت حکمراں میدنی رائے کو اپنا وزیر متعین کیا۔ محمود کو چتوڑ کے حکمراں رانا سانگا نے شکست دی۔ 1513ء میں گجرات کے حکمراں بہادر شاہ نے مانڈو پر حملہ کر کے محمود ثانی کو شکست دی اور مالوہ کو گجرات میں ملالیا اور اس طرح مالوہ ریاست کی خود مختاری ختم ہو گئی۔ 1535ء میں جب ہمایوں نے گجرات فتح کیا تو مالوہ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا، لیکن جلد ہی اس کے ہاتھ سے نکل کر شیر شاہ کے قبضے میں چلا گیا۔ اسلام شاہ سور کی موت کے بعد مالوہ کے گورنر باز بہادر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ بالآخر اکبر نے باز بہادر کو شکست دے کر مالوہ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ باز بہادر کے خلاف اکبر کی مہم کی قیادت ادہم خاں نے کی۔ باز بہادر نے اکبر کی ماتحتی قبول کر کے دو ہزار کا منصب قبول کیا۔ باز بہادر اعلیٰ پیمانے کا موسیقار بھی تھا۔

1.5 گجرات (Gujarat)

گجرات کو سب سے پہلے 1297ء میں علاءالدین خلجی نے فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کیا۔ اس کے بعد ایک صدی تک گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ تیمور کے حملہ کے بعد 1401ء میں یہاں کے صوبہ دار نے ایک آزاد حکومت قائم کر لی۔

احمد شاہ (Ahmad Shah)

گجرات بڑا زرخیز اور آباد صوبہ تھا۔ یہاں تقریباً دو صدیوں کے عرصہ میں کئی بادشاہ ہوئے جنھوں نے ملک کو ترقی دی۔ ان میں ایک احمد شاہ تھا۔ احمد آباد کا مشہور شہر اسی نے آباد کیا۔ اس زمانہ میں احمد آباد میں 300 محلے تھے اور ہر محلہ میں ایک مسجد اور ایک بازار تھا۔ اس شہر کے بازار اتنے کشادہ تھے کہ دس گاڑیاں ایک ساتھ گزر سکتی تھیں۔ عمارتیں زیادہ تر اینٹوں اور چونے کی تھیں۔ جب شہر بن گیا تو بادشاہ نے شہر کے مکان اور دوکانیں لوگوں کو بغیر کسی معاوضہ کے دے دیں۔ احمد آباد اس وقت سے آج تک گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ احمد شاہ نے

گجرات ریاست کو بڑی وسعت دی اور جونا گڑھ اور سورت فتح کیے۔ وہ جب کوئی علاقہ فتح کرتا تھا تو ہر شہر میں ایک مسجد، ایک سرائے اور ایک مدرسہ تعمیر کرتا تھا۔احمد شاہ کے عدل وانصاف کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے۔اس کے داماد نے ایک آدمی کو بغیر کسی قصور کے قتل کر دیا۔ جب احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے قتل کے جرم میں داماد کو سولی دے دی۔ جب اس سے کہا گیا آپ خون بہا دے سکتے تھے تو اس نے کہا، اس طرح رعایا کے خون کو امراء اور شہزادے جائز سمجھ لیں گے۔ اپنے خزانوں سے خون بہا دیتے رہیں گے اور خون کرتے رہیں گے۔

محمود بیگڑہ (Mahmud Bigada)

احمد شاہ اگرچہ بہت اچھا بادشاہ تھا لیکن گجرات کا سب سے مشہور بادشاہ محمود بیگڑہ (1458تا1511) ہوا ہے۔اس نے 52 سال حکومت کی اور اپنے زمانہ حکومت میں گجرات کے ساحلوں سے بحری قذاقوں کا خاتمہ کر دیا اور کئی شہر آباد کیے محمود بیگڑہ نے بڑی قابلیت اور انصاف سے حکومت کی۔ وہ شریعت کا پابند تھا اور وعدہ کا پکا تھا۔اس کی شہرت یورپ تک ہو گئی تھی اور دہلی کے سلطان سکندر لودی نے اس کو تحفے بھیجے۔ محمود بیگڑہ مسلم حکومتوں سے لڑنا اچھا کام نہیں سمجھتا تھا۔ایک مرتبہ جب مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کا انتقال ہوا تو امراء نے مالوہ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے یہ کہ کر انکار کر دیا کی اسلام میں یہ جائز نہیں کہ مسلمان مسلمان سے لڑیں اور ایک ہمسایہ ملک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر چڑھ دوڑے۔اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے کہا ہماری ماں سندھ کی رہنے والی ہے اور ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے ننھیال پر حملہ آور ہوں۔ محمود بیگڑہ نے مسافروں کے آرام کے لیے سرائیں، طلباء کے لیے مدرسے اور مسلمانوں کے لیے مسجدیں تعمیر کرائیں۔اس کا دربار علما فضلاء سے بھرا رہتا تھا۔ گجرات پر 1573ء میں مغلوں نے قبضہ کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

1.6 بنگال (Bengal)

بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا تھا۔ شروع میں یہاں کے تین صوبہ داروں نے تین حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ یہ حکومتیں مشرقی بنگال، شمالی بنگال اور مغربی بنگال پر مشتمل تھیں۔ مشرقی بنگال کی حکومت کا بانی فخر الدین مبارک شاہ تھا۔کتاب الرحلہ کا مصنف ابن بطوطہ اسی کے زمانے میں بنگال آیا تھا اور مشرقی بنگال کے دارالحکومت سنار گاؤں اور سلہٹ تک گیا تھا۔ سنار گاؤں ڈھاکہ کے قریب تھا۔ابن بطوطہ نے بنگال کی زرخیزی اور ارزانی کی بہت تعریف کی ہے۔اور لکھا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک بنگال کے برابر سستا نہیں۔ فخر الدین مبارک شاہ کے بارے میں اس نے لکھا ہے کی وہ بڑا فاضل بادشاہ ہے اور پردیسیوں اور صوفیوں سے محبت رکھتا ہے۔ سولہویں صدی میں بنگال میں حسین شاہی خاندان کا عروج تھا

حسین شاہی خاندان

علاءالدین حسین شاہ اور اس کے بیٹے نصرت شاہ کا زمانہ بنگال کے سیاسی عروج اور تمدنی ترقی کا زمانہ ہے۔اس زمانہ میں بہار، اڑیسہ اور آسام کا ایک حصہ بھی بنگال کی حکومت کے تحت آ گیا تھا۔ لکھنوتی، بنگال کا دارالحکومت تھا۔اس شہر اور دوسرے مقامات پر مساجد اور دوسری

شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جو بنگال کے طرز تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ علماء کی سرپرستی کی گئی اور رفاہ عام کے کام انجام دیے گئے۔ ایک چینی سیاح نے اس زمانے کے بنگال کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کی پیداوار وافر اور باشندے خوشحال ہیں۔ ہندو اور مسلم دونوں ہی اپنے معاملات میں راستباز اور فراخ دل ہیں۔ نصرت شاہ کے حکم پر سنسکرت کی مشہور رزمیہ داستان مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے زمانے میں بنگالی زبان میں پہلی مرتبہ کتابیں لکھیں گئیں۔ مالادھر بسو نے حسین شاہ اور نصرت شاہ کے نگرانی میں بھگوت گیتا کا ترجمہ شری کرشن وجے نام سے بنگلا زبان میں کیا۔ حسین شاہ اور نصرت شاہ نے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، چنانچہ اس دور کا ایک ہندو شاعر لکھتا ہے کہ نصرت شاہ کا باپ ایک عظیم بادشاہ تھا اور ملک پر ایک دوسرے رام کی طرح حکومت کرتا تھا۔ حسین شاہ نے ہندوؤں کے لیے نرم پالیسی اپنائی اور انہیں اعلیٰ عہدے دیے۔ حسین شاہ کے وزیر گوپی ناتھ تھے اور روپ اور سناتن نامی دو ویشنو بھائی اس کے اہم افسر تھے۔ حسین شاہ نے اپنے ہمنام جونپور کے شکست خوردہ شرقی سلطان کو لودیوں کے خلاف پناہ دی، اس لیے اسے سکندر لودی سے جنگ کرنی پڑی۔ حسین شاہ نے خلیفۃ اللہ کا لقب اپنایا۔ حسین شاہ نے راجدھانی ایکدلا منتقل کی۔ ہندوؤں کے لیے ہمدردی اور انصاف کے سبب اس کو کرشن کا اوتار مانا جاتا ہے۔ بابر نے حسین شاہ کو سید کہا ہے۔ نصرت شاہ نے فن تعمیر میں خوب دلچسپی دیکھائی۔ اس نے گوڑ میں بڑا سونا مسجد اور قدم رسول مسجد بنوائی۔ بابر نے نصرت شاہ کو گھاگھرا کی لڑائی میں شکست دی۔ شیر شاہ سوری نے آخری حکمراں غیاث الدین محمود کو ہرا کر 1538ء میں بنگال پر قبضہ کر لیا۔

1.7 آہوم (Ahom)

آہوم قوم بارہویں صدی میں آج کے میانمار کے علاقے سے ہجرت کر کے برہم پتر وادی میں پہنچے۔ انہوں نے یہاں کے پرانے سیاسی نظام، بھوئیاں، (زمینداروں) کو کچل کر ایک ریاست بنائی۔ سولہویں صدی کے درمیان انہوں نے 1523 میں چھوٹیاؤں کی ریاست کو 1581 میں کوچ ہاجو کی ریاست کو اپنی ریاست میں شامل کیا اور بہت سے قبیلوں کو مطیع بنالیا۔ آہوموں نے ایک بڑی ریاست قائم کر لی اور اس کے لیے انہوں نے 1530ء کے دہوں سے ہی بارودی ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیے تھے۔ 1660ء تک تو یہ بہت اعلی درجے کا بارود اور توپیں بنا سکتے تھے۔ بہر حال آہوموں کو جنوب مغرب کی طرف سے بہت سے حملے برداشت کرنے پڑے۔ 1662 میں میر جملہ کی قیادت میں مغلوں نے اہوم ریاست پر حملہ کیا۔ پوری بہادری سے مدافعت کرنے کے باوجود آہوم ہار گئے۔ مگر اس علاقے پر مغلوں کا براہ راست تسلط زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا۔

آہوم ریاست جبریہ مزدوری پر قائم تھی۔ ریاست کے لیے جبریہ مزدوری کرنے والوں کو 'پیک' کہا جاتا تھا۔ آبادی کی مردم شماری کی گئی تھی۔ ہر گاؤں کو باری باری جبریہ مزدوروں کی ایک متعینہ تعداد بھیجنی ہوتی تھی۔ بہت زیادہ گنجان آبادی والے علاقوں سے لوگوں کو بکھری ہوئی آبادی والے علاقوں کی طرف منتقل کیا جاتا تھا۔ اس طرح آہوم خاندانی گروہ یا گو ترٹوٹ گئے۔ سترھویں صدی کے پہلے نصف زمانے تک انتظامیہ میں کافی مرکزیت آگئی تھی۔ جنگ کے دوران لگ بھگ سارے جوان مرد فوجی خدمت انجام دیتے تھے۔ دوسرے وقتوں میں یہ لوگ باندھ بناتے، آبپاشی کے منصوبوں کی تعمیر کرتے اور دوسرے عوامی کام انجام دیتے تھے۔ اہوموں نے چاول کی کاشت کے نئے طریقے شروع

کیے۔آہوم سماج خیلوں میں بٹاہوا تھا۔ان میں کاریگروں کی ذاتیں کم تھیں اوران کے کاریگر پاس پڑوس کی ریاستوں سے آتے تھے۔ خیل عام طور پر کئی گاؤں پر گرفت رکھتا تھا۔کسان کو گاؤں کا سماج زمین دیتا تھا۔سماج کی مرضی کے بغیر بادشاہ بھی اس زمین کو کسان سے واپس نہیں لے سکتا تھا۔ شروع میں آہوم لوگ اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔بہر حال تیرہویں صدی کے پہلے نصف حصے میں برہمنوں کا اثر بڑھا۔ برہمنوں اور مندروں کو بادشاہوں نے زمینیں دیں۔سب سنگھ کے دور حکومت میں یہاں کی زیادہ تر آبادی کو زبردستی ہندو بنالیا گیا۔ آہوم بادشاہوں نے ہندو مذہب قبول کر لینے کے بعد بھی اپنے روایتی عقیدوں کو نہ چھوڑا۔آہوم سماج بہت مہذب سماج تھا۔شاعروں اور عالموں کو زمینی عطیات دیے جاتے تھے۔ناٹکوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ سنسکرت کی اہم کتابوں کا مقامی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔تاریخی کتابیں جنہیں 'برنجی' کہا جاتا تھا، پہلے آہومی میں اور پھر آسامی میں لکھی گئیں۔

1.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ سولہویں صدی میں ہندوستان کا سیاسی نقشہ کافی منقسم تھا جہاں ملک کے مختلف علاقوں میں متعدد علاقائی ریاستیں قائم تھیں۔ شمال میں لودی سلطنت، جونپور کی شرقی سلطنت کو ختم کرکے دہلی سلطنت کی وراثت کا دعویٰ کر رہی تھی اور سکندر لودھی کے عہد میں ہندوستان کی سب سے طاقتور ریاست تھی۔ شمال مشرق میں حسین شاہ اور نصرت شاہ کے تحت بنگال سلطنت اپنے عروج پر تھی جب کہ شمال بعید میں اہوم، آسام میں اپنی ریاست قائم کر چکے تھے۔ مغرب میں راجستھان میں رانا سانگا کی قیادت میں راجپوت طاقت کو غلبہ حاصل تھا اور وہ لودی سلطنت اور آس پڑوس کی ریاستوں کے لیے خطرہ بناہوا تھا۔ گجرات اور مالوہ میں بھی آزاد سلطنتیں قائم تھیں۔ دکن میں بہمنی سلطنت سے ٹوٹ کر بننے والی بیجاپور، احمد نگر، برار، خاندیش اور گولکنڈہ ریاستوں کو عروج حاصل تھا، جب کہ جنوب بعید میں کرشن دیورائے کی قیادت میں وجے نگر سلطنت جنوب کی سب سے طاقتور ریاست بن کر ابھری۔اسی دوران ہندوستان میں مغلوں کی آمد ہوئی۔ مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو اس کے وسطی ایشیائی وطن فرغانہ سے دشمن ازبکوں نے نکال باہر کیا تھا۔اس نے سب سے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی اور پھر 1526ء میں علاقوں اور وسائل کی تلاش میں ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کی۔ بابر کے جانشیں نصیر الدین ہمایوں نے سلطنت کی سرحدوں کی توسیع کی لیکن افغان قائد شیر شاہ سوری کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اسے جلا وطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمایوں نے ایران کے صفوی حکمران شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ شیر شاہ نے ہندوستان میں ایک عظیم سور سلطنت قائم کی مگر اسے سلطنت کو پروان چڑھانے کا وقت نہیں مل سکا اور 5 سال بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔1555ء میں ہمایوں نے سور حکمرانوں کو شکست دی مگر ایک سال بعد ہی اس کی موت ہو گئی۔اس کا جانشیں اکبر عظیم مغل بادشاہ تھا جس نے نہ صرف سلطنت کی توسیع کی بلکہ اس نے اپنے زمانے کی مستحکم، وسیع ترین، طاقتور اور خوشحال سلطنت بھی بنائی۔اکبر ہندوکش پہاڑوں تک اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں کامیاب رہا۔اس نے توران کے ازبکوں اور ایران کے صفویوں کے توسیع پسند منصوبے پر روک لگائی۔

1.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

برنجی	:	آسام کی تاریخ سے متعلق وہ تاریخی کتابیں جنہیں پہلے آہومی میں اور پھر آسامی میں لکھا گیا۔
پیک	:	جبریہ مزدوری کرنے والوں کو پیک کہا جاتا تھا۔
گوڑ	:	بنگال کی دوسری راجدھانی

1.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کا بانی کون تھا۔
2. ابراہیم لودی کس سن میں بادشاہ بنا۔
3. گجرات میں کون سا مشہور بندرگاہ ہے
4. بنگال میں کون سی ندی بہتی ہے۔
5. وجے نگر کا عظیم حکمراں کون تھا۔
6. کرشنا دیورائے کس کتاب کے مصنف ہیں۔
7. مہابھارت کا بنگالی زبان میں ترجمہ کس نے کیا۔
8. وجے نگر کہاں واقع ہے۔
9. وجے نگر کی راجدھانی کہاں تھی۔
10. گجرات کے کسی شہر کا نام بتایئے۔

1.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سکندر لودی پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
2. محمود بیگڑہ کے بارے میں لکھیے۔
3. احمد شاہ کے بارے میں مختصر طور پر بتائیں۔
4. بابر کی فتوحات سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔
5. شیر شاہ سوری کے کارنامے بیان کریں۔

1.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. لودی سلطنت کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ لکھئے۔
2. مغل سلطنت کی خصوصیات کو واضح طور پر لکھئے۔
3. محمود بیگڑہ کے کردار کو واضح طور کیجئے۔
4. کرشنا دیورائے پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
5. نصرت شاہ نے بنگال میں کیا کردار نبھایا، وضاحت کیجئے۔

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chandra, Satish, *History of Medieval India: 800–1700*. Orient Longman, New Delhi, 2007.
2. Hussain, Syed Ejaz, *The Bengal Sultanate*: *Politics, Economy and Coins*, (*A.D. 1205–1576*). Manohar, New Delhi, 2003.
3. Sewell Robert. *A Forgotten Empire Vijayanagar a Contribution to the History of India*. SELTZER BOOKS 2018.
4. آر پی ترپاٹھی، مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
5. ستیش چندر، عہد وسطیٰ کا ہندوستان: دہلی سلطنت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
6. پروفیسر یاسین، مغل عہد کی سماجی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 2۔ بابر اور ہمایوں

(Babur and Humayun)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 مغل کون تھے؟

2.3 بابر اور وسط ایشیا کے سیاسی حالات

2.4 بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات

2.5 بابر کا ہندوستان پر حملہ

2.6 پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب

2.7 کھانوا کی جنگ

2.8 ہمایوں

2.9 ہمایوں اور بہادر شاہ

2.10 ہمایوں اور شیر شاہ

2.11 ہمایوں کی شکست کے اسباب

2.12 اکتسابی نتائج

2.13 کلیدی الفاظ

2.14 نمونہ امتحانی سوالات

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں ہم مغل سلطنت کے قیام پر بحث کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ مغل سلطنت کے ابتدائی دنوں کی سیاسی تاریخ پیش کی جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ بابر اور ہمایوں نے کن حالات میں شمالی ہندوستان میں ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس سلسلہ میں انہیں کیا کیا مشکلات پیش آئیں۔ ہم نے 15 ویں صدی کے دوسرے نصف میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے اور ان عوامل پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ حالانکہ بابر اور ہمایوں کو حکومت کی توسیع اور نظم و نسق درست کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، لیکن افغان اور راجپوت راجاؤں کی متحدہ مخالفت کے باوجود ایک ایسے ملک میں مغل سلطنت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جو ثقافتی اور سماجی طور پر ان کے آبائی وطن سے بہت مختلف تھا۔ ہم نے پانی پت اور کھانوا کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سیاسی کشمکش کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان حالات و وجوہات کا بھی تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو ہمایوں کی شکست کے ذمہ دار تھے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل کے تعارف، ابتدائی حالات اور بابر کی ہندوستان میں آمد کے اسباب سمجھ سکیں گے۔
- شمالی ہند میں مغلیہ حکومت کے قیام اور اس کے عوامل کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- پانی پت اور کھانوا کی جنگوں میں بابر کی فتح اور اس کے اسباب کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہمایوں کو در پیش اندرونی اور بیرونی مسائل سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان کشمکش اور ہمایوں کی جلاوطنی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہمایوں کی ایران سے واپسی اور مغل سلطنت کے دوبارہ قیام سے واقف ہو سکیں گے۔

2.2 مغل کون تھے؟ (Who Were the Mughals?)

مغلوں کا تعلق وسط ایشیا کے ترک و منگول قبائل سے تھا، یعنی وہ نسلاً ترک بھی تھے اور منگول بھی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کو ترک اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ والد کی طرف سے وہ امیر تیمور کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور منگول اس لیے کیونکہ والدہ کی طرف وہ چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ اس طرح مغلوں کا تعلق وسط ایشیا کے دو عظیم جنگجو حکمرانوں سے تھا، یعنی امیر تیمور جس نے چودھویں صدی میں وسط ایشیا اور خراسان کے علاقوں پر ایک بڑی ریاست قائم کی تھی، اور چنگیز خاں جس نے 13 ویں صدی میں وسط ایشیا، ایران، مغربی روس اور مشرقی یورپ تک کے علاقہ پر مشتمل ایک وسیع منگول ریاست قائم کی تھی۔

مغل نام در حقیقت ۔'منگول' لفظ سے ماخوذ ہے۔ سولہویں صدی میں یورپینوں نے سب سے پہلے اس نام کا استعمال ان تیموری بادشاہوں کے لیے کیا، جو ہندوستان کے حکمراں تھے۔ بعد کے دور میں بالخصوص انیسویں صدی کے بعد انگریز افسروں اور مورخین نے بھی اپنی تحریروں میں مغلوں کو یہی نام دیا ہے۔ حالانکہ آج یہ نام 'مغل' ایک عظیم الشان حکومت کی نشاندہی کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن دلچسپ یہ ہے کہ اس حکومت کے حکمرانوں نے کبھی بھی خود کے لیے مغل نام کا استعمال نہیں کیا بلکہ وہ سرکاری دستاویزوں، تاریخوں اور فرمانوں میں ہمیشہ اپنے آپ کو تیموری کہتے تھے، یعنی امیر تیمور کے جانشین۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ منگول، بالخصوص چنگیز خان، کی ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس سے خاندانی یا سیاسی رشتہ قائم کرنا بھی حکمت عملی کے خلاف تھا۔ لیکن یہ انگریزی نام کچھ اس طرح ہماری کتابوں اور زبانوں پر غالب آگیا کہ یہی اس حکومت کا مقدر بن گیا۔

2.3 بابر اور وسط ایشیائی سیاسی حالات (Babur, and the Political Conditions of Central Asia)

ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کے مراحل پر گفتگو کرنے سے پہلے وسط ایشیا کے سیاسی ماحول کو سمجھنا ضروری ہے جن کے سبب بابر کو ہندوستان پر چڑھائی کرنے کو مجبور ہونا پڑا۔ 1404ء میں امیر تیمور کے انتقال کے بعد تیموری ریاست اس کے جانشینوں میں تقسیم ہوگئی اور اس طرح ایک مضبوط ریاست چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر کمزور ہوگئی۔ یہ تیموری ریاست اور النہر (آمو دریا اور سیر دریا کے درمیان کا علاقہ) اور خراسان (موجودہ ایران کا شمال مشرقی حصہ) کے خطے میں پھیلی ہوئی تھیں، جو وسط ایشیا کے سب سے زرخیز حصہ تھا۔ اِسی کی ایک چھوٹی ریاست فرغانہ تھی جس پر بابر کے والد عمر شیخ مرزا کی حکمرانی تھی۔ اس کے علاوہ بابر کے چچا سلطان محمود مرزا سمرقند و بخارا کے حکمراں تھے جبکہ حصار، ترمذ اور بدخشان بابر کے دوسرے چچا سلطان احمد مرزا کے قبضہ میں تھا۔ محمد حسین بیقرہ بلخ اور خراسان کا حکمراں تھا جس کی دارالحکومت ہرات علم و فن کا شاندار مرکز تھی۔ پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں وسط ایشیا کے سیاسی حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تمام تیموری ریاستیں ماراؤالنہر کے اس اہم خطہ پر قبضہ جمانے کے لیے آپس میں مستقل لڑتی رہتی تھیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر تیموری حکمراں اپنی ریاست کی سرحدوں کو پھیلانا چاہتا تھا۔ ان حالات میں اپنے والد عمر شیخ مرزا کے انتقال کے بعد بابر نے 1496ء میں صرف 12 سال کی عمر میں ریاست فرغانہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ حالانکہ بابر کے رشتہ داروں نے، خاص طور سے چچا سلطان محمود مرزا اور سلطان احمد مرزا اور ماموں محمود خان اور احمد خان، بابر کی کم عمری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد بار فرغانہ پر ناجائز قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

وسط ایشیا کے سیاسی حالات اور پیچیدہ اس وقت ہوئے جب پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے ابتدائی دہائی میں دو اور بڑی طاقتیں وسط ایشیا اور مغربی ایشیا میں ظاہر ہوئیں، ایک ازبیک سلطنت اور دوسرے صفوی حکومت۔ ازبیک خانہ بدوش تھے جن کا تعلق ترک و منگول قبیلہ سے تھا۔ یہ ترکی زبان بولتے تھے اور ان کا ابتدائی مسکن موجودہ قزاقستان کا علاقہ تھا۔ پندرہویں صدی کے وسط سے ازبیک رفتہ رفتہ ماوراءالنہر کی سیاست میں دخل اندازی کرنے لگے، کیونکہ ماوراءالنہر کی تیموری ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف ازبکوں کی مدد لیتی تھیں بالآخر پندرہویں صدی کے آخر میں ازبیک اپنے لیڈر شیبانی خان کی قیادت میں ماوراءالنہر کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کرنے

میں کامیاب ہوگئے۔ازبکوں نے دھیرے دھیرے تمام چھوٹی بڑی تیموری ریاستوں کو ختم کردیا۔اس دوران بابر نے دو بار(1497ءاور 1501ء) شیبانی خان کے خلاف سمرقند اور بخارا کے خطے کو واپس حاصل کرنے کے لیے فوجی مہم کی لیکن وہ بہت دیر تک ان علاقوں پر اپنا اقتدار نہیں برقرار رکھ سکا۔1497ء کی فوجی مہم میں بابر اپنی ریاست فرغانہ بھی اس کے ہاتھوں سے چھن گئی اور بغیر ریاست کا بادشاہ بن کر رہ گیا۔دوسری بار 1502ء میں شیبانی خان نے بابر کو زبردست شکست دی، جس کے نتیجہ میں بطور مصالحت بابر کو اپنی بڑی بہن خان زادہ بیگم کو شیبانی خان کے نکاح میں دینا پڑا۔اس ہار کے بعد بابر کے حوصلے پست ہوگئے چنانچہ وسط ایشیا میں سیاسی میدان تنگ ہوجانے کے بعد بابر نے افغانستان کا رخ کیا اور 1504ء میں کابل قبضہ کرلیا جو آئندہ سالوں میں اس کے لیے اہم سیاسی مرکز کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔دوسری طرف 1506ء میں شیبانی خان نے محمد حسنین بیقرہ کی موت کے بعد ہرات پر بھی قبضہ کرلیا اور ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقہ میں موجود آخری تیموری ریاست کا بھی خاتمہ کردیا۔

ازبکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایران کے صفوی حکمراں کو تشویش ہوئی کہ خراسان کے بعد ازبیک کہیں ایران پر نہ حملہ کردیں۔ چنانچہ 1510ء میں صفوی حکمراں شاہ اسماعیل نے 'مرو' کے مقام پر ازبکوں سے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی جس میں ان کا لیڈر شیبانی خان قتل ہوا۔اس تبدیلی حالات نے بابر کو ایک تیسرا موقع دیا اپنی ریاست فرغانہ واپس حاصل کرنے اور تیموری دارالحکومت سمرقند پر قبضہ کرنے کا۔لیکن اس پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ازبکوں کو ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقوں سے نکال سکے۔ مجبوراً بابر نے ایرانی بادشاہ شاہ اسماعیل سے مدد چاہی۔شاہ اسماعیل نے بابر کی درخواست قبول کرلی لیکن اس کی چند شرائط تھیں، جیسے بابر خطبہ میں ایرانی بادشاہ کا نام شامل کرے گا، اس کے نام سے سکے ڈھالے گا، اور شیعہ مسلک کو فروغ دے گا وغیرہ۔ بابر نے بظاہر یہ شرائط قبول کرلیں اور ایرانی فوجوں کی مدد سے 1511ء میں سمرقند اور بخارا واپس لینے میں کامیاب رہا۔ لیکن جلد ہی 1512ء میں عثمانی ترکوں نے ایرانی بادشاہ شاہ اسماعیل کو شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر ازبکوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ بہر حال اب ازبیک پورے ماوراءالنہر کے سب سے طاقتور حکمراں بن چکے تھے۔ آخرکار بابر پھر کابل لوٹ آئے اور 1514ء میں چلدیران کی جنگ کے بعد جس میں ترکوں نے ایرانی فوجوں کو زبردست شکست دی تھی، بابر کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔

2.4 بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات

(Political Conditions in North India before Babur's Invasion)

بابر کے حملہ سے پہلے شمالی ہندوستان میں مختلف چھوٹی بڑی ریاستیں موجود تھیں، جن میں دو نہایت اہم اور مضبوط تھیں۔ایک لودی حکومت اور دوسرے میواڑ کی ریاست۔ ہندوستان میں لودی حکومت کی بنیاد بہلول لودی نے رکھی لیکن ریاست کی اصل توسیع سلطان سکندر لودی کے دور میں ہوئی۔ سکندر لودی نے سولہویں صدی کی ابتدائی دور کی دودہائیوں میں جونپور کی شرقی حکومت پر مکمل قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ مالوہ اور راجستھان کے کچھ حصوں پر بھی اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔اس طرح سکندر لودی کے دور میں لودی افغانوں کی حکومت مغرب میں پنجاب سے لے کر مشرق میں بہار تک پھیل چکی تھی۔

لیکن 1517ء میں سکندر لودی کی موت کے بعد شمالی ہندوستان کے سیاسی ماحول میں میں تبدیلی آنے لگی۔ سکندر لودی کے انتقال کے بعد اس کے جانشین ابراہیم لودی اور قدیم بزرگ افغان امراء کے درمیان اقتدار کو لیکر کشمکش شروع ہوگئی۔ ابرہیم لودی مرکزیت پسند نظریۂ بادشاہت کا حامی تھا جس میں تمام قوت اور اقتدار حکمراں کے پاس ہوتی ہے، جبکہ قدیم افغان امراء مرکزیت پسند اقتدار کو اپنے اختیار اور آزادی پر حملہ سمجھتے تھے۔ اس سیاسی بحران سے ابھرنے کے لیے ابراہیم لودی نے دربار میں اپنے چہیتے اور پسندیدہ امراء کو جگہ دی اور بزرگ افغان امراء کو دور دراز کے صوبوں میں بھیج دیا تاکہ مرکز میں اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجربہ کار اور قدیم افغان سرداروں نے اپنی قوت بڑھانی شروع کی اور رفتہ رفتہ ان تمام افغان امراء کے مرجع بن گئے جو ابراہیم لودی سے ناخوش تھے۔ آخر کار بغاوت شروع ہوگئی۔ بہار کے گورنر دریا خان نوحانی نے خود کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ وہیں دوسری طرف ابرہیم لودی کے چچا اور بہلول لودی کے بیٹے عالم خان لودی نے گجرات کے حکمراں کی شہ پر بادشاہ ہونے کا دعویٰ پیش کیا۔ پنجاب کے گورنر دولت خان نے بھی بغاوت کردی اور عالم خان لودی کو سلطان علاؤالدین کے لقب سے اپنا سلطان تسلیم کرلیا۔ سلطان اور امراء کے درمیان اس کشمکش کو بہتر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب دولت خاں نے بابر کو ابراہیم لودی کے خلاف چڑھائی کرنے کی دعوت دی تو اس نے سلطان پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک ظالم اور جابر حکمراں ہے جس نے سکندر لودی کے امراء کے ساتھ بدسلوکی کی اور ان میں 25 کو بے سبب قتل کردیا۔ ظاہر ہے اس طرح کے سیاسی ماحول میں کسی بڑے خطرہ اور حملے کا مقابلہ کرنے کی گنجائش کم تھی۔ چنانچہ اس غیر متحدہ سیاسی بداندیشی کے سبب بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے آسانی ہوئی۔

میواڑ کی ریاست شمالی ہندوستان کی دوسری بڑی قوت تھی۔ میواڑ کے راجا رانا سانگا پندرہویں صدی کے اختتام تک پورے راجپوتانہ پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ رنتھمبور اور چندیری کے قلعے بھی اس کے قبضے میں آچکے تھے۔ اس کے علاوہ مالوہ کے خطے پر بھی اس کا اثر قائم تھا۔ مالوہ کا علاقہ لودی سلطنت اور رانا سانگا کے درمیان جنگ کا اصل سبب تھا، کیونکہ اس خطہ کی زرخیزی اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر دونوں طاقتیں اس پر اپنا قبضہ قائم کرنا چاہتی تھیں۔ غالباً اس سیاسی حکمت عملی کے مدنظر رانا سانگا نے بابر کو شمالی ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تاکہ ابراہیم لودی کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد وہ مالوہ اور اس کے ساتھ ساتھ درمیانی گنگا ندی کے علاقوں پر مکمل طور پر قبضہ کرلے۔ ان دو بڑی طاقتوں کے علاوہ متحدہ چھوٹی چھوٹی افغان ریاستیں آگرہ کے گردونواح میں قائم تھیں۔ جیسے میوات میں حسن خان، بیانہ میں نظام خان، وصول پور میں محمد زین، گوالیار میں تاتار خان، اٹاوہ میں قطب خان، کالپی میں عالم خان اور سنبھل میں قاسم وغیرہ۔ ان چھوٹی چھوٹی افغان ریاستوں کا کردار بابر کے حملے کے وقت اہم ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ مغل سلطنت کے قیام کے بعد یہ افغان ریاستیں دوبارہ اپنی طاقت حاصل کرنے کے لیے بابر کے خلاف متحدہ سیاسی محاذ بنا کر مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔

2.5 بابر کا ہندوستان پر حملہ (Babur's Invasion of India)

حالانکہ بابر نے اپنی سوانح- 'تزک بابری' میں ذکر کیا ہے کہ 1504ء میں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد ہی سے اس کی نظر ہندوستان پر تھی، لیکن یہ صرف ایک دعویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کابل پر حملہ کرنے کے ایک دہائی بعد تک بابر وسط ایشیا کے سیاسی حالات میں الجھا ہوا

تھا۔ چنانچہ اس دوران، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اس نے تیسری بار سمرقند اور بخارا پر قبضہ کرنے کے لیے کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا۔ لیکن چند مہینوں میں ازبکوں نے پلٹ وار کیا اور 1511ء میں ایک بار پھر بابر کو ناکام کابل واپس لوٹنا پڑا۔ 1514ء میں عثمانیوں کے ہاتھوں ایرانی بادشاہ کی شکست کے بعد وسط ایشیائی سیاست میں اب ایسی کوئی طاقت باقی نہیں بچی جو بابر کو اس کی ریاست اور تیموری دارالحکومت واپس دلانے میں مدد کرسکتی تھی۔ چنانچہ غالب گمان یہ ہے کہ 1514ء کے بعد بابر نے ہندوستان کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا ہوگا، جبکہ اس کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بابر کا ہندوستان پر حملہ اصل میں وسط ایشیائی حالات کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اہم عوامل بھی تھے جس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

کابل اور اس کے اطراف، جن پر بابر کا قبضہ تھا، گرچہ بہت خوبصورت تھے، جیسا کہ بابر نے خود تعریف کی ہے، لیکن معاشی وسائل اور ذرائع پیداوار کے اعتبار سے ناکافی تھے۔ کابل، قندھار اور بدخشاں پر مکمل کنٹرول قائم رکھنے اور قبائل افغانوں کو قابو میں رکھنے کے بابر کو ایک بڑی اور مشہور فوج کی ضرورت تھی جس کا انتظام مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے ممکن نہیں تھا۔ اسی مالی تنگ دستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دربار اکبری کے مشہور مورخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بعض سرحدی علاقوں پر حملہ بابر کے لیے ایک بہتر متبادل تھا، جس سے اس کی معاشی پریشانیاں بھی بہت حد تک دور ہوسکتی تھیں۔ ابرہیم لودی اور افغان امراء کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف قدیم افغان سرداروں نے بغاوت کی، وہیں دوسری طرف پنجاب کے گورنر دولت خان نے اپنے بیٹے کو کابل بھیج کر بابر کو ابراہیم لودی کے خلاف فوجی مہم کی دعوت دی۔ ابرہیم لودی کے چچا عالم خان لودی نے بھی بابر کو اس حملہ کے لیے اکسایا۔ اس کے علاوہ میواڑ کا طاقتور راجا رانا سانگا نے بھی بابر کو دہلی پر حملہ کرنے کا پیغام بھیجا تھا۔ کیونکہ وہ ابراہیم لودی کو اقتدار سے ہٹا کر پورے مالوہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بابر کے مطابق رانا سانگا نے اس وعدہ کیا تھا کہ بابر دہلی پر حملہ کرے جبکہ وہ خود آگرہ پر حملہ کرے گا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ رانا سانگا نے واقعی بابر کو خط لکھا یا نہیں یا کس نے کس سے تعاون مانگا۔ لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ ان رانا سانگا بھی ابراہیم لودی کے اقتدار کو چیلنج کررہا تھا۔ لہذا ایسے سیاسی ماحول میں جس میں غیر مرکزیت تھی اور مختلف سیاسی قوتیں آپس میں لڑ رہی تھیں، باہر کو ہندوستان میں تیموری حکومت قائم کرنے کا حوصلہ ضرور ملا ہوگا۔

تیموری خاندان کے جانشین ہونے کے حیثیت سے بابر کا یہ دعویٰ تھا کہ ہندوستان کے وہ حصے جو امیر تیمور کے حملہ کے بعد تیموری حکومت کا حصہ تھے بالخصوص شمال مغربی سرحدی علاقے، ان پر بابر کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1578ء میں بھیرا اور باجور کے علاقوں پر حملہ کرنے کے بعد بابر نے ابراہیم لودی کے دربار میں ایک قاصد روانہ کیا اور ان علاقوں پر اپنا موروثی سیاسی حق جتاتے ہوئے ابراہیم لودی سے ان علاقوں کو اس کے حوالے کرنے کی مانگ کی۔ حالانکہ یہ قاصد لودی دربار تک نہیں پہونچ ساک، کیوں کہ پنجاب میں دولت خان نے اس کو روک لیا۔ نہ خود اس سے ملاقات کی اور نہ ہی ابراہیم لودی تک اس کو جانے دیا۔ لیکن اس سے صاف واضح ہے کہ بابر ہندوستان پر حکومت اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کی نظر میں ہندوستان پر حملہ صرف ایک فوجی مہم نہیں بلکہ اپنے موروثی حق کی حصولیابی تھا۔

پانی پت کی جنگ سے پہلے بابر نے شمال مغربی علاقے بالخصوص پنجاب صوبہ پر چار بار حملے کیے۔ 1519ء میں بابر نے ’باجور‘ اور ’بھیرا‘ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا، جو دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے اور شمالی ہندوستان میں داخلہ کا راستہ ہے۔ بابر کا یہ پہلا جارحانہ حملہ تھا۔ حالانکہ دولت خان نے بابر کے گورنر کو بھیرا سے نکال کر دوبارہ اپنا قبضہ بحال کر دیا، لیکن 21-1520ء میں بابر ایک بار پھر آیا اور بھیرا کو واپس حاصل کر لیا۔ اگلے دو سالوں میں دولت خان اور ابراہیم لودی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور افغان وزیر نے بابر کو حملہ کرنے کا پیغام بھی بھیج دیا تھا۔ چانچہ اب حالات بابر کے لیے مشکل نہیں تھے۔ 1524ء میں بابر لاہور آیا اور شاہی افواج کو شکست دی۔ پنجاب کے علاقے میں بابر کے جمتے ہوئے قدم سے ابراہیم لودی پریشان تھا اور اس طرح مستقبل قریب میں ان دونوں کے درمیان ایک مقابلہ طے تھا۔ پنجاب ابراہیم لودی کے لئے اہم تھا، کیوں کہ اس پر کسی دوسری طاقت کے قبضہ سے شمالی ہندوستان بالخصوص گنگا میدان کے علاقوں پر حملے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف یہ علاقہ بابر کے لیے بھی اہم تھا کیوں کہ معاشی طور پر خوشحال ہونے کے ساتھ ساتھ تیموری حکومت کے قیام اور توسیع کے لیے بھی یہ صوبہ انتہائی اہم تھا۔

دسمبر 1525ء میں بابر اپنی بارہ ہزار افواج کے ساتھ کابل سے ہندوستان کے لیے نکلا اور دریائے سندھ پار کر کے پنجاب ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ بالآخر بابر اور ابراہیم لودی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہوئیں۔ بابر کی چھوٹی فوج کے مقابلے میں ابراہیم لودی کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی، جیسا کہ خود بابر نے اپنی سوانح میں اس کی تفصیل دی ہے، ممکن ہے بابر نے اپنی فتح کو بڑھا چڑھا کر بتانے کے لیے لودی فوج کی تعداد کے بیان میں مبالغہ سے کام لیا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ بابر کی فوجیں ابراہیم لودی کی فوجوں سے بہت کم تھیں۔ خود افغان مآخذ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لودی فوجیں کسی بھی حال میں پچاس ہزار سے کم نہیں تھیں۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہ دونوں فوجیں میدان میں ڈٹی رہیں اور چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئی رہیں۔ البتہ جنگ کے دن صرف چند گھنٹوں میں ہی بابر نے ابراہیم لودی کو شکست فاش دی۔ ابراہیم لودی میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اپنے کئی کمانڈروں کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوا۔ گوالیار کے راجہ وکرماجیت بھی جنگ میں مارا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق پندرہ ہزار افغان قتل ہوئے۔ اس جنگ کی سیاسی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کیوں کہ اس نے شمال ہندوستان میں ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی، جس نے دھیرے دھیرے تقریباً پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی۔

2.6 پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب

(Causes for Babur's Victory in the Battle of Panipat)

آخر وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے بابر نے ایک مختصر سی فوج کی مدد سے ابراہیم لودی کی ایک بڑی فوج کو دہرا دیا تھا۔ بابر نے ابراہیم لودی کے خلاف دو طرح کی جنگی حکمت عملی اور تکنیک کا استعمال کیا تھا، جو اس نے وسط ایشیا میں دیکھا تھا۔ ایک جنگی حکمت عملی وہ تھی جسے بابر رومی (عثمانی) تدبیر کہتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک دفاعی تدبیر تھی جس کا استعمال عثمانی ترکوں نے ایرانیوں کے خلاف 1514ء میں چلدایران کی جنگ میں کیا تھا اور ایرانی بادشاہ کو بری شکست دی تھی۔ اس رومی جنگی تکنیک کے مطابق بابر نے اپنی فوج کے آگے لکڑی کی

گاڑیوں کی قطاریں لگادیں اوران گاڑیوں کوآپس میں رسی سے باندھ دیاتا کہ وہ زور پڑنے پر بکھر نہ جائیں۔اس طرح بابر نے اپنی فوج کوان لکڑی کی گاڑیوں کے پیچھے چھپادیا۔البتہ ان گاڑیوں کے درمیان تھوڑا فاصلہ کیا گیا جس میں سے بندوقچی گولی چلا سکیں اور گھوڑسوار سپاہی تیر برسا سکیں۔ بابر نے اس حکمت عملی کا استعمال کر کے ایک طرف اپنی فوجیوں کو دشمنی کے حملے سے محفوظ رکھا اور وہیں دوسری طرف بارود کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا کہ پوری فوجیں سنبھل نہیں سکیں۔

رومی جنگی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ بابر نے ایک اور جنگی تدبیر اپنائی تھی جسے تلوغمہ کہتے ہیں۔ یہ جنگی تدبیر وسط ایشیا میں ازبکوں کے ذریعہ اپنائی گئی تھی جس کا مشاہدہ خود بابر نے کیا تھا۔ یہ جارحانہ تدبیر تھی جس کے مطابق بابر نے اپنی فوج کو متعدد چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا۔ان فوجی ٹکڑیوں نے مخالف فوج کو دائرہ بنا کر دھیرے دھیرے دائیں، بائیں اور پیچھے سے گھیر لیا۔اس طرح مخالف فوج کا دستہ سمٹتے سمٹتے فوج کے مرکز میں پہنچ گیا جس کے نتیجہ میں فوج کے قلب پر دباؤ بڑھتا گیا اور بھگدڑ و بدانتظامی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔اس کا فائدہ بابر کو ہوا اور اس کی فوجیں بارود اور تیروں کے ذریعہ لودی فوجوں پر حملہ کرتی رہیں۔آخر میں محفوظ فوجی دستہ (Reserved) جو پہلے سے تازہ دم ہے، مخالف فوج پر حملہ کر کے اس کو بے دم کر دیتا ہے۔اس طرح ازبکوں کی تلغمہ تکنیک کا استعمال کر کے بابر نے ابراہیم لودی کی فوجوں میدان جنگ میں مات دے دی۔

بابر نے بارود کا استعمال بڑی خوبصورتی اور موثر انداز میں کیا۔ چھوٹی چھوٹی توپوں کے ذریعہ، جو فوج کے قلب میں رکھی گئی تھیں، مخالف فوجوں پر بارود کے گولے برسائے اور ساتھ میں گاڑیوں کے پیچھے پیچھے بندوقچیوں نے بندوق کی گولیوں سے وار کیا۔ بابر کے ذریعہ بارود کے استعمال کی وجہ سے بعض مؤرخین مغل سلطنت کو 'بارود والی ریاست' ('Gunpowder Empire') کہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بابر نے پہلی بار شمالی ہندوستان میں جنگ میں بارود کا استعمال کیا، لیکن اس سے پہلے بھی دکن کی ریاستوں میں بارود کا استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ ممکن ہے ابراہیم لودی کو اس کی خبر نہ ہو، یا اس نے اس کے استعمال میں حکمت نہ سمجھی ہو۔ بہر حال بابر نے اپنے بندوقچیوں اور ہلکی توپوں کا بڑا عمدہ استعمال کیا جس سے دشمن کی فوجوں کو بہت نقصان پہونچا۔

بعض جدید مؤرخین جیسےStephen F. Dale اور ستیش چندر وغیرہ نے بارود کے استعمال کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یقیناً بارود کے گولے اور بندوقیں بابر کی فتح کا سبب بنیں، لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ بابر کی جیت کا اصل سبب اس کی فوج تھی۔ ترک ومنگول گھوڑسوار سپاہیوں پر مشتمل بابر کی فوج تیزی سے حرکت کرنے کے اصول اور فن سے واقف تھی۔ بابر کے فوجی تیزی سے گھوڑوں سے دوڑتے ہوئے تیر سے نشانہ لگا سکتے تھے۔اس کے علاوہ چستی سے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی تدبیر سے بھی واقف تھے، جو فوجی حکمت عملی کا اہم حصہ تھا۔ چنانچہ مغل فوجوں نے اپنی رفتار، حکمت عملی اور تیراندازوں کے ذریعہ افغان فوجوں پر سبقت حاصل کی اور انہیں میدان جنگ میں چونکا دیا۔ بہر حال پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح سے ہندوستان میں مغل سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ فتح کے بعد پانی پت کے میدان میں بابر نے دو مسجدوں کی تعمیر کروائی۔ ظاہر ہے مسجدوں کی تعمیر ایک علامتی پیغام تھا جس کے ذریعہ بابر اپنی جیت کی یادگار اور نئی حکومت کے قیام

کانشان چھوڑنا چاہتا تھا۔ چند دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد بابر آگرہ روانہ ہوا اور لودی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

2.7 کھانوا کی جنگ (Battle of Khanwa)

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر کے سامنے دو بڑے چیلنج تھے، ایک راناسانگا اور دوسرے افغان۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ابراہیم لودی کے خلاف بابر اور راناسانگا کے درمیان ایک دوسرے کا تعاون کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ الیکن بابر کے مطابق راناسانگا نے وعدہ خلافی کی اور بابر کا ساتھ نہیں دیا۔ ایسا کیوں ہوا اس محض قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ راناسانگا نے خیال کیا ہو کہ بابر بھی امیر تیمور کی طرح دہلی اور آگرہ کا خزانہ لوٹنے سے واضح کر دیا کہ اس کا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ حالانکہ بابر کے امراء و بیگ اور فوجی واپس وسط ایشیا جانا چاہتے تھے، کیوں کہ نہ تو ہندوستان کا موسم اور نہ ہی یہاں کے پھل و میواجات، نہ تو یہاں کی زبان اور نہ ہی یہاں کے رسم ورواج، کچھ بھی ان کے مزاج اور طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ لیکن بابر نے واپس جانے کا اظہار نہیں کیا باوجود اس کے کہ وہ بھی ہندوستان کے مقابلہ میں کابل وبدخشان کی خوب تعریف کرتا ہے۔

بابر کے ارادے نے راناسانگا کے سامنے ایک چیلنج کھڑا کر دیا۔ ہندوستان میں بابر کی موجودگی اور مغلیہ حکومت کا استحکام رانا کے لیے ابراہیم لودی کی حکومت سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہیں دوسری طرف راناسانگا کا بڑھتا ہوا اقتدار مغل سلطنت کے وجود کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان جنگ ہونا قطعی تھا۔ 1527ء میں راناسانگا نے راجپوت اور شکست خوردہ افغان سرداروں کا ایک بڑا متحدہ فوجی محاذ بنایا، جس میں راجپوتانہ کے تقریباً تمام راجپوت راجا شامل تھے۔ افغان سرداروں میں سکندر لودی کا چھوٹا بیٹا محمود خان لودی بھی رانا کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میوات کا افغان حکمراں حسن خان بھی محاذ کا حصہ تھا۔ فی الحقیقت راجپوت اور افغان سرداروں کا متحدہ محاذ کھڑا کرنے میں اس کارول سب سے اہم تھا۔ 1527ء تک یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں اور راناسانگا یہ متحدہ فوج لیکر آگرہ کی طرف بڑھا۔ اس خبر کے سنتے ہی بابر نے اپنی فوج اکھٹا کی اور آگرہ کے قریب کھانوا کے مقام پر یہ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ مقابلہ سے پہلے بابر کی فوجوں میں ناکامی کا خوف چھایا ہوا تھا۔ اس وجہ راناسانگا کی بہادری اور جانبازی کے قصے اور ایک بڑی فوج تھی، جو اس نے راجپوت اور افغانوں کی مدد سے جمع کی تھی۔ بابر کے مطابق رانا کی فوج کی تعداد دولاکھ تھی۔ گرچہ بابر نے مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن ہر حال میں سانگا کی فوجیں بابر کی فوجوں سے زیادہ تھیں۔ فوج پر چھائے ہوئے اس خوف اور ناکامی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے بابر نے فوج کے سامنے ایک زبردست تقریر کی۔ اس تقریر کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں بابر نے ایک سیاسی کشمکش کو مذہبی رنگ دیا تاکہ فوجیوں میں جوش وجذبہ کو ابھارا جاسکے۔ بابر نے اعلان کیا کہ یہ جہاد ہے۔ بابر نے اپنے تئیں ایک نیک اور پاک باز مسلم حکمراں کی تصویر پیش کرنے کے لیے شراب ترک کر دیا اور شراب کے گھڑے توڑنے کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ جنگ کے بعد جو شخص چاہے، واپس وسط ایشیا لوٹ سکتا ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ بابر نے ان نعروں کا استعمال صرف اور صرف اپنی فوج کے حوصلہ وجذبہ کو بھڑکانے کے لیے کیا تھا، نہ کہ واقعی مذہبی جنگ کے لیے، کیوں کہ اس جنگ میں فتح کرنا اس کے لیے ہر حال میں ضروری تھا۔

17 مارچ 1527ء کو دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ شروعاتی حملوں میں رانا سانگا کی فوج غالب رہی، لیکن جلد ہی مغل فوجوں نے خود کو سمیٹا اور اپنا دفاع کیا۔ اس جنگ میں بھی بابر نے رومی (عثمانی) اور تلغمہ جنگی تدبیروں کا استعمال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانا نے پانی پت کی جنگ سے کوئی سبق نہیں لیا تھا۔ اس کی فوج ہاتھیوں اور تلوار باز سپاہیوں کی طاقت پر منحصر تھی۔ چنانچہ اس بار بابر نے رانا سانگا کو اپنی تیز رفتار گھوڑ سوار فوج اور تیر اندازوں کے مدد سے شکست دی۔ رانا زخمی ہوا اور چتور کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس کے ساتھیوں میں محمود خاں لودی تو بچ کر بھاگ گیا، لیکن حسن خان میواتی قتل ہوا۔ راجپوتوں کو بڑی ہار ملی، یہاں تک کہ کسی بھی فوجی دستہ کا کمانڈر زندہ نہیں بچا۔ کھانوا کی جیت نے بابر کا اقتدار اور مضبوط کر دیا اور اس کے لیے شمالی ہند میں کوئی بڑا خطرہ موجود نہیں تھا، جو اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکتا۔ البتہ مالوہ کا راجپوت راجہ میدنی رائے ایک طاقتور حکمراں ضرور تھا۔ بابر کو یہ امکان تھا کہ رانا سانگا میدنی رائے کی مدد سے دوبارہ حملہ کی تیاریاں کر سکتا ہے۔ چنانچہ بابر نے 1528ء میں چندیری پر حملہ کر دیا۔ میدنی رائے نے بابر کا مقابلہ کیا لیکن اپنی بہادرانہ جنگی صلاحیت کے باوجود ہار گیا۔ اب بابر شمالی ہندوستان کا ناقابل تسخیر بادشاہ بن چکا تھا۔

بعض تاریخی کتابوں میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ بابر اور راجپوتوں کے درمیان لڑی گئی جنگ کی بنیاد اصل میں مذہب تھی۔ یعنی کہ راجپوت اپنا مذہب اور قوم بچانے کے لیے مغلوں سے جنگ کر رہے تھے اور یہ کہ کھانوا کی جنگ دراصل ہندو اور مسلم قوم کے درمیان ایک جنگ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ کھانوا کی جنگ میں راجپوت اور افغان متحدہ محاذ بنا کر بابر کے خلاف لڑے تھے۔ اس متحدہ محاذ میں رانا سانگا کے ساتھ ابراہیم لودی کے چھوٹے بھائی محمود خان لودی اور میوات کے افغان سردار حسن خان میواتی بھی تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جنگ ہندو مسلم کے درمیان مذہب کے سوال پر نہیں لڑی گئی تھی۔ قابل غور ہے کہ بابر اپنی سوانح میں حسن خان کو کافر و ملحد کہتا ہے۔ ظاہر ہے بابر کی تعداد میں رانا سانگا اور حسن خان دونوں ہی کافر اس لیے لڑے کیوں کہ انہوں نے بابر کے خلاف ایک محاذ بنایا تھا۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بابر کو ہندوستان سے نکالنے اور اپنی اپنی ریاست کو بچانے کے مقصد کے تحت ہیں، دور کی طاقتیں، خواہ ہندو ہوں یا مسلم، ساتھ آئیں تھیں۔ دوسرا یہ کہ بابر نے مذہبی نعروں اور مذہبی علامات کا استعمال صرف اپنی طاقت واقتدار کو محفوظ کرنے اور اپنے دشمنوں کے خلاف اپنے فوجیوں اور امراء کو اکٹھا کرنے کے لیے کیا تھا۔

2.8 ہمایوں (Humayun)

1530ء میں بابر کی وفات کے بعد ہمایوں 23 سال کی عمر میں مغل شہنشاہ بنا۔ ہمایوں کے لیے حالات سازگار نہیں تھے کیوں کہ اسے ان تمام مسائل سے دوچار ہونا تھا، جو بابر نے نامکمل چھوڑ دیے تھے۔ ہمایوں کے سامنے داخلی اور خارجی دو طرح کی مشکلات تھیں

داخلی مشکلات (Internal Problems)

بابر کے انتقال سے پہلے ہی وسط ایشیائی امراء ہمایوں اور اس کے بھائیوں کو درکنار کر کے مہدی خواجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے، جو بابر کی بہن خانزادہ بیگم کا شوہر تھا۔ سازش کامیاب نہیں ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کیوں کہ مہدی خواجہ تیموری نہیں تھا، جبکہ تخت پر

تیموری نسل کا ہی کوئی وارث بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن اس سازش سے چغتائی امراء کی آزاد اور باغیانہ روش کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح بابر کے انتقال کے بعد بعض چغتائی بیگ مستقل اپنے لیے ایک آزاد دائرہ اقتدار قائم کرنے کے فراق میں رہتے تھے، جیسے محمد زمان مرزا اور محمد سلطان مرزا، جو سلطان حسین بیقرہ کے پوتے تھے اور جن کے ساتھ بابر نے اپنی بیٹیوں کی شادی کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باقی امراء کے درمیان بھی ہمایوں کے خلاف ایک مخالفانہ ماحول پیدا ہو رہا تھا۔ ہمایوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج وہ تیموری روایت تھی جس کے تحت ریاست کو جانشینوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس روایت کے مطابق ہمایوں کو بھی چھوٹی سی مغل سلطنت کے صوبوں کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ چنانچہ کابل وقندھار، جن پر پہلے ہی سے کامران مرزا کا کنٹرول تھا، ان کے حوالہ کر دیا گیا، جبکہ ہندال کو میوات اور عسکری مرزا کو سنبھل کا علاقہ سونپا گیا۔ ہمایوں کے حصہ میں آگرہ اور پنجاب کا علاقہ آیا۔ ظاہر ہے اس سیاسی غیر مرکزیت سے ہمایوں کی طاقت کمزور ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ کامران مرزا نے جلد ہی لاہور پر حملہ کر کے پنجاب پر اپنا قبضہ کر لیا۔ بھلے ہی کامران نے بدلے میں ہمایوں کی بالادستی قبول کر لی، لیکن اس سے ہمایوں کو بہت نقصان پہونچا کیوں کہ ایک زرخیز خطہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب ہمایوں شمال مغربی علاقے سے بے فکر ہو کر شمال اور مشرقی ہند کے معاملات کو سنجیدگی سے حل کر سکتا تھا۔ ہمایوں کے بھائیوں نے بھی اہم اور نازک موقعوں پر اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بعض نے تو خود بادشاہ ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ اس امر کی تفصیل اور شیر شاہ کے درمیان جنگ کے ضمن میں آئے گی۔

خارجی مشکلات (External Problems)

ہمایوں کے دو بڑے سیاسی اور فوجی دشمن تھے۔ 1 پہلا مغرب میں گجراتی سلطان بہادر شاہ اور دوسرے مشرق میں افغان امرا۔ تخت نشینی کے بعد ابتدائی دو سالوں تک ہمایوں اپنا اقتدار مستحکم کرنے اور خاص طور سے مشرقی اتر پردیش اور بہار کے افغانوں کا زور توڑنے میں مصروف رہا۔ سب سے پہلے اس نے بندیلکھنڈ کے کالنجر قلعہ کا محاصرہ کیا جو آگرہ کے جنوب میں ایک اہم قلعہ تھا اور آگرہ کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد بندیلا راجا نے ہمایوں کی بالادستی قبول کر لی۔ ادھر مشرق میں افغان سردار شیر خان (بعد میں شیر شاہ) نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہمایوں لودی حکومت کا جانشین ہونے کی حیثیت سے چنار کے قلعہ کو اپنی حکومت کا حصہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ 1532ء میں ہمایوں نے چنار کا محاصرہ کر لیا۔ چھ مہینوں تک چلے اس محاصرہ میں آخر ہمایوں کو کامیابی ہوئی اور شیر خان نے قلعہ کے عوض ہمایوں کی بادشاہت قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ مغل سلطنت کا وفادار رہے گا اور فوجی مہمات میں اپنی فوج کے ذریعہ ہمایوں کا تعاون کرے گا۔ اپنی طاقت مضبوط کرنے کے بعد اب ہمایوں کے پاس موقع تھا کہ وہ بہادر شاہ کی چنوتی کا سامنا کرے۔

2.9 ہمایوں اور بہادر شاہ (Humayun and Bahadur Shah)

گجرات کے حکمراں بہادر شاہ نے بظاہر کوئی مخالفانہ قدم نہیں اٹھایا بلکہ ابتدائی چند سالوں (1531تا1533) میں اس کے اور ہمایوں کے تعلقات دوستانہ رہے۔ تاہم وہ آہستہ آہستہ اپنی طاقت اور اقتدار وسیع کر رہا تھا۔ 1531 میں اس نے مالوہ کے علاقہ پر قبضہ کر لیا جو گجرات اور آگرہ دونوں حکومتوں کے لیے کئی معنوں میں اہم تھا۔ ایک تو یہ کہ مالوہ ان دونوں ریاستوں کے درمیان ایک حائل ریاست

(Buffer State)کادرجہ رکھتا تھا، ساتھ ہی مالوہ تجارتی اعتبار سے ایک اہم خطہ تھا کیوں کہ گجرات کی بندرگاہوں سے ہونے والی تجارت مالوہ کے راستے ہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ مالوہ کا خطہ کاشتکاری پیداوار کے لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے۔ حتیٰ کہ گجرات اپنی غذائی اجناس کے لیے بڑی حد تک مالوہ پر منحصر تھا۔ان تمام پہلوؤں کے چلتے بہادر شاہ اور ہمایوں دونوں اس پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتے تھے۔مالوہ پر حملہ کے بعد ہی 1532 میں بہادر شاہ نے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔اس حملہ سے ہمایوں چوکنا ہو گیا کیوں کہ مشرقی راجستھان پر بہادر شاہ کا قبضہ ہونے سے آگرہ اور دہلی پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ہمایوں تیزی سے گوالیار کی طرف بڑھا جس کے نتیجہ میں بہادر شاہ درمیان ہی میں رانا سے معاہدہ کر کے واپس لوٹ گیا۔ان دونوں کے درمیان تعلقات ابھی بھی کشیدہ نہیں ہوئے۔ہمایوں واپس دہلی آیا اور ایک سال تک یہاں مقیم رہا جس دوران اس نے یہاں 'دین پناہ' کے نام سے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔

لیکن اس کے بعد بعض ایسی تبدیلیاں ہوئیں جن کے سبب ان دونوں کے درمیان سیاسی مڈبھیڑ ہوئی۔1534 میں بہادر شاہ نے چتوڑ پر دوبارہ حملہ کر دیا۔دوسری طرف وہ مشرق میں افغان حکمرانوں سے ہمدردانہ تعلقات قائم کیے ہوئے تھا۔خاص طور سے بہار میں شیر شاہ اور بنگال میں نصرت شاہ سے، جو ہندوستان سے مغل سلطنت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ بہادر شاہ کا دربار افغان سرداروں اور تیموری خاندان کے باغی امراء کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔حالانکہ بابر نے اپنے ایک سفارتی خط میں بہادر شاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ افغان سرداروں اور باغی چغتائی امراء کو پناہ نہ دیں لیکن اس کے باوجود اس نے سکندر لودی کے بھائی عالم خان لودی اور تیموری شاہزادہ محمد زمان مرزا کو پناہ دی تاکہ وہ اندرونی طور پر ہمایوں کو کمزور کر سکے۔ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے ہمایوں کے لیے بہادر شاہ کے خلاف ایک سنجیدہ اقدامی پالیسی بنانا ضروری تھا۔

جب بہادر شاہ چتوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ہمایوں نے 1535 میں بڑی چالاکی سے مالوہ پہنچ کر مانڈو کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔اس طرح ہمایوں نے بہادر شاہ کا راستہ روک لیا، کیوں کہ چتوڑ سے گجرات جانے کے لیے صرف مانڈو ہی ایک راستہ تھا۔حالانکہ بہادر شاہ نے چتوڑ کا قلعہ جیت لیا لیکن واپسی میں ہمایوں سے اس کا مقابلہ ہوا۔چونکہ ہمایوں نے بہادر شاہ کی فوج تک پہونچنے والی خوراک کے تمام راستے کاٹ دیے تھے، اس لیے بہادر شاہ کی فوج میں افراتفری مچ گئی، گھوڑے مرنے لگے اور سپاہیوں کو بھی سخت پریشانی ہوئی۔نتیجہ میں بہادر شاہ کی فوج فرار ہو گئی اور جاتے جاتے خود انہوں نے اپنی توپیں اور ہتھیار تباہ کر دیے تاکہ ہمایوں انہیں ان کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔مانڈو میں شکست کھانے کے بعد بہادر شاہ چمپانیر، احمد آباد، اور پھر کھمبایت کی طرف بھاگا۔ہمایوں نے اس کا تعاقب کیا۔آخر کار بہادر شاہ نے اپنا خاندان اور سارا خزانہ 'دیو(Diu)' بھجوا دیا اور خود بھی وہاں پناہ لی۔ہمایوں نے 1535 میں چمپانیر کے قلعہ کو فتح کر لیا اور اس طرح بہادر شاہ کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔صرف 10 مہینوں میں ہمایوں نے مالوہ اور گجرات جیسے اہم صوبوں پر قبضہ حاصل کر لیا اور بہادر شاہ جیسے ماہر حکمراں کے چیلنج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

لیکن ہمایوں کی مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔اس فتح کے بعد ہمایوں گجرات، مرزا عسکری کی نگرانی میں چھوڑ کر دوبارہ مانڈو واپس آگیا۔مرزا عسکری صحیح طرز پر گجرات کا انتظام نہیں چلا سکا، کیوں کہ اس کے اور باقی دوسرے امراء کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے

تھے۔ دوسرے یہ کہ مقامی طور پر بدانتظامی کے نتیجے میں مقامی عوام وطاقتور جماعتیں بھی مغل سلطنت کے مخالف ہوگئیں۔مزید یہ کہ مرزا عسکری کے اندر بذات خود ایک آزاد و خود مختار حکمراں بننے کا جذبہ پنپ رہا تھا۔ چنانچہ ان اسباب کی وجہ سے بہادر شاہ نے دوبارہ احمد آباد پر حملہ کر دیا لیکن پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں اس کی موت سے یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔البتہ اس سیاسی بحران میں 1532 تک مالوہ اور گجرات بہت جلد ہی ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اگرچہ گجرات پر ہمایوں کا قبضہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا، لیکن بہادر شاہ کی شکست اور اس کی موت سے مغربی جانب سے لاحق خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔اب ہمایوں اطمینان کے ساتھ مشرق کے حالات کا سامنا کر سکتا تھا۔

2.10 ہمایوں اور شیر شاہ (Humayun and Sher Shah)

جس وقت مغرب میں ہمایوں بہادر شاہ کے خلاف اپنی فوجی مہم میں مشغول تھا، مشرق میں شیر خان اپنی طاقت مضبوط کرتا رہا شیر شاہ کے سیاسی عروج اور اس کے نظم ونسق سے متعلق علاحدہ اکائی میں بحث کی گئی ہے۔اس دوران 1532 تا1537ء اس نے بہار میں اپنا اقتدار قائم کیا اور دو موقعوں پر بنگالی حکمراں کی فوجوں کو بھی (1532 اور 1534) شکست دی۔اس طرح بنگالی حکمراں کی فوجی کمزوری بھی واضح ہوگئی اور مغل بادشاہ ہمایوں سے براہ راست مڈبھیڑ کیے بغیر وہ ایک آزاد اور خود مختار حکمراں کے طور پر ابھرنے لگا۔ شیر خان کی طاقت کا سبب ایک طرف تو وہ فوج تھی جو اس نے بنگال کے حکمراں کے تاوان اور بہادر شاہ کی مالی امداد کے ذریعہ کھڑی تھی اور دوسری طرف بہادر شاہ کے زوال کے بعد افغان امراء اور فوجیوں کی ایک بڑی تعداد تمام شمالی ہند سے شیر شاہ کے پاس جمع ہوگئی تھی، جو ان کی نظر مغل اقتدار سے چھٹکارہ پانے کا واحد ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر 1532 میں بنگال پر حملہ کر دیا۔ان تمام حالات کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے ہمایوں نے اپنے امراء کے مشورہ کے مطابق 1537 میں بارش کے موسم میں چنار کی طرف رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ، جو شیر خان کے قبضہ میں تھا، انتہائی اہم قلعہ مانا جاتا تھا کیونکہ یہ بنگال اور بہار میں داخلہ کا راستہ تھا اور بنگال اور آگرہ کے درمیان آمد و رفت کا اہم ذریعہ بھی تھا۔البتہ اس دوران شیر خان نے بنگال کی راجدھانی گوڑ پر قبضہ کر لیا، جبکہ ہمایوں کو چنار کا قلعہ فتح کرنے میں چھ مہینے لگ گئے۔اس فتح کے بعد ہمایوں نے شیر خان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ ہمایوں کے سامنے جھک جائے اور بنگال واپس کر دے، تو چنار، جونپور یا کہیں اور اسے اچھی جاگیر دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے شیر خان نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ دراصل ہمایوں اور شیر خاں دونوں کی مہم کا اصل مقصد بنگال پر قبضہ کرنا تھا، کیونکہ بنگال انتہائی زرخیز اور مالدار صوبہ اور سمندری تجارت کا اہم مرکز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں تھے۔اس کے علاوہ ہمایوں کو اب بھی شیر خان کی طاقت کے سلسلے میں غلط فہمی تھی۔ اس کا وہم تھا کہ شیر خان کوئی جنگجو افغان سردار ہے جو صرف جاگیروں سے خوش ہو جائے گا۔ بہر حال چنار کی فتح کے بعد ہمایوں گوڑ کی طرف بڑھا، جبکہ اس دوران شیر خان بنگال کے خزانہ کا ایک بڑا حصہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتاس کے قلعہ میں منتقل کر چکا تھا۔ شیر خان نے ہمایوں کے لیے بنگال کا راستہ خالی چھوڑ دیا اور پلٹ کر بہار اور یوپی کے علاقے میں اپنا اثر بڑھانا شروع کر دیا۔اس نے مونگیر اور بنارس پر قبضہ کر لیا، چنار اور جونپور کا محاصرہ کیا اور سنبھل سے قنوج تک مغل علاقوں کو تباہ کر دیا تھا۔اس طرح اس نے بنگال میں موجود ہمایوں اور آگرہ کے درمیان رابطہ کی ہر کڑی کو توڑ دیا تھا۔بنگال میں ہمایوں ایک لمبی مدت یعنی 1539 تک مقیم رہا اور اس دوران اس کی مشکلیں بڑھتی رہیں۔بنگال کے موسم کی وجہ سے اس کی فوج کے گھوڑے مرنے

لگے۔اس کے علاوہ اس کے بھائی ہندال نے، جس کو اس نے مزید افواج اور اناج لانے کے لیے بھیجا تھا، آگرہ پہنچ کر خود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا۔ حالانکہ یہ خبر سننے کے بعد لاہور سے کامران آگرہ پہنچا اور ہندال کو بغاوت سے باز رکھا۔ ہمایوں بڑی مشکلوں سے افغان حملوں سے بچتے ہوئے چوسا پہونچا جہاں 26 جون 1539 کو شیر خان سے آمنا سامنا ہوا۔ تین مہینے کی ناکام بات چیت کے بعد شیر خان نے بہتر جنگی تدبیر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمایوں کی فوجوں کو اچانک جالیا، جس سے مغل فوجوں میں انتشار پیدا ہوگیا۔ ہمایوں کی شکست ہوئی اور وہ کسی طرح کرم ناسا ندی پار کر کے آگرہ پہنچا۔اس کی جان بچانے میں اس کے خاص ملازم جوہر آفتابچی نے اس کی مدد کی، جو بعد میں ایک اہم مغل امیر کی حیثیت سے آخر دم تک ہمایوں کے ساتھ رہا۔

ہمایوں آگرہ پہنچا اور شیر خان سے مقابلہ کے لیے تیاریاں شروع کر دیں لیکن کامران مرزا نے اپنی جنگجو فوج جو دس ہزار سواروں پر مشتمل تھی ہمایوں کی قیادت میں دینے سے انکار کر دیا، کیونکہ اسے اب ہمایوں کی جنگی صلاحیت پر بھروسہ نہیں تھا۔ چوسا کی جنگ میں بھی کامران نے اپنی پوری فوجوں سے ہمایوں کی مدد اس ڈر سے نہیں کی تھی کہ کہیں افغان طاقت کو کچلنے کے بعد ہمایوں اسے بھی لاہور سے نہ نکال باہر کرے۔ بہر حال کامران اپنی فوج کے ساتھ واپس لاہور لوٹ گیا۔ 17 مئی 1540 کو قنوج میں ہمایوں اور شیر خان کا آمنا سامنا ہوا، جس میں اگرچہ ہندال اور عسکری نے ہمایوں کا ساتھ دیا، لیکن ہمایوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ ادھر شیر خان نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی گدی سنبھالی۔ شیر خان کی اس جیت نے شمالی ہندوستان میں ایک نئی افغان ریاست کی بنیاد رکھی۔

شکست خوردہ ہمایوں آگرہ سے بھاگ کر لاہور پہنچا لیکن اس کے اور بھائیوں کے درمیان کسی جنگی منصوبہ پر اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد شیر شاہ نے لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ کامران نے ہمایوں کو کابل میں پناہ لینے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں اگلے ڈھائی سال ہمایوں سندھ سے راجستھان اور پھر راجستھان سے سندھ مختلف مقامی حکمرانوں کے پاس تعاون کے لیے بھٹکتا رہا۔ اسی دوران سندھ میں امر کوٹ کے راجپوت راجہ نے ہمایوں کو پناہ دی۔ یہیں 1541 میں ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم سے نکاح کیا اور یہیں 1542 میں ہندوستان کے عظیم مغل بادشاہ اکبر کی پیدائش ہوئی۔ آخر کار جب ہمایوں کو کامیابی نہیں ملی تو وہ غزنی کے راستہ 1544 میں ایران پہنچا جہاں ایران کے فرمانروا طہماسپ نے اسے پناہ دی۔ ایرانی دربار میں بادشاہ کے دباؤ کے تحت ہمایوں نے بظاہر شیعہ مسلک اختیار کر لیا کیوں کہ وہ کسی طرح اپنی حکومت واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ طہماسپ نے مال و فوج سے ہمایوں کی امداد کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ فتح کے بعد قندھار، ایران کے سپرد کر دیا جائے۔ ہمایوں نے یہ شرط مانتے ہوئے 1545 میں قندھار، جو اس وقت عسکری مرزا کی ماتحتی میں تھا، فتح کر کے ایران کے حوالہ کر دیا۔ قندھار پر ہمایوں کی فتح سے متعدد چغتائی امراء بشمول مرزا ہندال، ہمایوں کے گرد جمع ہوگئے۔ کامران گھبرا کر کابل سے غزنی اور غزنی سے سندھ بھاگا اور اس طرح ہمایوں کے لیے 1545 میں کابل اور غزنی میں داخلہ آسان ہوگیا۔ اگلے آٹھ سالوں تک ہمایوں اور کامران کے درمیان افغانستان میں غلبہ کو لیکر کشمکش جاری رہی۔ آخر کار 1553 میں کامران مرزا قید ہوا اور ہمایوں کابل کا تنہا حکمراں بن گیا۔

ادھر شمالی ہند میں 1545 میں شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین بیٹا اسلام شاہ اپنے والد کی انتظامی اصلاحات اور مرکزی اقتدار کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ چنانچہ 1553 میں اس کے انتقال کے بعد سور حکومت پنجاب، آگرہ اور دہلی، بہار اور مشرقی علاقے اور بنگال میں منقسم

ہو گئی جس پر اس کا بیٹا اور خاندان کے دوسرے افراد حکومت کرنے لگے۔ ہمایوں اس غیر مرکزیت اور معاشی بدحالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1555 میں کابل سے لاہور پہنچ گیا اور بڑی آسانی سے آگے بڑھتا گیا۔ آخر کار پنجاب کے حکمراں سکندر شاہ سور سے سرہند کے مقام پر مقابلہ ہوا جس میں ہمایوں کو فتح نصیب ہوئی اور سکندر شاہ بھاگ کر شوالک چلا گیا اس طرح دہلی کا راستہ صاف ہو گیا۔ جون 1555 کو ہمایوں دہلی میں داخل ہوا اور دوبارہ اس نے اپنی کھوئی حکومت حاصل کی اور مغل سلطنت کا اقتدار بحال کیا۔

2.11 ہمایوں کی شکست کے اسباب (Causes of Humayun's Defeat)

یہ غور کرنا ضروری ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہمایوں کو مالوہ اور گجرات کے صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ شیر شاہ سے بھی شکست اٹھانی پڑی۔ مغل امراء کی ایک بڑی جماعت بابر کے دور میں وسط ایشیا سے شمالی ہند میں آکر آباد ہوئی تھی۔ ان کے لیے آگرہ اور دہلی کے علاقے چھوڑ کر گجرات، بنگال یا کسی بھی دور دراز کے علاقے میں مقیم ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ بنگال کی فتح کے بعد جب ہمایوں نے زاہد بیگ کو بنگال کا گورنر بنانا چاہا تو اس نے طنزاً کہا 'کیا اس کے علاوہ میرے قتل کا کوئی اور بہتر راستہ نہیں تھا'۔ امراء کے اس عدم تعاون کے سبب ہمایوں کو کئی موقعوں پر مشکلیں اٹھانی پڑیں۔ شیر شاہ، ہمایوں کے مقابلے میں ایک بہتر کمانڈر اور سیاست دان تھا۔ ہمایوں نے کئی موقعوں پر سست رفتاری سے کام لیا جبکہ اسے تیزی سے مارچ کرنے کی ضرورت تھی جیسے چنار کا محاصرہ اور بنگال پر حملہ وغیرہ۔ اسی سست رفتاری نے شیر شاہ کو اپنی طاقت مضبوط کرنے کا پورا موقع دیا۔ غالباً ہمایوں کو شیر شاہ کی جنگجوئی اور ارادوں کے سلسلے میں غلط فہمی تھی۔ وہ اس کو صرف ایک افغان کمانڈر سمجھتا تھا جس کو کبھی بھی دبایا جا سکتا تھا۔ جب تک شیر شاہ کے عزائم اس پر واضح ہوئے، شیر شاہ ایک مضبوط فوج کے ساتھ مشرق کا حکمراں بن چکا تھا۔ بابر کے جلد انتقال اور حال ہی میں مغل سلطنت کے قائم ہونے کے سبب حکومت کی جڑیں مقامی طور پر ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ مقامی سرداروں کی بغاوت کی وجہ سے ہمایوں کو گجرات اور مالوہ کے صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ہمایوں کے لیے ایک اہم مسئلہ اسکے بھائیوں کا باغیانہ رویہ بھی تھا۔ ہندال نے چوسا کی جنگ سے پہلے خود کی بادشاہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ کامران مرزا نے چوسا اور قنوج کی جنگوں کے موقعوں پر اپنی فوجوں سے شیر شاہ کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ حتیٰ کہ جلاوطنی کے دور میں بھی کئی موقعوں پر ہمایوں کے قتل کی سازشیں ہوئیں۔ اگر ہمایوں کو اس کے بھائیوں کا تعاون ملتا تو شاید شیر شاہ کے حملہ کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

2.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر کا ہندوستان پر حملہ اور 1526ء میں مغل ریاست کی بنیاد دراصل وسط ایشیائی سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ اسکے علاوہ شمالی ہند میں ابراہیم لودی اور افغان امراء کے درمیان اقتدار کی کشمکش اور افغان سرداروں کی بغاوت نے بھی بابر کے لیے راہ ہموار کی۔ 1504ء میں کابل کو اپنا سیاسی اور فوجی مرکز بنانے کے بعد بابر نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر متعدد حملے کے اور بالآخر 1526ء میں پانی پت کے میدان میں لودی افواج کو شکست دی۔ 1527ء میں کھانوا کی جنگ میں بابر نے رانا سانگا کو ہرا کر شمالی ہند کی دوسری شرعی قوت کو بھی پسپا کر دیا اور اس طرح مغل ریاست کے قیام کو یقینی بنایا۔ ان جنگوں میں بابر کے فتح کا سبب رومی جنگی تدبیر

بالخصوص تلغمہ تکنیک تھی۔ جس کی مدد سے بابر نے مخالف فوجوں کو چاروں طرف سے گھر کران پر حملہ کر دیا۔اس کے ساتھ ساتھ بابر نے بارود سے بھری بندوقوں اور ہلکی توپوں کا بھی خوب استعمال کیا جبکہ افغان اور راجوت فوجیں بارود کے استعمال سے ناواقف تھیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ بابراور راناسانگاکے درمیان جنگ مذہبی نہیں تھی، بلکہ یہ دوسیاسی قوتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ تھی۔1530ء میں بابر کی موت کے بعد ہمایوں حکمراں بنا جس کو شروع سے ہی بعض داخلی اور خارجی مشکلات کا سامنا کرناپڑا۔ ہمایوں کے دو بڑے سیاسی دشمن تھے۔1۔ مغرب میں بہادر شاہ گجراتی 2۔ مشرق میں افغان جماعتیں۔ سب سے پہلے ہمایوں نے بہادر شاہ کے خلاف مہم کا آغاز کیااور متعدد کوششوں کے بعد بالآخر 1535ء میں مالوا اور گجرات جیسے اہم صوبوں پر قبضہ قائم کرلیا۔ گرچہ گجرات پر ہمایوں کاقبضہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا، لیکن بہادر شاہ کی شکست اوراس کو موت سے مغربی جانت سے لاحق خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ہمایوں کے لیے سب سے بڑاچیلینج شیر خان کی بڑھتی ہوئی قوت تھی۔ شیر شاہ کے خلاف بنگال کی فوجی مہم ہمایوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔1539ء میں چوسا کے مقام پر شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی اور ان کے اور ان دونوں کے درمیان آخری مقابلہ 1540ء میں قنوج کے مقام پر ہوا جس میں ایک بار پھر ہمایوں کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہمایوں نے راہ فرار اختیار کی اور صفوی حکمران شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ شاہ کی فوجی مدد سے ہمایوں نے پہلے قندھار پھر کابل اور بالآخر 1555ء میں دوبارہ ہندوستان میں مغل ریاست کا اقتدار بحال کیا۔

2.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

رومی جنگی تدبیر : یہ بنیادی طور پر ایک دفاعی جنگی حکمت عملی تھی جس کا استعمال ترکوں نے ایرانیوں کے خلاف کیا تھا۔اس جنگی حکمت عملی میں فوج کے آگے لکڑی کی گاڑیوں کی قطاریں لگادی جاتی تھیں تاکہ مقابل فوج کے حملے سے بچا جاسکے اور اپنی فوج کے تیر انداز، یاتوپچی محفوظ انداز سے دشمن کانقصان کرتے رہیں۔

تزک بابری : یہ بابر بادشاہ کی سوانح عمری ہے جو اس نے خود ترکی زبان میں لکھی تھی۔اس کتاب میں بابر نے جنگی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مشاہدات اور وسط ایشیا اور ہندوستان کے مختلف پہلوؤں پر اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

شاہ طہماسپ : ایران کے صفوی خاندان کا حکمراں جس نے 1544ء میں ہمایوں کو پناہ دی اور بالآخر اسی کی مدد اور فوجی تعاون سے ہمایوں مغل سلطنت کا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو پایا۔

بارودی حکومتیں : (‘Gunpowder Empire’) مغل ریاست کے حوالے سے بعض مورخین کا یہ نظریہ ہے کہ اس کے قیام اور ہندوستانیوں اور راجپوتوں کے مقابلے اس کی فتح کے پیچھے اصل سبب اور محرک بارود کا بہتر استعمال تھا جس کی وجہ سے مغل ریاست کی فوجی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔اسی طرح کے خیال کا اظہار سلطنت عثمانیہ اور صفوی سلطنت کے بارے میں کیا گیا۔ان تینوں سلطنتوں کو مائکل ہاجسن (Michael Hodgson) نے مجموعی طور پر بارودی سلطنتیں کہا۔

2.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 16ویں صدی میں ایران میں کس خاندان کی حکومت تھی؟
2. شیبانی خان کہاں کا حکمراں تھا؟
3. خانوا کی جنگ کب اور کس کے درمیان لڑی گئی؟
4. تلوغمہ جنگی تدبیر سے کیا مراد ہے؟
5. وسط ایشیا میں بابر کس ریاست کا حکمراں تھا؟
6. ہمایوں کی جنگ گجرات کے کس سلطان سے ہوئی؟
7. ہمایوں کے تین بھائیوں کے نام بتایئے۔
8. شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد ہمایوں ایران کے کس بادشاہ کی پناہ میں پہنچا؟
9. وسط ایشیا سے نکلنے کے بعد بابر نے کس علاقے کو اپنا سیاسی مرکز بنایا؟
10. 'Gunpowder Empire' سے کیا مراد ہے؟

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل کون تھے؟ مختصر تعارف پیش کیجیے۔
2. بابر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
3. بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں کو درپیش داخلی اور خارجی مشکلات کا جائزہ لیجیے۔
4. پانی پت کی جنگ میں بابر کی فتح کے اسباب پر ایک مضمون لکھیے۔
5. آپ کی رائے میں ہمایوں کیوں شیر شاہ کو ہرانے میں ناکام رہا؟ وضاحت کیجیے۔

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بابر کے حملے سے قبل شمالی ہندوستان کے سیاسی حالات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سیاسی کشمکش کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیجیے۔
3. ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کا ایک تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

2.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Asher, Catherine B., and Talbot, Cynthia, *Indian Before Europe*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006.
2. Bhargava, Meena, *Understanding Mughal India: Sixteenth to Eighteenth Centuries*, Orient Blackswan, New Delhi, 2020.
3. Chandra, Satish, *Meideval India: Mughal Empire (1526-1748)*, Har-Anand Publication, New Delhi, 1997.
4. Dale, Stephen Frederick, *Babur: Timurid Prince and Mughal Emperor, 1483-1530*, Cambridge University Press, New Delhi, 2018.
5. Eaton, Richard M., *India in the Persianate Age 1000-1765*, Penguin Books, Delhi 2019.
6. Habib, Irfan, *Medieval India: The Study of a Civilization*, National Book Trust, New Delhi, 2008. (Also available in Urdu)
7. Richards, John F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, Cambridge, 1993.
8. Robinson, Francis, *The Mughal Emperors and the Islamic Dynasties of India, Iran and Central Asia*, Thames and Hudson, London, 2007.
9. Streusand, Doughlas E., *Islamic Gunpowder Empires: Ottomans, Safavids, and Mughals*, Westview Press, 2011.
10. Thackston, W.M., *The Baburnama: Memoirs of Babur, Prince and Emperor*, Random House Publishing, New Delhi, 2002.
11. Tripathi, R.P., *Rise and Fall of the Mughal Empire*, Central Book Depot, Allahabad, 1956. (Also available in Urdu)

اکائی 3۔ سوری خاندان

(Sur Dynasty)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 شیر شاہ سوری
3.2.1 ابتدائی حالات زندگی
3.2.2 ابتدائی مسائل اور ان کا حل
3.3 فوجی کاروائیاں اور فتوحات
3.3.1 نصرت خان سے جھڑپ
3.3.2 ہمایوں سے پہلا ٹکراؤ
3.3.3 بنگال کے حکمراں کی سرکوبی
3.3.4 ہمایوں سے دوسرا ٹکراؤ
3.3.5 قنوج اور چوسا کی جنگ
3.3.6 گکھروں کی مزاحمت کا خاتمہ
3.3.7 مالوہ کی تسخیر
3.3.8 رائے سین کے قلعہ پر قبضہ
3.3.9 راجستھان پر کنٹرول
3.3.10 ملتان اور سندھ کی فتح
3.3.11 کالنجر کی مہم
3.4 شیر شاہ کے کارنامے
3.5 شیر شاہ کی شخصیت اور کردار

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

3.6 تاریخ میں شیر شاہ کا مقام
3.7 شیر شاہ کے جانشین
3.7.1 اسلام شاہ سوری
3.7.2 عادل شاہ سوری
3.8 سوری سلطنت کے زوال کے اسباب
3.9 اکتسابی نتائج
3.10 کلیدی الفاظ
3.11 نمونہ امتحانی سوالات
3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

سوری خاندان کی حکومت کو دہلی سلطنت کے تسلسل اور ارتقا کی علامت کہا جا سکتا ہے۔جس کو قائم کرنے کا سہرا بلاشبہ اس افغان بہادر سالار کے سر جاتا ہے جس کا پیدائشی نام تو فرید خان تھا لیکن اپنی بے پناہ جرأت و بہادری کی وجہ سے شیر خان کے خطاب سے نوازا گیا اور تاریخ میں وہ شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے۔وہ ایک طاقتور افغان سردار کی شکل میں ابھرا۔وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ افغانوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور لودیوں کے بعد ہندوستان میں دوسری افغان حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا جو سوری خاندان کے نام سے معروف ہے۔عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں شیر شاہ سوری کا ایک اہم مقام ہے۔اس کا شمار ہندوستان کے ان چند عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے قلیل عہد حکمرانی میں ایسے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے جس کے ان مٹ نقوش آج تک ہندوستان میں نظر آتے ہیں۔شیر شاہ ان چند حکمرانوں میں سے ایک تھا جنھوں نے ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کو وحدت کے دھاگے میں باندھنے کی کوشش کی، شہری سہولیات اور ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا۔اس نے کئی غیر ملکی حملہ آوروں سے مقابلہ کیا اور اسی لیے وہ ہندوستانی عوام کی محبت، تعاون اور حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔بیشتر مورخین کا ماننا ہے شیر شاہ سوری اپنے عہد کا نہایت ہی ہوشیار، دور اندیش، جفاکش، محنتی، قابل اور بے حد دانشمند حکمران تھا۔وہ ایک معمولی جاگیر دار کا بیٹا تھا لیکن وہ اپنے عزم، ہمت، بہادری، تدبر اور دور اندیشی سے بالآخر ہندوستان کا حکمراں بن گیا۔

1540ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر ایران میں پناہ لینے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں مغل بادشاہت عارضی طور پر ختم ہو گئی۔ ایک عظیم فاتح ہونے کے ساتھ شیر شاہ ایک ماہر منتظم بھی تھا۔ اپنے پانچ سالہ مختصر دورِ حکمرانی میں اس نے نظم و نسق کا ایک بہترین نظام تشکیل دیا جو آنے والے وقت میں مغل نظم و نسق کی بنیاد بنا۔ اگر شیر شاہ چند سال اور زندہ رہتا تو شاید ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- شیر شاہ سوری کے ابتدائی حالات، شخصیت اور کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مغل بادشاہ بابر اور ہمایوں سے اس کے تعلقات بیان کر سکیں گے۔
- شیر شاہ سوری کی فتوحات اور کامیابیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- شیر شاہ سوری کے اہم کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- شیر شاہ سوری کے جانشینوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- سوری خاندان کے زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔

3.2 شیر شاہ سوری (Sher Shah Suri)

3.2.1 ابتدائی حالات زندگی (Early Life)

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خاں تھا۔ وہ ابراہیم سوری کا پوتا اور حسن خاں کا بیٹا تھا۔ ابراہیم سوری گھوڑوں کے تاجر تھے۔ وہ سلطان بہلول لودی کے عہدِ حکومت میں بہتر روزگار کی تلاش میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ افغانستان سے ہندوستان آئے اور پنجاب میں سکونت اختیار کی۔۔ ایک روایت کے مطابق فرید خان 1472ء میں پنجاب ہی میں پیدا ہوا۔ تاریخ ولادت کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر قانونگو شیر شاہ کی تاریخ پیدائش 1486ء بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر پی۔ سرن اور ڈاکٹر آشیر وادی لال سری واستو فرید خان کی ولادت 1472ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے خیال میں بھی 1484 درست ہے۔ فرید خان کے والد حسن خان اور دادا ابراہیم سوری دونوں ہی پنجاب میں جمال خان کی خدمات میں شامل ہوئے اور انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد جمال خان کو سکندر لودی نے مشرقی علاقوں کے انتظام کے لیے جون پور بھیجدیا۔ جمال خان حسن خان کو اپنے ہمراہ بہار لے گیا اور سہسرام، خواص پور اور ٹانڈا کی جاگیریں حسن کو دے دیں۔

3.2.2 ابتدائی مسائل اور ان کا حل (Initial Problems, and their Solution)

فرید خان کے والد حسن خاں کی چار بیویاں اور آٹھ لڑکے تھے۔ فرید خان پہلی بیوی کا بڑا بیٹا تھا اور سب سے بڑی نرینہ اولاد تھا لیکن وہ اپنے باپ کی مناسب توجہ اور نگرانی سے محروم رہا کیوں کہ حسن خاں اپنی چوتھی بیوی پر فریفتہ تھا۔ وہ اپنے شوہر کو فرید خان کے خلاف بھڑکاتی

رہتی تھی۔اس نے حسن خان کو فرید سے بہت بد ظن کر دیا تھا۔والدین کی بے التفاتی فرید خاں کے لیے بہتر ثابت ہوئی اور 1494 میں سہسرام سے جونپور چلا گیا۔ وہاں اس نے علمی سر گرمیوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی۔ یہاں فرید نے عربی، فارسی اور ماضی کے عظیم بادشاہوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا۔ حیرت انگیز ذہنی قوت کے سبب اور بے پناہ محنت کے باعث اُس نے بہت سی عربی اور فارسی کتابیں ازبر کرلیں ان میں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ شامل تھیں۔اس کی ذہانت کے باعث جمال خاں بہت خوش ہوا اور اسے خصوصی توجہ کے لائق سمجھا۔جمال خاں نے جلد ہی فرید اور اس کے باپ کے درمیان مصالحت کرادی۔اس کے نتیجہ میں بہار کے ضلع شاہ آباد میں سہسرام اور خواص پور کی اپنے باپ کی جاگیروں کا فرید خاں کو نائب مقرر کیا گیا۔اپنے باپ کی جاگیر کا نائب ہونے کے بعد فرید نے ایک ماہر منتظم کی حیثیت سے اپنی بھرپور صلاحیتوں اور واضح قابلیتوں کا استعمال کرتے ہوئے جاگیر کو خوب ترقی دی۔ فرید کے بہترین انتظام و انصرام کی وجہ سے 1497ء سے 1518ء تک اس کی جاگیر انتہائی سر سبز اور شاداب ہوگئی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی۔اس نے 21 سال تک کمال ہنر مندی سے اس کام کو سرانجام دیا۔

اس کی بہترین کارکردگی اس کی سوتیلی ماں کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔اپنی سوتیلی ماں اور بھائیوں کی حسد اور دشمنی کی وجہ سے اسے اپنے باپ کی ہمدردی اور نائب جاگیر دار کے عہدہ سے محروم ہونا پڑا۔ چنانچہ وہ ایک باا ثر امیر دولت خاں لودی کی مدد سے آگرہ میں ابراہیم لودی کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کی جاگیر لینے کی درخواست کی۔ پہلے تو ابراہیم لودی نے اس کی اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ لیکن 1520ء میں جب حسن خاں کا انتقال ہو گیا تو ابراہیم لودی نے اس کے باپ کی جاگیر فرید کو عطا کردی۔اس طرح فرید خان سہسرام خواص پور اور ٹانڈا کا مالک بن گیا اور سہسرام میں سکونت اختیار کی۔ ابراہیم لودی کی دی ہوئی جاگیر سے فرید خاں کی مشکلات میں کمی نہیں آئی۔فرید کے سوتیلے بھائی سلیمان خاں نے اپنے آقا محمد خاں کی مدد سے جو چوند کا جاگیر دار تھا اپنی جاگیر حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سلیمان کو محمد خاں کی تائید حاصل تھی۔اسکی حمایت کے توڑ کے لیے فرید نے بہار خاں لوہانی کی ملازمت اختیار کرلی جو جنوبی بہار میں ابراہیم لودی کا نائب تھا۔ فرید خاں نے جاگیر بانٹنے سے انکار کر دیا اور اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے جنوبی بہار کے حکمراں بہار خان لوہانی کی خدمات میں شامل ہو گیا جہاں فرید خاں نے بہت محنت کی۔ بہار خاں لوہانی کی ملازمت کے زمانے میں فرید نے تلوار کے ایک ہی وار سے شیر کو مار ڈالا۔فرید خان کی اس بہادری پر بہار خان لوہانی نے اس کو شیر خاں کے خطاب سے نوازا۔یہی شیر خان تاریخ میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہے۔

لوہانی امراء شیر خاں کے عروج کو پسند نہیں کرتے تھے۔دوسرے افغان امراء بھی اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہار خاں کے کانوں میں زہر بھرنا شروع کر دیا۔ بہار خاں کو یہ تاثر دیا گیا کہ شیر خان، محمد لودی سے گٹھ جوڑ کر رہا ہے جو ہندوستان میں مغل سلطنت سے ٹکرانے کا عہد کیے ہوئے تھا۔اس پر بہار خان، شیر خاں سے بد ظن ہو گیا اور اسے اپنے بھائیوں کے ساتھ جاگیر بانٹنے کا حکم دیا۔ شیر خان کے انکار کرنے پر شیر خان کی جاگیر پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ چنانچہ شیر خان کو وہاں سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جب شیر خاں سے جاگیر چھین لی گئی تو وہ بے بس ہو گیا اور اپریل 1927ء میں مغل دربار سے منسلک ہو گیا۔ جب مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے بہار پر حملہ کیا تو شیر خاں اس کے بڑے کام آیا۔اس خدمت کے عوض بابر نے اس کی جاگیر بحال کر دی۔ شیر خان نے مغل دربار میں بڑی کامیابی سے وقت گزارا۔اس نے

مغل انتظامیہ، ان کے نظم و نسق اور فوجی تنظیم کی خامیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس نے مغلوں کے جاہ و جلال کا بھی بنظر غائر مشاہدہ کیا۔ 1527ء اور 1528ء کے درمیان فرید خان 15 مہینوں تک بابر کی ملازمت میں رہا۔ 1528 میں اس نے مغل دربار کو بھی چھوڑ دیا۔ جاتے جاتے وہ بابر کے ذہن پر اپنی اولوالعزمی کے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ بابر کی دور بین نظروں نے اُسے پہچان کر ایک بار کہا تھا 'یہ افغان معمولی باتوں سے پریشان ہونے والا نہیں۔ یہ عظیم آدمی ہو گا۔ شیر خان پر نظر رکھو۔ یہ بڑا ہوشیار شخص ہے، بادشاہت کے نشان اس کی پیشانی پر دمک رہے ہیں۔'

مغل دربار سے نکل کر شیر شاہ جنوبی بہار چلا گیا جہاں وہ جنوبی بہار کے حکمراں بہار خان کے لڑکے جلال خان کا اتالیق مقرر ہوا۔ اسی دوران 1528ء میں بہار خان کا انتقال ہو گیا اور شیر خان، اس کے بیٹے کے اتالیق کی حیثیت سے جنوبی بہار کا نائب گورنر بن گیا۔ نئے عہدے پر آتے ہی شیر خان نے جنوبی بہار کی انتظامی صورت حال میں دوررس تبدیلیاں کیں۔ اس نے اپنے پیروکاروں کی ایک بہترین فوج بھی تیار کرلی جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ 1528ء میں شیر خان کو ایک اور مشکل پیش آئی۔ کچھ افغان امرا نے محمود لودی کو بہار آنے کی دعوت دی اور اس کے جھنڈے تلے سارے کے سارے افغان اکٹھے ہو گئے اور محمود نے جنوبی بہار کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ شیر خاں نے محمود لودی کے لیے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شیر خان بابر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابتداء میں افغانوں کو کامیابی ملی مگر جلد ہی انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مغلوں کا باج گزار بن کر رہنا اور خراج دینا پڑا۔ شیر خان کو پھر سے بہار کا نائب گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جلال خاں کی ماں کے انتقال کے بعد شیر خان نے بہار کا نظم و نسق انتہائی حسن اسلوبی سے سنبھالا۔ چونکہ جلال خان نو عمر اور ناتجربہ کار تھا۔ جلال خاں کے نائب کی حیثیت سے فرید خان نے جنوبی بہار کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رفتہ رفتہ بہار کا اصلی حکمران بن گیا اور پر اعتماد زندگی کا آغاز کیا۔

3.3 فوجی کاروائیاں اور فتوحات (Military Operations and Conquests)

3.3.1 نصرت خان سے جھڑپ (Clash with Nusrat Khan)

بنگال اور بہار کے تعلقات کبھی خوش گوار نہیں تھے۔ اس تلخی کا سبب مفادات کا ٹکراو تھا۔ حکمراں بنگال نصرت شاہ نے بہار پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ 1529ء میں اس نے شیر خاں کے علاقہ پر حملہ کیا لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود شیر خان سے شکست کھائی۔ اس فتح سے جہاں شیر خاں کے وقار اور مرتبے میں اضافہ ہوا وہیں بہت سے لوگ مخالف بھی ہو گئے۔ جنوبی بہار کے لوہانی امراء اس سے حسد کرنے لگے۔ انہوں نے شیر خاں کے خلاف سازش کی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے اس کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور شیر خاں کی طرف سے ایذا رسانی کے خوف سے جلال خاں کے ہمراہ بنگال فرار ہو گئے۔ اس طرح تخت شاہی شیر خاں کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ 1530ء میں جنوبی بہار کا سلطان بن گیا مگر اس نے اپنی حکومت کا کوئی رسمی اعلان نہیں کیا صرف 'حضرت اعلیٰ' کا لقب اختیار کیا۔ اس نے چنار قلعہ کی بیوہ مالکن سے شادی کر لی اور وہاں سے بہت سامال و اسباب اکٹھا کیا اور افغانوں کا مقتدر رہنما بن گیا۔

3.3.2 ہمایوں سے پہلا ٹکراؤ (First Confrontation with Humayun)

1529ء میں محمود لودی نے گھاگھرا کی جنگ میں شکست کھائی تھی۔ 1530ء میں وہ مغلوں سے نبرد آزمائی کو نکلا۔ ہمایوں سخت بیمار تھا۔ جب وہ تندرست ہوا تو پتہ چلا کہ اس کے والد ظہیر الدین بابر کا انتقال ہو گیا ہے۔ تخت نشینی کے وقت ہمایوں بہت مصروف تھا۔ محمود لودی نے خیال کیا کہ وہ بہار جیسے دُور دراز علاقے کی طرف توجہ نہ دے سکے گا۔ چنانچہ محمود لودی نے سارے افغانوں کو جمع کر لیا اور شیر خاں کو بڑی منت سماجت سے راضی کیا۔ افغانوں نے بنارس تک کا علاقہ لے لیا۔ جب افغان فوج جونپور کی طرف بڑھی تو ہمایوں ہوشیار ہو گیا۔ اس وقت ہمایوں کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ کالنجر کے راجہ سے صلح کر کے وہ افغانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلا۔ دوراہہ کے مقام پر 1532ء میں لڑائی ہوئی جس میں افغانوں کو شکست ہوئی اور محمود لودی بھاگ نکلا۔ بادل نخواستہ شیر خاں کو بھی جنوبی بہار کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ اس فتح کے بعد ہمایوں نے شیر خان کے مقبوضہ قلعہ چنار کا محاصرہ کر لیا۔ چار ماہ تک محاصرہ جاری رہا مگر ہمایوں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ ہندال کی خود مختاری کا سن کر ہمایوں مضطرب ہو گیا، شیر خاں نے موقعہ کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور بڑی حکمت و دانشمندی سے ہمایوں کے ساتھ مصالحت کر لی اور پانچ سو افراد اور اپنا ایک بیٹا اس کی خدمت پر مامور کیے۔

3.3.3 بنگال کے حکمراں کی سرکوبی (Suppression of the Ruler of Bengal)

جس وقت شیر خان ہمایوں سے جنگ میں مصروف تھا تو بنگال کے حکمراں نے اس کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کی تھیں۔ چنانچہ شیر خاں نے ہمایوں سے صلح کرنے کے فوراً بعد بنگال کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ 1534ء میں سورج گڑھ کی لڑائی میں بنگال کے حکمراں کو شکست ہوئی۔ شیر خان کی زندگی میں یہ فتح ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر قانون گو کے مطابق 'فوجی نقطہ نظر سے تو یہ فتح عظیم تھی ہی، مگر دوررس سیاسی تاریخ کے لحاظ سے عظیم ترین تھی۔ اگر سورج گڑھ کی لڑائی میں شیر خان کو فتح حاصل نہ ہوتی تو سہسرام کے جاگیر دار شیر خان کو گوشتہ گمنامی سے نکل کر اس ہندوستان پر حکمرانی نصیب نہ ہوتی جس پر بہادر شاہ اور ہمایوں بادشاہ جیسے موروثی تاجدار حکمران تھے۔' مزید یہ کہ بنگالی فوج کا پورا خزانہ، ہاتھی اور توپ خانے کی بھری ہوئی گاڑی شیر خان کے ہاتھ لگی اور وہ بہار اور اس کے گرد و نواح کے دیگر علاقوں کا بلا شرکتِ غیر مالک بن گیا۔ اس کامیابی سے شیر خاں کا حوصلہ کافی بڑھ گیا اور اس نے بنگال پر پے در پے کئی حملے کیے اور ہر مرتبہ بنگالیوں کو شکست دے کر انہیں بھاری تاوان دینے پر مجبور کیا۔ ایک دفعہ تو حکمراں بنگال نے پرتگالیوں کی مدد بھی حاصل کی تھی مگر شیر خان کے تدبر اور فراست کے مقابلے میں ان کی سبھی چالیں اور منصوبے ناکام ثابت ہوئے

3.3.4 ہمایوں سے دوسرا ٹکراؤ (Second Confrontation with Humayun)

1536ء میں صلح کے معاہدہ کے باوجود شیر خان نے سارے بنگال پر قبضہ کا منصوبہ بنایا۔ زبردست جنگی تیاریاں کرنے کے بعد شیر خاں نے 1547ء میں بنگال پر چڑھائی کر دی۔ حکمراں بنگال نے اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے ہمایوں سے مدد طلب کی۔ ادھر ہمایوں بھی ایک عرصہ سے شیر خان کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ فوراً چنار کی طرف بڑھا اور نومبر 1537ء میں اس کا محاصرہ کر لیا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ مورخین کا ماننا ہے کہ یہ ہمایوں کی ناعاقبت اندیشی تھی۔ اُسے براہ راست بنگال پہنچ کر حکمراں بنگال کی مدد کرنی چاہیے تھی۔

ادھر ہمایوں چنار کے محاصرہ میں لگا تھا تو دوسری طرف شیر خاں نے گوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہ بنگال کے خاصے بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس نے روہتاس کے ناقابل تسخیر قلعہ کو بھی فتح کر لیا جو کہ ایک ہندو راجا کے قبضہ میں تھا۔ اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ شیر خاں نے ہندو راجہ سے درخواست کی کہ سوری خاندان کی خواتین کو قلعہ میں پناہ دی جائے۔ راجا راضی ہو گیا۔ اس پر شیر خان نے عورتوں کے بھیس میں ڈولیوں میں سپاہی اندر بھیجے جنھوں نے قلعہ میں داخل ہونے کے بعد ہندو سپاہیوں کو باہر نکال دیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ اس واقعہ کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور یہ صرف من گھڑنت کہانی لگتا ہے۔ بہر حال شیر شاہ 1538ء میں رہتاس پر قابض ہو گیا۔ اس دوران ہمایوں چنار کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور شیر خان گوڑ پر قبضہ میں مزید تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بڑی کوششوں سے اس نے گوڑ پر قبضہ کر لیا۔ اب شیر خان بنگال پر قابض ہو چکا تھا۔ مگر بنگال پر اس کا قبضہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

دراصل ابتداء میں ہمایوں نے شیر خان سے مصالحت کی بات چیت کی۔ اس نے شیر خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ کچھ جاگیر اپنے پاس رکھ لے اور اپنے باقی تمام مقبوضہ علاقے چھوڑ دے۔ مگر شیر خاں نے ہمایوں کا یہ مطالبہ ٹھکرا دیا۔ اس پر ہمایوں نے دوسری شرط یہ پیش کی کہ شیر خاں بہار سے دستبرار ہو جائے اور بنگال پر قابض رہے اور دس لاکھ روپے سالانہ خراج ادا کرتا رہے۔ شیر خاں اس پر راضی ہو گیا اور بظاہر معاملات رفع دفع ہو گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ہمایوں نے شیر خان کی طاقت کو ختم کرنے کیلیے بنگال پر قبضہ کا منصوبہ بنایا۔ شیر خاں کو ہمایوں کی وعدہ خلافی پر بہت غصہ آیا اور جب ہمایوں نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی تو شیر خان نے اپنے بیٹے کو اس کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا۔ ہمایوں شیر خان کے بیٹے سے الجھا رہا اور شیر خان نے اپنا سارا خزانہ، روپیہ پیسہ اور توپ خانہ وغیرہ روہتاس کے قلعہ میں منتقل کر دیا۔ اس نے ہمایوں کو بنگال جانے کا راستہ بھی دے دیا۔ ہمایوں بنگال میں داخل ہوا اور گوڑ پہنچ کر اس نے بنگال کو اپنے افسران میں تقسیم کر دیا اور خود کئی مہینوں تک عیش میں مصروف رہا۔ ان مہینوں میں، شیر خان اپنے حامیوں اور افغان فوجیوں کے ساتھ چنار، بنارس، جونپور، قنوج اور پٹنہ پر کنٹرول قائم کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے بہار اور دہلی کے درمیانی علاقوں پر مکمل قبضہ کر لیا اور دہلی اور بنگال کے درمیان خبر رسانی اور رسد و کمک کا راستہ روک دیا۔ وہ ہمایوں کے واپس لوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہمایوں، شیر خان کی چال سمجھ نہیں سکا اور اس نے اچھا خاصا وقت گوڑ میں بلا وجہ ضائع کر دیا۔ بنگال میں بارشیں شروع ہو گئیں جو مغل فوج کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث بن گئیں۔

3.3.5 قنوج اور چوسا کی جنگ (Battles of Kanauj and Chausa)

کافی دنوں تک گوڑ میں قیام کے بعد بالآخر ہمایوں نے آگرہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پیچھے دو وجوہات بتائی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ بنگال میں ملیریا اور دیگر وبائی امراض کی وجہ سے اس کے فوجی اور جنگی جانور بڑی تعداد میں مر رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہندال بغاوت پر آمادہ تھا۔ وہ بنگال سے روانہ ہوا اور ہندال سے کہا کہ وہ آگرہ سے مشرق کی جانب کوچ کرے اور دونوں مل کر افغانوں کو دونوں طرف سے گھیر لیں لیکن ہندال نے بغاوت کر دی اور خود بادشاہ بننے کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران ہمایوں کے چھوٹے بھائی کامران نے دہلی پر قبضہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوا اور اس نے آگرہ کا رخ کیا۔ یہ خبریں ملتے ہی ہمایوں نے تھوڑی سی فوج گوڑ میں چھوڑ کر آگرہ کی جانب کوچ کیا۔ مغل امیروں میں بے اطمینانی، برسات کے موسم کی پریشانی اور افغانوں کے مسلسل حملوں کے باوجود ہمایوں اپنی فوج کو کسی بڑے نقصان کے بغیر بکسر کے

قریب چوسا تک لانے میں کامیاب رہا۔شیر خان موقعہ کی تلاش میں تھا۔مارچ 1539 میں جیسے ہی ہمایوں کی فوج چوسا پہونچی پہلے سے تیار افغان فوج نے رات کے وقت مغل فوج پر حملہ کر دیا۔ہمایوں کو سنبھلنے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔چوسا کی خونریز لڑائی میں ہمایوں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ بڑی مشکل سے ایک بہشتی کی مدد سے دریا پار کر کے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔شیر شاہ نے ہمایوں کا پیچھا بھی کروایا مگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہا۔چوسا کی فتح شیر خان کے لیے انتہائی اہم ثابت ہوئی۔ اس کو بہت ساری دولت حاصل ہوئی۔اس کے جوش اور ولولوں میں خاصی شدت پیدا ہوگئی۔ قانون گو کے بقول '1538ء میں شیر خاں کی حیثیت ایک مغل جاگیر دار کی تھی۔اس فتح سے وہ جون پور، بنگال اور بہار کا خود مختار حکمراں بن گیا تھا۔اب وہ شہنشاہ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا تھا۔'1539ء کی اس بڑی کامیابی کے بعد شیر خاں، شیر شاہ کے نام سے تخت نشین ہوگیا۔اس نے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا اور اپنے نام کے سکے ڈھلوائے۔

چوسا کی شکست سے ہمایوں کے وقار کو بہت ٹھیس پہونچی اس نے شیر شاہ سوری کو ہرا کر اپنے وقار کو دوبارہ بحال کرنے کی ناکام کوشش کی۔17 مئی 1540ء میں قنوج میں شیر شاہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ایک طرف اس کے بھائیوں اور کئی امیروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔تو دوسری طرف اس نے گنگا پار کرنے کی دوبارہ غلطی کی۔بارش کی وجہ سے اس کا توپ خانہ بھی ٹھیک سے کام نہیں کر سکا۔وہ افغانوں کے حملے کا کوئی موثر جواب نہیں دے سکا اور نتیجتاً اسے شیر خاں کے ہاتھوں فیصلہ کن شکست ہوئی۔ہمایوں شکست کھا کر پہلے آگرہ اور پھر لاہور گیا۔لاہور میں کامران مرزا نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور اسے یہاں سے بھی نکلنا پڑا۔شیر شاہ نے ہمایوں کا تعاقب جاری رکھا۔لاہور سے ہمایوں سندھ کی طرف بھاگ گیا۔اس فتح سے شیر شاہ کا اقتدار مزید مستحکم اور مضبوط ہوگیا اور ہمایوں کو ایران کے صفوی حکمراں شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لینی پڑی۔قنوج کی فتح نے شیر شاہ سوری کے لیے دہلی اور آگرہ کا راستہ ہموار کر دیا۔10 جون 1540 کو 67 سال کی عمر میں دلی کے تخت پر بیٹھا۔1545 میں اپنی وفات تک ہندوستان کے بادشاہ کے طور پر حکومت کی اور دوسری افغان مملکت کی بنیاد ڈالی۔

3.3.6 گکھروں کی مزاحمت کا خاتمہ (The End of Gakhars' Resistance)

ہمایوں کے جلاوطن ہونے کے باوجود مغلوں کے دوبارہ لوٹ آنے کا خطرہ برقرار تھا۔شمال مغرب سے آنے والا حملہ آور آسانی سے اس جگہ سے گزر کر پنجاب میں اپنی حیثیت مستحکم کر سکتا تھا۔شیر شاہ اس کا مکمل سدِ باب کرنا چاہتا تھا۔جنگی اور دفاعی نقطہ نظر سے شیر شاہ کے لیے شمال مغربی سرحدوں پر کنٹرول کرنا ضروری تھا۔شیر شاہ کے خدشات بھی درست تھے وہ جانتا تھا کہ کابل میں کامران مرزا اور کشمیر میں مرزا حیدر کی حکومت ہے اور یہ دونوں کسی بھی وقت گٹھ جوڑ کر کے اس کی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔شمال مغربی سرحد پر سارنگ خان گکھر، مغلوں کا حمایتی تھا۔گکھروں نے مغلوں کے ساتھ وفاداری نبھائی تھی اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی رکھتے تھے۔چنانچہ شیر شاہ سوری کے لیے ان کے علاقوں پر کنٹرول کرنا ضروری تھا۔ان کے گاوؤں کو آگ لگا دی گئی، مخالفت کرنے والوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔گکھروں نے بھی خوب مقابلہ کیا مگر ناکام رہے۔چنانچہ شیر شاہی لشکر نے وہاں خوب غارت گری کی۔اچانک شیر شاہ سوری کو بنگال کے گورنر کی بغاوت کا پتہ چلا تو اُسے فوراً وہاں جانا پڑا۔اس نے اپنے انتہائی تجربہ کار جرنیل اور پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے وہیں چھوڑا اور خود بنگال کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ ہوا۔وہاں پہونچ کر خضر خاں کی بغاوت کو ختم کیا۔بنگال کو سرکاروں (ضلعوں) میں تقسیم

کر کے ہر سرکار کا ایک شقدار مقرر کیا۔ ہر شقدار اپنی سرکار کا نظم و ضبط سنبھالتا تھا۔ ان شقداروں کا سربراہ اعلیٰ قاضی فضیلت کو مقرر کیا گیا۔ یہ صوبے کا حکمراں اعلیٰ بھی تھا۔ نچلے حکام اس کی مدد اور تعاون پر مامور تھے۔

3.3.7 مالوہ کی تسخیر (Conquest of Malwa)

بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد 1542ء میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر شیر شاہ سوری نے مالوہ پر چڑھائی کر دی۔ عباس خان سروانی نے مالوہ پر حملہ کو انتقامی کارروائی بتایا ہے۔ دیگر فارسی مورخین بھی اسے بدلے کی کارروائی بتاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے مالوہ کے حکمراں ملو خان نے شیر شاہ کے بیٹے قطب خان کی اس وقت کوئی مدد نہیں کی جب وہ مغلوں سے برسرپیکار تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب خاں، مرزا عسکری اور ہندال کے ہاتھوں مارا گیا۔ شیر شاہ کو اس کا بہت رنج تھا۔ مزید یہ کہ ملو خان نے قادر شاہ کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور مانڈو اور سارنگ پور پر قابض ہو گیا تھا۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر شیر شاہ مالوہ کو فتح کرنے کے لیے سارنگ پور جا پہنچا۔ جب شیر شاہ مالوہ میں داخل ہوا تو ملو خان خود ہی اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیر شاہ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی لیکن قادر شاہ کو خبر ملی کہ اسے لکھنوتی بھیجے جانے کا امکان ہے۔ چنانچہ وہ اپنا سارا مال واسباب اور خزانہ وہیں چھوڑ کر اپنی جان بچا کر گجرات چلا گیا۔ اس طرح بلا کسی خون خرابے کے مالوہ پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا اور بہت سارا مال واسباب بھی اس کے ہاتھ لگا۔ مالوہ کی طرف کوچ کرتے وقت شیر شاہ نے اپنے جنگجو امیر شجاعت خان کو روہتاس سے گوالیار جانے کا حکم دیا اور خود مالوہ کی جانب کوچ کیا۔ شجاعت خان نے گوالیار فتح کر لیا۔ واپسی پر شیر شاہ سوری نے رنتھنبور کا قلعہ بھی فتح کر لیا اور اسے اپنے بڑے بیٹے عادل خان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح مالوہ، گوالیار اور رنتھمبور پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

3.3.8 رائے سین کے قلعہ پر قبضہ (Capture of Roy Sen's Fort)

رائے سین کا قلعہ ہندوستان کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت کا حامل تھا۔ مارچ 1543 میں شیر شاہ نے رائے سین پر چڑھائی کی۔ یہاں کا حکمراں راجہ پورن مل شیر خان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی اطاعت قبول کی۔ شیر شاہ نے اُسے تحفے تحائف بھی عطا کیے۔ لیکن وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ جب تک رائے سین کا قلعہ فتح نہیں کر لیا جاتا، مشرقی مالوہ کے راجپوتوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہے اور مالوہ کی فتح ادھوری ہی رہے گی۔ پورن مل کے متعلق شیر شاہ کو یہ اطلاع ملی کہ وہ متعصب اور شدت پسند ہندو ہے جس نے چندیری پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ مسلمان عورتوں کو اپنی کنیزیں اور لونڈیاں بنا لیا تھا اور مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی۔ چنانچہ شیر شاہ نے رائے سین کے قلعہ پر چڑھائی کی۔ وہ مانڈو کے راستے رائے سین پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عمدہ جنگی ترکیب اور بہتر حکمت عملی سے قلعہ فتح کر لیا۔ کچھ مورخین نے شیر شاہ کی اس جنگی حکمت عملی کو دھوکہ سے تعبیر کیا۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ راجپوت فوجیوں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کیا اور شیر شاہ کے لشکر سے مقابلہ کے لیے آ گئے۔ بالآخر افغان فوج نے انہیں بری طرح شکست دی اور قلعہ رائے سین پر قبضہ کر لیا۔

3.3.9 راجستھان پر کنٹرول (Control over Rajasthan)

مالوہ، گوالیار، رنتھمبور اور رائے سین پر قبضہ سے شیر شاہ سوری کی حیثیت کافی مضبوط ہو گئی۔ لیکن راجپوتانہ میں جودھپور کے راجہ

مالدیو کی بڑھتی ہوئی طاقت شیر شاہ کے لیے کبھی بھی خطرہ بن سکتی تھی۔ مالدیو، ہمایوں کا حلیف بھی رہ چکا تھا۔ شیر شاہ کو اصل خطرہ کے راجہ مالدیو سے ہی تھا۔ وہ 1532 میں گدی پر بیٹھا اور بہت جلد ہی اس نے پورے مغربی اور شمالی راجستھان پر قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ اور ہمایوں کی رسہ کشی کے دوران اس نے اپنے حدود کو جیسلمیر اور اجمیر تک وسیع کر لیا تھا۔ اس نے میواڑ اور بیکانیر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ وہ پورے راجستھان پر قبضہ کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1541ء میں مالدیو نے ہمایوں کو دہلی کے تخت کی بازیابی کے لیے بھی دعوت دی تھی۔ شیر شاہ کو یہ بات کھٹکنے لگی۔ اس نے مالدیو کو مشورہ دیا کہ ہمایوں کو پناہ دینے کے بجائے اُسے گرفتار کر کے اسکے حوالے کر دے لیکن مالدیو نے شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان آنے سے گریز کیا۔ چنانچہ شیر شاہ نے اُس سے نپٹنے کا فیصلہ کیا۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ مالدیو کے پاس پچاس ہزار فوج تھی۔ ستیش چندرا لکھتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ آگرہ یا دہلی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ دونوں فریقوں کے لیے مشرقی راجستھان پر قبضہ فوجی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم تھا۔ دونوں جانب بہت زور شور سے تیاریاں کی گئیں۔ 1544 میں اجمیر اور جودھپور کے درمیان سیمل کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک ماہ تک دونوں فوجیں آمنے سامنے ڈٹی رہیں۔ اچانک ہی ایک روز مالدیو جودھ پور لوٹ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی شیر شاہ کی ایک سیاسی شاطرانہ چال کام آئی۔ اس نے ایک فرضی رقعہ لکھوا کر مالدیو کے خیمے کے پاس ڈلوا دیا تاکہ وہ مالدیو کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ رقعہ مالدیو کے راجپوت سرداروں کی طرف سے شیر شاہ کے نام تھا۔ الفاظ کچھ یوں تھے۔ 'بادشاہ کے ذہن میں کسی قسم کی بے چینی اور شکوک وشبہات کو جگہ نہیں ملنی چاہیے۔ ہم جنگ کے دوران مالدیو کو پکڑ کر آپ کے پاس لے آئیں گے۔' یہ خط مالدیو کے ہاتھ لگ گیا۔ اُس نے خط کے متن سے بڑا شدید اثر لیا اور اپنے راجپوت سرداروں کی بات سنے بغیر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ راجپوت سرداروں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس کی بدظنی دور کرنے کی لاکھ کوششیں کی مگر مالدیو نہیں مانا اور واپس جودھ پور لوٹ گیا۔ راجپوت سرداروں کو خط کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی اور وہ اسے اپنی عزت و ناموس پر دھبہ سمجھنے لگے کہ کوئی انھیں غدار اور بے وفا کہے۔ چنانچہ وہ دس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر شیر شاہ کی فوجوں سے بڑی بے جگری سے لڑے۔ ہمعصر مورخ عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ راجپوت فوجیوں نے ناقابل بیان دلاوری اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ چونکہ افغانوں کی فوج بڑی تھی اور ان کا توپ خانہ بھی کافی بہتر تھا اس لیے راجپوت فوج شکست کھا گئی۔ لیکن ان کی دلیری اور جانبازی کو دیکھ کر خود شیر شاہ سوری بھی بڑا حیران تھا۔ اگرچہ اس جنگ میں افغانوں کو فتح ہوئی مگر شیر شاہ کو کہنا پڑا 'میں مٹھی بھر باجرے کی خاطر پوری سلطنت گنوانے جا رہا تھا۔' سیمل کی فتح راجستھان کے مستقبل کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے اجمیر اور جودھپور کا محاصرہ کر لیا اور 1544ء میں انہیں فتح کر کے مالدیو کو راجستھان کے ریگستانی علاقوں کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میواڑ کی باری آئی۔ میواڑ کا کم سن راجا اُدے سنگھ، شیر شاہ سے مقابلہ کی حیثیت میں نہیں تھا، اس نے قلعہ کی چابیاں خود ہی شیر شاہ کے پاس بھجوا دیں اور خود آبو کی پہاڑیوں کی جانب چلا گیا۔ اس طرح محض دس ماہ کی مختصر مدت میں شیر شاہ نے تقریباً پورے راجستھان کو فتح کر لیا۔

شیر شاہ نے راجپوتوں سے جو رویہ اختیار کیا وہ دشمنی والا نہیں بلکہ ایک ہوشیار مدبر کا تھا۔ ڈاکٹر قانون گو لکھتے ہیں کہ شیر شاہ نے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح راجستھان کے مقامی سرداروں کو جڑ سے اکھاڑنے یا انھیں مکمل غلام بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس

کے نزدیک یہ کام خطرناک اور بے سود تھا۔اس کا مقصد راجپوتوں کی آزادی کو چھیننا نہیں بلکہ ایک دوسرے سے اُن کی سیاسی اور جغرافیائی علیحدگی مقصود تھی تاکہ افغان حکومت کے خلاف کی جانے والی شورش کے امکانات کو ختم کیا جاسکے۔شیر شاہ نے مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں بنائیں اور ذرائع مواصلات کے مکمل نگرانی رکھی۔اجمیر،چتوڑ،جودھپور،اور ماؤنٹ آبو پر افغان دستوں کی بالادستی قائم کردی۔

3.3.10 ملتان اور سندھ کی فتح (Conquest of Multan and Sindh)

1541ء میں شیر شاہ خوشاب میں مقیم تھا۔سندھ کا علاقہ اس کے زیر نگین آچکا تھا اور وہاں کا ایک مقامی سردار اسماعیل خان والی مقرر کیا جاچکا تھا۔اس نے پنجاب کامران مرزا سے خالی کروالیا اور ہیبت خان نیازی کو وہاں حکمراں مقرر کیا۔شیر شاہ کے حکم سے ہیبت خان نے سندھ کے نواحی علاقوں کو فتح کرنے اور باغیانہ فطرت کے حامل سرداروں کو کچلنے کے لیے مہم چلائی۔اس نے پہلے پاک پٹن کے حکمراں فتح خان جاٹ کی طرف رخ کیا جس نے لاہور اور دہلی جانے والی شاہراہ کو اپنی لوٹ مار سے غیر محفوظ کردیا تھا۔اس کاروائی میں فتح خان گرفتار ہوا اور اسے قتل کردیا گیا۔اس کے بعد ہیبت خان نے ملتان کا رخ کیا اور وہاں کے حکمراں بخشولنگ کی سرکوبی کی۔بخشولنگ شیر شاہ سے معافی کا خواستگار ہوا۔شیر شاہ نے اس کو اور اس کے بیٹے کو معاف کردیا۔ہیبت خان کو انعام سے نوازا اور حکمراں ملتان سے کل پیداوار پر ایک چوتھائی حکومت کو دینے کا مطالبہ کیا۔اس طرح ملتان اور سندھ بھی فتح ہو گیا۔

3.3.11 کالنجر کی مہم (The Kalinjar Campaign)

شیر شاہ نے آخری معرکہ کالنجر (بندیل کھنڈ) کے چندیلوں کے خلاف لڑا تھا۔اس معرکہ کا سبب یہ تھا کہ کالنجر کے راجہ کیرتی سنگھ نے راجہ ویر بھانو بگھیل کو پناہ دے رکھی تھی جو ہمایوں کا دوست اور شیر شاہ کا مخالف تھا۔شیر شاہ کا اصرار تھا کہ اسے واپس کردیا جائے مگر کیرتی سنگھ نے اسے سونپنے سے انکار کردیا۔چنانچہ 1544ء میں شیر شاہ نے کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔یہ قلعہ کافی مضبوط تھا اور اسے بندیل کھنڈ کا دروازہ بھی تصور کیا جاتا تھا۔یہ محاصرہ تقریباً سال بھر جاری رہا مگر قلعہ فتح نہیں ہوسکا۔قلعہ پر سے افغان فوج پر پتھر پھینکے جاتے تھے۔اس مشکل صورتِ حال اور طویل محاصرے سے تنگ آکر شیر شاہ نے قلعہ کو بارودی گولوں سے اڑانے کا حکم دیا۔بارودی گولے چل رہے تھے کہ ایک بارودی گولہ واپس بارود خانے میں آکر گر گیا اور بارود خانہ میں آگ لگ گئی جس میں شیر شاہ بھی بری طرح جھلس گیا۔شام تک قلعہ تو فتح ہو گیا مگر شیر شاہ اپنے زخموں کی تاب نہ لاسکا اور بالآخر 1545ء کو اسی حادثہ میں اس کی وفات ہو گئی۔

3.4 شیر شاہ سوری کے کارنامے (Achievements of Sher Shah Suri)

سوری خاندان کا سب سے قابل اور عظیم حکمران شیر شاہ سوری تھا۔اس کی حکومت کو دلی سلطنت کے تسلسل اور ارتقا کی علامت کہا جاسکتا ہے۔اس نے اپنے مختصر عہدِ حکمرانی میں کئی اہم اور گراں قدر کارنامے انجام دیے۔اکثر و بیشتر مورخین کا ماننا ہے کہ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔اس نے اپنی پوری سلطنت میں امن وامان نافذ کیا۔ان چوروں،ڈاکوؤں اور ان زمینداروں کے ساتھ سختی سے پیش آیا جو لگان ادا کرنے یا حکومت کے احکامات ماننے سے انکار کرتے تھے۔شیر شاہ سوری کے واقعہ نگار عباس خان سروانی نے لکھا ہے

کہ 'زمیندار اس قدر خوف زدہ ہوگئے تھے کہ کسی میں بغاوت یا شورش برپا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ جرائم پیشہ افراد کو بھی اپنے علاقوں سے گزرنے والے افراد کو پریشان اور تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔' شیر شاہ نے تجارت اور کاروبار کی ترقی اور آمد و رفت کے وسائل کے بندوبست میں بہتری لانے پر بھی مکمل توجہ دی۔ شیر شاہ نے پرانی شاہی سڑک کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ اس سڑک کو گرانڈ ٹرنک روڈ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شاہراہ دریائے سندھ کو بنگال میں سونار گاؤں سے جوڑتی ہے۔ شیر شاہ نے آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک بھی سڑک بنوائی جو گجرات کی بندرگاہوں تک جانے والی سڑکوں سے مل جاتی تھی۔ اس نے ایک تیسری سڑک لاہور سے ملتان تک تعمیر کرائی۔ ملتان اس وقت مغرب اور وسطی ایشیا کی طرف جانے والے قافلوں کے پڑاؤں کا مرکز تھا۔ شیر شاہ نے ان سڑکوں پر ہر دو کوس کے فاصلے پر مسافروں کی سہولت کے لیے سرائیں بھی بنوائیں۔ ان سرایوں میں مسافروں کے قیام کرنے کھانے پینے کے سامان کو محفوظ رکھنے کا بندوبست ہوتا تھا۔ ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قیام کے لیے الگ الگ بندوبست ہوتا تھا۔ ہندو مسافروں کے کھانے، پینے اور ٹھہرنے نیز ان کے گھوڑوں کے دانہ پانی کے بندوبست کے لیے برہمنوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ عباس خان سروانی نے لکھا ہے کہ 'ان سرایوں کا یہ قاعدہ تھا کہ ان میں قیام کرنے والوں کو حکومت کی طرف سے ان کے عہدے کے مطابق کھانا اور ان کے جانوروں کو دانہ پانی ملتا تھا۔ ان سرایوں کے آس پاس گاؤں آباد کرنے کی کوشش کی گئی اور ان سرایوں کے اخراجات کے لیے کچھ زمین مخصوص کر دی گئیں۔ ہر سرائے میں کچھ چوکیدار بھی رکھے جاتے تھے جو ایک شحنہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے 17 سو سرائیں تعمیر کراوائیں تھیں۔ ان میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی مضبوط رہی ہوں گی۔ شیر شاہ کی بنوائی سڑکوں اور سرایوں کو اس کی سلطنت کی شہ رگ کہا جاتا ہے۔ ان سے ملک میں تجارت اور کاروبار کا فروغ ہوا۔ بہت سی سرایوں کے آس پاس قصبے آباد ہوگئے جہاں کسان اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ان سرایوں کو ڈاک چوکی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا جہاں سرکاری ہرکارے قیام کرتے تھے (ڈاک نظام کے بارے دیکھیں اکائی 4)۔ ان ڈاک چوکیوں کی مدد سے شیر شاہ سوری کو اپنی وسیع و عریض سلطنت کے تمام حالات اور واقعات کی خبر مسلسل ملتی رہتی تھی۔

3.5 شیر شاہ سوری کی شخصیت اور کردار (Personality of Sher Shah Suri)

بلاشبہ شیر شاہ سوری جامع الکمالات شخصیت کا مالک تھا۔ وہ نیک طبع، حلیم النفس اور وسیع المشرب انسان تھا۔ ایک عظیم سلطنت کا بانی، قوم پرست، اولوالعزم اور بہادر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ 'سرگرم عمل رہنا بہادر اور مستعد لوگوں کا کام ہے' ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے مطابق 'بہار کے ایک معمولی جاگیردار کا بیٹا ہو کر بھی وہ شہنشاہیت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا۔' اس نے اٹھارہویں صدی کے یورپ کے روشن خیال مطلق العنان بادشاہوں جیسی ذہانت، قابلیت اور جان نثاری کا مظاہرہ کیا۔ آر۔ ایس۔ شرما کا خیال ہے کہ 'شیر شاہ بابر اور پروشیا کے فریڈرک اعظم کی خوبیوں کا مجموعہ تھا۔' شیر شاہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مقام کا مستحق ہے۔ اس نے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس کا ایک معمولی گھرانے سے تعلق تھا، ایک کامیاب فاتح، سلطنت کے بانی اور عظیم منتظم کے اعلیٰ ترین مقام تک ترقی کی۔ شیر شاہ سوری بجا طور پر عہد وسطیٰ کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے مطابق 'بلاشبہ شیر شاہ ایک عظیم حکمران، تجربہ کار جرنیل، جنگ آزمودہ سپاہی، غیر متعصب مسلمان، رعایا کی بہبود کا خیال رکھنے والا راعی، کاشتکاروں کا مددگار، اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والا

سیاستدان اور بہترین منتظم تھا۔' اس نے پانچ سال کے مختصر دورِ حکمرانی میں جو کچھ کیا، اُس کے نقوش اس کے بعد مغل عہد اور انگریزی دور حکومت میں حتیٰ کہ آج بھی ہندوستان میں جابجا نظر آتے ہیں۔ وولزلے ہیگ نے اس کو ہندوستان کا سب سے عظیم مسلمان حکمراں قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سری واستو نے ایک حکمران کی حیثیت سے شیر شاہ کو اکبر کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ جے۔ این۔ سرکار اور آر۔ پی۔ ترپاٹھی نے شیر شاہ کا شیواجی سے مقابلہ کیا ہے۔ جے۔ این۔ سرکار لکھتے ہیں کہ شیواجی اور شیر شاہ سیرت و کردار ہی میں یکساں نہیں تھے بلکہ یکساں حالات میں جوان ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیر شاہ میں کئی خوبیاں تھیں۔ ڈاکٹر وی۔ اے۔ اسمتھ کے بقول 'اگر شیر شاہ کچھ عرصہ اور زندہ رہ جاتا تو عظیم مغل خاندان تاریخ کی سٹیج پر کبھی نمودار نہ ہو سکتا۔'

واقعات مشتاقی میں شیر شاہ سوری کے روز مرہ کے مشاغل کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔ 'شیر شاہ شب و روز امور سلطنت میں مصروف رہتا تھا کبھی فارغ نہ بیٹھتا تھا۔ وہ رات کو پچھلے پہر اٹھتا، وضو کرتا اور تہجد ادا کرتا۔ اس کے بعد وہ افسروں اور ناظموں کو بلاتا اور ان سے دن بھر کے کاموں کی رپورٹ لیتا۔ چار گھنٹے تک وہ امور سلطنت یا سرکاری کام کاج کی رپورٹیں پڑھوا کر سنتا، جو حکم دیتا اسے لکھ کر جاری کر دیا جاتا اور اس پر عمل شروع ہو جاتا۔ اس کے احکام سے متعلق کسی سوال و جواب کی گنجائش نہ ہوتی۔ اس طرح وہ فجر کی نماز تک مصروف رہتا۔ فجر کی نماز ایک جمعیت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ بعد ازاں وہ اُمراء اور سپاہیوں سے ملاقات کرتا تھا۔ اور پھر گھوڑوں کے داغنے کی بابت دریافت کرتا۔ پھر وہ باہر جا کر لشکر کا معائنہ کرتا، نئے لشکریوں کی بھرتی کرتا، ان کی تنخواہیں زبانی ہی مقرر کر دیتا۔ اس کے بعد وہ کئی دوسرے کام انجام دیتا اور حسابات کی جانچ پڑتال کرتا۔ وہ اپنی حکومت کے مختلف حصوں سے آنے والی درخواستوں اور اپیلوں کو سنتا اور احکام صادر کرتا۔ وہ اپنے احکام اور فیصلے نقل نویسوں کو فارسی زبان میں لکھواتا تھا۔ ملاقاتیوں سے محل میں ملاقات کرتا تھا۔'

3.6 تاریخ میں شیر شاہ کا مقام (Place of Sher Shah in History)

بلاشبہ شیر شاہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں بلند مقام رکھتا ہے وہ تعمیری، تدبیری، سیاسی، انتظامی صلاحیت، بلا کی محنت، جہدِ مسلسل، عدل و انصاف، کردار کی پاکیزگی، شخصیت کے لحاظ سے اپنے عہد کے دیگر حکمرانوں کے مقابلے میں بلند مقام پر فائز تھا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی حکمرانوں میں شیر شاہ وہ واحد حکمران ہے جس نے ہندوستان گیر تصور پیش کیا یعنی ایسے ہندوستان کا جس میں ہندو اور مسلمان بلالحاظ مذہب و اعتقاد، زندگی کے ہر شعبہ میں مل جل کر رہیں۔ اکبر نے تو غیر مسلموں کے دل جیتنے کی خاطر شرعی احکامات کو ترک کر دیا لیکن شیر شاہ نے اسلامی قوانین اور شرعی احکامات کی حتیٰ الامکان پیروی کرتے ہوئے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کا احترام کیا۔ شیر شاہ سوری ایک عادل حکمران تھا۔ اس کا عدل اعلیٰ اور ادنیٰ سب کے لیے یکساں تھا۔ انصاف کے سلسلہ میں اس نے اپنے بھتیجے تک کو معاف نہیں کیا۔ شجاعت خاں کو جاگیر روک لینے اور تاخیر کرنے پر سزا دی۔ غیر متعصب مذہبی مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ ہر طبقہ، برادری اور مذہب میں یکساں مقبول تھا۔ پانچ سال کے مختصر عرصہ میں اس نے جس قدر تیزی سے اصلاحات کیں وہ اس کی انتظامی قابلیت کا حیرت انگیز نمونہ ہیں ۔ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی نے 'شیر شاہ کو دوسری افغان سلطنت کا بانی قرار دیا ہے۔ اس نے افغان قبائل کو متحد کیا اور اُن کی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لی۔' وہ سلاطین دہلی میں ایک عظیم ترین سیاسی مدبر اور مغلوں کا حقیقی پیشرو تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اکبر کی شاندار پالیسی کے لیے شیر شاہ ہی نے راہ

ہموار کی تھی تو غالباً بے جا نہیں ہو گا۔ شیر شاہ نے دہلی کے تخت پر صرف پانچ سال حکومت کی لیکن اس نے علاقائی فتوحات کے علاوہ مرکزی نوعیت کے بڑے کام کیے۔ایک طرف اس نے ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کی جس کی پوری طاقت اس کی ذات اور مرکز میں موجود تھی۔ اس نے اپنی ریاست کے منقسم صوبوں کو یکجا کر کے متحد کر دیا۔اس طرح افغان قبائلی پالیسی کی کمزور وفاقیت کی بجائے مرکزی بادشاہت کی داغ بیل پڑی۔دوسری طرف اس نے ملک کی انتظامیہ کو معیاری بنانے کے اقدامات کیے اور ہندوستان کو سیاسی، طور پر متحد کرنے کے لیے اس نے سڑکوں اور سراؤں کا وسیع سلسلہ قائم کیا،افسروں کو ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں تبدیل کرنے کا طریقہ نکالا۔دفاعی نقطہ نظر سے اہم مقامات پر قلعے تعمیر کروائے جن میں مرکزی احکام کے تحت ساز و سامان رکھا جاتا تھا۔مالیہ کی وصولی کا باقاعدہ انتظام کیا گیا اور یہ انتظام ان اصولوں پر مبنی تھا، جو سلاطین دہلی کی حکومت کے سخت قوانین سے زیادہ معقول اور مدبرانہ تھے۔شیر شاہ نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج کو پاٹنے کی کامیاب کوشش کی اور اس سلسلہ میں سرایوں میں ہر مسافر کے لیے مساویانہ سلوک کا انتظام کیا پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں ہندوؤں کو انتظامیہ میں جگہ دی۔ملک کی ریڑھ کی ہڈی زرعی طبقہ کی حالت سدھاری اور انصاف سے کام لیا۔ سر ولزلے ہیگ نے لکھا ہے کہ 'ہندوستان کے کچھ مورخین نے شیر شاہ سوری سے پورا انصاف نہیں کیا۔انہوں نے شیر شاہ کے حالات ان درباری وقائع نویسوں کی تحریروں سے اخذ کیے ہیں جو مغل سلطنت کے خادم شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی اور مغلوں کی نظر میں شیر شاہ سوری محض ایک باغی افغان سردار تھا۔درحقیقت وہ دہلی کے عظیم ترین حکمرانوں میں نمایاں ترین حیثیت کا حامل تھا۔قطب الدین ایبک سے لیکر اور نگ زیب تک کوئی حکمران ایسا نہیں جسے انتظامی معاملات کا اتنا گہرا علم حاصل ہو جتنا کہ شیر شاہ سوری کو تھا۔'

3.7 شیر شاہ سوری کے جانشین (Successors of Sher Shah Suri)

3.7.1 اسلام شاہ سوری (Islam Shah Suri)

شیر شاہ سوری کی وفات کے وقت اس کے دونوں بیٹے عادل خان اور جلال خان شیر شاہ سوری سے دُور تھے۔شیر شاہ سوری کی وفات کی خبر پاتے ہی جلال خان پہلے دلی پہنچا اور امراء نے اُسے تخت پر بیٹھا دیا۔اس طرح عادل خان کو جسے شیر شاہ نے اپنا موروثی جانشین نامزد کیا تھا، تخت سے محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔جلال خان نے اسلام شاہ یا سلیم شاہ کے نام سے 1536 سے 1553 تک حکومت کی۔اسلام شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے فوج کو دو ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی۔جاگیریں حاصل کر لی گئیں اور ان کے مالکوں کو معاوضہ دے دیا گیا۔کالنجر کے راجہ کو قتل کر دیا گیا۔اسلام شاہ نے شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی سرایوں کے درمیان ہر آدھے کوس کے بعد ایک سرائے بنوائی اور ہر سرائے میں دو گھوڑے اور کچھ پیادہ سپاہی مقرر کیے جو بنگال سے روزانہ کی رپورٹ بادشاہ کو پہنچاتے تھے۔غریب مسافروں کو ہر قسم کی سہولت فراہم کی گئی۔ان سرایوں میں خیرات تقسیم کی جاتی اور شہری اور فوجی حکام کو خصوصی ہدایات جاری کی گئیں اور افسروں کو تاکید کر دی گئی کہ ان ہدایات پر سختی سے عمل کریں۔ فوج میں نظم و ضبط کو مزید سخت کر دیا گیا اور فوج کی تنظیم نو کی گئی۔ سپاہیوں کے لیے اراضیاں مخصوص کی گئیں۔ان چھ سو سواروں جنھوں نے شہزادگی کے دنوں میں اسلام شاہ کی خدمات انجام دی تھیں، انہیں ترقی دے کر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔جاسوسی کا نظام ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اور بادشاہ، ملکی حالات کے ہر لحہ سے باخبر رہتا تھا۔ قانون شکنی کرنے والوں اور

باغیوں کے خلاف فوری اقدام کر کے اُن کی سر کوبی کی جاتی تھی۔ ملک میں جابجا فوجی کیمپ قائم کیے اور فوج تعینات کر دی گئی جو بادشاہ کے اقتدار کے لیے تحفظ کا ذریعہ تھی۔ ہر جمعہ کو عرضیاں وصول کی جاتی تھیں اور بادشاہ منصف کے فرائض انجام دیا تھا۔ اسلام خان کے اندر حکمرانی کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں مگر وہ ضرورت سے زیادہ شکی مزاج تھا اور اُمرا پر مکمل بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اس طرح امراء اس کے خلاف سوچتے رہتے تھے۔ ان امراء میں وہ لوگ شامل تھے جو شیر شاہ کے معتمد خاص تھے اگرچہ اسلام شاہ اپنے دشمنوں کو شکست دینے اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے میں کامیاب رہا لیکن افغان سلطنت ان لڑائیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی۔

خواص خان جو شیر شاہ کا نائب اور معتمدِ خاص تھا عادل خان کو اس کی جاگیریں دلوائیں اور اسے شاہی دربار سے نقصان نہ پہونچائے جانے کا وعدہ کیا۔ لیکن دو ماہ کے اندر ہی اسے گرفتار کر کے اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ اس پر خواص خان بہت ناراض ہوا۔ اس نے عادل خان اور دیگر افغان امرا کے ساتھ مل کر اسلام شاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیکن یہ بغاوت کامیاب نہیں ہو سکی۔ خواص خان روپوش ہو گیا اور زندگی بھر باغی بنا رہا۔ عادل خان بھی فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ اسلام شاہ نے مشتبہ باغیوں کے خلاف تادیبی کاروائیاں کیں۔ قطب خان، زین خان نیازی اور عادل خان کے دیگر حامیوں کو قید کر دیا گیا۔ قید خانے میں ہی ان کی موت ہو گئی۔ اسلام شاہ نے بہت منظم طریقے سے اپنے مخالف افغان امراء کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کر دیا جن میں بڑے چھوٹے سبھی شامل تھے۔ ہیبت خان نیازی پنجاب کا گورنر تھا۔ اسلام شاہ کے دل میں اس کے بارے میں شکوک نے جنم لیا مگر ہیبت خاں نے شجاعت خاں کی طرح بادشاہ کے شکوک رفع کرنے کی کوشش نہیں کی جس کے نتیجے میں بات بڑھ گئی اور ہیبت خان کو بغاوت کرنا پڑی۔ خواص خان نے بھی ہیبت خان کا ساتھ دیا مگر کسی وجہ سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس نااتفاقی کے باعث دونوں شکست کھا گئے۔ اسلام شاہ ان کی ایک ایک حرکت سے باخبر تھا لہٰذا یہ دونوں اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ شجاعت خاں اور اسلام شاہ کے بیچ بھی کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی چنانچہ شجاعت خاں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب اسلام شاہ نے شجاعت خاں کا تعاقب کیا تو شجاعت خاں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کا موقف تھا کہ وہ اپنے محسن اور آقا شیر شاہ سوری کے بیٹے پر تلوار اٹھانا ناجائز سمجھتا ہے۔ اس بات نے اسلام شاہ کو بہت متاثر کیا اور اس نے شجاعت خاں کو معاف کر دیا اور اس کی جاگیر اور منصب اُسے دوبارہ بخش دیا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح ذاتی قوانین نافذ کیے مگر اس میں اپنے باپ کی ان خصوصیات کا فقدان تھا جن کے باعث لوگ اس کے باپ سے محبت کرتے تھے۔ اسلام شاہ نے امراء کو کچلنے کا طریقہ اختیار کیا۔ خواص خاں کے علاوہ تمام مخالف اُمراء کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس نے لوگوں کو خوف وہراس کی فضا میں جینے پر مجبور کیا اور اقتدار کو اپنے آہنی ظالمانہ قوانین کی بندشوں میں جکڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی موت کے بعد یہ بندشیں اس طرح ٹوٹیں کہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

3.7.2 عادل شاہ سوری (Adil Shah Suri)

1553 میں اسلام شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا فیروز تخت پر بیٹھا۔ مگر دو دن میں ہی اس کے ماموں مبارز خاں نے اسے قتل کر دیا۔ مبارز خاں شیر شاہ کے بھائی نظام کا بیٹا تھا۔ اسلام شاہ نے بھی مبارز خاں کی شورش کو محسوس کیا تھا مگر اُس نے اُسے چھیڑا نہ تھا۔ مبارز خان ایک خشک اور بے خبر شخص تھا۔ اس نے محمد عادل کا لقب اختیار کیا مگر لوگ اسے اندھلی (اندھا) کے نام سے یاد کرتے رہے۔ اُسے امور عامہ کی

کوئی پرواہ نہ تھی۔ اسے سماج کا اعلیٰ طبقہ ناپسند کرتا تھا مگر نیچے درجے کے لوگ اُسے چاہتے تھے۔ وہ افغان سلطنت کو زوال پذیر ہونے سے کسی طرح نہ بچا سکا۔ لوگ اس کے حصول تخت کے طریقے کو نہ بھول سکے تھے۔ بقول الفنسٹن 'اس کا کردار اتنا موثر نہ تھا کہ اس کے جرم کا داغ دھو سکتا۔ وہ بے حد بے خبر، عیاش اور گھٹیا لوگوں کا شوقین تھا اور وہ اپنی برائیوں کی طرح امور سلطنت کے لیے بھی غیر موزوں تھا۔'

عادل شاہ نے ہیمو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا جس نے کہ اپنی ذاتی محنت سے ترقی پائی۔ اُس نے بڑی عیاری سے اپنے آقا کا دل جیتا اور بکرماجیت کا لقب اختیار کیا۔ وہ امور سلطنت کے سلسلہ میں اپنی جرات اور وقت کے باعث مشہور ہو گیا۔ اس کی ترقی سے افغان امراء بد ظن ہو گئے۔ اب پانچ افغان اقتدار کی دوڑ میں تھے۔ محمد شاہ عادل کا بہار، جون پور اور ارد گرد کے اضلاع پر قبضہ تھا۔ ابراہیم سوری نے دہلی اور دوآب کا سارا علاقہ سنبھال لیا تھا۔ احمد خاں نے سکندر شاہ کا لقب اختیار کر کے پنجاب میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ محمد خاں نے بنگال میں خود مختاری کا اعلان کیا اور سلطان محمد کا لقب اختیار کیا۔ شجاعت خان کے فرزند دولت خاں نے مالوہ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ سب سے پہلے حکمراں پنجاب نے جدوجہد کا آغازہ کیا۔ اس نے ابراہیم کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا اور دریائے سندھ اور گنگا کی درمیانی سرزمین کا مالک بن گیا۔ 1555 میں صورت حال یہ تھی کہ ابراہیم دہلی اور آگرہ واپس لینے کی جدوجہد کا منصوبہ بنا رہا تھا عادل ابراہیم کو نکال باہر کرنے کے درپے تھا۔ محمد شاہ اپنی حدود سے نکل کر بہار میں عادل پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان دگرگوں اور الجھے ہوئے حالات کا فائدہ اٹھا کہ ہمایوں نے حملہ کیا اور سکندر سوری سے دہلی اور آگرہ چھین لیے۔ اس طرح دوسری افغان حکومت کا خاتمہ ہوا۔

3.8 سوری سلطنت کے زوال کے اسباب (Causes for the Decline of the Sur Empire)

- **نااہل جانشین:** 1553 میں شیر شاہ کی وفات کے بعد اسلام شاہ اور محمد عادل تخت نشین ہوئے مگر وہ افغان حکومت کو اچھی طرح سنبھال نہیں سکے۔ انہوں نے سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اسلام شاہ نے شیر شاہ کے معتمد جرنیلوں جیسے خواص خان و دیگر ممتاز امرا کو بری نظر سے دیکھا اور انھیں عتاب کا شکار بنایا۔ یہی لوگ سلطنت کے ستون تھے اور یہی امراء شیر شاہ کی حکومت کی جان تھے مگر اسلام شاہ نے انھیں بدنام اور رسوا کیا۔ اسلام شاہ کے بعد رہی سہی کسر محمد عادل نے پوری کر دی۔ اس کی عیاشی، بے خبری اور ہیمو بقال کا عروج افغانوں کے لیے غیض و غضب اور حسد کا باعث بنا اور وہ بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ اسلام شاہ نے افغانیوں میں اتحاد پیدا کرنے کی بجائے طبقاتی گروہ پیدا کیے جو بالآخر متحارب گروہوں کی شکل میں بٹ کر باہم دست و گریباں ہو گئے۔
- **لامرکزیت:** شیر شاہ سوری کی قائم کردہ مرکزیت ختم ہو گئی۔ محمد عادل کے دور میں پانچ حکمران بادشاہت کی دوڑ میں تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مرکزیت کا فقدان تھا۔ افغان امرا اور حکمران آپس میں برسرپیکار تھے۔ انہیں اس کا احساس ہی نہیں رہ گیا تھا کہ ہمایوں کسی وقت بھی لوٹ سکتا ہے۔ ہمایوں نے سکندر سوری سے دہلی اور آگرہ چھین لیے اور سوری سلطنت ختم ہو گئی۔ آر۔ پی۔ ترپاٹھی لکھتے ہیں کہ 'حب الوطنی کے جس مقدس جذبے کے سہارے شیر شاہ نے افغانوں کو جوش دلا کر انہیں متحد کیا تھا، اسی جذبہ کو اسلام شاہ کے ہاتھوں اس قدر شدید دھچکا لگا کہ یہ جذبہ عملاً مفقود ہو گیا۔' رفتہ رفتہ افغان قوم منتشر ہو گئی۔
- **کاشتکاروں کا استحصال:** شیر شاہ سوری نے کاشت کاروں اور کاشت کاری کی فلاح و بہبود کے جو انتظامات کیے تھے اُس کے جانشینوں نے

اس کو برقرار رکھنے میں کوتاہی برتی، امراء نے ملازم طبقہ اور کاشت کاروں کو کچلنا اور ان کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ کاشت کار حکومت سے بد ظن ہو گئے۔ کسانوں کے ساتھ عام لوگوں کی زندگی بھی غیر محفوظ ہو گئی۔ اس حالت میں کسی حکومت کا استحکام ممکن نہیں رہتا۔

- **جنگی سرگرمیاں اور اقتصادی بحران:** افغان امراء اور شیر شاہ کے جانشینوں نے شیر شاہ کے فرامین سے قطع تعلق کر لیا۔ شیر شاہ نے جو قلعے دفاعی ضروریات کے لیے بنوائے تھے اس کے جانشینوں کے دور میں یہ شورشوں اور بغاوتوں کے مرکز بن گئے۔ بے جا کارروائیوں اور فضول مہموں پر رقوم ضائع کی جانے لگی۔ ریاستی مالیات پر توجہ نہیں رہی۔ حسابات کا بہتر خیال نہیں رکھا گیا۔ جس کے نتیجہ میں بہت غبن ہوا۔ جنگی سرگرمیوں اور اقتصادی بدحالی کے سبب ریاست کی بنیادیں ہل گئیں۔
- **ظلم واستبداد اور ناانصافیاں:** شیر شاہ سوری کے جانشینوں نے عوام کو قانونی تحفظ فراہم کرنے میں بے توجہی برتی۔ عوام پر بے جا سختی کی گئی، انہیں ہر طرح کی سزائیں دی گئیں، ان کی جان، مال، عزت وآبرو کی کوئی پروانہ رہی۔ ریاست کا افسر شاہی نظام ناکارہ ہو چکا تھا اور دفاعی نظام بالکل ڈھیلا ہو گیا تھا۔ ہر طرف بد نظمی، انتشار اور ظلم وجبر کا ماحول تھا۔ ان حالات میں ریاست کا استحکام ممکن نہیں تھا۔
- **افغان قومیت کا فقدان:** شیر شاہ نے افغان امراء میں قومیت کا جو جذبہ فروغ دے کر انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا۔ شیر شاہ کے بعد اس کے جانشینوں اور امراء نے اس جذبہ سے پہلو تہی اختیار کی۔ ذاتی مفاد کو قومی شاخ پر فوقیت دی جانے لگی۔ مخالفتوں اور آپسی تنازاعات نے زور پکڑا۔ آپسی دشمنی، عناد اور تعصب نے افغان قومیت کے جذبہ کو منتشر کر دیا۔
- **بدکرداری:** افغانوں کا کردار تباہ ہو گیا تھا۔ وہ احترام ذات کے جذبہ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہیمو بقال نے انھیں بزدلی کا طعنہ دیا تو وہ اس توہین کو خوش گوار سمجھ کر برداشت کر گئے۔ اخلاقی بے راہ روی میں محمد عادل نے ساری حدیں پار کر دی تھیں۔ ایسی قومیں ملک وملت کی تعمیر نہیں کر سکتیں۔ اخلاقی اصولوں سے روگردانی کسی بھی مستحکم سلطنت کی ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔

3.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

شیر شاہ 1472ء میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام فرید خان تھا۔ اس کے والد حسن خاں افغانستان سے ہندوستان آئے اور پنجاب میں ہستناپور کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ فرید اسی مقام پر پیدا ہوا تھا۔ فرید حسن خاں کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا۔ حسن خاں اپنی چوتھی بیوی پر فریفتہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے باپ کی مناسب توجہ سے محروم رہا 22 سال کی عمر میں فرید کی اس کے والد سے نااتفاقی ہوئی تو وہ جونپور چلا گیا اور وہاں جمال خاں کے ساتھ رہنے لگا جو کسی زمانے میں اس کے باپ کا آقا تھا۔ یہاں فرید نے عربی، فارسی اور ماضی کے عظیم بادشاہوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا۔ جمال خاں نے اسے اس کے والد کی جاگیروں سہسرام اور خواص پور کا نائب مقرر کیا۔ فرید نے جاگیر کا انتظام انتہائی محنت اور لگن سے سنبھالا۔ 1497ء سے 1518ء تک جاگیر سرسبز اور شاداب ہو گئی۔ اپنی سوتیلی ماں اور بھائیوں کی حسد اور دشمنی کی وجہ سے اپنے باپ کی ہمدردی اور نائب جاگیر کے عہدہ سے محروم ہونا پڑا۔ دولت خاں لودی کی مدد سے آگرہ میں ابراہیم لودی کی ملازمت کی۔ 1520ء میں حسن خاں کا انتقال کے بعد اس کی جاگیر ملی۔ فرید کے سوتیلے بھائی سلیمان نے جاگیر چھیننے کی کوشش کی۔ فرید نے ابراہیم لودی کا نائب بہار خاں لوہانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دور میں فرید نے تلوار کے ایک ہی وار سے شیر کو مار ڈالا۔ اس کی اس بہادری پر بہار خاں لوہانی نے اسے شیر

خاں کا خطاب دیا۔فرید 1527ء اور 1528ء کے درمیان 15 مہینوں تک بابر کی ملازمت میں بھی رہا۔1528ء میں سلطان محمد کے انتقال کے بعد جلال خاں اپنے باپ کی جگہ جنوبی بہار کا حکمراں بن گیا۔اس کے نائب کی حیثیت سے فرید جنوبی بہار کا اصلی حکمران بنا۔1529ء میں شیر خاں نے بنگال کے حکمراں نصرت خاں کو شکست دے دی جس نے شیر خاں کے علاقہ پر حملہ کیا تھا۔جنوبی بہار کے لوہانی امراء اور جلال خاں سازشوں کو ناکام بنا کر 1530ء میں جنوبی بہار کا حکمران بنا اور شیر شاہ کا خطاب اختیار کیا۔

شیر شاہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کرتا تھا۔اس نے ترکوں اور افغانوں کی مذہبی پالیسی کو جاری رکھا۔اپنے سابقہ حکمرانوں کی طرح اس نے اپنی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ملازم رکھا،اور ہندوؤں کے تعلق سے کسی قسم کے تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سہسرام کے مقام پر اس کی زندگی میں تعمیر کیے گئے مقبرے کے فن تعمیر میں ہندی اور سینٹرل ایشین خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس کے وسیع المشرب ہونے کی دلیل ہے شیر شاہ کالنجر کے قلعہ کے قریب ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا دوسرا بیٹا اسلام شاہ تخت نشین ہوا۔اس نے 1553 تک حکومت کی۔اسلام شاہ ایک قابل حکمران اور حوصلہ مند سپہ سالار تھا لیکن اس کا زیادہ تر وقت اپنے بھائیوں اور افغان سرداروں کی بغاوتوں کو دبانے میں برباد ہو گیا۔خاندانی انتشار، اندرونی بغاوتوں اور مغلوں کے مسلسل خطرے نے اسلام شاہ کو سلطنت کی توسیع کی طرف دھیان دینے کا موقعہ نہیں دیا۔ عین جوانی میں ہی اس کی وفات ہو گئی۔جس کے نتیجہ میں جانشینی کے مسئلہ پر خانہ جنگی چھڑ گئی۔اس صورتِ حال سے ہمایوں نے فائدہ اٹھایا اور ہندوستان میں دوبارہ مغل سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔1555 میں دو اہم معرکے اور فوجی کاروائیاں ہوئیں۔جن میں افغان فوجوں کو شکست ہوئی اور ہمایوں نے دلی اور آگرہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔اس طرح ہندوسان سے سوری خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

3.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرائے	:	مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ
شحنہ	:	کوتوال، داروغہ، نظم و نسق عامہ کا ایک اعلیٰ افسر
ڈاک چوکی	:	اطلاعات پہونچانے کے ادارے
ہرکارہ	:	اطلاعات، خبر اور احکامات پہونچانے والا کارندہ
جاگیردار	:	عہدِ وسطیٰ میں فوجی خدمات کے عوض دی جانے والی آراضی کا مالک
داغ	:	گھوڑوں کو داغ لگا کر نشان زد کرنا
سرکار	:	عہدِ وسطیٰ میں ایک انتظامی اکائی
شق دار	:	شق یعنی ضلع کا انتظامی عہدیدار

3.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. شیر شاہ سوری کے اجداد کہاں سے ہندوستان آئے تھے۔
2. شیر شاہ سوری کے والد کا کیا نام تھا۔
3. شیر شاہ سوری کا اصل نام کیا تھا۔
4. فرید خان کو شیر خان کا خطاب کس نے دیا تھا۔
5. ہمایوں سے شیر شاہ کا پہلا مقابلہ کہاں ہوا تھا۔
6. گرانڈ ٹرنک روڈ کس نے بنوائی تھی۔
7. شیر شاہ سوری اپنی کس مہم میں زخمی ہوا تھا۔
8. شیر شاہ کا انتقال کب ہوا۔
9. شیر شاہ سوری نے اپنا جانشین کسے نامزد کیا تھا۔
10. شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین کون بنا تھا۔

3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. شیر شاہ سوری کے خاندانی حالات بیان کریں۔
2. شیر شاہ سوری ابتدائی مسائل پر روشنی ڈالیں۔
3. ہمایوں کے خلاف شیر شاہ سوری کی جدوجہد کا حال بیان کریں۔
4. راجپوتوں کے خلاف شیر شاہ سوری کی کاروائی کا جائزہ لیں۔
5. اسلام شاہ سوری کے بارے میں ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔

3.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. شیر شاہ سوری کے ابتدائی حالات کو تفصیل سے بیان کریں۔
2. شیر شاہ سوری کی فوجی کارروائیوں اور فتوحات کا جائزہ لیں۔
3. سوری خاندان کے زوال کے اسباب و وجوہات پر روشنی ڈالیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

3.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. عباس خان سروانی : تاریخِ شیر شاہی، مترجم مظہر علی خان ولا، سملان اکاڈمی حق نشان، کراچی۔
2. رزق اللہ مشتاقی : واقعاتِ مشتاقی، رام پور، رضا لائبریری، رامپور، یوپی۔
3. احمد یادگار : تاریخِ سلاطینِ افاغنہ، مترجم سید نیازی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، پاکستان۔
4. ودیا بھاسکر : شیر شاہ سوری، مترجم ممتاز مرزا، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔
5. صفدر حیات صفدر : عہدِ مغلیہ مع دستاویزات، نیو بک پیلیس، اردو بازار، لاہور۔
6. آر پی ترپاٹھی : سلطنتِ مغلیہ کا عروج و زوال۔
7. ستیش چندرا : عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان۔
8. خواجہ نعمت اللہ ہروی: تاریخِ خان جہانی و مخزنِ افغانی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، پاکستان۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 4۔ شیر شاہ اور اس کا نظم ونسق

(Shershah and His Administration)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 فرید خان/شیر شاہ

4.2.1 ابتدائی حالات زندگی

4.2.2 شیر شاہ بطور حکمراں

4.2.3 سلطنت کی وسعت

4.3 سور انتظامیہ

4.3.1 مرکزی حکومت

4.3.2 صوبائی نظم ونسق

4.3.3 زمینی مالگزاری انتظامیہ

4.3.4 عدل وانصاف

4.3.5 دیگر انتظامی اصلاحات

4.4 اکتسابی نتائج

4.5 کلیدی الفاظ

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

4.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سور خاندان کے مقام کا تعین، رشبروک ولیمس (Rushbrooke Williams) نے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا ہے۔ 'یہ تیموری خاندان کی غیر معمولی خوش قسمتی تھی کہ آخرکار وہ اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، ایسی وراثت جسے افغان شیر شاہ نے مضبوط کیا تھا۔ شیر شاہ ایسا منتظم تھا جس میں تخلیقی صلاحیت تھی اور جس نے انجانے میں ہی مغلوں کے لیے نظم و نسق کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کر دیا جسے مغل خود بنانے کی استعداد نہیں رکھتے تھے، بھلے ہی انہوں نے بادشاہت کے ایک نئے معیار کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔'

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- فرید خان کے شیر شاہ بننے تک کے سفر کو جان سکیں گے۔
- ایک حکمراں کے طور پر شیر شاہ کی شخصیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سور انتظامیہ میں مرکزی حکومت اور صوبائی نظم و نسق کے بارے میں جان سکیں گے۔
- سور مالگزاری انتظامیہ اور مالگزاری کے ادائیگی کے طریقوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- شیر شاہ کے عدل و انصاف اور دیگر انتظامی اصلاحات کے بارے میں جان سکیں گے۔

4.2 فرید خان/شیر شاہ (Farid Khan)

تقریباً 500 سال پہلے 1528 کا واقعہ ہے۔ ہندوستان کی راجدھانی آگرہ میں ہر طرف گہما گہمی کا ماحول ہے۔ مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر چندیری فتح کرکے راجدھانی لوٹ آئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کو ہندوستان میں مستحکم بنا چکے ہیں۔ جشن فتح کے ساتھ شاہی ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ضیافت میں مرغ، مچھلی، ہرن کا گوشت، کباب، پلاؤ، نان کے علاوہ دستر خوان پر دیگر پھلوں کے ساتھ ماہیچے (ایک قسم کا پھل) بھی دستر خوان پر رکھے گئے ہیں۔ بابر بھی اپنے امیروں اور وزیروں کے ساتھ وہاں موجود ہیں۔ اچانک ان کی نگاہ ایک افغان نوجوان پر پڑتی ہے جو ماہیچے کو اپنے انداز میں چھری کانٹے کے بجائے خنجر نکال کر اس کے ٹکڑے کر کے آرام سے کھا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بابر کے دل میں ایک طرح کی تشویش پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے پاس موجود اپنے وزیر اعظم میر خلیفہ سے کہتے ہیں کہ اس شخص کے آثار سے ایسا لگتا ہے کہ یہ بدامنی کا سبب بنے گا، 'اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔' میر خلیفہ بادشاہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کی گرفتاری مصلحت کے خلاف ثابت ہوگی اور افغان سرداروں میں یہ تاثر جائے گا کہ مغل، افغانوں سے دلی بغض و عناد رکھتے ہیں۔ اس افغان نوجوان کی گرفتاری تو نہیں ہوتی لیکن بابر بے چین ہو جاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ اس پر کڑی نظر رکھی جائے اور اس کے احوال سے شہنشاہ کو باخبر رکھا جائے کیونکہ 'وہ بہت چالاک آدمی ہے اور اس کی پیشانی پر حکومت کے آثار نمایاں ہیں'۔۔۔ 'میں نے کتنے ہی افغان سورما دیکھے ہیں

لیکن کسی نے بھی مجھے پہلی ملاقات میں اتنا متاثر نہیں کیا جتنا اس شخص نے کیا ہے۔اس کے جاہ وجلال کے آثار ہمارے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔‘ادھر یہ افغان نوجوان بادشاہ اور وزیر کو اس طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور باہم بات چیت کرتے دیکھتا ہے۔وہ دوری کے سبب ان کی باتیں تو نہیں سن پاتا لیکن اپنی ذہانت سے سمجھ لیتا ہے کہ اسی کا تذکرہ چل رہا ہے اور بادشاہ کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔چنانچہ تیزی سے کھانا کھاکر وہ مغل شاہی کیمپ سے اور پھر راجدھانی آگرہ سے ہی نکل جاتا ہے۔یہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ مغلوں کا سب سے بڑا دشمن اور ہندوستان میں دوسرے مغل بادشاہ ہمایوں کی حکومت کا خاتمہ کرکے اسے دربدر بھٹکنے پر مجبور کردینے والا، شیر شاہ سوری تھا جس نے سلطنت سور کی بنیاد ڈالی۔بابر کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور دس سال بعد تو وہ حقیقت میں بدل گیا جب شیر شاہ سوری نے بابر کے جانشین اور مغل حکمران ہمایوں کو ہندوستان سے باہر جانے پر مجبور کردیا۔شیر شاہ سوری نے شمالی ہندوستان پر صرف پانچ سال (17 مئی 1540 سے 22 مئی 1545 تک) حکومت کی لیکن اس نے تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا جس میں اس کا حسن انتظام ایک ایسا روشن مینارہ ثابت ہوا جس سے بعد کے حکمرانوں بطور خاص مغل بادشاہ اکبر نے بیحد استفادہ کیا اور انتظام مملکت میں اس کے نمونے پر عمل کیا۔اس کا چلایا ہوا روپیہ جدید دور میں بھی ایک معیاری سکہ ثابت ہوا جس کا وزن 178 گرین تھا۔روپیہ تو پہلے بھی رائج تھا لیکن اس کی مقدار طے نہ تھی۔

4.2.1 ابتدائی حالات زندگی (Early Life)

شیر شاہ کی پیدائش کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مانتے ہیں کہ وہ 1486 میں ہریانہ کے حصار میں پیدا ہوا۔ اس کا حقیقی نام فرید خان تھا اور وہ سہسرام، حاجی پور اور خواص پور کے جاگیردار حسن خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔حسن خان کا باپ ابراہیم خان، بہلول لودھی کے دور میں ہندوستان آیا تھا اور یہ جاگیر حاصل کی تھی۔فرید خان کے والد حسن خان نے کالکاپور کے مسند اعلیٰ اور بہلول لودھی کے منظور نظر وزیر عمر خان سروانی کے یہاں ملازمت اختیار کی جس نے شاہ آباد پرگنے میں کئی گاؤں حسن خان کو جاگیر کے طور پر حوالے کیے۔ سکندر لودھی کے دور میں جب جمال خان کو عظمت حاصل ہوئی تو اس نے حسن خان کو اس کے والد ابراہیم خان کی جاگیر کے علاوہ 500 گھڑ سواروں کا افسر مقرر کیا اور بنارس کے پاس سہسرام، حاجی پور اور ٹانڈہ کی جاگیریں اس کی ملکیت میں دیں۔فرید کو اس کے والد حسن خان نے اپنی جاگیر کا انتظام سونپا۔فرید کے حسن انتظام کی جب شہرت ہوئی تو باپ تو خوش ہو لیکن سوتیلی ماں حسد میں جل بھن گئی۔فرید خان نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فرائض سے سبکدوشی اختیار کی اور وہاں سے نکل گیا۔کچھ دن جونپور رہ کر تعلیم حاصل کی اور اسی درمیان آگرہ جاکر لودھی سلطان سے اپنے باپ سے اپنا حصہ دلوانے کی عرضداشت پیش کی جسے اس نے نہایت برہمی کے ساتھ ٹھکرادیا اور کہا کہ کیسا فریادی ہے کہ اپنے باپ کے خلاف شکایت کرتا ہے۔حالانکہ باپ کی موت کے بعد اپنے بھائی نظام شاہ کی مدد سے باپ کی وراثت اسے حاصل ہو گئی اور لودی سلطان نے بھی اس کی توثیق کردی۔

اس وقت ہندوستان میں ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔ابراہیم لودھی کے مرکزیت پسند اور سخت رویے کی وجہ سے متعدد علاقوں کے امرا باغی ہو گئے۔بہار میں دریا خان لوحانی نے اپنی خود مختار حکومت قائم کی۔دریا خان لوحانی کے انتقال کے بعد امراء نے اس کے بیٹے بہار خان لوحانی کو حکمراں مقرر کیا گیا۔فرید خان کے پرگنے بہار خان کی سلطنت سے متصل تھے اس لیے اس نے بہار خان کا ساتھی بننے میں اپنی

حفاظت سمجھی کیونکہ چونڈ کا جاگیر دار سردار محمد خان اس کے سوتیلے بھائی سلیمان کی حمایت کر رہا تھا۔ جلد ہی بہار خان کو فرید خان کی لیاقت، محنت، وفاداری اور جاںثاری کی وجہ سے اس پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان تعلقات مضبوط ہوتے چلے گئے۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودھی کی بڑی فوج کی بدترین شکست کا سن کر بہار خان نے سلطان محمد کا لقب اختیار کر کے بہار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا سکہ جاری کیا۔ انہیں دنوں ایک بار بہار خان، فرید خان کے ساتھ شکار پر گیا۔ جنگل میں گھومنے کے دوران اچانک ایک شیر نے اس پر حملہ کر دیا۔ فرید لپک کر شیر اور بہار خان کے درمیان آگیا۔ یہ دیکھ کر شیر نے فرید پر حملہ کر دیا۔ فرید نے شیر کا وار بچا کر اپنی تلوار سے ایسا نپا تلا وار کیا کہ ایک ہی ضرب میں شیر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سب لوگ فرید خان کی بہادری سے دنگ رہ گئے۔ بہار خان فرید خان کی اس بہادری اور جاں نثاری سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے شیر خان کا خطاب دے کر اپنے بیٹے کا استاد اور نگراں مقرر کر دیا۔ اس دن سے فرید خان کو شیر خان کے نام سے ہی جانا جانے لگا۔

بہار خان کی بادشاہت کے اعلان اور شکست خوردہ افغانوں کے اس کے ارد گرد اکٹھا ہو جانے کا سن کر بابر نے اس کی سرکوبی کے لیے مشرقی مہم کا ارادہ کیا تو ہمایوں نے اس مہم کے لیے اپنا نام پیش کر دیا۔ بابر نے بھی ہمایوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ ہمایوں نے باغی افغانوں کی اچھی طرح گوشمالی کی۔ ادھر شیر خان کے تعلقات بہار خان سے بگڑ گئے کیونکہ وہ حاسد امرا کے بہکاوے میں آکر شیر خان سے بدظن ہو گیا۔ اس نے اپنی جاگیر اپنے سوتیلے بھائیوں کے حوالے کر کے مغل گورنر جنید برلاس کی امان کی یقین دہانی کے بعد اس کے پاس جونپور چلا گیا۔ اس نے تقریباً سوا سال تک مغل فوج میں خدمات انجام دیں۔ 16 مارچ سنہ 1527 میں خانوا (کنوا) کی جنگ کے بعد جنید برلاس کے ساتھ ہی شیر خان بابر کے دربار میں پہنچا جہاں جنید اور وزیر اعظم کے کہنے پر بابر بادشاہ نے شیر خان کو سہسرام میں اس کی جاگیر عطا کی۔ لیکن بابر کے دسترخوان پر شیر خان کی مذکورہ واقعے نے بابر کے دل میں شک پیدا کر دیا۔

اکبر کے درباری مورخ عباس خان سروانی کی شیر شاہ سے رشتہ داری تھی۔ اکبر نے اسے افغانوں کی تاریخ نویسی کا کام سونپا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ شیر شاہ شروع سے ہی عالی ہمت اور بلند حوصلے والا تھا اور مغلوں سے حکومت چھیننے کا خواب دیکھتا تھا جبکہ دوسرے افغان اسے سرپھرا اور شیخی باز سمجھتے تھے۔ شروانی، شیر شاہ کو سکندر ثانی کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ 'چندیری کی مہم میں سکندر ثانی (شیر شاہ)، ظل سبحانی بابر بادشاہ کے لشکر کے ساتھ تھا۔ شیخ ابراہیم سروانی نے مجھ سے آکر کہا آؤ شیر خان سور کے پاس چلیں۔ وہ اپنے مرتبے سے بڑھ کر ایسی باتیں زیادہ کرتا ہے کہ لوگ ہنستے ہیں۔ ہم سوار ہو کر اس کے ڈیرے میں گئے۔ باتوں باتوں میں شیخ ابراہیم نے کہا مشکل ہے کہ ملک ہندوستان، پھر افغانوں کے ہاتھ آئے اور مغل ہندوستان سے خارج ہوں۔ شیر خان نے شیخ محمد کو کہا، گواہ رہیو کہ میرے اور شیخ ابراہیم کے درمیان جو بات ہوتی ہے، اگر میرے طالع نے یاوری کی تو تھوڑے دنوں میں مغلوں کو ہند سے نکال دوں گا۔ اس لیے کہ مغل تلوار کی لڑائی میں افغانوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپس کی مخالفت کے سبب افغانوں نے ہند کا ملک اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ جب سے میں مغلوں میں آیا اور ان کی لڑائی کا معلوم کیا تو پایا کہ ان کے پاؤں لڑائی میں نہیں ٹھہرتے اور بادشاہ ان کا اعلیٰ نسبی اور بلند مرتبے کے باعث اپنی ذات سے تدبیر ملک میں متوجہ نہیں ہوتا اور امور مملکت کی مہمات کو اپنے امرا اور ارکان دولت کو سونپ دیتا ہے اور ان کے قول و فعل پر اعتماد کرتا ہے اور دیہی رعیت، سپاہی اور زمیندار جو حرام

خور ہیں ان کے برآمد کار کے لیے دام رشوت میں گرفتار ہیں۔ بھلا برا سب پیسے کے زور سے اپنے کام نکالتا ہے۔ زر کی طمع کے سبب سے دوست و دشمن میں آپ فرق نہیں کرتے۔ اگر اقبال نے یاوری کی تو شیخ جی دیکھو گے یا سنو گے کہ افغانوں کو اس طرح قابو میں کروں گا کہ متفرق نہ ہونے دوں۔' شیر خان کی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ اس سے قبل جب پہلی بار اسے اپنے پرگنے کا انتظام سونپا گیا تھا تو اس نے دوٹوک رعایا کی خاطر زمین دار اور پٹواریوں پر لگام ڈالی تھی۔ ادھر بادشاہ بابر کے انتقال کے بعد شیر خان افغانوں کو یکجا کرنے اور اپنی طاقت کو بڑھانے میں لگ گیا۔ اس نے پہلی اہم جنگ بنگال کے سلطان محمود کے خلاف لڑی اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ میں شیر شاہ نے منفرد جنگی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ بنگال پر شیر شاہ کے قبضے نے ہمایوں کو خواب غفلت سے جگایا جو کہ بابر کے بعد ہندوستان کا حکمراں بنا۔ شیر شاہ نے چنار کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس حکمراں لاڈ ملکہ سے شادی کر لی۔ اس طرح چنار کا قلعہ اور اس میں موجود لودیوں کا خزانہ شیر شاہ کے ہاتھ میں آگیا جس سے اسے اپنی فوج کو بڑھانے اور مزید منظم کرنے کا موقع ملا۔

ہمایوں کو گجرات کے بہادر شاہ کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ شیر شاہ پر آغاز میں پوری توجہ نہ دے سکا۔ اسے اپنے بھائیوں سے بھی کسی طرح کی مدد حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے پہلی بار جب چنار کے گرد گھیرا ڈالا تو خبر ملی کہ گجرات کا بہادر شاہ مغلوں پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ مجبوراً اسے شیر خان سے صلح کرنی پڑی۔ بہادر شاہ کا معاملہ نپٹانے کے بعد وہ دوبارہ شیر خان کی طرف بڑھا لیکن شیر خان نے مقابلہ کرنے کے بجائے اسے بنگال کے دارالحکومت گوڑ جانے دیا۔ اس مہم میں ہمایوں کا بہت سرمایہ، سپاہی اور وقت ضائع ہو گیا اور وہ برسات کی وجہ سے کئی مہینے بنگال میں پھنسا رہا۔ اس نے آگرہ سے کمک منگوائی جو کہ اسے نہیں ملی۔ 1539 میں واپسی کے سفر میں کرمناساندی کے کنارے چوسہ کے مقام پر اس کا تازہ دم افغان فوجوں سے سامنا ہوا۔ یہاں اسے زندگی کی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ندی عبور کرتے ہوئے اس کی جان ایک بھشتی نے بچائی۔ 1540 میں قنوج کے مقام پر وہ تیاری کے ساتھ شیر خان کے مقابلے پر آیا۔ یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جس میں شیر خان کامیاب ہوا اور ہمایوں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس کے بعد شیر خان نے شیر شاہ کے لقب سے ہندوستان پر اپنی حکومت کا آغاز کیا۔

4.2.2 شیر شاہ بطور حکمراں (Sher Shah as a Ruler)

کسی مستند معاصر تاریخی کام کی عدم موجودگی میں، اکبر کے دور میں عباس خان سروانی کی تحریر کردہ تاریخ شیر شاہی کو ریاستی تاریخ سمجھا جانا چاہیے۔ ابتدا میں اس نے غالباً تحفہ اکبر شاہی لکھنے کے لیے منصوبہ بنایا جس کے تین ابواب تھے لیکن شیر شاہ اور اسلام شاہ سے متعلق صرف پہلے دو ابواب ملے ہیں۔ شیر شاہ کی جو عوامی شبیہ اب تک بنی ہے اس کا سہرا صرف عباس خان کے سر ہے۔ جدید دور کے مورخین جیسے کے۔ آر۔ قانون گو (K. R. Kanungo) نے بھی اسی شبیہ کو اپنے مطالعہ میں 'شیر شاہ اور اس کا دور' کے عنوان سے قبول کیا ہے۔ پرماتما سرن (P. Saran) اور کچھ دوسرے دانشوروں نے مؤثر طریقے سے قانون گو کے خیالات پر سوال اٹھائے ہیں۔ شیر شاہ کا معروضی جائزہ اسی وقت ممکن ہو گا جب ہم یہاں عباس خان اور ان کی تخلیق کا مختصر مگر تنقیدی جائزہ لیں گے۔

تصویر 4.1۔ شیر شاہ کی سلطنت(1545-1540ء)

(Source: https://www.mapsofindia.com/history/sher-shah-suri-empire.html)

عباس خان کے کام کی اصل بنیاد یہ تھی کہ افغانوں کو میدان جنگ میں مغلوں سے زیادہ فوقیت حاصل تھی اور افغانوں میں اتحاد کا فقدان ہی پہلی افغان سلطنت کے خاتمے کا سبب بنا۔ اس لیے افغانوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور شیر شاہ کی طرف سے دوسری افغان سلطنت کا قیام ایک بڑی کامیابی تھی۔ افغانوں کی ابتدائی ناکامیوں، شیر شاہ کی کامیابی اور شیر شاہ کے جانشینوں کی ناکامیوں سے متاثر ہو کر عباس خان نے شیر شاہ کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی۔ شیر شاہ کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظامی ڈھانچے کی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے ایک مثالی نظام قرار دیا ہے۔ اس نے نہ صرف اصل تفصیلات کو اپنے متعصبانہ نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ شاید افغان دولت مشترکہ اور اس میں سلطان کے کردار کو بھی اپنے مثالی اور خیالی خاکے میں چسپاں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے عباس خان

نے اپنی لمبی لمبی تقریروں اور الفاظ کو اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ وہ سلطان کو بہت سے کرداروں والی ایک جامع شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے: افغانوں کے سرپرست کے طور پر، اتحاد، احیاء نو اور امید کی علامت کے طور پر، ایک غیر معمولی قائد کے طور پر، ایک ہوشیار اور سخت جرنیل کے طور پر اور ایک تجربہ کار عوامی حکمران کے طور پر۔

اس کے نزدیک حکمران کی رہنمائی کے لیے درج ذیل چیزیں ضروری ہیں۔

- عدل وانصاف: 'حکومت ظالموں سے عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا ذریعہ ہے اور سرکاری ملازمین کے ظلم سے تحفظ کی بنیاد ہے۔'
- اس کی فکر کا سب سے بڑا موضوع اس کی رعایا یا عوام تھے۔ عوام ہی معاشی نظام کی بنیاد تھے، اس لیے اسے امیر طبقے اور سرکاری عاملوں دونوں کی لوٹ مار سے بچانا ضروری تھا۔
- افغانوں کے رہنما ہونے کے ناطے سلطان کا فرض تھا کہ وہ افغانوں کو تحفظ فراہم کرے، ان کی خدمات ریاست کے انتظام کے لیے استعمال کرے۔ لیکن اقتدار اعلیٰ خدا کا تحفہ ہے، اس لیے انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اسے سلطان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے۔
- منصب اور مقام کی بلندی اور وقار، حکمران کا وقت اور توانائی خرچ کرتی ہے۔ 'اعلیٰ ترین کو ہمیشہ متحرک رہنا چاہیے۔'

واضح رہے کہ عباس خان کے یہ تمام بیانات اس کے اپنے دور کے ہیں اور یہ زمانہ شہری ہویں صدی کا آخری دور تھا۔ شیر شاہ کے بارے میں قانون گو کے خیالات، عباس خان کے تعصبات سے بہت زیادہ متاثر رہے، اور عباس خان کے تعصبات شیر شاہ اور افغان ریاستی وفاق کے حق میں تھے۔ تاریخ میں شیر شاہ کے مقام کے بارے میں، قانونگو لکھتے ہیں، 'تاریخی دستاویزات کی کمی کے باوجود، جو بھی مواد دستیاب ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی سلطنت جن نظریات پر مبنی تھی، ان کا ماخذ شیر شاہ کے نظریات میں پایا جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے حکمرانوں میں، شیر شاہ واحد حکمراں تھا جو ایک نئے ہندوستان کے لیے نمونہ عمل بن سکتا تھا۔ ایک ایسا ہندوستان جو ہندو اور مسلمان دونوں کا ہو اور جس میں دونوں کے درمیان دلی اتحاد قائم رہے۔' وہ ایک قومیت کے معمار کے طور پر شیر شاہ کی شبیہہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں: 'شیر شاہ اور اکبر کے درمیان یہ تنازعہ ہو سکتا ہے کہ متضاد عقائد کے لوگوں کے درمیان میل ملاپ کروا کر ایک طاقتور ہندوستانی قوم کی تعمیر کی کوشش کرنے والا پہلا شخص کون تھا۔ شیر شاہ نے ملک کو ایک مضبوط، منصفانہ اور دانشمندانہ حکومت دی، ہندوؤں کی سیاسی بحالی اور معاشی خوشحالی کے لیے کام کیا اور دونوں برادریوں کو مل کر کام کرنے اور بیرونی اتحاد کی حفاظت پر مجبور کیا۔ اس نے نوزائیدہ قومیت کی ترقی کے بنیادی تقاضے پورے کیے، یعنی اس نے زمین کو ہموار کیا اور بیج بو یا۔'

شیر شاہ کو اس کے صحیح تاریخی تناظر میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ درج بالا بیانات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیر شاہ جب اڑسٹھ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا تو وہ ایک تجربہ کار اور ماہر منتظم تھا۔ اس میں فرض منصبی سے گہرا لگاؤ موجود تھا۔ وہ غیر معمولی توانائی سے بھرا ہوا تھا اور اپنے روزمرہ کے معمولات کا بیشتر حصہ انتظامی امور کی دیکھ بھال میں صرف کرتا تھا۔ وہ بابر

اور ہمایوں کے رائج کردہ نظاموں کا بہت بڑے ناقد تھااور جب بھی اسے موقع ملا وہ پوری تندہی سے اس کی اصلاح کرنے میں لگ جاتا۔ شیر شاہ کو نہ صرف اکبر کے پیش رو ایک سلطنت قائم کرنے والے اور منتظم کے طور پر جانا جاتا ہے بلکہ اسے اکبر سے زیادہ تخلیقی ذہانت کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے۔ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اگر اس کے پاس زیادہ وقت ہوتا تو شاید اس نے اپنا شاہی خاندان قائم کر دیا ہوتا اور تب عظیم مغلوں کو ہندوستانی تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔

شیر شاہ ایک تجربہ کار اور ماہر منتظم تھا۔ اس میں فرض کا احساس اور غیر معمولی توانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوی تھی۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ ماننا کہ وہ ایسے انتظامی اصولوں کے پیش رو تھے جو نہ صرف مغلیہ نظم و نسق کی بنیاد بنے بلکہ جنہیں انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنایا، اس کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے۔ تفصیلی بیانات کی عدم موجودگی میں بھی یہ اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے کہ شیر شاہ کا مرکزی نظم و نسق پہلے کے نمونوں پر مبنی تھا۔ اس کا ذاتی مطلق العنان نظام اور مرکزی ریاست کی تشکیل۔ یہ دونوں تنظیمی امور اس عمل کا حصہ تھے جسے سکندر لودی اور ابراہیم لودی نے شروع کیا تھا۔ یہی نہیں، لودیوں کا نظام بھی بلبن اور علاؤالدین خلجی کے بنائے ہوئے اداروں کی پیداوار تھا۔

اقتدار حسین صدیقی (Iqtidar Hussain Siddiqui) کے مطابق بہلول لودی پہلا مطلق العنان افغان حکمران تھا۔ شیر شاہ نے وکیل جیسا کوئی نیا ادارہ قائم نہیں کیا۔ ایسا نیا ادارہ اکبر کے دور میں قائم ہوا۔ بنگال کو چھوڑ کر، دیگر جگہوں پر شیر شاہ کے ذریعے عمل میں لائی گئی انتظامی تقسیم اس کے پیشروؤں کے نمونوں پر مبنی تھی۔ کوئی نیا صوبہ نہیں بنایا گیا تھا۔ مقامی ذیلی صوبوں کا قیام، شہری انتظامیہ اور زمینی مالگزاری انتظامیہ وغیرہ تمام نظام اپنے سابقہ موجودہ نظاموں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ گھوڑوں کو داغنے (داغ) اور فوجیوں کی جسمانی تفصیلات (چہرہ) رکھنے کے طریقے بھی رائج تھے۔ لیکن شیر شاہ ایک عظیم مصلح تھا، اس لیے اس نے موجودہ اداروں میں بہت سی اصلاحات کیں اور انہیں مزید موثر بنایا۔ انہی کاموں سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

4.2.3 سلطنت کی وسعت (Extent of Empire)

شیر شاہ نے مغل بادشاہوں بابر اور ہمایوں سے بھی بڑے علاقے پر حکومت کی۔ اس کی سلطنت مشرق میں سنارگاؤں سے شمال مغرب میں گکھڑ کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مغربی سرحدی خط شمال میں جہلم کے کنارے بالناتھ جوگی اور جنوب مغرب میں 100 میل دور واقع خوشاب کو جوڑتا تھا اور پھر جہلم کے پار سندھ کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے بھکر تک چلا جاتا تھا۔ افغان سرداروں نے سندھ کو شیر شاہ کے حوالے کر دیا تھا لیکن جیسلمیر کا صحرائی علاقہ اور بیکانیر اور جودھ پور کے کچھ حصے سور حکمرانی کے دائرہ اختیار سے باہر ہی رہے۔ جنوب میں اس کا سلطنت وندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ پورا راجپوتانہ، مالوا اور کالنجر اس کے زیر تسلط تھے۔ اس کے جانشین، سلطنت کی حدود کو اس سے زیادہ نہیں بڑھا سکے۔ شیر شاہ کی سلطنت کی وسعت، شیر شاہ کے جاری کردہ سکوں اور عباس شروانی کی پیش کردہ تفصیلات سے ثابت ہوتی ہے۔

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

تصویر 4.2۔ شیر شاہ سوری کے زمانے کی سرائے غازیہ آباد میں گرانڈ ٹرنک روڈ کے پاس دریافت ہوئی ہے۔ بشکریہ جزن
(https://www.bbc.com/urdu/regional-57205295)

اتنے وسیع و عریض علاقے کو منظم کرنا کسی بھی حکمراں کے لیے ایک انتھک کام تھا۔ عباس سروانی نے شیر شاہ کے روزمرہ کے معمولات کے بارے میں لکھا ہے: 'عزت و وقار اور مقام و مرتبہ کے ساتھ جڑی ہوئی اس کی عظمت کی وجہ سے، اپنی ریاست کے کسی کام کو کبھی چھوٹا یا غیر اہم نہیں سمجھتا اور اسے اپنے وزیروں کے غیر ضروری اعتماد پر نہیں چھوڑتا۔' سروانی سے ہمیں معلوم ہوا کہ شیر شاہ نے رات اور دن دونوں کو مختلف کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا۔ اپنے محکموں کے سربراہوں سے ملنے کے کام سے آغاز کر کے اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں سے آنے والی عرضیوں اور خبروں کو سننے، فوجوں کا معائنہ کرنے، گھوڑوں کو داغنے، لوگوں کی وضاحتی فہرستیں بنوانے، حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے اور مالگزاری افسران سے رپورٹیں وصول کرنے جیسے امور کے لیے الگ الگ اوقات مقرر کیے تھے۔

4.3 سور انتظامیہ (Sur Administration)

4.3.1 مرکزی حکومت (Central Government)

شیر شاہ کی سلطنت ایک مرکزی مطلق العنان ریاست تھی، جو بظاہر افغانی روایات پر عمل پیرا تھی، لیکن حقیقت میں یہ ترک خصوصیات کی حامل تھی۔ اس نے افغان سلطنت کے احیاء کے لیے سخت محنت کی۔ وہ افغانوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا تھا اور انہیں ہندوستان میں مستقل طور پر آباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے افغانوں کو متعدد اہم شاہی اور ریاستی خدمات پر فائز کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مقامی لوگوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی انتظامیہ میں شامل کیا گیا۔ حکومتی عہدوں کے دروازے ہر اس شخص پر کھلے تھے جو اس کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد افغانوں کو اس طرح منظم کرنا تھا کہ ان کی قبائلی سیاست کے نقائص دور ہو جائیں اور ایک نوزائیدہ افغان خود مختار سلطنت کو استحکام

حاصل ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کے دور میں کبھی وزیر کا عہدہ تھا یا نہیں۔ اس عہدے کی عدم موجودگی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ شیر شاہ اپنی حکومت کی ہر شاخ اور روزمرہ کی انتظامیہ کی دیکھ بھال خود کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کے اعلیٰ عہدے کے قیام سے افغان سرداروں کے درمیان مزید دشمنی پیدا ہو۔ شاید ان وجوہات کی بناء پر ہمیں مرکزی حکومت جیسی کسی بھی تنظیم اور وزراء یا محکموں کے سربراہوں کی تقرری کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریاست کی پوری مشینری کی کایاپلٹ کرنے کے لیے پانچ سال کا وقت بہت کم رہا ہو۔ ایک نوجوان فرید کے طور پر، اس نے اپنے والد کی جاگیر کے منتظم کے طور پر گاؤں اور پرگنہ انتظامیہ میں کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے چھوٹے درجے کے انتظامی ڈھانچے کی اصلاح کے کام سے شروع کیا۔

4.3.2 صوبائی نظم ونسق (Provincial Administration)

صوبہ یا سرکار؟

قانون گو شاید چاہتے ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ شیر شاہ کے دور میں 'سرکار' سے بڑی کوئی انتظامی اکائی نہیں تھی اور یہ بھی کہ اکبر نے ہی صوبوں کو بنایا اور صوبیدار مقرر کیے۔ قانونگو کے مطابق، شیر شاہ کے صوبائی نظم ونسق کی مثال بنگال تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ شیر شاہ نے بنگال میں ایک بالکل نیا نظام رائج کیا تھا، جو سلطنت کے باقی حصوں کے نظم ونسق کی بنیاد بن گیا۔ اس سے پہلے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کرنے کی جو روایت تھی اسے چھوڑ دیا گیا اور اس کی شروعات بنگال سے ہوئی۔ اس نے بنگال کو انیس ذیلی اکائیوں میں تقسیم کیا۔ شاید یہ ذیلی تقسیم اکبر کے زمانے کے بنگال کی انیس 'سرکاروں' سے مماثلت رکھتی ہیں جن کا شمار ابوالفضل نے کیا تھا۔ اس طرح قانون گو یہ مانتے ہیں کہ شیر شاہ کی سلطنت کی سب سے بڑی انتظامی اکائی 'سرکار' تھی۔ تاریخی دستاویزوں میں صوبوں اور صوبیداروں کے وجود کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ وہ تو پورے صوبے کے انتظامی اتحاد کو محفوظ رکھنے اور گورنروں کو باہمی جھگڑوں سے بچانے کے لیے وضع کیے گئے تھے (جیسا کہ پنجاب کے معاملے میں)، یا فوجی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے گئے تھے (جیسے پنجاب، مالوہ، اجمیر، جودھ پور اور ناگور)۔ پرماتما سرن واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ایسے واضح ثبوت موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیر شاہ کی سلطنت باقاعدہ صوبوں میں تقسیم تھی۔ اس طرح قانون گو کے خیالات تاریخی حقائق پر مبنی نہ ہو کر یکطرفہ ہیں۔ بنگال کی تقسیم کو بیان کرتے ہوئے عباس سروانی نے اس کی انتظامی اکائیوں کی تعداد کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نہ تو کسی ہمعصر نے اور نہ ہی بعد کے کسی مورخ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بنگال کے علاوہ کوئی دوسرا صوبہ مرکز کو سیدھے طور پر جوابدہ اتنی چھوٹی اکائیوں میں بٹا ہوا تھا۔ شیر شاہ نے بنگال کی اس طرح کی تقسیم دو وجوہات کی بنا پر کی تھی:

- بنگال مرکز سے بہت دور تھا اور صوبیدار، اس کے بے پناہ وسائل کے لالچ میں اکثر سلطان کے خلاف بغاوت پر اتر آتے تھے۔
- دوسری وجہ یہ تھی کہ جب سے شیر شاہ تخت نشین ہوا تھا، بہت سے افغان سردار انعامات نہ ملنے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔

لہٰذا، ان کو مطمئن کرنے کے لیے، شیر شاہ نے یہ طریقہ تلاش کیا کہ سرکاروں کی از سر نو تنظیم کرکے ہر ایک سرکار کو ایک مختلف افغان سردار کے حوالے کر دیا جائے۔ ہر سرکار اپنے اندرونی روزمرہ کے انتظام کے معاملے میں دوسری سے آزاد تھی۔ اس کا متوقع نتیجہ یہ نکلا

کہ سرکاریں چھوٹی ہونے کی وجہ سے بغاوت نہیں کر سکتی تھیں ساتھ ہی سردار بھی مطمئن ہو گئے۔تاہم، شیر شاہ کبھی بھی صوبے کو چھوٹا کرنا یا ختم کرنا نہیں چاہتا تھا،اس کے برعکس، وہ اس کے سیاسی اور اقتصادی اتحاد کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔اسی لیے اس نے قاضی فضیلت کو، جسے قاضی فضیحت (بدنام قاضی) کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے، بنگال کا گورنر یا'امین بنگال' مقرر کیا۔امین پورے صوبے کے دفاع کا ذمے دار تھا۔عباس سروانی اور بدایونی دونوں نے قاضی فضیلت کو بنگال کا امین بنائے جانے کا ذکر کیا ہے۔اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بنگال کی ذیلی تقسیم کے بعد (انتشار کے خطرے سے اور افغان سرداروں کو جگہ دینے کی غرض سے) اس صوبے کے تمام محکمے اور ان سے متعلق معاملات قاضی فضیلت کی ماتحتی میں دے دیے گئے۔افغان سرداروں کے ماتحت آنے والی بعض سرکاروں میں، سرداروں کی جاگیر کے علاقے بھی شامل تھے۔انتظامیہ کی علاقائی اکائی کے طور پر 'سرکار' شیر شاہ سے پہلے ہی موجود تھی۔

'سرکار' کو انتظامیہ کی اعلیٰ ترین اکائی مان کر پوری سلطنت کے لیے اس نظام کو اپنانے کے بارے میں، پرماتما سرن کہتے ہیں کہ یہ نظریہ پنجاب کے بارے میں عباس سروانی کے درج ذیل بیان کی غلط تشریح پر مبنی ہے: 'وہ (شیر شاہ) اعظم ہمایوں (ہیبت خان) کو پنجاب کے صوبیدار کے عہدے سے ہٹانا چاہتا تھا، لیکن شہید ہونے سے پہلے اسے وقت ہی نہیں ملا۔' اگر اس واقعے کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شیر شاہ، ہیبت خان کو اس کی بدتمیزی کی وجہ سے ہٹانا چاہتا تھا نہ کہ اس کی صوبے داری کے منصب کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ہمیں حقیقی صورت حال کے بارے میں جو معلومات ملی ہیں وہ یہ ہے کہ روہیل کھنڈ تک کے سارے علاقوں والا پورا صوبہ احمد خان سروانی کو ملا اور صوبہ روہیل کھنڈ سے اودھ تک عیسیٰ خان کو سونپا گیا۔صوبہ دہلی تو عام طور پر ایک امین کے ماتحت رہتا تھا اور امینوں کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ایسا کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ سلطان وقتاً فوقتاً غیر حاضر رہتا تھا۔قاضی فضیلت بھی کبھی دہلی کے امین تھے۔شیر شاہ نے احمد خان سروانی کو 5000 گھوڑوں کی باقاعدہ فوج رکھنے اور سنبھل کو چوکی بنانے کا حکم دیا کیونکہ اس علاقے میں باغیوں کی تعداد زیادہ تھی۔اس کے علاوہ یہ اس کے علاوہ اس بات کا یقینی ذکر ملتا ہے کہ اجمیر، مالوا اور بہار بشمول لاہور، ملتان، سنگھ، جودھ پور اور ناگور صوبے تھے۔ان صوبوں کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یا نہیں اس بات کے شواہد نہیں ملتے۔

صوبوں کے اعلیٰ حکام کو کبھی حکیم، کہیں امین یا فوجدار کہا جاتا تھا۔ان کے اختیارات میں بھی برابری نہیں تھی۔پنجاب کے ہیبت خان کو ایک لاکھ کی فوج رکھنے اور جاگیریں بانٹنے کا حق حاصل تھا۔اجمیر کے صوبیدار خواص خان کے پاس 26,000 جبکہ مالوہ کے صوبیدار شجاعت خان کے پاس 12,000 کی فوج تھی۔کچھ دوسرے صوبیداروں کے پاس صرف 5000 کی فوج تھی۔بہرصورت شیر شاہ ان تمام صوبیداروں پر سخت کنٹرول رکھتا تھا۔وہ کبھی بھی بدنظمی، دھوکہ دہی یا مرکز کی ہدایات کی نافرمانی جیسی چیزوں کو برداشت نہیں کرتا تھا۔شیر شاہ کے جانشینوں کے دور میں بھی صوبیداروں اور ان کی تقرریوں کے بارے میں ذکر ملتا ہے۔اکبر جب تخت پر بیٹھا تب بھی صوبے باقی تھے۔اکبر اور اس کی پالیسیوں کی تعریف کرتے نہیں تھکنے والے ابوالفضل نے کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ اکبر نے ہی سب سے پہلے صوبوں کی بنیاد رکھی یا صوبوں کی تعمیر کا تصور اکبر کا تھا۔اس لیے صوبوں کے خاتمے کو لے کر قانون گو کا مذکورہ بالا بیان درست نہیں ہے۔

اقطاع یا سرکار:

ذیلی تقسیم کو اقطاع کہا جاتا تھا اور یہ مغل دور کے صوبوں سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن ان کی تشکیل یا ان کا نظم و نسق کسی اچھی طرح سے متعین اصولوں یا کسی ایک قسم کی ساخت پر مبنی نہیں تھا۔ اقطاع بھی سرکاروں اور پرگنوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کی سب سے چھوٹی انتظامی اکائی گاؤں تھا۔ اقطاع کی تقسیم اور ان کی انتظامی ساخت کو ترک حکمرانوں کے دور کے طرز حکمرانی کا تسلسل سمجھا جا سکتا ہے۔ نظام حکومت دوہری طرز کا تھا۔ سرکار کی سطح پر شقدار شقداران اور منصف مصنفان ہوتے تھے۔ شقدار شقداران یا صدر شقدار عموماً فوجی قابلیت والا افسر ہوتا تھا۔ اس کے پاس فوجی ٹکڑیاں ہوتی تھی اور وہ امن وامان نافذ کرتا تھا۔ وہ شہری انتظامیہ کا ذمے دار تھا اور اسے فوجداری معاملات سے نمٹنا پڑتا تھا۔ مجرم کا پتہ لگانے اور اسے سزا دینے کے معاملے میں مقامی ذمہ داری کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس لیے اگر مجرم کو پیش نہ کیا جاتا تو اس کی ساری ذمہ داری مقدم یا گاؤں کے سربراہ پر عائد ہوتی تھی۔ منصف مصنفان یا صدر منصف مالگزاری کے معاملات دیکھتا تھا جس میں مالگزاری کی وصولی اور حساب کتاب شامل تھا۔ وہ دیوانی مقدمات بھی نمٹاتا تھا اور غالباً ان کی سماعت کے لیے دورہ بھی کرتا تھا۔

پرگنہ:

پرگنہ کی سطح پر بھی ایسی ہی تنظیم تھی۔ شقداروں اور منصفوں کے کام بالکل وہی تھے جو 'سرکار' کی سطح پر شقدار شقداران اور منصف مصنفان کے ہوتے تھے۔ البتہ ان کی مدد کے لیے ایک ماتحت عملہ موجود تھا۔ آر پی ترپاٹھی نے واقعات مشتاقی کے دو عبارتوں کے درمیان فرق کی طرف دھیان کھینچا ہے۔ ایک کا جزوی ترجمہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن نے کیا ہے، جس میں ایک خزانہ دار، ایک منصف خزانہ، اور ایک فارسی اور ایک ہندو کاتب کی تقرریوں کا ذکر ہے۔ دوسری عبارت میں ان ملازمین کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہر پرگنہ میں شقدار اور منصف کے ساتھ ایک کارکن ہوا کرتا تھا۔ عباس خان نے منصف کے بجائے امین کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن لگتا ہے کہ وہ بھی اسی ملازم کا حوالہ دے رہا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر پرگنہ میں ایک قانونگو ہوتا تھا جو حکومت کو پرگنہ کی حالت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ شقدار کی مدد کے لیے کارکن نامی مالگزاری کاتب موجود تھا۔ جو مال جمع ہوتا اسے خزانہ دار کے پاس جمع کرایا جاتا تھا، جسے فوتہ دار بھی کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی حدود اور زرعی زمینوں کی پیمائش کے لیے حکومت کی طرف سے امین مقرر کیے گئے تھے۔ یہ امین پیمائش کر کے جوت سے متعلق جھگڑوں کو بھی نمٹاتے تھے۔ آر پی ترپاٹھی کا ماننا ہے کہ قانون گوؤں کی تقرری حکومت نے نہیں کی تھی، وہ مقدموں کی طرح تھے، یعنی موروثی پیشہ ور نیم سرکاری ملازمین تھے جو زراعت اور کسانوں کے موجودہ اور ماضی کے حالات کا حساب رکھتے تھے۔

گاؤں:

انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تھا، جس میں ایک پٹواری اور ایک مقدم ہوتے تھے۔ پٹواری کا کام کسانوں اور ان کی ملکیت کے بارے میں حساب کتاب رکھنا تھا، جبکہ مقدم اپنے دائرہ اختیار میں رہنے والے لوگوں سے مالگزاری اکٹھا کر کے حکومت کے حوالے کرتے تھے۔ پرگنوں اور سرکاروں کے عملے کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ افسران کی تقرری کا کام شیر شاہ خود دیکھتا تھا، اس لیے سب صرف اس کے سامنے جوابدہ تھے۔ انتظامیہ کے دوہرے نظام کی وجہ سے انتظامی امور اور ملازمین دونوں کی ہی صحیح طریقے سے جانچ پڑتال ہو جاتی تھی۔

4.3.3 زمینی مالگزاری انتظامیہ (Land Revenue Administration)

شیر شاہ نے زمینی مالگزاری انتظامیہ کی ابتدائی تربیت اس وقت حاصل کی تھی جب وہ نوجوان فرید تھا اور اپنے والد کی جاگیروں کا منتظم تھا۔ عباس خان، جاگیروں کے بارے میں فرید کی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں:

1. رعیت یعنی رعایا کی فلاح و بہبود کی فکر۔ اسی لیے مقررہ زمینی مالگزاری کی مقدار عام سی ہوتی تھی، لیکن تشخیص کے بعد اس کی مکمل وصولی کی جاتی تھی۔
2. وصولی کی فیس کی صورت میں اور زمینداروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کا واجب الادا حصہ انہیں ضرور دیا جاتا تھا۔

فرید نے کسان کو پیمائش اور شراکت (بٹائی) کے درمیان کسی ایک کو چننے کی آزادی دی۔ دونوں میں سے کس کا انتخاب کریں اور کس کو چھوڑیں، کسان اس بات پر ہم خیال نہیں تھے، اس لیے دونوں طریقے جاری رہے۔ یہ واضح ہے کہ اس انتخاب میں نفع اور نقصان کا فرق نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے کسانوں کو یہ آزادی بھی دی تھی کہ وہ زمینی محصول نقد یا جنس کے طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ فرید کسانوں سے تحریری قبول نامہ (قبولیت یا پٹہ) لیتا تھا اور اس نے پیمائش کی فیس (جریبانہ) اور ٹیکس وصولی کی فیس (محاصلانہ) بھی طے کر رکھی تھی۔ اس نے دلالوں اور اپنے ملازمین کو خبردار کیا تھا کہ اگر انہوں نے وصولیابی کے معاملے میں کوئی غیر قانونی کام کیا اور وہ قصوروار پائے گئے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

جب وہ (فرید) خود حکمران (شیر شاہ) بنا تو اس نے ان میں سے کچھ اصولوں کو لاگو کیا جن کا تجربہ اس نے اپنے باپ کی جاگیر کا منتظم رہتے کیا تھا۔ لیکن اس بیان کا جائزہ لینا اور جانچنا ضروری ہے۔ چونکہ مالگزاری ریاست کے لیے آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ تھا، اس لیے شیر شاہ کی آمدنی کے استحکام اور زرعی مصنوعات میں اضافے کے ذریعے مالگزاری میں اضافے کے بارے میں تشویش فطری تھی، اسے قبول کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ چونکہ زرعی معاشرہ، ریاست کی بنیاد تھا، اس لیے وہ کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے فکرمند تھا۔ شیر شاہ کے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے ضابطوں میں سے ایک کے بارے میں عباس خان کہتے ہیں: 'اس کی فاتح فوج کہیں لوگوں کی زراعت کو تباہ نہ کر دے اس لیے جب وہ فوج کے ساتھ سفر کرتا تھا تو خود کھیتی باڑی کی حالت دیکھتا جاتا تھا اور گھڑ سواروں کو چاروں طرف یہ دیکھنے کے لیے پھیلا دیتا تھا کہ فوج کے سپاہی کسانوں کے کھیتوں میں نہ گھس سکیں۔۔۔۔۔۔جو شخص حکم عدولی کرتا اور فصلوں کو نقصان پہنچاتا اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ سپاہیوں پر ان باتوں کا حیرت انگیز اثر ہوا۔'

تاہم، قانونگو کا یہ نظریہ کہ شیر شاہ نے دیگر تمام طریقوں کو چھوڑ کر صرف پیمائش کے عمل پر انحصار کیا اور اسے اپنی پوری سلطنت پر لاگو کیا، قابل قبول نہیں ہے۔ مورلینڈ کا کہنا ہے کہ 'شمالی ہندوستان میں رائج زمینی مالگزاری کی روایت اس وقت سے چلی آرہی ہے جب ہندو مذہب کے مقدس قانون کی تخلیق ہوئی تھی، اور انیسویں صدی میں اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اس میں کچھ تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ یہی روایت سوردور حکومت میں بھی ایک اٹوٹ شکل میں جاری رہی۔ اگرچہ کہ شیر شاہ نے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں، لیکن اس

نے بھی بنیادی چیزوں جیسے محصولات کے تعین کا طریقہ، ادائیگی کی قسم، زرعی پیداوار میں ریاست کے حصہ وغیرہ کو تبدیل نہیں کیا۔ ایس سی مسرا (S.C. Misra) نے 'Revenue System of Sher Shah' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالے میں بتایا ہے کہ دستاویزات میں استعمال ہونے والا لفظ 'جریب' اور جدید مصنفین کے ذریعہ بطور ترجمہ استعمال کیے ہوئے لفظ 'measurement' یا 'پیمائش' وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے پہلے تمام زرعی اراضی کے رقبے کی حد بندی (پیمائش) کروائی اور پھر اس کی بنیاد پر زمین کی آمدنی کا تعین کیا، تو اس قول کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر 'جریب' سے مراد یہ ہے کہ تمام قدیم طریقوں کو ہٹا کر محاصل کا پورا نظام بالکل بدل دیا گیا تو یہ بیان قابل قبول نہیں ہے۔

شیر شاہ نے مالگزاری انتظامیہ کے قدیم نظام کو کبھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں کیا۔ قلب سلطنت (Core) کے علاوہ دیگر دور دراز علاقوں میں وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ پیمائش کے بارے میں جو اس کے خیالات تھے ان کو بہت سے علاقوں میں لاگو نہیں کیا جا سکتا تھا، اور نہ ہی ایسا کیا گیا۔ مثال کے طور پر ملتان میں مالگزاری کی تشخیص اور وصولی کے لیے بٹائی (حصہ داری) کا رواج پہلے سے جاری تھا، شیر شاہ نے اسے چلتے رہنے دیا۔ مالوہ، راجپوتانہ اور مغربی پنجاب کے علاقے اس وقت مکمل طور پر پر امن نہیں تھے، اس لیے اگر شیر شاہ پیمائش کا بندوبست کرنا بھی چاہتا تو شاید ہی کامیابی حاصل کر پاتا۔ دولت شیر شاہی کے مصنف حسن خان نے ملک میں رائج مالگزاری انتظامیہ کے تین طریقوں کا ذکر کیا ہے: 'پہلا یہ ہے کہ ہم گاؤں کے کسی فرد کو سرکاری واجبات کی ادائیگی کی ذمہ داری سونپ دیں۔ ایسی صورت حال میں اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کھیتوں سے واجبات وصول کرے اور حکومت کے پاس ایک مقررہ رقم جمع کرائے۔ لیکن ایسی حالت میں (بعض معاملوں میں) جبر یا طاقت کے استعمال کو کم کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ سرکاری ملازمین کو عوام کی جان و مال کی حفاظت کا خیال رکھنے کی ہدایات دی جائیں تاکہ کہیں بھی کوئی مالگزار رعایا پر ظلم کرنے کے لیے اپنے پنجے نہ پھیلا سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ان احکامات پر عمل کرنا ہو گا۔'

اے سی مشرا بتاتے ہیں کہ ایک ایسے نظام میں جس میں ایک خاص شخص کو اس کے مختص کردہ علاقے سے محصول جمع کرنے اور ریاست کے پاس ایک مقررہ حصہ جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو، اس جریب طریقہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نقد رقم ادائیگی کا طریقہ کارآمد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دو طریقے جنہیں غلہ بخشی (اشتراک) اور جریب (پیمائش) کہا جاتا ہے، پرانے رواج تھے اور چلے آرہے تھے۔ شیر شاہ نے ان میں مداخلت نہیں کی۔ البتہ، اس نے ان کے طریقہ کار کو منظم کیا۔ اس نے زمین کے نقشے بنائے، کاشتکاری اور ملکیت کی درجہ بندی کروائی۔ دولتِ شیر شاہی کے فرمان نمبر 10 سے معلوم ہوتا ہے کہ زرعی (پولج) اور ناقابل کاشت (پرتی)، دونوں قسم کی زمینوں کی پیمائش کا کام احمد خان کو سونپا گیا تھا۔ اس نے یہ کام برہمنوں کی مدد سے مکمل کیا۔ اس تخمینے کی بنیاد پر ایک رجسٹر (خسرہ کھتونی) تیار کیا گیا جس میں مالک کے حقوق اور تمام زرعی زمینوں کی پیمائش اور ان کی اقسام درج کی گئیں۔ پیمائشی کام کے لیے 32 عددی سکندری گز اور سن کی چھڑ کا استعمال کیا گیا۔

شیر شاہ کا جھکاؤ پیمائش کے طریقے کی طرف تھا اور علاؤالدین خلجی کی طرح وہ بھی اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاہتا تھا۔ زمینوں کا عام سا تجزیہ کروانائی 'جمع' کے تعین کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا، لیکن اس کا دور حکومت اتنا مختصر تھا کہ سروے زیادہ اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود اس کا سب سے اہم کارنامہ 'ریع' (rai) یا تشخیص کے لیے فصل کی شرحوں (rates) یا دروں کی ایک فہرست کا لاگو کیا جانا تھا۔ فصل کا شرح یا در تیار کرنے کا طریقہ بہت آسان تھا۔ پیداوار کی قسم کی بنیاد پر، دونوں موسموں کی تمام اقسام کی اہم اہم فصلوں کی ایک، ایک بیگھہ اچھی، درمیانی اور خراب زمین کی پیداوار کے آنکڑوں کو فی بیگھہ کی اوسط پیداوار کا حساب لگانے کے لیے اکٹھا کیا جاتا اور حاصل شدہ اوسط کے تین حصے کر دیے جاتے۔ اس میں سے ایک حصہ یعنی کل کا 3/1، مقرر کردہ مالگزاری، یا حکومت کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

مورخین کے درمیان اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ پیداوار کا کتنا حصہ محصول کے طور پر ریاست کو ادا کیا جاتا تھا۔ قانون گو اور آئی ایچ قریشی (I.H. Qureshi) کا خیال ہے کہ شیر شاہ پیداوار کا ¼ حصہ لیتا تھا۔ قانونگو کی رائے 'مخزن افاغنہ' میں دی گئی معلومات پر مبنی ہے، جہاں شیر شاہ نے ہیبت خان کو لکھا کہ ملتان سے پیداوار کا چوتھائی حصہ لینا ہے۔ وہ ابوالفضل کے اس بیان پر بھی یقین رکھتا ہے کہ شیر شاہ کی شرح مالگزاری یا زمینی محصول سب سے کم تھا اور اکبر نے اسے بڑھا کر 3/1 کر دیا۔ مورلینڈ (W.H. Moreland) نے قانون گو کے ان دلائل کی تردید کی ہے، جو اس نے 'مخزن افاغنہ' اور ابوالفضل کے بیانات کی بنیاد پر قائم کیے ہیں۔ مورلینڈ کا خیال ہے کہ شیر شاہ نے ملتان کے بارے میں ہمیشہ جانبدارانہ رویہ اپنایا تھا۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ شیر شاہ کا پوری سلطنت کے ساتھ ایک جیسا رویہ تھا۔ پرماتما سرن، مورلینڈ سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیر شاہ کے 'ریع' کو اکبر نے بھی اپنایا تھا، اس لیے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں جو بھی شرحیں رائج تھیں اور جنھیں شہنشاہ نے منظور کیا تھا، وہ اکبر کو شیر شاہ سے وراثت میں ملی تھیں۔ سرن، لفظ ریع کی وضاحت کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ریاست کا مطالبہ 3/1 تھا۔

ادائیگی کے طریقہ کار (mode of payment) کے بارے میں پورا نظام، کٹائی کے بعد کی پیداوار پر مبنی تھا اور محصول کی تشخیص کی بنیاد اناج یا کوئی دیگر پیداوار تھی۔ مالگزاری صرف اناج کی شکل میں لی جاتی تھی، لیکن اسے بازار بھاؤ پر بیچ کر نقدی میں بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ کسان بھی اناج کے بجائے نقد رقم میں بھی محصول ادا کر سکتا تھا۔ ریاست بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ کاشت کار کو 'جریبانہ' یا تخمینہ فیس اور 'محاصلانہ' یا ٹیکس جمع کرنے کی فیس بھی ادا کرنی پڑتی تھی، جن کی شرحیں زمینی مالگزاری کی بالترتیب 2½ اور 5 فیصد تھیں۔ حسن خان کہتے ہیں کہ شیر شاہ نے اس طرح انتظام کیا تھا کہ ہر زمیندار اور مالگزاری دینے والا اپنے محصول کا ڈھائی فیصد سرکاری خزانے میں جمع کراتا تھا، تاکہ یہ رقم حادثات یا بھاری سزاؤں پر خرچ ہو سکے۔ یقیناً یہ ٹیکس اناج کی شکل میں جمع کیا جاتا تھا، جسے مقامی غلہ خانوں میں ذخیرہ کیا جاتا تھا اور قحط کے وقت تکلیف کو دور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کسانوں میں پٹے بانٹتا تھا جس میں زمین کی قسم اور مختلف فصلوں کی شرحیں یا نرخ دیے گئے ہوتے تھے۔ کسان 'قبولیت' لکھتا تھا جس میں ریاست کی آمدنی کی مانگ کے مطابق مالگزاری ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ اس نے زمینی اصلاحات کی حوصلہ افزائی کی، خشک

سالی یا قحط کی صورت میں محصول میں چھوٹ یا معافی دی، مصیبت کے وقت اور کنویں کھدوانے کے لیے کسانوں کو قرض دیا اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے نہری آبپاشی کا نظام نافذ کیا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیر شاہ کے زمانے کا مالگزاری انتظامیہ کا نظام پیشرو ترکوں سے ملتا جلتا تھا اور لودیوں کے دور میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ جس کام کا سہرا اسے دیا جاتا ہے وہ اس نے والد کی جاگیر کا انتظام سنبھالتے ہی اسی جاگیر میں شروع کر دیا تھا۔اس کا واحد مقصد تھا کہ وہ حکومت میں جان پھونک کر اسے طاقت دے اور اس کے کام کاج میں بہتری لائے۔اس مقصد کو پورا کرنے میں اسے کافی حد تک کامیابی بھی ملی لیکن وہ اہل کار طبقے میں پھیلی ہوئی بدعنوانی کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا یا اسے اس کا وقت نہ مل سکا۔

4.3.4 عدل وانصاف (Administration of Law and Justice)

شیر شاہ عدل وانصاف کو مضبوطی سے نافذ کرتا تھا۔اس نے سلطان العدل کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔ قانونگو کہتے ہیں کہ ساڑھے پانچ سال کے مختصر دور حکومت میں شاید ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جب شیر شاہ نے اس اصول سے انحراف کیا ہو۔اس کے انصاف کے بارے میں عباس خان کا یہ بیان قابل غور ہے کہ 'وہ ہمیشہ پہلے اس بات کی تحقیق کرتا تھا کہ مظلوم اور انصاف مانگنے والے مدعی کی اصل حقیقت کیا ہے،اس نے کبھی ستانے والوں یا ظالموں کا ساتھ نہیں دیا، چاہے وہ اس کے قریبی رشتہ دار ہوں یا اس کے پسندیدہ بیٹے، چاہے وہ معزز امیر ہوں یا اس کے قبیلے کے لوگ،اس نے ظالم کو سزا دینے میں نہ تو تاخیر کی اور نہ ہی نرمی کا مظاہرہ کیا۔انصاف کے لیے ایسی فکر کا اثر تو ہونا ہی تھا جس کے بارے میں عباس خان نے مبالغہ آرائی سے کہا ہے کہ 'ایک بزرگ، قریب المرگ بوڑھی عورت اپنے سر پر سونے کے زیورات سے بھری ٹوکری لے کر سفر پر نکلی، تب بھی کسی چور یا ڈاکو کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس بوڑھی عورت کے پاس پھٹک بھی جائے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شیر شاہ اسے اس بات کی کتنی سخت سزا دے سکتا ہے۔'

4.3.5 دیگر انتظامی اصلاحات (Other Administrative Reforms)

اس کی فوجی انتظامیہ اور بھی زیادہ موثر تھی۔ گھوڑوں کو داغنے کی روایت 12ویں صدی میں سلجوقیوں نے کی تھی۔ لیکن شیر شاہ سے پہلے اگر کسی ہندوستانی حکمران نے اسے نافذ کیا تو وہ علاؤالدین خلجی تھا۔ شیر شاہ نے اسے سختی سے جاری رکھا۔ شیر شاہ عمارتیں اور سڑکیں بنوانے والا ایک عظیم حکمراں تھا۔اس کے ذریعے بنائی گئی چار بڑی سڑکیں (شاہراہیں) مشہور ہیں۔ بنگال کے سونار گاؤں سے شروع ہو کر ایک راستہ آگرہ، دہلی اور لاہور ہوتا ہوا دریائے سندھ تک گیا تھا۔ دوسرا آگرہ سے مانڈو پہنچتا تھا۔ تیسرا آگرہ سے جودھ پور ہوتا ہوا چتور تک اور چوتھا لاہور سے ملتان تک جاتا تھا۔اس نے سڑکوں کے دونوں طرف پھل دار اور سایہ دار درخت لگوائے۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر سرائے بنوائیں، جن کی کل تعداد 1700 تھی اور جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ کھانے پینے اور ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ گھوڑوں اور دودھ دار جانوروں کے لیے اناج اور گھاس بھی ملتا تھا۔ قیام امن کے لیے پولیس والے بھی ان سراؤں میں رکھے جاتے تھے۔ ہر سرائے میں ڈاک لانے اور لے جانے کے لیے دو گھوڑے رکھے جاتے تھے، جنہیں شاہی گھوڑ سوار ڈاکیے استعمال کرتے تھے۔

ان اقدامات سے تجارتی سرگرمیوں کی بھی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ سفر کے دوران، آرام اور سہولیات سے تاجروں اور سوداگروں کو بہت فائدہ ہوا۔ شیر شاہ نے داخلے اور فروخت کی جگہ پر دو ٹیکسوں کے علاوہ باقی تمام قسم کی چنگیوں کو ہٹا دیا، اس سے بھی تجارت کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے سکوں کی ڈھلائی کو بھی بہتر کیا۔

تصویر 4.3۔ شیر شاہ سوری کے سکے (پہلا روپیہ) 1538-1545ء

(Source: https://en.wikipedia.org/wiki/Sher_Shah_Suri#/media/File:Sher_shah's_rupee.jpg(Online))

اس کے دو قسم کے سکے اہم تھے۔ چاندی کا روپیہ 178 گرین اور تانبے کا دام 380 گرین کا تھا۔ اس نے ٹکسالوں کی تعداد بڑھا کر 23 تک پہنچا دی۔ ان میں سے کچھ جن مقامات پر تھیں، ان کے نام آگرہ، گوالیار، اجین، لکھنؤ، شیر گڑھ (ساسارام)، آبو، سکر، بکر (سندھ) ہیں۔ یہ ٹکسال والی جگہوں کے نام اس کی سلطنت کی وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔

4.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ وہ 1486ء میں پیدا ہوا اور پشتون کی مشہور شاخ سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جونپور میں تعلیم حاصل کی۔ 21 سال تک اپنے والد کی جاگیر کا انتظام بحسن وخوبی چلایا۔ بعد میں بہار کے حکمراں بہار خان کی ملازمت کی۔ کچھ عرصہ شہنشاہ بابر کی ملازمت میں بھی رہا۔ بابر کے مرنے کے بعد بنگال بہار اور قنوج پر قبضہ کیا۔ مغل شہنشاہ ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ اس نے اپنی مملکت میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اپنے تعمیری کاموں کی وجہ سے اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے سنار گاؤں سے دریائے سندھ تک ایک ہزار پانچ سو کوس لمبی شاہراہ تعمیر کروائی جو آج تک جی ٹی روڈ کے نام سے موجود ہے۔ شہنشاہ اکبر مملکت کا انتظام چلانے میں شیر شاہ سے بڑا متاثر تھا۔ 22 مئی 1545ء میں کالنجر کی فتح کے وقت بارود خانہ کے اچانک پھٹ جانے سے وفات پائی۔ تاریخ دان شیر شاہ سوری کو برصغیر کی تاریخ کا عظیم رہنما، فاتح اور مصلح مانتے ہیں۔ اردو ادب میں شیر شاہ سوری سے متعلق کئی مثالی قصے ملتے ہیں۔ شیر شاہ سوری (1476 تا 1545ء) ایسا فرماں روا تھا جس کی ستائش نامور مؤرخین اور عالمی مبصرین کرتے رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کا پہلا حکمران تھا جس نے عوامی فلاح کی جانب اپنی بھرپور توجہ دی اور کئی کارنامے انجام دیے۔ ساڑھے پانچ سو سال قبل اس نے زرعی اصلاحات کا کام شروع کروا دیا تھا، جس کی پیروی بعد کے حکمرانوں نے کی۔ شیر شاہ نے سہسرام سے پشاور تک جو شاہراہ کی تعمیر کروائی تھی اور اس کے کنارے کنارے سایہ دار اور پھل دار پیڑ لگوائے، سرائیں تعمیر کروائیں اور سب سے پہلا ڈاک کا نظام نافذ کیا تھا۔ اپنی محنت اور مسلسل کوششوں سے شیر شاہ نے ایک عظیم سلطنت قائم کی تھی لیکن اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر اس نے سہسرام کا انتخاب کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی میں ہی کیمور کی پہاڑی پر ایک مقبرہ تعمیر کروایا تھا جس کے چاروں جانب جھیل کا پانی پھیلا ہوا ہے۔

4.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

جریب	:	پیمائش
بٹائی/غلہ بخشی	:	اشتراک یا فصل کا برابر بنٹوارہ
خزانہ دار/فوتہ دار	:	سرکاری خزانے کا نگراں
کارکن	:	مالگزاری کاتب یا کلرک
امین	:	صوبے کا گورنر یا اعلیٰ حکمراں/زمین کی پیمائش کا ذمہ دار
سرکار	:	صوبہ یا صوبے کی تقسیم کی ایک اکائی
منصف مصنفان	:	سرکار کی سطح پر مالگزاری معاملات اور دیوانی مقدمات کا نگراں
سکندری گز	:	سکندر لودی کے ذریعے چلایا گیا ایک گز جس کی پیمائش 32 نکتوں والی سن کی ڈنڈی سے کی جاتی تھی۔
رجسٹر	:	خسرہ کھتونی، زمینوں اور ان کی آمدنیوں کا لیکھا جوکھا
پرتی	:	ناقابل کاشت یا بنجر زمین
پولج	:	زرعی یا زرخیز زمین
جمع	:	تخمینے کے بعد متعین کی ہوئی مالگزاری
حاصل	:	حقیقت میں حاصل ہونے والی مالگزاری
جریبانہ	:	پیمائش کی فیس، مالگزاری کی تقریباً ½2 فیصد
محاصلانہ	:	ٹیکس وصولی کی فیس، مالگزاری کی تقریباً 5 فیصد
ریع	:	'ریع' (rai) یا تشخیص کے لیے فصل کی اگلی پچھلی شرحوں (rates) یا نرخوں کی فہرست۔

4.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فرید خان کون تھا؟
2. فرید کے باپ کہاں کے جاگیر دار تھے؟
3. فرید کو شیر خان کا لقب کس نے دیا؟
4. شیر شاہ کا مقبرہ کہاں ہے؟
5. شیر شاہ کا چلایا ہوا روپیہ کتنے گرین کا تھا؟

6. بٹائی/غلہ بخشی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
7. خزانہ دار/فوتہ دار کون ہوتا تھا؟
8. سرکار کیا تھی؟
9. شقدار شقداران کس سرکاری افسر کو کہا جاتا تھا؟
10. سکندری گز کتنے عدد کا ہوتا تھا؟

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. شیر شاہ کی سلطنت کی وسعت پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. سور انتظامیہ میں مرکزی حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. صوبہ یا سرکار کی بحث کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
4. پرگنہ کے نظم ونسق پر روشنی ڈالیے۔
5. شیر شاہ کے عدل وانصاف پر نوٹ لکھیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

- فرید خان کے ابتدائی حالات زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
- شیر شاہ کے دور میں زمینی مالگزاری انتظامیہ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
- سور انتظامیہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Aquil, Raziuddin. *Sufism Culture and Politics: Afghans and Islam in Medieval North India*. Oxford University Press, 2007.
2. تاریخ شیر شاہی، عباس خاں سروانی، مترجم: مظہر علی خاں ولا، سلمان اکیڈمی حق نشان، کراچی، 1963، معاون: ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد۔
3. https://www.rekhta.org/ebooks/detail/tareekh-e-shair-shahi-abbas-khan-sarwani-ebooks?lang=ur
4. https://archive.org/details/20210628_20210628_1504/page/24/mode/2up

اکائی 5۔اکبر

(Akbar)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 اکبر کی تاجپوشی
5.3 اکبر کی ابتدائی فتوحات
5.3.1 پانی پت کی دوسری جنگ
5.3.2 مالوہ کی فتح
5.3.3 غدار امرا اور بغاوتوں کا قلع قمع
5.4 اکبر اور مغلیہ سلطنت کی توسیع
5.4.1 اکبر اور راجپوت سلطنتیں
5.4.2 اکبر اور گونڈوانا کی رانی درگاوتی
5.4.3 میواڑ پر قبضہ
5.4.4 اکبر اور رانا پرتاپ
5.4.5 رنتھمبور کی فتح
5.4.6 کالنجر، جودھ پور، بیکانیر اور جیسلمیر کی خودسپردگی
5.4.7 گجرات کی فتح
5.4.8 بہار اور بنگال کی فتح
5.4.9 کشمیر کی فتح
5.4.10 سندھ کی فتح
5.4.11 اڑیسہ کا الحاق

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

5.4.12 بلوچستان کی فتح
5.5 دکنی فتوحات
5.5.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح
5.5.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی
5.6 اکبر کے مذہبی افکار و اعمال
5.6.1 اکبر اور عبادت خانہ
5.6.2 اکبر کا دین الٰہی
5.7 اکبر کی شخصیت اور اس کے اثرات
5.8 اکتسابی نتائج
5.9 کلیدی الفاظ
5.10 نمونہ امتحانی سوالات
5.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

جلال الدین محمد اکبر، جسے اکبر یا اکبرِ اعظم کے نام سے جانا جاتا ہے، ہندوستان کے مشہور ترین بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ اپنے حیران کن سیاسی اور مذہبی کارناموں کی بنا پر اس نے ہندو اور مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کے دلوں اور دماغوں میں ایک غیر معمولی مقام حاصل کیا ہے۔ وہ اتنا مشہور ہے کہ اس کے نام کے آگے 'عظیم' کی صفت خود بخود جڑ جاتی ہے۔ 'عظیم' کی صفت کے علاوہ اس کے ذاتی نام 'اکبر' کا مطلب بھی 'عظیم' ہے۔ اکبر کو آج اس کی وسیع النظری، دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کرنے (شمولیت)، دیگر عقائد کا احترام اور رواداری اور سب سے بڑھ کر اس کے ناقابل یقین عقلی رویہ کے لیے جانا جاتا ہے۔ اکبر، عہد وسطیٰ کا ایک حکمران جو کہ آج بھی جدید ہندوستان کے بہت سے لوگوں کو متاثر کر رہا ہے۔ جب بھی ہندوستانی معاشرہ اور سیاست کو فرقہ وارانہ افراتفری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب ایک مذہبی طبقہ دوسرے مذہبی طبقہ کی نفرت سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت اکبر کو خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، منی مگدھا شرما

(Manimugdha S. Sharma)اپنی کتاب بعنوان *‘Allahu Akbar: Understanding the Great Mughal in Today’s India’* میں لکھتے ہیں کہ ’1941 میں، آدی کے۔ منشی(Adi K. Munshi)نامی ایک باشعور ہندوستانی شہری نے ’ایک ایسے لیڈر کا خواب دیکھا تھا‘ جو ’ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر سکے۔‘ ہندوستان میں 1940 کی دہائی بہت ہنگامہ خیز تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست فرقہ وارانہ تناؤ تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت میں، مسلمانوں کا ایک طبقہ، مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک یعنی مستقبل کا پاکستان چاہتا تھا۔

آخر وہ رہنما کون تھا جس کے بارے میں آدی۔ کے۔ منشی کہہ رہے تھے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرے گا؟ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ نہ تو مہاتما گاندھی تھے، نہ جواہر لعل نہرو تھے اور یہاں تک کہ سبھاش چندر بوس بھی نہیں تھے۔ یہ اکبر ہی تھا، جو آدی کے منشی کی جانب سے 10 اکتوبر 1941 کو ٹائمز آف انڈیا میں خط لکھنے سے 400 سال پہلے بستا تھا۔ (یہ خط 15 اکتوبر 1941 کو شائع ہوا)۔ اس خط میں انہوں نے اس بات کی شدید خواہش کا اظہار کیا کہ 1940 کے دہے کے ہندوستان کو اکبر جیسے حکمران کی ضرورت ہے۔ اکبر کو انہوں نے ایک ’عظیم ہندوستانی سپاہی‘، ایک ’مدبر‘، اور ’اب تک کا سب سے بڑا ہندوستانی قوم پرست‘ قرار دیا۔ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے منشی صاحب نے کرنل جی بی میلسن(Colonel J.B. Malleson)کا حوالہ دیا جس نے اپنی کتاب *Akbar and the Rise of the Mughal Empire*(طبع شدہ 1896)میں اکبر کی عظمت کے بارے میں درج ذیل اقتباس کہا: ’جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس نے کیا کیا، تو جس زمانے میں اس نے یہ سب کچھ کیا، اس کے حصول کے لیے اس نے جو طریقہ اختیار کیا، تو ہم اکبر کو ایک ایسا نامور آدمی ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنہیں پروردگار کسی قوم کی مصیبت کی گھڑی میں اسے دوبارہ امن و رواداری کے راستہ پر گامزن کرنے کے لیے بھیجتا ہے جو اکیلا ہی لاکھوں کی خوشیوں کا ضامن ہوتا ہے۔‘ اپنے خط میں، آدی کے۔ منشی نے مزید لکھتے ہیں: ’ہندوستان کے اندرونی اختلافات، فرقہ وارانہ انتشار اور خاص طور پر ہندو مسلمانوں کے درمیان خلیج کے ان ایام میں ہندوستان، پہلے سے کہیں زیادہ، متحدہ ہندوستان کے پیغامبر، اکبر کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔‘

5.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- اکبر کے دور حکومت میں مغل سلطنت کے پھیلاؤ کو سمجھ سکیں گے
- اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ راجپوتوں اور اکبر کے درمیان تنازعات محض سیاسی تھے اور ان کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔
- اکبر کے مذہبی نظریات کی وضاحت کے ساتھ یہ جان سکیں گے اکبر کی عقلیت پسندی، اس کی مذہبیت میں گہرائی تک پیوست تھی۔
- اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ مذہبی افکار کے لحاظ سے اکبر نہ صرف اپنے زمانے سے بلکہ ہمارے زمانے سے بھی آگے تھا۔
- اکبر کی شخصیت کے ذریعہ یہ سمجھ سکیں گے کہ عقلیت پسند ہونے کے لیے کسی بھی شخص کو غیر مذہبی ہونا ضروری نہیں۔

5.2 اکبر کی تاجپوشی (Akbar's Coronation – 14 February 1556)

اکبر ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کے ہاں پیدا ہوا۔ ہمایوں، جس نے قسمت کے نشیب و فراز کا بخوبی مشاہدہ کیا، 26 جنوری 1556 کو اڑتالیس سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ یہ کوئی جنگ نہیں بلکہ اس کی لائبریری تھی جو اس کی موت کا سبب بنی۔ وہ اپنی لائبریری کی سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر گیا تھا۔ اس کی زندگی ایک واضح پیغام دیتی ہے 'کبھی بھی ہمت نہ ہاریں، چاہے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں'۔ اور اس نے استقامت کی ایک دلکش پذیر کہانی ترتیب دی۔ اپنے والد کی اچانک موت نے کم عمر اکبر پر کئی ذمہ داریاں عائد کر دیں جو اس کے باپ کے ایک دانشمندانہ فیصلے کی وجہ سے اس کے کاندھے پر آئیں۔ ہمایوں نے بیرم خان کو اکبر کا سرپرست مقرر کرنے کا فیصلہ اپنی موت سے صرف دو ماہ قبل لیا۔ بیرم خاں ایک سچا نمک خوار تھا۔ اس کی کوشش سے، اکبر صرف تیرہ سال کی عمر میں بادشاہ بن گیا۔ جب ہمایوں کا انتقال ہوا تو اکبر، بیرم خان کے ساتھ پنجاب میں تھا۔ مغلوں کا تخت جو اکبر کو وراثت میں ملا تھا، کانٹوں سے بھرا ہوا تھا اور حالات کافی نازک تھے۔ لیکن بیرم خان کے نزدیک اس کا نظم اکبر کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ بیرم خان ہی تھا جس نے اکبر کے لیے ہندوستان کو محفوظ و مامون بنایا جیسا کہ اس نے اس کے والد ہمایوں کے لیے بھی یہی کیا تھا۔ بیرم خان بابر کے زمانے سے مغلوں کا پرانا وفادار تھا۔ وہ ہمایوں کے زمانے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوا، اور اسے اکبر کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ بیرم خان کو مغل سلطنت میں اکبر کے اتالیق کی حیثیت سے مکمل اختیار حاصل تھا، اس نے کبھی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وفادار بن کر رہا۔ ورنہ اس کے پاس ایسا کرنے کے تمام مواقع موجود تھے۔ ہمایوں کی موت کی خبر ملتے ہی، بیرم خان نے اکبر کی تاجپوشی کے انتظامات کا فوری مگر محتاط فیصلہ کیا جو 14 فروری 1556ء کو منعقد ہوئی۔ یہ تقریب پنجاب میں گرداسپور کے مغرب میں دریائے راوی کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قصبے کلانَور میں انجام پائی۔

5.3 اکبر کی ابتدائی فتوحات (Akbar's Initial Victories)

چاروں طرف سے دشمنوں اور حریفوں سے گھرے ہونے کی بنا پر اکبر کی حیثیت بہت ہی نازک تھی۔ اسے کئی مضبوط دشمنوں سے نمٹنا تھا۔ پنجاب میں یہ سکندر شاہ سوری تھا جو ایک سنگین خطرہ تھا۔ اسے منکوٹ کے قلعے میں گھیر لیا گیا، اور اس نے مئی 1557 میں ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے رحم کی بھیک اور اپنی جان کی امان مانگی اور بطور عطیہ کچھ زمین حاصل کر لی۔ اسی سال یعنی 1557 میں مغل تخت کا ایک اور مضبوط دعویدار محمد عادل شاہ بنگال کی طرف پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوا، جہاں وہ بنگال کے حکمران کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن سب سے سنگین چیلنج ہیم چندر کی طرف سے آیا، جسے ہیمو کے نام سے جانا جاتا تھا، اور اس سے نمٹنا ایک بے حد مشکل کام تھا۔

5.3.1 پانی پت کی دوسری جنگ (Second Battle of Panipat, 5 November 1556)

ہیمو کا آغاز بڑی نچلی سطح سے ہوا لیکن اس نے تیزی سے ترقی پائی۔ اس کا تعلق دہلی کے قریب اَلوَر سے تھا اور وہ ہیم چندر کے نام سے معروف تھا۔ ابوالفضل کے مطابق وہ نمک (saltpeter) فروخت کرتا تھا۔ اسلام شاہ نے اس کی قابلیت کو پہچانتے ہوئے اسے دہلی بازار کا

نگران مقرر کیا۔ عادل شاہ نے جب اسلام شاہ کے بیٹے کا تخت الٹ دیا تو یہ ہیمو ہی تھا جس نے حکومت چلائی کیونکہ عادل شاہ عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ اگرچہ ابوالفضل نے ہیمو کا یہ کہتے ہوئے مذاق اڑایا کہ اس کے پاس 'نہ رتبہ ہے، نہ نسل، نہ خوبصورتی اور نہ ہی عمدہ خصوصیات'، ہیمو نے ایک ماہر مدبر اور عظیم جرنیل کے طور پر اپنی قابلیت ثابت کی۔ اس نے اپنے آقا عادل شاہ کے لیے بائیس فتوحات حاصل کیں۔ ہیمو کے پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی: وہ کسی بڑے گھرانے سے نہیں آیا تھا اور بنیا ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمایوں کی موت سے حوصلہ پا کر ہیمو اپنے آقا عادل شاہ کے صدر مقام چنار سے نکل گیا۔ اکتوبر 1556 میں اس نے آگرہ پر حملہ کر دیا اور مغل فوج کو شکست دی اور اس کے بعد دہلی پر حملہ آور ہوا۔ جان کے خوف سے مغل کمانڈر تردی بیگ خان فرار ہو گیا۔ ہیمو دہلی میں داخل ہوا اور اس نے وکرمادتیہ کا لقب اختیار کیا۔ اگرچہ مغل افواج کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ کابل کی جانب پسپائی اختیار کر رہے تھے، اکبر اور بیرم خان نے ان کا اعتماد بڑھا دیا۔ انہوں نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا اور ہیمو سے لڑنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ بد دل مغل افسران کو سنگین نتائج سے آگاہ کرتے کرنے کے لیے، بیرم خان نے تردی بیگ کو بزدلی اور فرائض سے غفلت کے الزام میں پھانسی دے دی کیونکہ وہ ہیمو کے خلاف لڑے بغیر دہلی سے بھاگ گیا تھا۔ اس سے مغل افسر دہشت زدہ ہو گئے اور وہ بلا چوں چرا احکام کی تعمیل کرنے لگے۔

5 نومبر 1556 کو مغل فوج، پانی پت کے تاریخی میدان جنگ میں ہیمو کی فوج کے دوبدو آئی۔ ہیمو جنگ جیتنے ہی والا تھا، لیکن قسمت اس کے حق میں نہیں تھی۔ ایک حادثے نے ہیمو اور اکبر دونوں کی تقدیر بدل دی۔ ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں لگا اور اس کی کھوپڑی کے پار گزر گیا جس سے وہ بے حس و حرکت ہو کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی اس کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ نیم مردہ ہیمو کو اکبر اور بیرم خان کے سامنے لایا گیا۔ بیرم خان نے ہیمو کے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکبر سے کہا: 'یہ تمہاری پہلی جنگ ہے۔ اس بے دین پر اپنی تلوار چلاؤ، کیونکہ یہ ایک نیک عمل ہوگا۔' لیکن اکبر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: 'اب وہ ایک مردہ آدمی سے زیادہ کچھ نہیں، میں اسے کیسے مار سکتا ہوں؟ اگر اس میں عقل اور طاقت ہوتی تو میں اپنی تلوار آزماتا۔' اس کے بعد بدایونی کے مطابق بیرم خان نے خود ہیمو کا سر قلم کر دیا۔ اس کا سر انعام کے طور پر کابل بھیجا گیا تھا، اور اس کا دھڑ دہلی میں بھیج دیا گیا جہاں اسے بطور عبرت ایک کھمبے پر لٹکا دیا گیا۔

ہیمو اور اکبر کا جھگڑا ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہیں تھا۔ یاد رہے کہ ہیمو نے افغان سلطانوں کی خدمت کی جو مسلمان بھی تھے۔ مورخ جے ایل مہتا نے لکھا ہے کہ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھا، جس میں سینکڑوں افغان رئیس اور ان کے ذاتی دستے شامل تھے۔ پانی پت کی دوسری جنگ نے جہاں دہلی میں مغلوں کو دوبارہ استحکام بخشا وہیں اس کے دور رس نتائج نکلے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اس طرح، تخت پر فائز ہونے کے اٹھارہ مہینوں کے اندر، اکبر کے عہدہ کے لیے تین سنگین ترین خطرات، سکندر شاہ، عادل شاہ اور ہیمو کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس نے اکبر اور بیرم خان کو مزید آگے بڑھنے کی ترغیب دی اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اجمیر کا قلعہ مغلوں نے 1558 میں بغیر کسی لڑائی کے جیت لیا۔ گوالیار کا قلعہ 1559ء میں فتح ہوا، 1560ء میں جونپور بھی قبضہ میں آ چکا تھا۔ یاد رہے کہ اکبر نے یہ سب کچھ بیرم خان کی سرپرستی میں حاصل کیا تھا۔

5.3.2 مالوہ کی فتح (Conquest of Malwa)

مالوہ، سوری سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ مالوہ کا گورنر شجاعت خان، محمد عادل شاہ سوری کے دور میں دہلی سے تقریباً آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے سارنگ پور سے حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد، اس کا بیٹا باز بہادر 1556 کے اوائل میں مالوہ کا حکمران بنا۔ اس نے شیر خوار بیٹے کی طرف سے حکومت کرنے والی رانی درگاوتی کے زیر اقتدار گونڈوانا پر حملہ کیا لیکن وہ یہ لڑائی ہار گیا۔ اس نے عورت کے ہاتھوں شکست کھانے کو انتہائی ذلت آمیز سلوک سمجھا، پدرانہ نظام اس کے دماغ پر چھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بنا پر اس نے ریاست کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر گیا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ اکبر نے مالوہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ 1560 میں، اس نے شاہی فوجیں آدھم خان کی کمان میں اور ملا پیر محمد خان کو نائب کماندار بنا کر بھیجیں۔ مغل فوجوں نے باز بہادر کو شکست دی اور مالوہ فتح کیا۔ باز بہادر خاندیش کی جانب فرار ہو گیا۔ مالوہ کی دولت، باز بہادر کے حرم کی مشہور خواتین سمیت آدھم خان کے ہاتھ لگ گئی۔ حرم کی سب سے زیادہ خوبصورت اور اسی لیے مشہور خاتون روپ متی نے اپنی عزت بچانے کے لیے خودکشی کر لی۔ آدھم خان کے مال غنیمت کے غلط استعمال اور اس کی خودسری نے اکبر کو اتنا مشتعل کیا کہ وہ سرپٹ مالوہ کی طرف دوڑا۔ اکبر کے اچانک سامنے آنے پر آدھم خان حیران رہ گیا۔ ماہم انگا، جو آدھم خان کی ماں اور اکبر کی دائی تھی، نے اکبر کے غضب کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے درحقیقت اپنے بیٹے کے پاس قاصد بھیجے تھے، لیکن اس سے پہلے کہ ماہم کے قاصد اس کا پیغام اس کے بیٹے تک پہنچا سکیں، اکبر سارنگ پور پہنچ گیا۔ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے، وہ خود وہاں پہنچی اور اپنے بیٹے کی جانب سے رحم کی درخواست کی۔ اکبر، جیسا کہ اس نے شاہی خاندان سے وابستہ بہت سے دیگر لوگوں کے ساتھ کیا تھا، نے آدھم خان کو بھی معاف کر دیا۔ آدھم خان کو مالوہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا اور ملا پیر محمد، جس نے مالوا کی فتح میں آدھم خان کے نائب کے طور پر کام کیا، کو اس کی جگہ پر رکھا گیا۔ اپنی اس ذلت پر آدھم خان نے مشتعل ہو کر شمس الدین اتکا خان کو قتل کر دیا جسے حال ہی میں اکبر نے ترقی دی تھی۔ اس نے اکبر کی بھی جان لینے کی کوشش کی تاہم اکبر خوش قسمتی سے بچ گیا اور اس نے آدھم خان کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں 40 روز بعد ماہم انگا بھی فوت ہو گئیں۔ باز بہادر دوبارہ منظر عام پر نمودار ہوا اور پیر محمد جسے آدھم خان کی جگہ مالوہ کا گورنر بنایا تھا، باز بہادر کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اکبر نے عبداللہ خان ازبک کی کمان میں ایک تازہ فوج بھیجی اور اس نے باز بہادر سے مالوہ دوبارہ واپس حاصل کر لیا۔ باز بہادر بھاگ کر میواڑ چلا گیا اور رانا اُدے سنگھ کے دربار میں پناہ لی۔ عبداللہ خان ازبک، جس نے اکبر کے لیے مالوہ کو دوبارہ حاصل کیا تھا، کو مالوا کا گورنر مقرر کیا گیا۔

5.3.3 باغی امرا اور بغاوتوں کا قلع قمع (Suppression of Disaffected Nobles, and Revolts)

ازبک، جن کی حکمران بابر کے خاندان سے روایتی دشمنی تھی، بار بار افراتفری پیدا کر رہے تھے اور ناقابل اعتماد ثابت ہو رہے تھے۔ پانی پت کی دوسری جنگ جیتنے میں اکبر کی مدد کرنے والے خان زمان ازبک کو جونپور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ خان زمان نے مشرقی ہندوستان سے افغان باغیوں کے حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور بہت بڑا مال غنیمت حاصل کیا، لیکن اکبر کو اس کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کیں اور اس کا بیشتر حصہ غلط استعمال کیا۔ اکبر حرکت میں آیا اور ذاتی طور پر جونپور کی طرف مارچ کیا۔ جب خان زمان نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی خطاؤں کے لیے معافی مانگی تو اکبر نے اسے معاف کر دیا۔ عبداللہ خان ازبک، جس نے اکبر کے لیے مالوہ پر دوبارہ قبضہ کیا اور بعد میں اس کا گورنر

مقرر ہوا، نے بغاوت کے اشارے دکھائے۔ اکبر ذاتی طور پر مالوہ پہنچا اور عبداللہ خان پر اچانک حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ مؤخرالذکر نے گجرات کے حکمران کے پاس پناہ لی۔ اکبر نے کارا بہادر خان کو مالوہ کا گورنر مقرر کیا اور آگرہ واپس آگیا۔ دیگر بہت سے امرا نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تاہم وہ دبا دیے گئے۔

5.4 اکبر اور مغل سلطنت کی توسیع (Akbar and the Expansion of Mughal Empire)

اکبر نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ فوجی مہمات میں گزارا۔ اسے جنگ میں اتنا ہی مزہ آتا تھا جتنا کہ جانوروں کے شکار میں۔ مغل بادشاہوں کے برعکس، وہ اکثر ذاتی طور پر اپنے دشمنوں کے خلاف جنگوں کی قیادت کرتا تھا۔ عہد وسطیٰ کا ایک بے رحم بادشاہ، جو زمین کا بھوکا تھا۔ اس کے مطابق، 'بادشاہ کو ہمیشہ فتح کا ارادہ رکھنا چاہیے، ورنہ اس کے دشمن اس کے خلاف ہتھیار اٹھا لیں گے۔ فوج کو جنگ میں استعمال کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ وہ تربیت کی کمی سے کند نہ بن جائیں۔' لہٰذا، اکبر میدان جنگ میں علاقوں کو فتح کرنے اور سلطنت کو پھیلانا چاہتا تھا۔ اکبر کے دور میں مغلوں کا علاقہ بہت تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ اس کی شروعات در حقیقت بیرم خان کے دور حکومت میں ہی ہوئی تھی۔

5.4.1 اکبر اور راجپوت سلطنتیں (Akbar and the Rajput Kingdoms)

راجپوتانہ کے علاقوں کو فتح کرنا اور راجستھان کے راناؤں کے دل و دماغ پر فتح حاصل کرنا اکبر کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ چند راجپوت سلطنتوں کے معاملے میں، شادی نے جنگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ حیرت انگیز کردار ادا کیا۔ اکبر صوفی خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے اجمیر کی جانب روانہ ہوا۔ یہ جنوری 1562 کی بات تھی۔ راستے میں امبر (موجودہ جے پور) کی راجپوت ریاست پڑتی تھی۔ امبر کے حکمران راجہ بہاری مل کچھواہا نے اکبر کے آگے خود سپردگی اختیار کی۔ وہ وہیں تک نہیں رکا۔ اس نے اکبر کو اپنی بیٹی سے شادی کی پیشکش کی۔ یہ دانشمندانہ اقدام امبر اور مغلوں دونوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ ایک بیوی کے علاوہ، اکبر کو راجہ مان سنگھ کی شکل میں ایک مضبوط فوجی جنرل ملا جو اس کی راجپوت بیوی کا بھتیجا، بھگوان داس کا بیٹا اور راجا بہاری مل کا پوتا تھا۔ اکبر نے ان کے ساتھ غیر معمولی طور پر اچھا سلوک کیا۔ ہندوستان کا مستقبل کا بادشاہ سلیم یعنی جہانگیر اسی شادی کا ثمر تھا۔ حرم میں راجپوت خواتین کی موجودگی نے اکبر پر خاص طور پر اس کے مذہبی نقطہ نظر کو وسیع کرنے میں بے حد اثر ڈالا۔ مغل فوجوں نے 1562 میں میرٹا کا قلعہ فتح کیا۔ میرٹا، جودھ پور کے راؤ مالدیو کے ایک نائب جے مل راٹھور کے پاس تھا۔ شدید لڑائی ہوئی جس میں دونوں طرف سے بھاری جانی نقصان ہوا۔ جے مل فرار ہو کر میواڑ چلا گیا جہاں اس نے رانا اُدے سنگھ کی ماتحتی اختیار کی جیسا کہ آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے، یہ جے مل ہی تھا جس نے چتور کا بہادری سے دفاع کیا اور اسے اکبر نے خود گولی مار کر ہلاک کیا۔

5.4.2 اکبر اور گونڈوانا کی رانی درگاوتی (Akbar and Rani Durgavati of Gondwana)

گونڈوانا پر مہوبا کی چندیل شہزادی رانی درگاوتی کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے نابالغ بیٹے ویر نارائن کی جانب سے حکومت کی۔ گونڈوانا جدید مدھیہ پردیش کے شمالی حصے میں تھا۔ چوراگڑھ اس کا دارالحکومت تھا۔ 1564 میں اکبر نے اپنی فوج کو گونڈوانا کی جانب بڑھنے کا

حکم دیا۔ حملہ آور مغل فوج 50,000 گھڑسواروں پر مشتمل تھی اور اس کی کمان آصف خان کے ہاتھوں میں تھی۔ دو دن تک بہادری سے لڑنے کے باوجود، رانی درگاوتی مغلوں کو زیر نہ کر سکی۔ وہ شدید زخمی ہو گئی اور اپنی عزت بچانے کے لیے خود کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر لیا۔ اس کا بیٹا بھی چوراگڑھ کا دفاع کرتے ہوئے شکست کھا گیا، جس پر مغل فوج نے حملہ کیا تھا۔

Alamy

A sketch of Akbar, c. 1600. Akbar did not want to die and was told that he would live several times the span of a normal life. But as he neared his sixties, the tireless emperor was ageing, whether he liked it or not. Artist unknown.

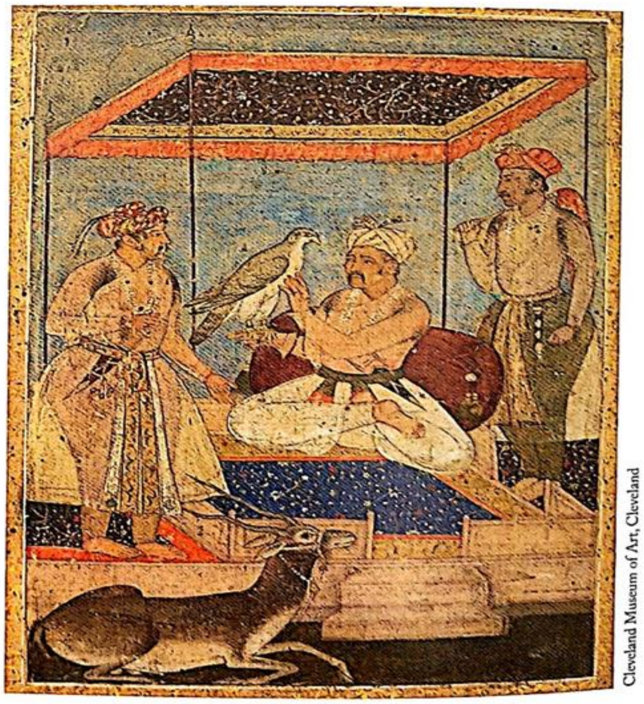

Cleveland Museum of Art, Cleveland

Akbar, Salim and Khusro, c. 1602–04. Salim has brought his father a trained falcon, but Akbar is no longer the young boy who derived such joy from his hunts. Instead, he looks a bit hunted himself, trapped between the ambitions of his lone remaining son, Salim, and his favourite grandson, Khusro (standing behind). Artist unknown.

Source: Parvati Sharma, *Akbar of Hindustan*, Juggernaut, New Delhi, 2022.

5.4.3 میواڑ پر قبضہ (Capture of Mewar)

اکبر چاہتا تھا کہ میواڑ کا رانا، اودے سنگھ (رانا سانگا کا بیٹا) اس کی حکمرانیت کو قبول کر لے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ رانا، اکبر کی حکمرانیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن اس نے خصوصی مراعات پر اصرار کیا جیسے بادشاہ کے سامنے ذاتی حاضری سے استثنیٰ اور مغل بادشاہ کو میواڑ کی شہزادی کی پیشکش نہ کرنا۔ ابوالفضل کے مطابق ایک غلط فہمی جنگ کا باعث بنی۔ صورت حال کچھ بھی ہو، میواڑ کی راجدھانی چتوڑ کو فتح کرنا اکبر کے لیے بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ رانا میں اکبر کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ لہٰذا، جیسے ہی مغل فوج نے میواڑ کی جانب پیش قدمی کی، وہ اپنے دو قابل جرنیلوں، جئے مل اور پٹہ کی کمان میں قلعہ کے دفاع کو چھوڑ کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ ان دونوں نے قلعہ کا بھرپور دفاع کیا۔ لیکن اکبر نے سنگرام نامی اپنی بندوق سے 23 فروری 1568 کو جئے مل کو گولی مار دی۔ راجپوت آخری جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور جوہر کی آگ جلائی گئی۔ جوہر کا مطلب یہ تھا کہ راجپوت ہار مان رہے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑنا چھوڑ رہے ہیں۔ ہر راجپوت دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے اپنے خون کے آخری قطرہ تک بہادری سے لڑتا رہا۔ راجپوتوں نے جو مزاحمت کی اس نے اکبر کو مشتعل کر دیا اور اس نے قلعہ میں لوگوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ابوالفضل کے مطابق، تقریباً 30,000 لوگ، جو زیادہ تر کسان تھے، جنہوں نے قلعہ میں پناہ لی تھی، قتل کر دیے گئے۔ چاہے تعداد میں مبالغہ آمیزی کی گئی ہو لیکن قتل عام کا حکم اکبر کے بے رحم پہلو کو صاف طور پر واضح کرتا ہے۔ مورخ ابراہم ایرالی (Abraham Eraly) کہتا ہے کہ 'یہ قتل عام محض انتقام نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بھی ایک پالیسی تھی۔ جتنی زیادہ مزاحمت، اتنی ہی بڑی انتقامی کارروائی، یہ مغلوں کا اصول تھا تا کہ ممکنہ مخالفین کے دلوں میں دہشت بٹھادی جائے اور ان کے لڑنے کے ارادے کو کمزور کر دیا جائے۔'

5.4.4 اکبر اور رانا پرتاپ (Akbar and Rana Pratap)

1572 میں اودے سنگھ فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے رانا پرتاپ نے، جو اس کا جانشین بنا، مغلوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ تاہم، شروع میں، وہ اکبر کا تابعدار بننے کی جانب مائل ہوا اور یہاں تک کہ اس نے اپنے بیٹے امر سنگھ کو مغل دربار میں بھی بھیجا لیکن اس نے ذاتی طور پر خود وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ متکبر اور سامراجی اکبر کا اصرار تھا کہ رانا پرتاپ کو ذاتی طور پر خود سپردگی کرنا چاہیے۔ رانا بھی اتنا ہی ضدی تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی تھیں جنہوں نے پہلے سے خراب ماحول کو مزید خراب کر دیا۔ چونکہ اکبر چاہتا تھا کہ رانا پرتاپ اس کا حلیف یا تابعدار بنے، اس نے امن کا معاہدہ کیا اور مان سنگھ کو رانا پرتاپ کی راجدھانی اودے پور بھیج دیا۔ اس نے رانا کو خلعت یا شاہی لباس بھی بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رانا نے مان سنگھ کا خیر مقدم کیا اور اس کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا۔ کرنل جیمز ٹوڈ (جس نے Annals and Antiquities of Rajasthan نامی کتاب لکھی) کے مطابق رانا پرتاپ خود جان بوجھ کر دعوت میں شامل نہیں ہوا۔ مان سنگھ نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ جب اس نے پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ سے پوچھا کہ اس کے والد کیوں موجود نہیں ہیں، تو اس نے جھوٹ بولا کہ اس کے والد کے سر میں درد ہے۔ مان سنگھ سمجھ گیا کہ یہ اس کے ساتھ کھانے سے بچنے کا محض ایک بہانہ ہے۔ اس نے اشارے سے رانا سے اتنے برے سلوک کی وجہ پوچھی جس پر رانا نے جواب دیا کہ وہ ایک ایسے راجپوت کے ساتھ نہیں کھا سکتا' جس نے اپنی بہن کو ایک ترک کو (شادی کے لیے) دے

دیا ہو اور جس نے شاید اس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہو'۔ آگ میں ایندھن ڈالتے ہوئے، میزبانوں میں سے کسی نے مان سنگھ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اگلی بار جب وہ وہاں جائے تو اپنا پھوپھا لے کر آئے۔ مان سنگھ کو بہت غصہ آیا اور اس نے جنگ میں رانا کے غرور کو کچلنے کا عہد کیا۔ مورخین کے مطابق ایک اور وجہ بھی تھی۔ اکبر کو جنون کی حد تک ہاتھی جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے رام پرساد نامی ایک عظیم ہاتھی کے بارے میں سنا تھا جس کا مالک رانا پرتاپ تھا۔ اکبر وہ ہاتھی لینا چاہتا تھا لیکن رانا نے اسے اکبر کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا۔

اصل وجوہات جو بھی ہوں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اکبر کسی بھی قیمت پر رانا پرتاپ کی خود سپردگی چاہتا تھا۔ جیسا کہ مان سنگھ کا امن مشن ناکام ہوا، اکبر نے فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ نتیجۃً ہلدی گھاٹی کی مشہور جنگ تھی جو 18 جون 1576 کو لڑی گئی۔ مغل جیت گئے اور ادے پور پر قبضہ کر لیا۔ رانا پرتاپ جان بچانے کے لیے گھنے جنگلوں میں چلا گیا۔ لیکن اس نے کبھی ہمت نہ ہاری اور مغل اسے کچل نہ سکے۔ میواڑ کی مسلسل مزاحمت اس وقت ہی ختم ہوئی جب رانا پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ نے اکبر کے بیٹے جہانگیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ رانا پرتاپ کو اکثر ایک بہادر ہندو ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس نے غیر ملکی مسلمانوں یعنی مغلوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اسے منظم طریقے سے راجپوتوں کا محافظ اور اس لحاظ سے غالب مسلمانوں کے مقابلے ہندوؤں کے سپوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صرف خام خیالی ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے۔ پرتاپ اور اکبر کے درمیان کا جھگڑا بالکل بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کا تنازعہ نہیں تھا جیسا کہ زیادہ تر گمراہ ذہن سمجھتے ہیں اور اسے لٹریچر، لوک گیتوں، عام کتابوں اور عوامی تقریروں کے ذریعے تقویت پہنچاتے ہیں اور دروغ گوئی کرتے ہیں۔ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ رانا پرتاپ کی فوج کی ساخت ملی جلی تھی: اس میں راجپوت/ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ اس کی ایک بہترین مثال حکیم خان سور ہے، جو ایک مثالی افغان جنرل تھا جس نے رانا پرتاپ کے شانہ بشانہ جنگ لڑی۔ اسی طرح کئی راجپوت/ہندو (امبر، بیکانیر اور بنڈی سے) اکبر کے ساتھ تھے اور رانا پرتاپ کے خلاف لڑے۔ لٰہذا، پرتاپ اور اکبر کے درمیان لڑائی بالکل بھی مذہبی جنگ نہیں تھی جیسا کہ بہت سے لوگ اسے باور کروانا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ ابراہم ایرالی (Abraham Eraly) کا کہنا ہے کہ 'مغل اور میواڑ کا جھگڑا بنیادی طور پر اقتدار کی لڑائی تھی، جیسا کہ کسی بھی دو بادشاہوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں وقار (Honour) ضرور شامل تھا، لیکن یہ پرتاپ سنگھ کا ذاتی وقار تھا، راجپوت یا ہندو کا وقار نہیں۔'

5.4.5 رنتھمبور کی فتح (Conquest of Ranatambhor)

اپریل 1568 میں اکبر نے اپنی فوج کو راجپوتوں کے مضبوط گڑھ رنتھمبور کو فتح کرنے کا حکم دیا۔ میواڑ کا ایک جاگیردار سُرجَن رائے ہرا اس کا حکمران تھا۔ تاہم، مالوا میں مرزاؤں کی بغاوت کی بنا پر، اکبر نے حملہ آور فوج کو واپس بلا لیا۔ اس نے فروری 1569 میں رنتھمبور کے خلاف دوبارہ حملہ شروع کیا اور ذاتی طور پر فوج کی قیادت کی۔ چھ ہفتے تک سخت لڑائی ہوئی۔ سرجن رائے نے امن کی خواہش ظاہر کی اور 18 مارچ 1569 کو قلعہ حوالے کر دیا اور شاہی سرپرستی میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول اکبر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

5.4.6 کالنجر، جودھ پور، بیکانیر اور جیسلمیر کی اطاعت
(Submission of Kalinjar, Jodhpur, Bikaner, and Jaisalmer)

چتوڑاور رنتھمبور کے زوال نے دوسرے راجپوت حکمرانوں کو خوفزدہ کردیا۔ اکبر نے بندیل کھنڈ میں کالنجر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس پر ریوا کے راجہ رام چندر کی حکومت تھی۔ اگست 1569 میں، مجنون خان کی قیادت میں، مغل فوجوں نے کالنجر کا محاصرہ کیا۔ راجہ رام چندر سخت مزاحمت نہ کر سکا اور مغل سلطنت کے سامنے پیش ہو گیا۔ کالنجر کو مغل سلطنت کا حصہ بنالیا گیا اور راجہ کو باعزت طور پر الہ آباد کے قریب ایک جاگیر عطا کردی گئی۔ کالنجر کے سقوط نے دوسرے راجپوت راجاؤں کی خود سپردگی کو تیز کردیا۔ نومبر 1570 میں دو راجپوت حکمرانوں نے اکبر کے اقتدار کو قبول کیا۔ ایک جودھ پور کے راجہ مالدیو کا بیٹا راجہ چندر سین تھا۔ دوسرے بیکانیر کا راجہ کلیان مل تھا۔ اکبر کو ان کے تابع کرنے میں امبر کے راجہ بھگوان داس نے سہولت فراہم کی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، بھگوان داس اکبر کا برادر نسبتی اور مستقبل کے مغل بادشاہ جہانگیر کا ماموں تھا۔ اکبر نے بیکانیر کے حکمران خاندان کی شہزادی سے شادی کی اور کلیان مل کے بیٹے رائے سنگھ کو مغلوں کی سرپرستی میں لے لیا۔ دسمبر 1570 میں، جیسلمیر کے حکمران راول ہر رائے نے اکبر کی حکمرانیت کو تسلیم کیا اور اپنی بیٹی کی اکبر سے شادی کی پیشکش بھی کی۔ اس طرح، 1570 کے آخر تک، میواڑ اور اس کی نمک خوار ریاستوں ڈنگار پور، بانسواڑہ اور پرتاپ گڑھ کو چھوڑ کر پورا راجپوتانہ مغل سلطنت کے تسلط میں آگیا۔

5.4.7 گجرات کی فتح (Conquest of Gujarat)

1537 میں بہادر شاہ کی موت کے بعد گجرات کے سیاسی حالات افراتفری کا شکار ہوگئے۔ یہ حالات باغی مرزاؤں کے وہاں پناہ لینے کے لیے سازگار ثابت ہوئے۔ 1572 میں، گجرات میں کوئی مضبوط حکومت نہیں تھی اور اس کا حکمران، مظفر شاہ سوم، کافی غیر مقبول تھا۔ تقریباً نصف درجن جاگیر دار سرداروں نے اس کے اقتدار کو ماننے سے انکار کردیا۔ جولائی 1572 میں،، مظفر شاہ سوم کے سیاسی مخالفین میں سے ایک، اعتماد خان نے اکبر سے مدد کی اپیل کی۔ اکبر نے نہ صرف مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور خان کلاں (یعنی مرزا محمد خان اٹکا) کی سربراہی میں فوج بھیجی بلکہ ساتھ ہی ذاتی طور پر بھی گجرات کے دارالحکومت احمد آباد کی طرف کوچ کیا۔ احمد آباد کا قلعہ بغیر کسی لڑائی کے ہاتھ آگیا۔ مظفر شاہ کو گرفتار کرلیا گیا لیکن اکبر اس سے نرمی سے پیش آیا۔ اعتماد خان مغلوں کا حلیف بن گیا۔ جیسے ہی مظفر شاہ اور اعتماد خان دونوں نے بغاوت کے آثار ظاہر کیے، اکبر نے انہیں قید کردیا اور مرزا عزیز کوکا کو گجرات کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد اکبر نے گجرات کے کئی دوسرے علاقوں کو فتح کیا۔ گجرات میں ایک مناسب شہری انتظامیہ کا بندوبست کرنے کے بعد، اکبر مارچ 1573 میں سیکری واپس آیا اور شاندار طریقے سے فتح کا جشن منایا۔ تاہم، اکبر کی گجرات کی پریشانیاں ختم نہیں ہوئیں۔ اکبر کی واپسی کے چھ ماہ کے اندر اندر، محمد حسین کی قیادت میں، گجرات میں سرکش لوگوں نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کردی۔ انہوں نے نہ صرف گجرات کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا بلکہ احمد آباد کے قلعے میں مغل گورنر کا محاصرہ بھی کرلیا۔ اس خبر نے اکبر کو مشتعل کردیا اور اس نے دوسری بار گجرات کی طرف کوچ کیا۔ وہ اس تیزی سے گجرات پہنچا کہ سیکری سے نکلنے کے 11 دنوں کے اندر اندر وہ 450 میل کا فاصلہ طے کرکے سابرمتی کے کنارے پر موجود تھا۔(اس نے

23اگست 1573 کو اپنے سفر کا آغاز کیا اور 2 ستمبر 1573 کو وہاں پہنچا۔ عہد وسطیٰ کے لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی تیز رفتاری تھی) غضبناک اکبر نے ایک طوفانی حملہ کیا اور باغیوں کو کاٹ اور کچل دیا۔ امن وامان کی بحالی کے بعد وہ سیکری واپس آ گیا۔

5.4.8 بہار اور بنگال کی فتح (Conquest of Bihar and Bengal)

بہار اور بنگال شیر شاہ کے دور میں سوری سلطنت کے گڑھ تھے۔ اس کی موت کے بعد، بہار کے افغان گورنر سلیمان کرّانی نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور بنگال اور اڑیسہ کے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کا صدر مقام ٹانڈہ تھا۔ 1568 میں اس نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ سلیمان کی موت کے بعد افغان امرا نے اس کے بڑے بیٹے اور جانشین بایزید کو قتل کر کے سلیمان کے دوسرے بیٹے داؤد کو تخت پر بٹھایا۔ اکبر داؤد کے باغی رویے سے ناخوش تھا کیونکہ اس نے اکبر کو اپنی تخت نشینی سے مطلع نہیں کیا نہ ہی اس نے مغل سلطنت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ اکبر نے جونپور کے مغل گورنر منیم خان کو داؤد پر حملہ کرنے اور بہار فتح کرنے کا حکم دیا۔ شروع میں داؤد نے ہار مان لی لیکن جلد ہی اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور غازی پور میں مغل چوکی پر حملہ کر دیا۔ داؤد کے پاس ایک بڑی فوج تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ مغلوں کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اکبر نے ذاتی طور پر مغل فوج کی قیادت کی، داؤد کو اگست 1574 میں پٹنہ میں شکست ہوئی، اور بہار کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ شکست خوردہ داؤد، بنگال بھاگ گیا۔ جب منیم خان نے داؤد کا پیچھا کیا تو اس نے اڑیسہ میں پناہ لی۔ منیم خان کی خراب صحت کی وجہ سے وہ داؤد کے خلاف اپنی مہم جاری نہیں رکھ سکا۔ منیم خان کی موت کے بعد، داؤد نے ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے، وہ اگست 1576 میں مغلوں کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کا کٹا ہوا سر اکبر کو بطور یادگار بھیج دیا گیا۔ اس طرح بنگال مغلوں کے مضبوط تسلط میں آ گیا۔

5.4.9 کشمیر کی فتح (Conquest of Kashmir)

اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کے ایک حصے کے طور پر، اکبر چاہتا تھا کہ کشمیر مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں ہو۔ اکبر نے مطالبہ کیا کہ کشمیر کا سلطان اس کی اطاعت قبول کر لے۔ اس پر مثبت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کشمیر کے سلطان یوسف خان نے 1581 میں اپنے ایک بیٹے کے ذریعے اکبر کو ٹالنے کی کوشش کی۔ 1585 میں اکبر شمال مغربی سرحد پر تھا۔ اس نے راجہ بھگوان داس، شاہ قلی محرم اور کئی دیگر امرا کو کشمیر فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مغل فوج دسمبر 1585 میں اٹّوک سے نکلی، یہ کشمیر کے سلطان کے لیے ایک مشکل صورتحال تھی اور اس کے پاس امن کی پیشکش کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ مغل کچھ شرائط پر امن کے لیے راضی ہوئے۔ مذکورہ شرائط کے مطابق، کشمیری سلطان کو سکوں کو اکبر کے نام پر ڈھالنا اور اس کے نام پر خطبہ دینا تھا۔ مزید برآں، مغل افسروں کو کشمیری ٹکسال، زعفران کی کاشت اور شالوں کی تیاری وغیرہ کو اپنے ماتحتی میں لینے کی اجازت دی گئی۔ اپنے بڑے بیٹے، یعقوب کے ساتھ، کشمیر کا سلطان مغل ایلچی کے ساتھ اکبر کو ذاتی طور پر خراج پیش کرنے کے لیے گیا لیکن توسیع پسند اکبر کا خیال مختلف تھا، وہ کسی بھی قیمت پر کشمیر کا الحاق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے متکبرانہ انداز میں برتاؤ کیا اور یوسف خان کو گرفتار کر لیا۔ تاہم سلطان کا بیٹا یعقوب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یعقوب نے مزاحمت کی اور چند لڑائیاں لڑیں۔ اکبر کو وادی

کو زیر کرنے کے لیے تازہ فوج بھیجنی پڑی۔ بے رحم مغلوں نے یعقوب کو پکڑ لیا اور باپ بیٹے دونوں کو قیدی بنا کر بہار بھیج دیا۔ وہ دونوں اسیری میں ہی مر گئے۔ کشمیر کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا اور اسے کابل کے صوبہ کی سرکار بنا دیا گیا۔

5.4.10 سندھ کی فتح (Conquest of Sind)

1574 کے اوائل میں، اکبر نے بالائی سندھ کو فتح کر لیا تھا، جن میں بھکر کا جزیرہ قلعہ بھی شامل تھا۔ 1590 میں اکبر نے عبدالرحیم خانخاناں کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ اس نے اسے سندھ کی فتح کو دریائے سندھ تک مکمل کرنے کی ہدایت کی۔ ترکمان سردار مرزا جانی بیگ، نچلی وادی سندھ پر حکومت کر رہا تھا۔ مغل فوج نے ٹھٹھا کا محاصرہ کر لیا اور سہوان پر بھی حملہ کیا۔ جانی بیگ نے چند ماہ تک سخت مزاحمت کی لیکن اسے شکست ہوئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے علاقے مغل سلطنت میں ملا لیے گئے۔ تاہم اکبر نے جانی بیگ کی شخصیت اور کردار کی تعریف کی۔ لہذا، اس نے اسے مغل سلطنت میں تین ہزاری کا منصب پیش کیا۔ جانی بیگ نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جانی بیگ، اکبر کے دین الٰہی کا رکن بنا اور اکبر کی محبت اور شفقت حاصل کی۔

5.4.11 اڑیسہ کا الحاق (Annexation of Orissa)

1580 کی دہائی کے آخر میں اکبر نے مان سنگھ کو حکم دیا کہ مغل سلطنت کو اس کی مشرقی سرحدوں کی جانب وسعت دی جائے۔ اڑیسہ پر لوہانی قبیلے کے ایک افغان خاندان کی حکومت تھی۔ 1590 میں اکبر نے اڑیسہ پر حملہ کیا۔ اس کے حکمران نثار خان نے ہتھیار ڈال دیے۔ پوری کے علاقے بشمول بھگوان جگن ناتھ کے مشہور مندر کو فتح کر لیے گئے۔ جب 1592 میں نثار خان دوبارہ اپنا سر اٹھاتا ہوا نظر آیا تو مان سنگھ نے دوسری مہم کی قیادت کی، نثار خان کو شکست دی اور اڑیسہ کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اسے بنگال کی ایک سرکار بنا دیا گیا۔

5.4.12 بلوچستان کی فتح (Conquest of Baluchistan)

بلوچستان کی فتح اکبر کی شمال مغرب میں توسیع پسندانہ پالیسی کا حصہ تھی۔ درحقیقت، مارچ 1586 کے اوائل میں، اکبر تقریباً 6 بلوچ سرداروں کو مغل دربار میں حاضری دینے اور اپنے اقتدار کو تسلیم کرانے میں کامیاب رہا۔ اس نے میر معصوم کو بلوچستان فتح کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ 'تاریخ سندھ' نامی کتاب کا مصنف میر معصوم ایک مشہور مورخ تھا جس نے 'تلوار اور قلم یکساں خوش اسلوبی سے چلائے۔' بلوچستان پر، پنی (Pani) افغانوں کا قبضہ تھا۔ میر معصوم نے سبی (سیوی) نامی بلوچ قلعے پر حملہ کیا، جو کوئٹہ کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ اس جنگ میں معصوم نے انہیں شکست دی اور ساتھ ہی اس نے تدبیر سے کام لیا۔ وہ انہیں شاہی سرپرستی کو قبول کرنے کے فوائد کے بارے میں قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ معصوم کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس کے نتیجے میں ساحلی علاقے مکران سمیت پورا بلوچستان، قندھار کی سرحدوں تک مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔

5.5 دکنی فتوحات (Deccan Conquests)

5.5.1 برار، احمد نگر اور خاندیش کی فتح (Conquest of Berar, Ahmednagar, and Khandesh)

شمالی ہندوستان میں اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے بعد مغلوں نے جنوب کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جغرافیائی نقطہ نظر سے شمال اور جنوب ایک دوسرے سے الگ تھے۔ دونوں کے درمیان ایک جغرافیائی حد فاصل تھی جو اور کہیں نہیں ملتی۔ لیکن یہ ایسی سرحد نہیں تھی جس کے پار افراد اور خیالات کا آنا جانا نہ ہو سکے تاکہ کسی حد تک دونوں کے درمیان ثقافتی اور جغرافیائی اتحاد قائم رہے۔ لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان ایک دوسرے سے الگ تھے کیونکہ دونوں میں اقتدار کی نوعیت مختلف تھی اور جغرافیای رکاوٹ تھی۔ مورخ بنی پرساد مغلوں کی جنوب کے لیے اپنائی جانے والی پالیسی کیلیے جغرافیائی حقائق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ نظریہ تھا کہ پورے ملک میں ہمالیہ سے کنیاکماری تک ایک ہی طرح کا سیاسی نظام ہو لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہاں علاقائیت اور جارحیت ہمیشہ بنی رہتی تھی۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا ہے کہ شمال ہی اکثر جارحیت پسند ہوتا تھا۔ جنوب میں فطرت نے ایک ایسا سیاسی نظام فروغ دیا جہاں اقتدار ایک ہی اکائی میں مرکوز نہیں ہو سکتا تھا جبکہ شمال میں ایک طاقت کے عروج کے ذریعے پورے شمال کو ایک ہی سیاسی نظام میں لانا ممکن ہو گیا لیکن زندہ رہنے کے لیے اسے اپنی توسیع کرنا ضروری تھا اور توسیع کے لیے سب سے بہترین علاقہ جنوب تھا۔ جب جنوبی ہندوستان کمزور اور بٹا ہوا تھا اس وقت شمالی ہندوستان میں ایک بڑی طاقتور ریاست کا عروج ہو رہا تھا۔ ایسی صورتحال میں اس بات کا پورا امکان تھا کہ شمال کی طرف سے جنوب پر حملہ ہو۔ جب جنوب کم دباؤ والا علاقہ ہو گیا تو وہاں باہری طاقت کا آنا فطری امر تھا۔ بنی پرساد کے مطابق 'یکسانیت (homogeneity) کے عناصر نے ہمیشہ شمال اور جنوب کو ایک دوسرے کے اوپر قبضہ کرنے کی تحریک دی ہے اور غیر جنسیت (heterogeneity) کے عناصر نے انہیں ایسا کرنے سے روکا ہے۔' اس لیے مالوہ اور گجرات کی فتح کے بعد اکبر جنوب کی سیاست میں مداخلت نہ کرتا، یہ ناممکن تھا۔ 1576 میں ایک مغل فوج نے خاندیش پر حملہ کیا اور اس کے حکمراں کو اطاعت قبول کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اسی درمیان جنوب کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ جنوبی ریاستوں میں باہمی لڑائیوں سے جنوب کی سیاست میں ابال آ رہا تھا۔

اکبر کو پورے ملک پر فرمانروائی کا دعوی تھا اس لیے وہ یہ چاہتا تھا کہ راجپوت راجاؤں کی طرح دکنی ریاستوں کے حکمران بھی اس کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس سے پہلے اس نے اپنا ایک ایلچی بھیج کر دکنی ریاستوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کے اقتدار کو قبول کر کے اس سے دوستی کر لیں۔ لیکن اس کے مشورے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ جب تک مغل سلطنت فوجی دباؤ نہیں ڈالے گی دکنی ریاستیں مغلوں کی اطاعت قبول نہیں کریں گی۔ 1591 میں اکبر نے ایک سفارتی مہم شروع کی۔ اس نے تمام دکنی ریاستوں کو مغلوں کی ماتحتی قبول کرنے کی دعوت دی۔ حسب توقع کسی بھی ریاست نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا البتہ خاندیش نے یہ دعوت قبول کر لی کیونکہ دوسری دکنی ریاستوں کی بنسبت خاندیش مغلوں کے قریب تھا اور اسے مغلوں کی طرف سے برابر خطرہ تھا۔ احمد نگر کے حکمران برہان نظام شاہ نے مغل ایلچی کے ساتھ بہت سخت سلوک کیا جبکہ دوسری دکنی ریاستیں دوستی کا وعدہ کر کے معاملے کو ٹال گئیں۔ یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اکبر نے دکن کے سلسلے میں کسی خاص اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ 1595 میں برہان نظام شاہ کی موت کے بعد نظام شاہی امراء میں آپس کی لڑائی

پھوٹ پڑی جس سے اکبر کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ ہوا یہ تھا کہ برہان نظام شاہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین متعین کیا تھا، لیکن بیجاپور احمد نگر کے بیچ ہوئی ایک جنگ میں اس کی موت ہوگئی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی تخت شاہی کے چار دعوے دار پیدا ہوگئے جنہیں چار مختلف گروہوں کی تائید حاصل تھی۔ سب سے مضبوط دعوی بہادر نظام شاہ کا تھا جو کہ مرحوم حکمراں کا بیٹا تھا۔ بیجاپور کا حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی بہادر کے دعوے کی تائید میں تھا جس کی حمایت عادل شاہ اول کی بیوہ چاند بی بی بھی کررہی تھی جو کہ برہان نظام شاہ کی بہن تھی۔ وہ ایک ممتاز خاتون تھی جو ابراہیم عادل شاہ کی کم سنی کے زمانے میں دس سال تک بیجاپور کی اصل حکمراں رہ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی برہان کی تعزیت کے لیے آئی تھی لیکن وہاں اپنے بھتیجے بہادر کی تائید کے لیے اسے رکنا پڑا۔ دوسرا دعوی اخلاص خان کے گروہ کا تھا۔ اس نے موتی نامی ایک لڑکے کو لاکر اسے سلطان منتخب کردیا تھا۔ تیسرے گروہ کی قیادت ایک حبشی سردار ابھنگ خان نے کی اور برہان نظام شاہ اول کے بیٹے شاہ علی کی حمایت کی۔ چوتھا فریق احمد کی حمایت کررہا تھا جس کی قیادت میاں منجھو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بہادر کو پکڑ کر اسیر بنالیا تھا، لیکن یہ جلد ہی پتہ چل گیا کہ احمد سچا وارث نہیں تھا اور اخلاص خان کی کڑی مخالفت کی وجہ سے میاں منجھو کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ اس نے احمد نگر شہر میں پناہ لی اور اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد سے مدد مانگی جو اس وقت گجرات کا صوبے دار تھا۔ اکبر نے احمد نگر پر حملہ کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کرلیا تھا۔ میاں منجھو کے ذریعے مدد مانگنے پر اکبر کو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے مناسب موقع مل گیا اور شہزادے نے خاندیش کے حکمراں رضا علی خان اور عبدالرحیم خانخاناں کو ساتھ لے کر 1595 میں احمد نگر کی طرف کوچ کیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں حریف پارٹی کے لیڈروں نے مغلوں کو مداخلت کی دعوت دے دی۔ اس طرح اب جو جدوجہد شروع ہوئی وہ دراصل احمد نگر پر غلبہ کے لیے مغلوں اور بیجاپور کے مابین جدوجہد تھی۔ احمد نگر کے امراء چونکہ آپس میں ہی الجھے ہوئے تھے اس لیے مغل فوج کو بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس طرح مغل فوجیں راجدھانی احمد نگر تک پہنچ گئیں۔ چاند بی بی اپنے بھتیجے اور کمسن بادشاہ بہادر کے ساتھ قلعہ میں محصور ہوگئی۔ چار ماہ تک قلعہ کا محاصرہ رہا جس کے دوران چاند بی بی نے عظیم حوصلے اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ چار ماہ بعد ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ مغل بہادر کے دعوے کو تسلیم کرلیں گے اور اس کے بدلے میں برار کا علاقہ مغلوں کو مل جائے گا۔ اس طرح 1596 میں مغلوں کا اقتدار بھی قبول کرلیا گیا۔

چاند بی بی کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مغلوں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ مغلوں نے احمد نگر کے علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا جن میں پتھری بھی شامل تھا۔ اسے احمد نگر کو ابھی واپس نہیں کیا گیا تھا۔ جبکہ برار کے دو قلعے غالب گڑھ اور نرنالہ، احمد نگر کے افسروں کے قبضے میں تھے۔ اس لیے لڑائی پھر سے شروع ہونے کے اسباب تو پہلے سے ہی موجود تھے۔ محمد خان کے ذریعے مغلوں سے مدد کی درخواست کرنے پر حملے کا دوسرا بہانہ بھی مل گیا۔ مغل سلطنت میں برار کے انضمام سے دکنی ریاستیں ہوشیار ہوگئیں۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ برار حاصل ہوجانے کے نتیجے میں دکن میں مغلوں کے قدم جم جائیں گے اور وہ کسی بھی وقت پیش قدمی کی حیثیت میں آجائیں گے۔ یہ خدشہ بے وجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ احمد نگر کی حامی ہوگئیں اور مغلوں کے ذریعے برار کے الحاق کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں۔ جلد ہی بیجاپور کے ایک کمان دار جمال خان کی قیادت میں بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر کی ایک بڑی اور مشترکہ فوج نے برار پر حملہ کردیا۔ 1597 کی زبردست جنگ میں مغل فوج نے اپنے سے تین گنی دکنی فوج کو شکست دے دی۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں اور چاند بی بی

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل اکیلی رہ گئی۔ حالانکہ چاند بی بی 1596 کے معاہدے کی پابندی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنے ان امیروں کو قابو میں نہیں رکھ سکی جو مغلوں کو پریشان کرنے کے لیے ان پر برار میں برابر حملے کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے احمد نگر کے قلعے کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔ کسی جگہ سے بھی کمک نہ ملنے کی وجہ سے چاند بی بی نے مغلوں کے ساتھ سمجھوتے کی بات شروع کی۔ لیکن مخالف گٹوں نے اس پر غداری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیا۔ اس طرح دکن کی سیاست کے ایک بہت ہی رومانوی کردار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد مغلوں نے احمد نگر قلعے پر حملہ کر کے 1600 میں اس پر فتح حاصل کر لی۔ نوعمر سلطان بہادر کو گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ بالا گھاٹ کو بھی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ احمد نگر میں مغل چھاونی قائم کر دی گئی۔

احمد نگر کی شکست اور بہادر نظام شاہ کو قیدی بنا لینے سے دکن میں اکبر کے مسائل کا خاتمہ نہیں ہو گیا کیونکہ وہاں اب کوئی ایسا نظام شاہی شہزادہ یا امیر باقی نہیں بچا تھا جسے کافی تائید اور حمایت حاصل ہوتی اور جو اکبر کے ساتھ صلح کی بات چیت کر سکتا۔ اس کے علاوہ مغل، احمد نگر سے آگے بڑھنے یا ریاست کے باقی ماندہ علاقوں کو زیر تسلط لانے کے بھی خواہش مند نہیں تھے۔ مغل امیروں کی آپسی تکرار سے صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔ اکبر صورت حال کا بچشم خود جائزہ لینے کے لیے پہلے مالوہ اور پھر خاندیش کی طرف بڑھا۔ وہاں اسے یہ معلوم ہوا کہ خاندیش کے نئے سلطان نے شہزادہ دانیال کا مناسب طریقے پر احترام نہیں کیا تھا جبکہ وہ خاندیش کے علاقے سے گذر کر احمد نگر جا رہا تھا۔ اکبر خاندیش میں واقع اسیر گڑھ کے قلعے کو بھی اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ قلعہ دکن کا مضبوط ترین قلعہ مانا جاتا تھا۔ قلعے کے مضبوط محاصرے اور اندرو با پھوٹ پڑنے کی وجہ سے 1601 میں خاندیش کے سلطان کو قلعے سے باہر آنا پڑا اور ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس طرح خاندیش کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس دوران شہزادہ دانیال نے جو کہ اکبر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور جس کے ہاتھوں میں دکن میں موجود تمام فوجوں کی کمان تھی، مرتضی نظام شاہ دوم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ مرتضی نظام شاہ کو احمد نگر کے زوال کے بعد نظام شاہی امیروں کے ایک گروہ نے سلطان قرار دے دیا تھا۔ معاہدے کے مطابق 1601 میں بالا گھاٹ اور تلنگانہ کے کچھ علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے گئے اور ریاست کے باقی حصے کو اس شرط کے ساتھ مرتضی نظام شاہ کے قبضے میں رہنے دیا گیا کہ وہ کبھی سرکشی نہیں کرے گا۔ اسیر گڑھ پر قبضے کے بعد اکبر شہزادہ سلیم کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے شمال کی طرف واپس لوٹ آیا۔ اگرچہ خاندیش، برار اور بالا گھاٹ کی فتح اور احمد نگر کے قلعے پر مغلوں کا قبضہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن مغلوں کو دکن میں ابھی اپنی حیثیت کو اور بھی مضبوط کرنا باقی تھا۔ اکبر کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ بیجاپور کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیے بغیر دشمن کے مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو یقین دہانی کرانے کے لیے اس کے پاس پیغامات بھیجے۔ سلطان عادل شاہ نے شہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی تجویز رکھی جو قبول کر لی گئی۔ لیکن شادی کے فوراً ہی بعد 1602 میں زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے شہزادہ دانیال کی موت ہو گئی۔ اس طرح دکن کی صورت حال غیر واضح اور پیچیدہ ہی رہی جس سے بعد میں اکبر کے جانشین جہانگیر کو نمٹنا پڑا۔

5.5.2 ملک عنبر کا عروج اور سلطنت کے استحکام میں مغلوں کی ناکامی

(The Rise of Malik Ambar and the Failure of Mughals to Stabilize the Empire)

احمد نگر کے زوال نیز ضابطوں (نظام شاہی افسروں) کے ہاتھوں بہادر نظام شاہ کے قیدی بنا لیے جانے کے بعد غالب امکان یہی تھا کہ احمد نگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور اس کے مختلف حصوں پر آس پاس کی ریاستیں قبضہ کر لیتیں۔ لیکن ملک عنبر کی شکل میں ایک قابل شخص کے عروج کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ملک عنبر ایک حبشی تھا جس کی پیدائش ایتھوپیا میں ہوئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے نادار والدین نے اسے بغداد کے غلام بازار میں فروخت کر دیا تھا جسے بعد میں ایک تاجر خواجہ بغدادی نے خرید لیا اور اپنے ساتھ دکن لے آیا جہاں کی خوش حالی اس وقت میں چاروں طرف کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بغدادی نے اسے احمد نگر میں چنگیز خان کے ہاتھوں بیچ دیا، جو کہ مرتضیٰ نظام شاہ اول کا وزیر تھا۔ ملک عنبر نے امیر چنگیز خان کے یہاں ملازمت کے دوران کافی ترقی کی۔ جب مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کیا تو ملک عنبر اپنی قسمت آزمانے کے لیے بیجاپور چلا گیا۔ لیکن وہ جلد ہی واپس آ گیا اور چاند بی بی کے مخالف حبشی گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد نگر کی شکست کے بعد ملک عنبر نے ایک نظام شاہی شہزادہ کو ڈھونڈ نکالا جسے اس نے بیجاپور کے حکمران کی درپردہ تائید اور مدد سے مرتضیٰ شاہ دوم کے نام سے گدی پر بٹھا دیا، اور خود اس کا پیشوا بن گیا۔ پیشوا کا خطاب احمد نگر میں پہلے ہی سے رائج تھا۔ ملک عنبر نے کافی بڑی تعداد میں مراٹھا فوج (بارگی) اکٹھی کر لی۔ مراٹھا کافی تیز رفتاری سے حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دشمن کی فوجوں کی رسد کی لوٹ مار اور کمک کا راستہ کاٹ دینے میں کافی ماہر تھے۔ اگرچہ دکن میں یہ چھاپہ مار طریقہ جنگ مراٹھوں کے لیے ایک روایت بن چکی تھی، لیکن مغل اس سے قطعی ناآشنا تھے۔ ملک عنبر نے مراٹھوں کی مدد سے مغلوں کے لیے برار، احمد نگر اور بالا گھاٹ میں اپنی حیثیت مضبوط بنانا مشکل کر دیا۔ اس وقت دکن میں مغلوں کا کمانڈر عبدالرحیم خانخاناں تھا جو کہ ایک بہت ہی دور اندیش اور زیرک سیاست داں نیز قابل فوجی تھا۔ اس نے 1601 میں موجودہ مہاراشٹر کے مقام ناندیر میں ملک عنبر کو شکست فاش دی لیکن اس نے ملک عنبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اس کا خیال یہ تھا کہ نظام شاہی کے باقی علاقے میں استحکام برقرار رہنا ہی مناسب ہو گا۔ دوسری طرف ملک عنبر نے بھی خانخاناں کے ساتھ دوستی میں بہتری سمجھی کیونکہ اس طرح اسے اپنے اندرونی مخالفوں سے نپٹنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ یہ معاہدہ 1605 میں اکبر کی موت تک قائم رہا۔ اس کے بعد ملک عنبر نے مغلوں پر برابر حملے کیے۔

5.6 اکبر کے مذہبی افکار و اعمال (Religious Ideas and Practices of Akbar)

5.6.1 اکبر اور عبادت خانہ (Akbar and the Ibadat Khana)

اکبر ایک متجسس اور عقلی ذہن کا حامل تھا تاہم وہ مذہبی تصوف کی جانب مائل تھا۔ وہ زیادہ تر مذہبی تعصبات سے پاک تھا اور مذہبی امتیاز سے اسے نفرت تھی۔ ایک تجرباتی ذہن، اکبر نے مذہب کے ساتھ تجربات کیے اور اکثر اسے مذہبی شدت پسندوں کی جانب سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بہت زیادہ مراقبہ میں ڈوبنے والا اور روحانیت پسند تھا۔ تاہم اس کی روحانیت اور مذہبیت، تعقل و استدلال سے عاری نہیں تھی۔ اگرچہ وہ معجزاتی اور مسیحائی قوتوں پر یقین رکھتا تھا لیکن یہ اس کا عقیدہ تھا کہ 'معجزات پر سطحی لوگ یقین رکھتے ہیں لیکن دانشمند آدمی کسی بھی چیز

کو بنا ثبوت کے نہیں مانتا۔' اکبر نے 1575 میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ قائم کیا۔ اس وقت اس کی عمر تینتیس سال تھی۔ 'عبادت خانہ'، مذہب اور فلسفہ پر تحقیقات کا ایک مرکز تھا۔ 'منتخب التواریخ' کے مصنف عبدالقادر بدایونی کے مطابق، اکبر نے بنگال کے سلطان سلیمان کرّانی سے متاثر ہو کر عبادت خانہ شروع کیا تھا، جو 'ہر رات تقریباً 150 افراد کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا جن میں نامور شیخ اور علمائے کرام شامل ہوتے تھے اور صبح تک ان کے مواعظات و تفاسیر سنتا رہتا تھا'۔ تاہم، اس عبادت خانہ کے قیام کی فوری وجہ بظاہر اس کے کزن سلیمان مرزا کی مغل دارالحکومت کو متوقع آمد تھی، جو بدخشاں کا حکمران تھا اور جس کے ساتھ اکبر طویل گھنٹوں تک گفتگو کرتا رہتا۔

Akbar holds a religious assembly at Fatehpur Sikri; the two men dressed in black are the Jesuit missionaries Rudolf Acquaviva and Francisco Henriques—Akbarnama, *miniature painting by Nar Singh, 1605.*

Source: Ira Mukhoty, *Akbar: The Great Mughal*, Aleph, 2020.

بدایونی کے مطابق عبادت خانہ میں 'تصوف سے متعلق عقلی مباحث، فلسفہ اور قانون کے بارے میں تحقیق' پر گفتگو چلتی رہتی تھی۔ نظام الدین احمد کے مطابق، عبادت خانہ میں سائنس، مذاہب، لوگوں اور فرقوں کی قدیم اور جدید تاریخ، اور دنیا سے متعلق دیگر معاملات جیسے موضوعات پر بحث ہوتی تھی۔ یہ بحثیں ہر جمعرات کی رات شروع ہوتی تھیں اور اکثر جمعہ کی دوپہر تک چلتی تھیں۔ ابتدا میں، عبادت خانہ صرف مسلمان علما کے لیے کھلا تھا کیونکہ اکبر مختلف متحارب اسلامی فرقوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کا مقصد 'سچائی کا تعین کرنا' اور 'حقیقی مذہب کے اصولوں کو تلاش کرنا اور انہیں منکشف کرنا، اور پھر اس کی الوہی اصل تک پہنچنا' تھا۔ مختلف فرقوں کے علماء کی متضاد آرا اکبر کو حقیقی مذہب کی تلاش میں مدد نہیں کر سکیں۔ وہ نہ صرف مایوس تھا بلکہ پریشان بھی تھا۔ عبادت خانہ جیسا تجربہ داخلی نہیں ہو سکتا، اس میں ہندوستان میں موجود دوسرے مذاہب کے خوشگوار افکار کی بھی شمولیت ضروری تھی۔ 1578 میں اکبر نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مدعو کیا۔ مختلف مسلم فرقوں کے علاوہ، عبادت خانہ اب ہندوؤں، جینیوں، یہودیوں، زرتشتیوں اور عیسائیوں کے لیے کھل گیا۔ نہ صرف یہ بڑے مذہبی گروہ بلکہ غیر واضح سامی فرقہ جسے صابی (ستارہ پرست) کہا جاتا ہے، اور چارواک (ایک قدیم ہندوستانی مادیت پرست فرقہ) بھی وہاں موجود تھے۔ اسپین کے فلپ دوم کو لکھے گئے اپنے خط میں اکبر نے کہا: 'ہم تمام مذاہب کے علماء کے

ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور اس طرح ان کے پر مغز بیانات اور اعلیٰ خیالات سے مستفید ہوتے ہیں۔' اکبر کا نظریہ تھا کہ 'کسی بھی مذہب کی توہین خدا کی توہین ہے'۔ اکبر کے تلخ ناقد بدایونی کے مطابق، اکبر نے مسلمانوں کے بہت سے مذہبی طریقوں کو فضول توہمات کے طور پر مسترد کیا، اور 'انسانی روایت نہیں بلکہ اس کے عقلیت پسندی کو مذہب کی واحد بنیاد کے طور پر تسلیم کیا۔'

5.6.2 اکبر کا دین الٰہی (Akbar's Din i Ilahi)

دین الٰہی، یا ربانی عقیدہ، اکبر کے سب سے شاندار مذہبی تجربات میں سے ایک تھا۔ اس کا مقصد موجودہ مذاہب کو عدم استحکام سے دوچار کرنا نہیں تھا، بلکہ ان سب میں موجود اچھی باتوں کو یکجا کرنا تھا۔ اس نے اس دین کو 1582 کے اوائل میں رائج کیا۔ مورخین کی رائے ہے کہ یہ حقیقی معنوں میں کوئی نیا مذہب نہیں تھا اور نہ ہی اکبر نے کوئی نیا مذہب قائم کرنے اور پیغمبر بننے کی خواہش کی تھی۔ تاہم، یہ ایک انتہائی متنازعہ مذہبی تجربہ ضرور بن گیا۔ اس کے ذریعے اکبر تمام مذہبی برادریوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک مشترکہ بنیاد فراہم کرنا چاہتا تھا۔ نہ عوام اس کی جانب مائل تھے اور نہ ہی اکبر اسے عام لوگوں میں پھیلانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ ہم خیال دانشوروں کی ایک سماجی اور مذہبی انجمن تھی جس نے سخت گیر مذہبی عقائد کی تنگ رکاوٹوں کو عبور کیا۔ فطری طور پر دین الٰہی کی رکنیت محدود تھی۔ صرف اٹھارہ سرکردہ ارکان تھے جن میں سے صرف ایک ہندو تھا اور وہ راجہ بیربل تھا۔ مورخ ابراہم ایرالی کہتے ہیں کہ ان اٹھارہ سرکردہ ارکان کے علاوہ، بلاشبہ، نچلی سطح پر کئی لوگ اس عقیدے کے پیروکار تھے۔ تاہم ایرالی کا کہنا ہے کہ، ان کی تعداد کبھی بھی بہت زیادہ نہیں رہی۔

دین الٰہی کا رکن بننے کا طریقہ کیا تھا؟ اگر کوئی دین الٰہی کا رکن بننا چاہتا تو وہ ہاتھ میں پگڑی لے کر اکبر کے پاس آتا اور بادشاہ کے قدموں میں سجدہ کرتا تھا۔ اکبر پھر اسے اٹھا کر اس کے سر پر پگڑی رکھ دیتا۔ دین الٰہی قبول کرنے والے کو اپنے پرانے عقیدے کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی ہندو یا مسلمان ہوتے ہوئے بھی دین الٰہی کا رکن رہ سکتا تھا۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر کے مطابق، 'دین الٰہی کے دائرے میں داخل ہونے والے کو، فرقہ وارانہ جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ مذاہب کے عالمگیر امن کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ اسے اپنے ہاتھ سے کسی جاندار کو نہیں مارنا چاہیے اور نہ ہی کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لینا چاہیے۔ البتہ جنگ اور تعاقب میں ان چیزوں سے استثنیٰ حاصل رہے گا۔ روشن اجسام (سورج، چاند وغیرہ) کی تعظیم کرنی ہے جو اپنے اپنے درجے کے مطابق خدا کے نور کے مظہر ہیں، اور ہر وقت اور ہر موسم میں خدا کی قدرت اور وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ اس بات (خدا کے وجود) سے ہمیشہ آگاہ رہیں، چاہے خلوت میں ہو یا جلوت میں، اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولیں۔' دین الٰہی کے اراکین ایک دوسرے کو 'اللہ اکبر' کہہ کر سلام کرتے اور اس کا جواب 'جل جلالہ' کہہ کر دیتے۔ تاہم دین الٰہی برقرار نہ رہ سکا۔ یہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی مر گیا۔ پھر بھی، یہ ان اعلیٰ ترین مذہبی نظریات کی نمائندگی کرتا ہے جن کے لیے اکبر کھڑا تھا۔ لیکن بدایونی جیسے اس کے ہم عصروں نے مذہبی اور اور ثقافتی لحاظ سے اس مختصر مدتی تاہم عظیم منصوبہ کے لیے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔

5.7 اکبر کی شخصیت اور اس کے اثرات (Akbar's Personality and Its Effects)

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اکبر کئی معنوں میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔ ہم جگہ کی کمی وجہ سے ان سب کو یہاں قلم بند نہیں کر سکتے، چند مثالیں نہ صرف فکری لحاظ سے بلکہ عملی طور پر بھی اسے عظیم ثابت کرتی ہیں۔ کوئی بھی اچھا حکمران اپنی رعایا کے حقیقی حالات جاننا چاہتا ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں حقیقی دلچسپی نہ لے۔ 1561 کے اوائل میں اکبر، اپنا بھیس بدل کر، آگرہ کی گلیوں میں گھومتا رہا تاکہ اپنی رعایا کے مسائل کو راست جان سکے۔ آج جمہوری ہندوستان میں شاید ہی کوئی عوامی نمائندہ یہ نیک کام کرتا ہو۔ جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ عام طور پر ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ 1562 میں اکبر نے جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم کر دیا۔ زائرین کو مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ 1563 میں اکبر نے اس غیر معقول زیارت ٹیکس کو ختم کر دیا۔ 1564 میں اس نے جزیہ ٹیکس کو بھی ختم کر دیا۔ ایک اسلامی ریاست میں، فوجی حفاظت کے بدلے قابل استطاعت غیر مسلموں پر جزیہ عائد کیا جاتا تھا۔ 1565 میں، اس نے متعدد مندروں کو غیر محصولی زمینی عطیات دیے۔

مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ راجپوت شہزادیوں سے شادیوں نے اکبر کی شخصیت کو بہت متاثر کیا۔ ابوالفضل کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ اکبر گھر اور سفر کے دوران گنگا کا پانی پیتا تھا۔ آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندو گنگا کے پانی کو مقدس مانتے ہیں۔ نسرین لکھتی ہیں کہ 'یہ پانی اس کے لیے مہر بند برتنوں میں لایا جاتا تھا۔ بارش کے پانی یا جمنا یا چناب کے پانی میں کھانا پکایا جا سکتا تھا لیکن اس میں گنگا کا تھوڑا سا پانی ضرور ملایا جاتا'۔ بدایونی نے اپنی کتاب 'منتخب التواریخ' میں اکبر کے بارے میں درج ذیل اقتباس لکھا:

> ابتدائی جوانی سے ہی، اپنی بیویوں، ہندوستان کے راجاؤں کی بیٹیوں کے احترام کے طور پر، اس نے زنان خانہ کے اندر 'ہوم' کی رسم کی انجام دہی جاری رکھی۔ یہ رسم سورج کی پوجا کی ایک شکل ہے۔ سورج کے کنیا (Virgo) میں داخل ہونے کے آٹھویں دن ایک تہوار منعقد ہوتا۔ اس دن وہ اپنے ماتھے تلک لگا کر، اپنی کلائی پر بطور برکت برہمنوں کے ہاتھوں سجاوٹ بھرا دھاگہ بندھوا کر، دیوانِ عام میں آتا۔ کلائی پر راکھی پہننا بھی اس دور کا رواج بن گیا۔ ہر وہ اصول جس پر دوسرے مذاہب کے علما عمل پیرا تھے اسے اس نے ہمارے اس مذہب (اسلام) کے خلاف واضح اور فیصلہ کن سمجھا۔

بلا شبہ، اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کو بہتر طور پر سمجھنے اور فارسی بولنے والی دنیا میں اس کی تفہیم کو مقبول بنانے کے لیے، اکبر نے 1573 میں 'مکتب خانہ' (ترجمہ بیورو) قائم کیا۔ اس کے زمانے میں بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنگھاسن بتیسی (نامہ خرد افزا)، اتھرو وید (اتھربن)، مہابھارت (رزم نامہ)، رامائن، ہری ونش پران (ہری بن)، لیلاوتی (بھاسکراچاریہ کی 1150 میں لکھی گئی ریاضی کی تصنیف)، تاجک انیل کنٹھی (تاجک: فلکیات پر ایک تصنیف)، راج ترنگنی (کلہن کی تصنیف کردہ کشمیر کی تاریخ)، پنچ تنتر (جانوروں کی کہانیوں کے توسط سے حکمت کے اسباق) وغیرہ ان میں سے چند تصنیفات تھیں جن کا ترجمہ کیا گیا۔

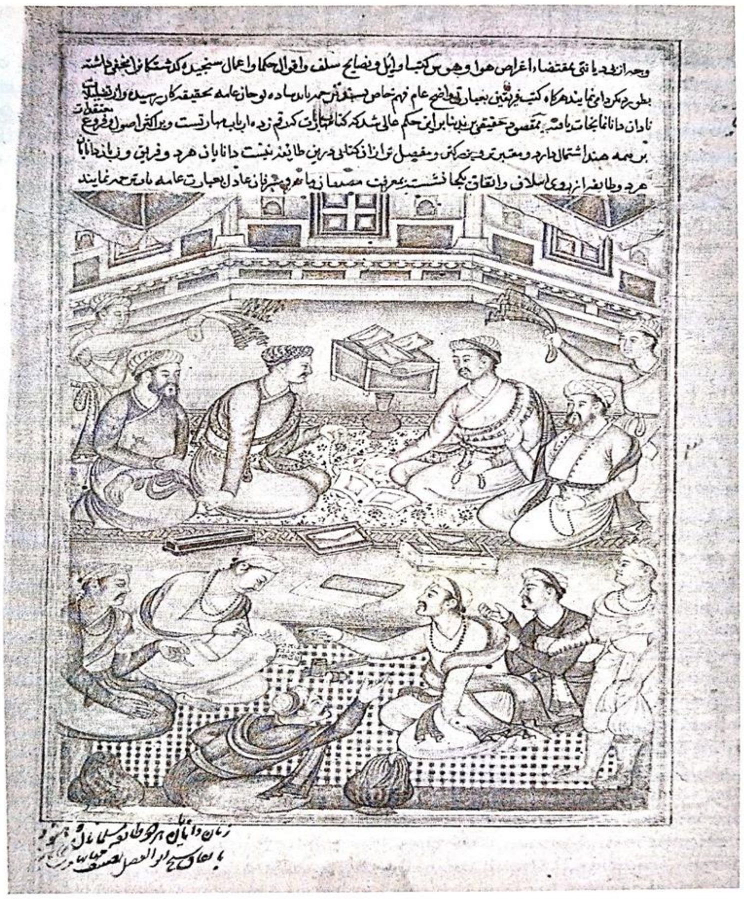

FIGURE Akbar's translation bureau with Sanskrit and Mughal translators collaborating, preface to the *Razmnāmah*, 1598–1599.

FREE LIBRARY OF PHILADELPHIA, LEWIS M18

Source: Audrey Truschke, *Culture of Encounters: Sanskrit at the Mughal Court*, Allen Lane/Penguin, New Delhi, 2016, p.106.

ابوالفضل کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستانی ثقافت کا مطالعہ نہیں کیا کیونکہ انہیں وراثت میں ملی روایت نے آزادی سے چھان بین کی اجازت نہیں دی۔ 'کیوں' اور 'کس طرح' یہ پوچھنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں تعقل واستدلال کے دروازے دوبارہ کھل گئے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اکبر بہت انسان دوست تھا اور وہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے ذاتی غلاموں کو آزاد کیا۔ اسے مجرموں پر تشدد سے نفرت تھی اور اس نے مشورہ دیا تھا کہ صرف سنگین ترین جرائم میں ہی جسمانی ایذادی جائے۔ خواتین کی فلاح وبہبود کے معاملے میں اکبر کی فکرمندی کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اکبر بچپن کی شادی کے خلاف تھا اور اس کا کہنا تھا کہ بچپن کی شادیوں سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ اس نے کثیر زوجیت پر یک زوجیت کو ترجیح دی۔ البتہ کہا کہ اگر ایک بیوی بچے پیدا نہ کرسکے تو مرد دوسری شادی کرسکتا ہے۔ وہ جوان بیواؤں کی دوبارہ شادی کے حق میں تھا۔ اس نے ستی کے ہولناک عمل کی مذمت کی (جس میں ایک عورت کو اس کے شوہر کی چتا پر زندہ جلا دیا جاتا تھا)۔ 1583 میں اس نے ایک عورت کو ستی ہونے سے بچایا۔ اس نے جائیداد کی اسلامی تقسیم میں خواتین کو دیے گئے کم حصہ پر سوال اٹھایا۔ اس نے دارالحکومت میں طوائفوں کی رہائش کے لیے ایک علاقہ مختص کیا اور اس

علاقے کا نام 'شیطان پورہ' رکھا گیا۔ اس نے ذاتی طور پر معروف طوائفوں سے بات کی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا اس کے کسی وزیر نے ان کا استحصال کیا یا ایسا کرنے کی کوشش کی۔ خواتین کے ساتھ بد سلوکی اکبر کو مشتعل کر دیتی تھی۔ اکبر کے ماموں خواجہ معظم نے غصے میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ اکبر نے اسے لاتوں اور لاٹھیوں سے بری طرح پٹوایا۔ اتنا ہی نہیں اسے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ 1594 میں اس نے غلاموں کی تجارت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کے اپنے محل کی حفاظت کا سربراہ ایک دلت ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اکبر نے اسے خدمت رائے کے لقب سے نوازا۔

5.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اکبر کی قیادت میں مغل سلطنت کس طرح دور دور تک پھیل گئی تھی۔ توسیع کی سامراجی پالیسی نے اکبر کو ہندوستان کے بہت سے حکمرانوں اور خاص طور پر راجپوتوں کے ساتھ ٹکراؤ کی راہ پر ڈال دیا۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ راجپوتوں اور اکبروں کے درمیان لڑائیاں ہندو مسلم تنازعات نہیں تھے۔ وہ خالصتاً سیاسی نوعیت کے تھے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مذہب کے معاملے میں کس طرح اکبر نے تمام مذاہب کے بہترین اعمال کو قبول کرنے کی کوشش کی۔ وہ اندھی تقلید اور شدت پسندی کے خلاف تھا۔ جیسا کہ آپ نے سمجھا کہ خوفناک اکبر کا ایک انسان دوست پہلو بھی تھا۔ اس نے پریشان حال لوگوں کی فکر کی اور ان کے لیے کام کیا۔ مجموعی طور پر، اکبر ایک شاندار، عظیم الشان اور عظیم حکمراں کے طور پر سامنے آیا۔

5.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

عبادت خانہ : اکبر کے دور میں ایک ایسی جگہ جہاں مختلف مذاہب اور فرقوں کے دانشور مذہبی مباحث میں حصہ لیا کرتے تھے۔

دین الٰہی : اکبر کے ذریعے شروع کی گئی ایک ہمہ مذہبی تنظیم۔

شیطان پورہ : اکبر کے دور میں طوائفوں کا محلہ

جل جلالہٗ : دین الٰہی تنظیم کا کوئی فرد اگر دوسرے فرد سے بطور آداب و تسلیم، اللہ اکبر کہتا تو جواب میں دوسرا جل جلالہ بولتا تھا۔

منتخب التواریخ : عہد وسطیٰ کے، مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی کی مایہ ناز تصنیف

مکتب خانہ : اکبر کے ذریعے 1573 میں قائم کردہ دارالترجمہ جہاں متعدد سنسکرت تصنیفات کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

5.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رانی درگاوتی کون تھی؟
2. منتخب التواریخ کس کی تصنیف ہے؟
3. اکبر کو عبادت خانہ کے قیام کی تحریک کس نے دی؟
4. اکبر کی والدہ کا نام کیا تھا؟
5. ماہم انگا کون تھی؟
6. 'تاریخ سندھ' کس نے لکھی؟
7. اکبر نے کس سال جزیہ ٹیکس ختم کیا؟
8. مہابھارت کے فارسی ترجمہ کا نام بتایئے؟
9. شیطان پورہ کیا تھا؟
10. عبادت خانہ کس سال قائم کیا گیا؟

5.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 'دین الٰہی' کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. اکبر کی کشمیر کی فتح پر ایک نوٹ لکھیں۔
3. بیرم خان پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. عبادت خانہ پر ایک نوٹ لکھیں۔
5. اکبر کے زمانے میں فارسی میں ترجمہ شدہ مختلف تصنیفات پر ایک نوٹ لکھیں۔

5.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اکبر کے دور میں مغل سلطنت کی توسیع پر ایک مضمون تحریر کریں۔
2. کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ رانا پرتاپ اور اکبر کے درمیان تنازعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تنازع تھا؟ اگر نہیں/ہاں، تو کیوں؟
3. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اکبر کے مذہبی ہم آہنگی اور شمولیت کے نظریات کی عصری ہندوستان کے لیے اشد ضرورت ہے؟ اگر ہاں/نہیں، تو کیوں؟

5.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State, 1526 – 1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1998).
2. Athar Ali, M., *Mughal India: Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford

University Press, New Delhi, 2022 (first pub. 2006)

3. Berinstain, Valerie, *Mughal India*: *Splendours of the Peacock Throne*, Thames and Hudson, London, 1998.
4. Bhatt, Rajendra Shankar, *Maharana Pratap*, (trans. Shubhankar Mishra), National Book Trust, India, 2004 (first pub. 1967).
5. Eaton, Richard M., *India in the Persianate Age* (*1000 – 1765*), Penguin Books, New Delhi, 2020.
6. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne*: *The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
7. Farooqui, Salma Ahmed, *Islam and the Mughal State*, Sundeep Prakashan, New Delhi, 2005.
8. Gascoigne, Bamber, *A Brief History of the Great Mughals*, *India's Most Flamboyant Rulers*, Robinson, London, 2002.
9. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1997).
10. Hooja, Reema, *Maharana Pratap*: *The Invincible Warrior*, Juggernaut, New Delhi, 2018.
11. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black and Ashoka University, Ranikhet, 2016.
12. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. II.* (*1526 – 1707*): *Mughal Empire*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1996 (first pub. 1981).
13. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A Study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. 1923).
14. Mukhia, Harbans, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2005.
15. Mukhoty, Ira, *Akbar*: *The Great Mughal*, Aleph, New Delhi, 2020.
16. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
17. _______, Farhat, If *History has Taught Us Anything*, Rupa, New Delhi, 2019.
18. Nath, R. *Private Life of the Mughals of India (1526– 1803 A.D.)*, Rupa & Co., New Delhi, 2005.
19. Prasad, Beni, *History of Jahangir*, Allahabad, 1930.
20. Raghavan, T.C.A., *Attendant Lords*: *Bairam Khan and Abdur Rahim*, *Courtiers and Poets in Mughal India*, Harper Collins, Noida, 2017.
21. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That was India*, *Part – II*, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first published in 1987 by Sidgwick & Jackson Ltd., London).
22. Sharma, Manimugdha S., *Allahu Akbar*: *Understanding the Great Mughal in Today's India*, Bllomsbury, New Delhi, 2019.
23. Sharma, Parvati, *Akbar of Hindustan*, Juggernaut, New Delhi, 2022.
24. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal Empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.
25. Vijapur, Abdulrahim P., 'Socio-Cultural Interactions in India: Does Contemporary India Disrespect Its Past?', *Ars Artium*: *An International Refereed Research Journal of English Studies and Culture*, Vol.11, January 2023, pp. 122-142.

اکائی 6۔ جہانگیر

(Jahangir)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر

6.2.1 جہانگیر کی پیدائش

6.2.2 دستورالعمل

6.2.3 قدیم امراء سے تعلقات

6.2.4 شہزادہ خسرو کی بغاوت

6.2.5 گرو ارجن دیو اور بادشاہ جہانگیر

6.2.6 جہانگیر اور شاہ عباس

6.2.7 میواڑ کے ساتھ صلح اور احمد نگر سے جنگ

6.3 اکتسابی نتائج

6.4 کلیدی الفاظ

6.5 نمونہ امتحانی سوالات

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

اکبر کے بعد اس کا لڑکا سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جہانگیر اپنے سیاسی معاملات میں نہایت ہی ہوشیار تھا۔ اکبر کے تمام لڑکے غیر مذہبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے شراب کے عادی تھے۔ جہانگیر اگرچہ عیش پسند تھا لیکن سلطنت کے انتظام میں اس نے کبھی غفلت نہیں کی۔ راجپوتانہ اور بنگال میں دہلی کا اقتدار جہانگیر کے زمانے ہی میں مستحکم ہوا اور ہر قسم کی مخالفت کچل دی گئی۔ جہانگیر کے زمانے میں دکن میں نظام شاہی حکومت سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن تیموری امراء کی غفلت اور نااہلی اور نظام شاہی امیر ملک عنبر حبشی کی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دکن میں مغل سلطنت کی حدود آگے نہیں بڑھ سکیں۔ شمال میں البتہ ہمالیہ کے دامن میں کانگڑہ فتح ہوا (1620) لیکن اس کے دو سال بعد ایرانیوں نے قندھار پر قبضہ کر لیا 1622 جہانگیر کے زمانے میں دو انگریز سفیر ولیم ہاکنس اور ٹامس مورے ہندوستان آئے اور انگیریزوں کو پہلی مرتبہ تجارتی مراعات دی گئیں۔ بنگال میں ڈھالہ کا شہر اسی زمانے میں آباد کیا گیا اور صوبہ کا صدر مقام لکھنوتی سی ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا۔ جہانگیر فن مصوری کا بہت شوقین تھا۔ اس کے زمانہ میں مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے اس کے عہد حکومت میں نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ استاد ابوالحسن نادر الزمان، استاد منصور، بشن داس اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔ کشمیر میں اس نے کئی باغ اور عمارتیں بنوائیں۔ ان میں شالیمار باغ اور نشاط باغ آج بھی موجود ہیں۔ اور سری نگر کے قابل دید مقامات میں ہیں۔ آگرہ کے قریب سکندرہ میں اکبر کا شاندار مقبرہ بھی جہانگیر کے عہد کی تعمیر ہے۔ لاہور اور آگرہ کے قلعے میں بھی اس نے کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ بابر کی طرح جہانگیر نے بھی فارسی میں اپنی زندگی کے حالات لکھے۔ یہ کتاب تزک جہانگیر کہلاتی ہے۔ تزک بابری کی طرح ہی بھی ایک دلکش کتاب ہے۔ اس کی تحریر میں بناوٹ کی بجائے سادگی اور صاف گوئی پائی جاتی ہے، جہانگیر کشمیر کی سیر سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں بیمار پڑا اور لاہور پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ لاہور پہنچ کر اس کو دفن کیا گیا اور اس کے بیٹے شاہ جہاں نے بعد میں اس کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کرا دیا، جو آج لاہور کی شاندار تاریخی یادگاروں میں سے ایک ہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جہانگیر کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جہانگیر کے اصل کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- جہانگیر کی دکن پالیسی کا تجزیہ کر سکیں گے
- نورجہاں اور جہانگیر کے کردار کی وضاحت کر سکیں گے
- اس دور میں ابھرنے والی بغاوتوں کو بیان کر سکیں گے۔
- جہانگیر کے دور کی سیاسی حالات بخوبی بیان کر سکیں گے۔

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

6.2 شہنشاہ نورالدین جہانگیر (Emperor Nuruddin Jahangir)

6.2.1 جہانگیر کی پیدائش (Birth of Jahangir)

جہانگیر کی پیدائش 30 اگست، 1569ء کو فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی کے قریب ایک حویلی میں ہوئی تھی۔ اکبر سلیم کو پیار سے شیخو بابا کہتا تھا۔ جہانگیر کی ماں ہرکھا بائی (مریم الزمانی) آمیر کے راجہ بھرمل کی لڑکی تھی۔ جہانگیر کی پہلی شادی 1585ء میں مان بائی سے ہوا جو آمیر کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی اور مان سنگھ کی بہن تھی۔ مان بائی سے خسرو کا جنم ہوا، جسے بعد میں جہانگیر نے اندھا کروادیا تھا۔ مان بائی کو شاہ بیگم کا منصب حاصل تھا، لیکن بعد میں اس نے سلیم کی عادتوں سے مایوس ہو کر افیم کھا کر خودکشی کرلی تھی۔ جہانگیر کی دوسری شادی مارواڑ کے راجہ اودے سنگھ کی لڑکی جگت گوسائی سے ہوئی۔ خرم جگت گوسائی کا بیٹا تھا۔ جودھا بائی کو ملکہ جہاں کا لقب حاصل تھا۔ جہانگیر کے تیسرے بیٹے پرویز کی پیدائش صاحب جمال سے اور چوتھے بیٹے شہریار کا جنم ایک رکھیل سے ہوا تھا۔ کرمسی جہانگیر کی راجپوت بیوی تھی۔ سلیم 24 اکتوبر 1605ء کو قانونی طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اتفاق سے بحساب جمل کلمہ جہانگیر کے حروف کے اعداد اتنے ہی نکلتے ہیں جتنا کہ اللہ اکبر کے۔ جشن تاجپوشی بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں قیدیوں کو رہا کیا گیا، نئے سکے نئے ناموں کے ساتھ چلائے گئے اور ایک فرمان کے ذریعے ان لوگوں کو جنھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کی مخالفت کرنے کی جرأت کی تھی عام معافی دے دی گئی۔ بیشتر ملازمین اپنی جگہوں پر مستقل کر دیے گئے اور نئے قوانین نافذ ہوئے۔

6.2.2 دستورالعمل (Dasturul Amal)

حکمراں بنتے ہی جہانگیر نے بارہ اعلانات کرائے جن کو واقعات جہانگیری میں دستورالعمل کہا گیا ہے۔

1. زکوہ، تمغہ اور میر بحری معاف کر دیا گیا۔
2. سڑکوں پر چوری ڈکیتی کے بارے میں قانون بنایا گیا۔
3. مرے ہوئے آدمی کی جائداد پر وراثت کے قانون بنایا گیا۔
4. شراب پر روک لگادی گئی۔
5. مجرمین کے ناک کان کاٹنے کی سزائیں موقوف کر دی گئیں۔
6. جائداد پر زبردستی قبضہ کرنے سے روک دیا گیا۔
7. اسپتالوں کی سہولتوں کو بڑھادیا گیا۔
8. جمعرات اور اتوار کو جانور کی قربانی کو روک دیا گیا۔
9. جاگیرداروں اور زمینداروں کو اپنے علاقے میں بنا اجازت اپنی رعایا کے ساتھ شادی بیاہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔
10. اتوار کا احترام ضروری قرار دیا گیا۔
11. مدد معاش اور ائمہ زمینوں کی تصدیق کرائی گئی۔

12. قیدیوں کو عام معافی دی گئی۔

سرکاری عہدے داروں سے کہا گیا کہ بڑے بڑے شہروں میں شفانے تعمیر کرائیں اور حکومت ان کے پورے اخراجات برداشت کرے۔ کھانے کے لیے جانوروں کا ذبیحہ 12 ربیع الاول سے جو شہنشاہ کا یوم ولادت تھا بند کر دیا گیا۔ یہ پابندی اس طرح عائد کی گئی کہ ہر سال بادشاہ کی عمر کا جو سال ہوتا اتنے ہی دنوں کے لیے اس سال کے دوران ذبیحہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے جمعرات و اتوار کو بھی ذبیحہ نہ ہوتا۔ یہ قوانین اکبر کے رائج کردہ اصلاحات پر مبنی تھے اور اس خیال سے نافذ کیے گئے کہ یہ اصلاحات جاری رہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قوانین پر عمل کس حد تک کیا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ رعایا کے مفاد کیلیے قائم کیے گئے تھے اور یہ بیکار ثابت نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین عام قسم کے تھے اور ان سے اسلام یا مسلمانوں کی طرفداری یا حمایت مقصود نہ تھی۔ یہ قوانین کسی حد تک اس لیے بھی نافذ کیے گئے کہ رعایا کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے کہ نیا بادشاہ اپنے باپ کی عام سیاست میں نمایاں تبدیلی لانا نہیں چاہتا۔

6.2.3 قدیم امراء سے تعلقات (Relations with Old Nobility)

شہزادہ خسرو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں راجہ مان سنگھ کی بہن تھی۔ اس کی شادی عزیز کوکہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ باوجودیکہ جہانگیر نے مان سنگھ سے قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ وہ شہزادے کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا پھر بھی جہانگیر نے اس کو نیم قید کی حالت میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کو اس وقت تک اطمینان حاصل نہ ہوا جب تک کہ اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ جوان شہزادہ نے آگرہ کا تخت حاصل کرنے کا ارادہ دل سے بالکل نکال دیا ہے اور اس کے طاقتور حامیوں نے بھی اس کی حمایت ترک کر دی ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں کا رویہ بھی پوری طرح واضح نہ تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے یہی فیصلہ کیا کہ اکبر کے زمانے کے ان امراء کا اثر بالکل ختم کر دیا جائے جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ خسرو کی یا اس کے بھائیوں میں سے کسی کی اولاد کی حمایت کریں گے۔ چنانچہ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ اختیارات ایسے لوگوں کو منتقل کیے جائیں جن پر اس کو پورا پورا اعتماد حاصل ہو۔ اس پالیسی کے مطابق جہانگیر نے محمد شریف کو جو کہ مشہور و معروف خوشنویس اور مصور خواجہ عبدالصمد کا لڑکا تھا ملک کے سب سے بڑے عہدے پر ترقی دے کر امیر الامراء مقرر کر دیا۔ شریف نے سلیم اور اکبر کے درمیان اختلافات بڑھانے میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ وہ اکبر کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا اور سخت مصیبتوں جھیلتا تھا۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو وہ بھی اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ باوجودیکہ وہ کسی خاص خوبی کا مالک نہ تھا اور سلطنت کے امراء اسے ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح مرزا غیاث بیگ کو اعتمادالدولہ کا خطاب دیا گیا اور اس کو نائب وزیر مقرر کیا۔ حالانکہ وہ صرف ایک ہزاری منصب دار تھا۔ بعض مثالوں کو چھوڑ کر جہانگیر کا انتخاب عام طور پر اچھا نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے حامیوں اور خوشامدیوں کا حلقہ بہت معمولی لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ سلطنت کے قدیم ارا کین کے دلوں میں نہ تو اعتماد پیدا کر سکا اور نہ ان پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ جہانگیر نے فوجیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی تنخواہ میں 400 فیصد تک اضافہ کر دیا اور اس کا بار سلطنت کے بھرپور خزانے پر پڑا۔

6.2.4 شہزادہ خسرو کی بغاوت (Rebellion of Prince Khusrau)

6 اپریل 1606ء کو شہزادہ خسرو تقریبا 350 سواروں کے ہمراہ آگرہ سے فرار ہو گیا۔ متھرا پہنچ کر اس نے حسین بیگ بدخشی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ دو تین سو ایماق سواروں کے ہمراہ اس سے مل جائے۔ پھر وہ دہلی ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں ایک لاکھ روپے کا خزانہ جسے عبدالرحیم دیوان لاہور سے آگرہ لے جا رہا تھا چھین لیا۔ لاہور پہنچنے تک شہزادے کے پاس بارہ ہزار سواروں کی فوج جمع ہو گئی تھی۔ لاہور کے صوبہ دار دلاور خاں نے شہزادے کو شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی۔ مشکل سے نو دن گزرنے پائے تھے کہ جہانگیر ایک بڑی فوج اور توپ خانہ لے کر آپہنچا۔ شہزادے نے اطاعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بھیروال کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں شہزادے کو شکست ہوئی اور جان بچا کر بھاگا۔ خسرو نے اپنے ہندی اور افغان ساتھیوں کے مشورے کو کہ آگرہ پر حملہ کر کے قبضہ کرتا ہوا اپنے ماموں مان سنگھ کے پاس بنگال چلا جائے ٹھکرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیشتر ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کی۔ دریائے چناب کو پار کرتے ہوئے اس کی کشتی کیچڑ میں پھنس گئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ شہزادے کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر لاہور لے جایا گیا اور قید خانے میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کو یہ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی کہ راستے کے دونوں طرف پھانسی کے تختوں پر اپنے ساتھیوں کو لٹکتے ہوئے سخت عذاب کے ساتھ جان دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ وحشت ناک منظر کئی دنوں تک اس کی آنکھوں میں گھومتا رہا۔ وہ دن رات روتا رہتا۔ اس منظر کا اثر اتنا دردناک تھا کہ شہزادہ جب تک زندہ رہا کسی نے اس کو خوش نہ دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنے دوسرے بیٹے پرویز کو ولی عہد مقرر کیا۔ ان لوگوں میں جن پر یہ الزام تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح باغی شہزادے سے رابطہ رکھتے ہیں سب سے زیادہ اہم اعتمادالدولہ اور اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد شریف تھا۔ اعتمادالدولہ کو قید میں ڈال دیا گیا لیکن بعد میں دو لاکھ روپیہ جرمانہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ البتہ محمد شریف کو قتل کر دیا گیا۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी

6.2.5 گرو ارجن دیو اور جہانگیر (Guru Arjundev and Jahangir)

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

باغی شہزادہ خسرو جب پنجاب سے فرار ہوتا ہوا گزرا تو اس نے گرو ارجن سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو نے شہزادے کو مبارک باد دی۔ اس کی پیشانی پر زعفران کا قشقہ کھینچا اور اپنی دعاؤں کے علاوہ کچھ مالی مدد بھی دی۔ خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کے مزاج میں تلخی پیدا کر دی تھی اور وہ سخت گیر بھی ہو گیا تھا۔ گرو ارجن نے اپنے سلوک کی وضاحت میں بیان کیا کہ انہوں نے خسرو کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ شہنشاہ اکبر کے پوتے سے جو پریشان حالی میں مبتلا تھا مہربانی اور ہمدردی کا اظہار کرتے لیکن جہانگیر اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے گرو پر دو یا ڈھائی لاکھ کا جرمانہ عائد کر دیا۔ گرو ارجن نے یہ کہ کر کہ ان کے پاس اتنی دولت نہیں اور جو کچھ ہے وہ غریبوں، لاچاروں اور مسافروں کے لیے ہے اور جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر شہنشاہ نے حکم صادر کیا کہ گرو کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کے بچے اور مکان فرید بخاری کو دے دیے جائیں جس کو اب مرتضی خاں کا خطاب مل چکا تھا۔ ان کی جائداد ضبط کر لی جائے اور گرو کو قتل کر دیا جائے۔ گرو کو جو سزا دی گئی وہ اس الزام کے مقابلے میں جو ان پر عائد کیا گیا بہت ہی زیادہ سخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔

6.2.6 جہانگیر اور شاہ عباس (Jahangir and Shah Abbas)

لاہور میں جہانگیر کو اس بات کا علم ہوا کہ فراۃ کے صوبے دار اور سیستان کے ملک نے ہرات کے گورنر حسین خان شاملو کی مدد سے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔ شہنشاہ کے لیے اکبر کی موت اور خسرو کی بغاوت کے بعد یہ واقعہ کچھ تعجب خیز نہ تھا۔ وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ برخاست شدہ مرزاؤں کے کچھ لوگ سرحد کے ایرانی افسروں کے ساتھ خط و کتابت کر رہے تھے تاکہ ان سے قندھار پر حملہ کروا سکیں۔ ادھر ایرانی جو قندھار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے اکبر کی موت کی اطلاع پانے کے بعد ایسی کوشش کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی لاہور ہی میں مقیم رہے تاکہ بوقت ضرورت کابل بھی جا سکے۔ جہانگیر نے یہ فیصلہ اپنے بعض مشیروں کے مشورے کے برخلاف کیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ شہنشاہ دارالسلطنت لوٹ جائے تاکہ وہاں سے گجرات، بنگال اور دکن کے حالات پر جو ابتر ہوتے جا رہے تھے نگاہ رکھ سکے۔ ٹھٹہ کے مشہور حکمران جانی بیگ کے بیٹے مرزا غازی بیگ کو 1607ء میں قندھار کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط فوج دے کر روانہ کیا گیا۔

1607ء میں جب قندھار پر حملہ ہوا تو ایران کے بادشاہ شاہ عباس نے اس کی طرف سے چشم پوشی کی لیکن اس میں کوئی عملی حصہ شاید اس لیے نہیں لیا کہ اس وقت ترکوں کے ساتھ اس کی لڑائی تھی۔ چنانچہ ایرانی فوج اتنی آراستہ اور مستعد نہ تھی کہ قندھار کو جلد فتح کر سکتی۔ جہانگیر کی خوش قسمتی سے قندھار اس وقت شاہ بیگ خاں جیسے لائق، وفادار، بہادر اور تجربہ کار شخص کے زیر حکومت تھا۔ وہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے بالکل آمادہ تھا۔ اس نے قلعہ کو مستحکم کر لیا تھا اور اس کے سپاہی بھی مستعد تھے۔ محاصرے نے طول کھینچا یہاں تک کہ غازی بیگ قندھار کے نواح میں پہنچ گیا۔ ایرانی اس کا اندازہ نہیں لگا سکے کہ شہنشاہ ہند اس قدر تیز اقدام کر سکتا ہے، لہٰذا غازی خاں کی آمد نے ان کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ لوگ لڑنے کے لیے آمادہ نہ تھے چنانچہ انہوں نے تیزی سے سرحد پار کر کے راہ فرار اختیار کی۔ شاہ عباس نے اپنے صوبے داروں کے کوتاہ نظرانہ عمل سے تجاہل کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ حملہ اس کی اجازت کے بغیر کیا گیا اور جوں ہی اس کو حملے کا علم ہوا اس نے حملہ آوروں کو بذریعہ فرمان فوراً واپسی کا حکم صادر کیا۔ اس نے فروری یا مارچ 1607 میں حسین بیگ کو اپنا ایلچی بنا کر روانہ کیا تاکہ خاندان تیموریہ سے اپنی دوستی و محبت کا اظہار کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ایران یہ توقع رکھتا تھا کہ جہانگیر کو اس کے لیے راضی کر لیا جائے گا کہ قندھار اس کو دے دے۔ شاہ نے اپنے سفیر یادگار علی سلطان تالش اور دوسرے کے ذریعے ایک سے زائد مرتبہ قندھار کی واپسی کے سوال کو چھیڑا لیکن جہانگیر نے ہر دفعہ اس بات کو ٹال دیا۔ جب شاہ اپنی سیاسی کوششوں میں ناکام ہو گیا تو اس نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کر لیا۔

6.2.7 میواڑ کے ساتھ صلح و احمد نگر سے جنگ (Truce with Mewar, and War with Ahmadnagar)

جہانگیر نے دکن کی ریاستوں کے بارے میں اپنے باپ کی سیاست کی پیروی کی۔ وہ سارے دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ مغلوں کی پیش رفت میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ملک عنبر تھا جس کی تنظیمی لیاقت، استحکام اور اثر و رسوخ ناقابل انکار تھے۔ عنبر کو بغداد کے بازار سے قاسم خواجہ نامی شخص نے خریدا اور احمد نگر لا کر مرتضی نظام شاہ اول کے لائق و ممتاز وزیر میرک دبیر چنگیز خاں کے

ہاتھ فروخت کیا۔ جب براراور خاندیش مغلوں کے قبضے میں آگئے تو عنبر نے بیجاپور میں ملازمت کرلی لیکن اس کی قسمت میں احمد نگر ہی لکھا تھا لہٰذا وہ احمد نگر واپس آیا اور حبشی سردار ابھنگ خاں نے اس کو 150 گھوڑوں کا منصب دار بنادیا۔ جب دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا تو عنبر اور ملک راجو کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مغل علاقے میں لوٹ مار اور غارت گری پھیلائیں۔ اس دوران اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عنبر کی کاروائیوں کا حلقہ تلنگانہ کی سرحدوں سے لے کر بیڑ اور چیول تک پھیل گیا۔ اس حلقے میں احمد نگر و احمد آباد کے بھی کچھ علاقے شامل تھے۔ احمد نگر کے زوال کے بعد بھی انہوں نے غارت گری کا کام جاری رکھا اور اس طرح مغلوں کو زبردست پریشانی لاحق ہوگئی۔

مغلوں اور ملک عنبر کے درمیان پہلی جھڑپ 02-1601ء میں ہوئی۔ مغل فوج کی کمان عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا مرزا ایرج کررہا تھا۔ مندیر کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا لیکن اس کے وفادار ساتھی اس کو نکال لے گیے۔ ملک عنبر کی کاروائیوں میں ملک راجو کی رقابت اور مخاصمانہ سرگرمیاں رکاوٹ بن گئیں۔ چونکہ ان دونوں میں صلح کا کوئی راستہ نہ نکل سکا لہٰذا ملک عنبر نے مغلوں سے صلح کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سرحد کا مسئلہ مغلوں کے ساتھ طے کرلیا اور خود خانخاناں کا منظور نظر بن گیا۔ اس کے بعض حامیوں نے اس تبدیلی سیاست کو پسند نہ کیا اور اس کی حمایت سے دست کشی اختیار کر کے مرتضی شاہ سے جا ملے۔ نظام شاہ نے ملک عنبر سے لڑنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن 1603ء میں اس کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عنبر نے پرندا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور یہ قلعہ اس کے خاندان کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ جس کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ جب دانیال نے دکن پر حملہ کیا تو اس وقت نظام شاہ نے عنبر کو اپنی طرف ملالیا اور وہ مغلوں کو پریشان کرنے لگا۔ نظام شاہ عنبر کی ادھوری حمایت سے اکتا گیا اور اس نے راجو سے عنبر کو زیر کرنے کے لیے مدد طلب کی۔ جب عنبر نے یہ دیکھا کہ وہ راجو کا مقابلہ نہ کرسکے گا تو وہ پھر مغلوں سے مدد کا طالب ہوا۔ خانخاناں کی زیرکانہ سیاست یہ تھی کہ وہ ان دونوں رقیبوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھے تاکہ وہ اپنے معاملات میں منہمک رہیں۔ نظام شاہ نے 1607ء میں عادل شاہ کی مدد سے راجو کو گرفتار کرلیا اور اس طرح عنبر کا راستہ صاف ہوگیا۔

ملک عنبر نے اپنی عقل خداداد سے یہ سمجھ لیا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل اور مقابل کے ترقی یافتہ فن جنگ کے سبب مغلوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہوسکتا اور یہ بات پچھلے تجربوں سے خوب واضح تھی۔ اس نے گوریلا جنگ کے فوائد کا اندازہ لگایا جو میواڑ کے ہندو راجا اور بندیل کھنڈ اور افغانستان کے سرحدی قبائل نے مغلوں کے برخلاف جاری کررکھی تھی اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔ ملک عنبر نے مراٹھوں کی پھرتیلی سوار فوج کی تعداد بڑھائی اور ان لوگوں کو گوریلا فن جنگ کی سخت تربیت دی۔ عنبر نے بحری فوج کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہ کیا جو اس کی ریاست اور ایران کے درمیان تجارتی تعلقات کی حفاظت کے لیے ضروری تھی۔ اس نے راج گڑھ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ جنجیرہ کو بحری چوکی بنانے کے لیے تجویز کیا اور فوجی کشتیوں پر عربی النسل حبشیوں کو ملازم رکھا۔ یہ لوگ سیدی کہلائے۔ ان کی قوت مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی قائم رہی اور وہ مراٹھوں اور یوروپی طاقتوں کو عرصے تک پریشان کرتے رہے۔ ان تیاریوں کی تکمیل کے بعد اس نے احمد نگر کے ان علاقوں کی واپسی کی کوشش کی جن کو مغل فتح کرچکے تھے اس کی خوش قسمتی سے اس وقت دکن میں مغل سلطنت آپس کی رنجشوں اور نااتفاقی کے سبب کمزور ہوگئی تھی یہ رنجش اور نااتفاقی کچھ تو جنوبی ریاستوں کے زروجواہر کے سبب

پیدا ہوئی جو فساد کی جڑ ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ مغل افسر دکن کی طولانی پہاڑی جنگوں سے اکتا چکے تھے۔ حالانکہ جہانگیر دکن کی سیاست کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا پھر بھی اس نے اپنے بہترین افسروں کو جن پر اسے پورا اعتماد تھا دکن روانہ کیا۔ 1608ء میں اس سے عبدالرحیم خانخاناں نے یہ تحریری وعدہ کیا کہ اگر اس کو بارہ ہزار مزید فوج اور دس لاکھ روپیہ دے دیا جائے تو وہ اس خدمت کو سرانجام دے گا۔ جہانگیر نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور شاہی اصطبل سے بہترین گھوڑے، پانچ ہاتھی، مرصع تلوار اور خلعت عطا کیا۔ جب عبدالرحیم خانخاناں نے جنگ میں کافی جوش و خروش نہ دکھایا تو پھر شہزادہ پرویز اور شریف خاں وزیر اعظم کو 1610ء میں مزید فوج دے کر روانہ کیا گیا لیکن شہنشاہ کے ان سب اقدامات کے باوجود کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ عنبر کے مقابلے میں مغلوں کی کچھ نہ چلی کیونکہ اس کے پرچم کے نیچے ایک بڑی فوج جمع ہو گئی تھی۔

ایک دفعہ جہانگیر نے بھی یہ ارادہ کیا کہ وہ خود دکن جا کر وہاں کے معاملات کو سلجھائے لیکن امراء نے اس کو باز رکھا اور خانخاناں نے وعدہ کیا کہ دکن کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت کم مغل افسروں کو جنوب کے سیاسی و فوجی حالات اور دشمن کے اثر و رسوخ اور وسائل کا صحیح علم تھا۔ تازہ فوجی کمک پہنچنے سے قبل خانخاناں کو دکن میں زبردست زک اٹھانی پڑی اس نے یہ کوشش کی کہ احمد نگر پر یکایک حملہ کر کے اس کو فتح کر لے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی دشمن باہر نکل کر لڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کے برخلاف انہوں نے گوریلا ترکیبیں اس کامیابی کے ساتھ انجام دیں کہ مغل فوج کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی رسد جو کہ پہلے ہی سے قحط کے سبب کم تھی بالکل ہی منقطع ہو گئی۔ خانخاناں کو زبردست نقصان ہوا اور اس نے صلح کر لی۔ وہ برہان پور واپس لوٹ گیا۔ اس ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ 1610ء میں احمد نگر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جہانگیر کو اس بات کا یقین دلا گیا کہ مغلوں کی شکست کی بنیادی وجہ خان خانان کی دورویہ پالیسی ہے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ خانخاناں ملک عنبر کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور عنبر نظام شاہ کی ریاست کی مالگزاری کا 1/2 حصہ خانخاناں کو ادا کرتا تھا۔ چنانچہ خانخاناں کو واپس بلا کر دکن کی مہم کی کمان خان جہان لودی کے سپرد کر دی گئی۔ خانخاناں کی طرح خان جہاں نے بھی شہنشاہ کو لکھا کہ اگر وہ اس مہم کو کامیابی سے سرانجام نہ دے سکے تو اس کو شہنشاہ کی خدمت میں حضوری کے شرف سے محروم کر دیا جائے اور پھر وہ غلامان دربار کو بھی اپنی صورت نہ دکھائے گا۔

شہنشاہ کا خیال خاں جہان کے بارے میں بہت تھا اور وہ اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ نے خان جہان کا مشورہ بخوشی مان لیا اور دو ہزار احدی، دس ہزار سوار اور ساڑھے تین لاکھ روپیہ دے کر روانہ کیا۔ شہنشاہ نے اپنی پگڑی بھی خان جہاں کے سر پر رکھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ کو میواڑ سے گجرات روانہ کیا اور یہ ہدایت دی کہ وہ خان جہاں سے میل جول قائم رکھے اور ناسک کے محاذ پر سرگرم عمل رہے۔ 1611ء میں خان جہاں اور ان کی اصل فوج برار اور خاندیش کے راستے روانہ ہوئی اور عبداللہ خاں براستہ ناسک روانہ ہوا۔ قرار یہ پایا کہ دونوں فوجیں دولت آباد کی طرف رخ کریں اور وہاں جا کر مل جائیں۔ عبداللہ نے اپنی لیاقت و استعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہا۔ وہ اصل فوج کو نظر انداز کر کے دشمنوں کی سرزمین میں گھستا ہوا دولت آباد تک پہنچ گیا۔ عبداللہ کو اس بے باکی و بے احتیاطی کا خمیازہ اٹھانا پڑا کیوں کہ احمد نگر کے سبک سوار دستے نے گوریلا طرز جنگ سے کام لے کر اس کو سخت پریشانی کیا، اس کی رسد منقطع کر دی اور اس

کا ساز و سامان لوٹ لیا۔ آخر اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور لڑتا ہوا گجرات کی سرحد تک لوٹ آیا۔ اس لڑائی میں اسے اپنے چند قابل اور بہادر سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سپہ سالار خان جہان نے اس پسپائی کی وجہ یہ بیان کی کہ امراء کے درمیان اختلافات موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس نے خانخاناں پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ظفر نگر میں روکے رکھا اور اس طرح اس پر غداری کا الزام لگایا۔ شہنشاہ نے اس شکست کو پیشتر عبداللہ خاں کی جلد بازی پر محمول کیا۔ 1612ء میں خان جہاں سے کمان واپس لے کر ایک مرتبہ پھر عبدالرحیم خانخاناں کو سونپ دی گئی۔ اس وقت عارضی طور پر شہنشاہ کی توجہ میواڑ کی طرف مبذول ہوگئی۔

میواڑ کی مہم

راجا باسو جب کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ چونکہ وہ رانا کا بہی خواہ ہے اس لیے اس مہم کو دل و جان سے انجام نہیں دے رہا ہے لہذا خان اعظم عزیز کوکہ کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا۔ عزیز کوکا دکن کی گندی سیاست سے علاحدہ رہنا چاہتا تھا اس لیے اس نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کو میواڑ بھیج دیا جائے۔ جب عزیز نے میواڑ کی فوج کی کمان سنبھالی تو اس نے شہنشاہ کو لکھا کہ جب تک شاہی پرچم ان علاقوں میں نہ لہرائے معاملات کا حل ہونا دشوار ہوگا۔ لہذا 1613ء میں جہانگیر باغی رانا کے معاملات کو ختم کر دینے کے لیے آگرہ سے روانہ ہوا اور اجمیر میں اپنا مرکز قائم کیا۔ خان اعظم کی درخواست پر اس نے شہزادہ خرم کو بھی جنگ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اولوالعزم اور تند مزاج شہزادہ کا خان اعظم جیسے عمر رسیدہ ایمان دار، صاف گو اور خوددار امیر کے ساتھ مل جل کر کام کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزادہ نے خان اعظم کے خلاف شہنشاہ سے شکایت کی۔ شہنشاہ نے فوراً ہی ایک مکتوب کے ذریعے خان اعظم سے سدھار کی درخواست کی اور اس کو تنبیہ بھی کر دی لیکن حالات میں سدھار نہ ہوا بلکہ وہ بگڑتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ شہزادے نے اس کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ شہنشاہ نے خان اعظم کو قلعہ گوالیار بھیج دیا پھر کچھ عرصے بعد اس کو رہا کر دیا گیا۔

شہزادہ خرم نے زبردست وسائل کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے مہم کا آغاز کیا۔ کھیتوں اور باغوں کو آگ لگا دی گئی، گاؤں اور شہر لوٹ لیے گئے۔ مغلوں نے میدانی علاقوں کو پہلے ہی اجاڑ دیا تھا اور کھیتی باڑی کے آثار تک باقی نہ رہے تھے۔ بہت سے ایسے علاقوں میں جہاں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ فوجی چوکیاں قائم نہیں کی جا سکتیں، قائم کر دی گئیں۔ اور بادرفتار فوجی دستے تیز دھوپ یا زبردست بارش کا خیال کیے بغیر راجپوتوں کا مسلسل تعاقب کرتے رہے۔ زبردست ناکہ بندی، مستقل جنگ، رسد کی کمی اور قحط و وبا نے مل کر راجپوتوں کی ہمت مقاومت کو توڑ دیا۔ لوگ رانا کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے یہاں تک کہ اس کے پاس مٹھی بھر ساتھی رہ گئے۔ ان حالات میں رانا امر سنگھ کا سلطنت مغلیہ کی قوت و طاقت سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا۔ امراء اور شہزادہ کرن نے رانا کو یہی مشورہ دیا کہ مصالحت کر لے۔ امر سنگھ نے وعدہ کر لیا کہ وہ شہزادہ خرم کے پاس خود حاضر ہوگا اور اپنے بیٹے کرن کو دربار میں بھیج دے گا۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ مغل فوج میں خدمت کے لیے روانہ کر دے گا لیکن اس نے یہ درخواست جرور کی کہ اس کو دربار میں حاضری سے معاف کیا جائے۔ شہزادہ خرم نے یہ تجاویز شہنشاہ کو بھیج دیں اور اس ننے بخوشی ان کو قبول کر لیا۔ ہمارے ذہن عالی میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قدیم خاندانوں کو برباد نہ کیا جائے۔ شہنشاہ محض یہ چاہتا تھا کہ وہ اطاعت تسلیم کر لیں۔ اس کے علاوہ دکن کے حالات بہت ہی غیر اطمینان بخش اور اس کے محتاج تھے کہ

شہنشاہ ان پر پوری توجہ دے لیکن جب تک میواڑ کا مسئلہ حل نہ ہو جائے وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ شہنشاہ نے رانا پر صرف ایک پابندی لگائی اور وہ یہ کہ رانا چتوڑ کے قلعے کو مضبوط نہ کرے۔ رانا امر سنگھ شہزادہ خرم سے ملنے لگا۔ شہزادے نے بہت ہی عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ تحفے تحائف بہت ہی بڑے پیمانے پر ردوبدل کیے گئے۔ رانا۔ رانا نے شہزادہ کرن کو بھیجنے کا وعدہ کیا اور اس کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ جوں ہی کرن شہزادے کے کیمپ میں پہنچا خرم اجمیر کی طرف چل دیا۔

شہنشاہ نے خرم کو بے حد عنایات سے نوازا اور اس کو بیس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور صف اول میں دائرے کے دائیں طرف جگہ دی جو کہ مغل دربار میں کسی کو کم ہی حاصل ہوتی ہے۔ کرن وحشی مزاج تھا لہذا ہمیں اس کا دل جیتنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی تازہ مہربانی کا سلوک کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہنشاہ اور نور جہاں بیگم نے کرن کو تحفوں سے لاد دیا۔ چند ماہ بعد اس کو پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔ جب صلح ہو گئی تو میواڑ کے وہ سارے علاقے مع قلعہ چتوڑ کے جو اکبر و جہانگیر کے زمانے میں چھین لیے گئے تھے رانا کو واپس کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ خود شہزادے کو کافی جاگیر عنایت کی گئی۔ دو سال بعد رانا امر سنگھ اور کرن کے دو سنگ مرمر کے سب سوار مجسمے آگرہ میں جھروکے کے نیچے والے باغ میں نصب کرائے گئے لیکن رانا پرتاپ کے لڑکے کی زخم خوردہ خودداری کو شاہی نوازشات سے کوئی سکون حاصل نہ ہوا اور اس کی ذہنی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ اس نے راج کمار کرن کے حق میں تخت سے دست برداری حاصل کر لی اور اپنی زندگی کے آخری ایام نوچوکی جا کر خلوت و تنہائی میں بسر کرنے لگا۔ لیکن جہانگیر نے از روئے عنایت رانا کی کنارہ کشی کو اس کی موت سے پہلے قانونی طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس طرح تیمور اور چتوڑ کے خاندانوں کی قدیم رقابت کا خاتمہ ہوا جو 1526ء میں شروع ہوئی لیکن 1567ء کے بعد سنجیدہ تر و طویل ہوتی گئی۔ اس پچاس سالہ جنگ کی تاریخ بہت سے ایسے جوشیلے واقعات سے پر ہے جن میں پر جوش دلاوری، تعجب خیز وفاداری، حیرت انگیز قربانی، غیر معمولی تحمل، کردار کی اعلیٰ ظرفی اور حب الوطنی کے مظاہرے ہوئے۔

6.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ اکبر کا سب سے بڑا بیٹا جہانگیر کسی رکاوٹ کے بغیر محض اس وجہ سے بادشاہ بن گیا تھا کہ اس کے سارے چھوٹے بھائی اکبر کی حیات میں ہی بے تحاشا شراب خوری کی وجہ سے مر چکے تھے۔ لیکن جہانگیر کے بادشاہ بننے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے بڑے لڑکے خسرو نے بغاوت کر دی۔ اس زمانے میں تخت کے لیے باپ اور بیٹے کے درمیان ٹکراؤ کا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ خود جہانگیر نے بھی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا اور اس کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے ساری سلطنت میں بدامنی پھیل گئی تھی۔ خسرو کی بغاوت زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی۔ جہانگیر نے جلد ہی لاہور کے قریب ایک جنگ میں اسے شکست دی اور قیدی بنا لیا۔ آپ جانیں گے کہ جہانگیر نے کس طرح میواڑ کے ساتھ چار دہائیوں سے چلی آ رہی مقابلہ آرائی کا خاتمہ کیا اور دکن میں جس ملک عنبر نے اکبر کے تصفیے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اس کے ساتھ ٹکراؤ کو بھی ختم کر دیا۔ اکبر کی طرح ہی جہانگیر بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی بھی علاقے کو طاقت کے بجائے علاقے کے لوگوں کے دلوں کو جیت کر ہی زیادہ عرصے تک قابو میں رکھا جا سکتا ہے چنانچہ اس

نے شکست خوردہ افغان امیروں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔1622ء تک جہانگیر ملک عنبر کو تابع کرنے، میواڑ کے ساتھ عرصے سے جاری کش مکش کو ختم کرنے اور بنگال میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہانگیر اس وقت 51 سال کا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ ایک طویل عرصہ امن اور خوش حالی میں ہی گذرنے والا ہے۔ مگر دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے صورت حال بالکل ہی تبدیل ہوگئی۔ ایک تو یہ کہ قندھار پر ایران کا قبضہ ہوگیا جس سے مغل وقار کو دھکہ پہونچا اور دوسرے یہ کہ جہانگیر کی صحت خرابی کی وجہ سے شہزادوں میں جانشینی کے لیے رسہ کسی شروع ہوگئی اور امراء اپنے اختیارات اور طاقت میں اضافے کی تاک میں لگ گئے۔ ان حالات نے سیاست کے میدان میں نورجہاں کے اترنے کے لیے موقع فراہم کردیا اس میں نورجہاں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

6.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

بارگی : مراٹھا تیز رفتار گھوڑسوار جو اجرت پر دکنی ریاستوں میں کام کرتے تھے۔

نورجہاں : جہانگیر کی محبوب بیوی جس نے سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

گوریلا طرز جنگ: یہ طریقہ جنگ ضرب لگاؤ اور بھاگو کے اصول پر کام کرتا تھا۔

شاہ عباس : ایران کا صفوی خاندان کا حکمراں

6.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جہانگیر کون تھا
2. تزک جہانگیری کس زبان میں ہے
3. لاہور کہاں واقع تھا۔
4. میواڑ کس جگہ ہے۔
5. قندھار ہمارے ملک سے کس سمت میں ہے۔
6. تزک جہانگیری کل کتنے لوگوں نے لکھی تھی۔
7. شالیمار باغ اور نشاط باغ کس نے بنوائے۔
8. نورجہاں کا پورا نام کیا ہے۔
9. آصف خاں کون تھا۔
10. اعتمادالدولہ کا مقبرہ کہاں ہے۔

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تزک جہانگیری کی اہمیت بیان کیجئے۔
2. عہد جہانگیری کے دو شہروں کے بارے میں لکھئے۔
3. نور جہاں کا کیا رول تھا بیان کیجئے۔
4. شاہ عباس کے جہانگیر سے کیسے تعلقات تھے بیان کیجئے۔
5. قندھار کی ناکامی پر نوٹ لکھئے۔

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. آئین جہانگیری پر ایک مضمون لکھئے۔
2. قندھار کی مہم پر خاص تبصرہ کیجئے۔
3. عہد جہانگیری میں ہونے والی بغاوتوں پر ایک نوٹ لکھئے۔
4. جہانگیر کی مذہبی پالیسی بیان کیجئے۔
5. تزک جہانگیری کے حوالے سے ایک نوٹ لکھئے۔

6.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Athar Ali, M., *Mughal India: Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. 2006)
2. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne: The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
3. Mukhia, Harbans, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2005.
4. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
5. آر پی ترپاٹھی، مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
6. ستیش چندر، عہد وسطیٰ کا ہندوستان: دہلی سلطنت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
7. پروفیسر یاسین، مغل عہد کی سماجی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 7۔ شاہ جہاں

(Shahjahan)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 شاہ جہاں
7.2.1 شاہ جہاں کی تاج پوشی
7.2.2 نور جہاں اور شاہ جہاں
7.2.3 جھجھار سنگھ بندیلہ کی بغاوت
7.2.4 شاہ جہاں اور گروہر گوند
7.2.5 احمد نگر کا الحاق
7.2.6 گولکنڈہ مہم
7.2.7 بیجاپور مہم
7.2.8 شاہ جہاں کی بلخ مہم
7.2.9 فن تعمیر
7.2.10 جانشینی کی جنگ اور شاہجہاں کی موت
7.3 اکتسابی نتائج
7.4 کلیدی الفاظ
7.5 نمونہ امتحانی سوالات
7.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.0 تمہید (Introduction)

شاہجہاں کی پیدائش لاہور میں سولہویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ یہ ایک راجپوت شہزادی کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے موقع پر درباری شاعروں نے اسے دنیا کا فاتح کہا تھا۔ اس اکائی میں ہم شاہجہاں کی تاج پوشی کے تفصیلی واقعات کو بیان کریں گے۔ کس طرح نور جہاں بادشاہی منصب کے لیے شہریار کی دعویداری کرنے لگی، اور کس طرح خرم اس کو شکست دے کر تخت پر رونق افروز ہوا اور یادگار کے طور پر کئی اہم احکام جاری کیے جو اس دور کے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ جہاں شاہ جہاں نے سیاسی پیچ و خم پر فتوحات کا جھنڈا لہرایا یا وہیں ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر بڑی گہری دلچسپی کا بھی مظاہرہ کیا تھا جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس اکائی میں ہم اس کے پورے دور میں ہونے والے اہم واقعات کا جائزہ لیں گے۔ مختلف بغاوتیں کس طرح معرض وجود میں آئیں اور ان بغاوتوں کے سرغنہ کون لوگ تھے؟ سماج میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ سیاسی سرگرمیوں میں نور جہاں کا کیا کردار تھا اور اس کو خرم نے کس طرح شکست دی؟ ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے ذریعے جاننے کی کوشش کریں گے۔ ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔ شاہجہاں کی فتوحات سے سے سماج کس طرح متاثر ہوا؟ اور ملکی و غیر ملکی واقعات کی وجہ سے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس کا اندازہ لگا سکیں گے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- شاہجہاں کے دور کو سمجھ سکیں گے۔
- تاج پوشی کے اہم واقعات سے روشناس ہو سکیں گے۔
- سماج میں بادشاہ کی حیثیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- شاہ جہاں کے دور کی اہم بغاوتوں کا خلاصہ کر سکیں گے۔
- ہندوستان کی سرحدوں میں تبدیلی میں شاہ جہاں کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- اس دور میں ہونے والی فتوحات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے واقف ہو سکیں گے۔

7.2 شاہ جہاں (Shah Jahan)

شاہ جہاں کے بچپن کا نام خرم تھا۔ خرم کی پیدائش 5 جنوری 1592ء کو لاہور میں ہوئی۔ اس کی ماں مارواڑ کے موٹا راجا اودے کی لڑکی جگت گوسائی (جودھا بائی) تھی۔ خرم کی پیدائش کے موقعہ پر درباری شاعروں نے اسے دنیا کا فاتح کہا تھا۔ شاہ جہاں پہلے نور جہاں گروہ کا

اہم امیدوار تھا لیکن نور جہاں کی اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کرنے پر نور جہاں بادشاہت کے منصب کے لیے شہریار کی دعوی داری کرنے لگی، اس لیے شاہ جہاں نے 1623ء میں بغاوت کر دی۔ 1627ء میں جہانگیر کی موت کے وقت شاہ جہاں دکن میں تھا، اس لیے شاہ جہاں کے سسر آصف خاں نے خسرو کے بیٹے داور بخش کو تخت پر بیٹھا کر چال چلی اور بنارسی داس نامی تاجر کے ذریعہ پیغام بھیج کر شاہجہاں کو بلوایا۔ شاہ جہاں نے اپنے بھائیوں کا خاتمہ کر کے آخر میں داور بخش کو بھی قتل کر دیا۔ ہمعصر مؤرخین نے داور بخش کو بلی کا بکرا کہا ہے۔

7.2.1 شاہ جہاں کی تاج پوشی (Coronation of Shah Jahan)

4 فروری 1628ء کو مغلوں کی روایتی شان و شوکت کے ساتھ شہزادہ خرم آگرہ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہ جہاں پادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں سجدے کی رسم کو ختم کر دیا، اپنا نیا کلینڈر شروع کیا اور حکم دیا کہ نئے سکوں کے ایک طرف خلفائے راشدین کے نام اور دوسری طرف اس کا اپنا نام کندہ کیا جائے۔ خاندان کی بیگمات اور خونی رشتے کے شہزادون کو بیش بہا تحائف دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں نے اپنی تاج پوشی کے موقع پر ایک کروڑ ستر روپیہ خرچ کیا۔ اس رقم میں سے تیس لاکھ روپیہ امراء کو ملا اور بقیہ روپیہ تحفوں کی شکل میں شاہی خاندان والوں کے حصے میں آیا۔ شاہجہاں نے اپنے حامیوں کو ترقیاں دیں یا جن کو ترقی نہ ملی وہ اپنے عہدے و منصب پر مستقل کر دیے اور ہمیشہ کی طرح جن امراء کی وفاداری میں کسی قسم کا شبہ و شک تھا ان کی جگہ اپنے معتمدین کا تقرر کیا۔ شاہ جہاں نے ازراہ مہربانی نور جہاں کے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ یہ بات واضح نہیں کہ یہ رقم نور جہاں کی ان عنایات کے صلے میں تھیں جو اس نے شاہ جہاں سے اعتمادالدولہ کے زمانے میں کی تھیں یا اپنے ضمیر کو تسلی دینے کے لیے مقرر کی تھی تاکہ اس نے جو سیاسی چالیں نور جہاں کے خلاف چلی تھیں اور اس سلسلے میں اس خاتون پر گستاخانہ الزامات لگائے تھے ان کا بدلہ چکایا جا سکے۔

تصویر 7.1۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں 1592تا1666۔
https://www.tajmahal.gov.in/about-shah-Jahan.aspx (Online Source)

7.2.2 نور جہاں اور شاہ جہاں (Noor Jahan and Shah Jahan)

نور جہاں عورت ہونے کی وجہ سے کسی ایسے ہمعصر وقائع نویس کو نہ پا سکی جو اس کے ساتھ انصاف کرتا۔ اس کے شوہر نے آداب معاشرت یا نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں زیادہ نہ لکھا البتہ کہیں کہیں اس کی وفاداری اور شوہر پرستی و لیاقت اور فراخ دلی کی

تعریف کی ہے۔نور جہاں کے دل ودماغ کی خوبیوں ، استعداد، ہنر مندی۔ادبی لیاقت ،ذکاوت ، باوقار رویہ ،شان وشوکت ،جاذبیت ، حوصلہ مندی، شکار اور دوسرے کھیلوں سے دل چسپی، تہذیب و شائستگی وملنساری کے سبب 23-1522ء میں اس کو بادشاہ بیگم کا قابل رشک خطاب ملا جس کی وہ پوری طرح مستحق تھی۔اس کا نام سکوں پر کندہ کرایا گیا۔یہ ایک ایسا غیر معمولی اعزاز تھا جو اسی قسم کی ایک اور خاتون ترکام خانم والدہ سلطان علاءالدین تکش خوارزم کو نصیب ہوا تھا۔بہت سے لوگوں کے نزدیک نور جہاں کو رسمی اور کھلے طور پر ملکہ کا رتبہ دیا جانا ایک بدعت سے کم نہ تھا اور اس کو بادشاہ کے عشق وفریفتگی کا مضمر سمجھا جاتا تھا۔بعض لوگوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔اس زمانے کے ایک عام ہندوستانی کے لیے یہ خیال کہ ملکہ کو اس قدر اعزاز واحترام دیا جائے ناقابل تصور تھا۔بہر حال یہ نہ تو کوئی غلط عمل تھا اور نہ ہی اس میں کوئی قابل ملامت بات تھی بلکہ اس کے بر خلاف یہ ایک وسیع النظر اور روشن خیال بادشاہ کا ترقی پسندانہ اقدام تھا۔اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں کہ نور جہاں نے اس اعزاز واکرام کے لیے شہنشاہ سے درخوست کی ہو یا اس کے لیے ضد کی ہو اور شہنشاہ اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔ نہ اس بات کی کوئی مثبت دلیل موجود ہے کہ نور جہاں نے شخصیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہو یا شاہی خاندان کی بیگمات یا مملکت کے ملازمین یا عام رعایا کو اپنے سے ناراض کیا ہو لیکن اگر کچھ لوگ رشک وحسد سے جلنے لگے ہوں تو اس میں اس کا کیا قصور۔شہریار کی خوشدامن ہونے کی وجہ سے اس پر ہر قسم کے الزامات عاید کیے جاتے ہیں اور اس پر انگشت نمائی کی جاتی ہے۔تاریخ کے مصدقہ واقعات ان الزامات کی تصدیق نہیں کرتے۔شاہ جہاں کے دور میں عملی زندگی سے کنارہ کش ہونے کے بعد اس نے اپنی زندگی کے 18 سال بڑی سختی کے ساتھ خاموش طریقے پر غم واندوہ میں گزارے۔نور جہاں 1645ء میں فوت ہوئی اور اپنے شوہر کے مقبرے کے قریب دفن کی گئی۔

7.2.3 جھجھار سنگھ بندیلہ کی بغاوت (Rebellion of Jhajhar Singh Bandela)

راجا بیر سنگھ بندیلا نے ابوالفضل کو قتل کر کے جو شہزادہ سلیم کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔شہنشاہ جہانگیر کی نظروں میں بڑی وقعت اور بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔جیانگیر نے اس کو خوب نوازا۔شہنشاہ کی مہربانی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے دوسرے زمینداروں کی زمینوں پر بھی ہاتھ ڈالا اور اس کی غاصبانہ نگاہوں سے شاہی علاقہ جات بھی محفوظ نہ رہ سکے۔راجا بیر سنگھ 1627ء میں انتقال کر گیا اور اس کا سب سے بڑا بیٹا جھجھار سنگھ اس کا وارث بنا۔شاہ جہاں کی تاج پوشی کے موقع پر جھجھار سنگھ اظہار اطاعت کے لیے خود آگرہ آیا۔اس کی عدم موجودگی میں اس کے بیٹے وکرماجیت نے ریاست کا انتظام بڑی بددیانتی اور ظالمانہ طریقے سے انجام دیا۔ریاست کے ایک قدیمی اور باعزت ملازم سیتارام نے جس کو وکرماجیت نے سخت اذیت پہنچائی تھی اور بہت ذلیل کیا تھا سخت شکایت کی چونکہ شاہ جہاں کو اورچھ کے راجاؤں سے کوئی انسیت نہ تھی اور وہ وہاں کے حکمرانوں کی سختیوں اور مظالم سے چشم پوشی کے لیے تیار نہ تھا لہذا اس نے اس شکایت کے پیش نظر حکم صادر کیا کہ ان واقعات کی اور راجا کے پاس غیر معمولی دولت جمع ہونے کی پوری پوری تفتیش کی جائے۔شہنشاہ نے جھجھار سنگھ کے خلاف کوئی غیر دوستانہ رویہ اختیار نہ کیا۔اس کے بر خلاف شاہجہاں نے اس کو چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا لیکن جب ریاست کے معاملات کے بارے میں تحقیقات کا حکم صادر ہوا تو راجا کو پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے اسی میں خیریت سمجھی کہ بغیر اطلاع کیے دربار سے بھاگ کر اپنی ریاست کی پہاڑیوں اور گنجان جنگلوں میں پناہ لے۔

راجا کے اچانک دربار سے غائب ہو جانے کے سبب شہنشاہ آزردہ خاطر ہوا اور مخالفین نے اورچھ کے خاندان کے خلاف جو شکایات کیں تھیں ان میں اور نمک مرچ ملا کر پیش کیا۔ شاہجہاں نے جھجھار سنگھ کو اس کی بے ادبی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہجہاں نے اس کا درست اندازہ لگایا کہ اکبر کے زمانے میں بیر سنگھ کے خلاف جو فوجی مہم بھیجی گئی تھی وہ بندیلا ریاست کے جغرافیائی حالات کے سبب کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی تھی اور اب تو اس ریاست کے مالی وسائل اس چوتھائی صدی کے آخر میں اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ لہذا ضرورت تھی کہ جو فوجی مہم اس کے خلاف بھیجی جائے وہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو اور اس کی خاص توجہ کی جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ مہم شاہجہانی عہد کی پہلی فوجی مہم تھی اور وہ بھی راجاؤں کے ایک نئے خاندان کے خلاف اگر وہ کامیاب نہ ہوئی تو اس کے عہد کا آغاز ایک ناکام مہم سے ہو گا جس سے اس کے وقار کو صدمہ پہنچے گا اور اس کے عہد حکومت کو بڑی بد شگونی کا سامنا پڑے گا۔ مہابت خاں کو حکم ملا کہ وہ گوالیار سے دس ہزار سوار اور دو ہزار بندوقچی لے کر روانہ ہوا۔ ادھر سید ظفر خاں بارھہ و دیگر افسران کو حکم ملا کہ بندیلا ریاست میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں۔ دوسری طرف خان جہاں لودی صوبے دار مالوہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ آٹھ ہزار سواروں کے ہمراہ مہابت خاں کی مدد کو پہنچے۔ اسی طرح عبداللہ خاں فیروز جنگ کو کالپی سے روانہ ہونے کا فرمان ملا۔ یہ بڑی زبردست مہم تھی اور اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ ڈالا۔ شہنشاہ نے کامیابی کرنے کے لیے خود بھی شکار کے بہانے گوالیار میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس ہمہ گیر مہم جس کی نگرانی ایک لائق ترین مغل بادشاہ کر رہا تھا بے نتیجہ ختم ہونے والی نہ تھی۔ ایرج کے قلعے پر شدید حملہ کیا گیا اور وہاں پر مقیم تین ہزار فوج تہہ تیغ کر دی گئی۔ جھجھار سنگھ نے اپنی نازک حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ وہ کامیابی سے شہنشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ادھر جھجھار سنگھ اپنی ریاست کے معاملات کو سنبھال نہ پایا تھا۔ ادھر شاہی کیمپ میں اس کا مدمقابل حریف بھرت سنگھ بندیلا جو کہ خود کو ریاست کا وارث سمجھتا تھا للکار رہا تھا۔ ان حالات میں جھجھار سنگھ نے اطاعت قبول کر لی۔ ایک ہزار اشرفی، پندرہ لاکھ روپیہ، چالیس ہاتھی بطور جرمانہ اور وہ علاقے جن پر اس کے باپ نے قبضہ کر لیا تھا واپس کر دیا۔ جھجھار سنگھ کو اس کے اصلی عہدے پر مستقل کر دیا گیا اور حکم ملا کہ دو ہزار سوار اور دو ہزار پیادہ لے کر دکن میں خدمت کیلیے پہنچ جائے۔ دوسری بغاوت 1628ء میں افغان سردار خان جہاں لودی (پیر خان) نے کیا۔ 1631ء میں خان جہاں کو مادھو سنگھ نے قتل کر دیا۔

7.2.4 شاہ جہاں اور گرو ہرگوبند (Shah Jahan and Guru Hargobind)

شاہ جہاں کے عہد کے آغاز میں سکھوں کے چھٹے گرو کا بادشاہ سے جھگڑا ہو گیا اس جھگڑے کا سبب بہت معمولی تھا۔ بادشاہ امرت سر کے قریب شکار کھیل رہا تھا اس کا ایک دل پسند باز اڑ کر گرو کے کیمپ میں پہنچ گیا جو وہاں سے بہت دور تھا۔ سکھوں نے پرندے کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مخلص خان کی سرکردگی میں سکھوں کو بیدار کیلیے مہم روانہ کی گئی۔ کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جن میں سکھوں کے قائد بھائی بھانو اور سنگھا دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ 1628ء میں سردار پائندہ خاں نے سکھوں کی فوج کو روکے رکھا اور آخری حملے میں جن کی سرداری خود گرو کر رہے تھے مغل فوج کو شکست ہوئی۔ یہ مغلوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی تھی۔ شاہی دربار میں سکھوں کے بہی خواہ وزیر خاں وغیرہ نے بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لیکن گرو کے دشمن بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ انہوں نے عبداللہ خاں کو جو کہ جالندھر میں مغل افسر تھا بھڑکایا کہ وہ گرو کے خلاف دوسری مہم شروع کر دے اس وقت گرو دریائے بیاس کے کنارے

ماجھا اور دوآب کے علاقوں کے درمیان پنجاب میں ایک نیا شہر تعمیر کرنے میں مصروف تھے جو کہ بعد میں ہرگوبند پور کے نام سے مشہور ہوا۔ جنگجو کسانوں کے ملک کے بیچ میں ایک نئے شہر کے آباد ہونے سے مغلوں کو امرت سر کی ویرانی سے جو فائدے حاصل ہوئے تھے وہ ختم ہوگئے۔ اس کے علاوہ صوبے دار کچھ اس وجہ سے بھی گرو کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا کہ گرو کے ساتھیوں نے ایک جھگڑے میں علاقے کے چودھری بھگوان داس گھیرار کو جو نئے شہر کی بنیاد ڈالنے اور گرو کی تبلیغ کا مخالف تھا مار ڈالا چنانچہ گرو کے پاس یہ پیغام بھیجا گیا کہ وہ نئے شہر کے بسانے کے ارادے کو ترک کردے لیکن گرو نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا اور اپنی کاروائی جاری رکھی۔ سکھوں پر حملہ کیا گیا لیکن گرو کو ہی غلبہ حاصل رہا۔

تیسری دفعہ بیدھی چند کی چوری کرنے پر جھگڑا ہوا۔ بیدھی کسی زمانے میں ایک مشہور ڈاکو تھا لیکن گرو کا ایک معتقد تھا۔ اس نے شاہی اصطبل سے دو بہترین گھوڑے چرا کر گرو کو پیش کردیے اور گرو نے بھی بد قسمتی سے ان کو قبول کرلیا۔ 1631ء میں ایک قوی مغل فوج گرو کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی لیکن اس کو شکست ہوئی۔ فوراً ہی دوسری فوج کالے خاں کی ماتحتی میں روانہ کی گئی۔ اس دفعہ مغل فوج پہلے کی نسبت زیادہ قوی تھی۔ ادھر گرو کا ایک بہترین افسر پائندہ خان گرو سے جھگڑ کر مغلوں سے جا ملا تھا لیکن گرو نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کرتار پور کے مقام پر خوف ناک جنگ ہوئی جس میں پائندہ خاں مارا گیا، سکھوں کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن آخر میں فتح ان ہی کو نصیب ہوئی اس لڑائی میں تیغ بہادر نے جو کہ بعد میں گرو ہوئے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ مغلوں کے مستقل دباؤ کی وجہ سے سکھوں کی ابھرتی ہوئی قوت کو صدمہ پہنچا انھیں نہ صرف یہ کہ مذہبی تبلیغی کام کو روکنا پڑا بلکہ مغلوں کی مخالفت کے سبب سکھوں کو بہت تکالیف اٹھانی پڑیں۔ جس کی وجہ سے یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ سکھ برادری جو اپنے ہی پیروں پر کھڑی تھی اور پنجاب کی ہندو آبادی سے اسے بہت کم مدد ملی تھی کہیں برباد نہ ہوجائے۔ گرو نے اپنی سمجھ سے اس بات کا اندازہ لگالیا کہ وہ اپنے محدود وسائل کے ذریعے مغل خاندان کے ایک سب سے زیادہ بااثر شہنشاہ کے لامحدود دباؤ کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہ کرسکیں گے چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ برادری کو کچھ مہلت دی جائے اور گرو اپنا وقت گیان ودھیان اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانے میں صرف کریں۔ لہٰذا وہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جاکر کرت پور کے مقام پر رہنے لگے اور انہوں نے اپنے آخری ایام خاموشی سے گیان دھیان اور تبلیغی کاموں میں گزار کر ہرگوبند کے سب سے بڑے لڑکے بھٹ ہررائے کو اپنا جانشین بناکر 1645ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد سکھوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو ہربند نے سکھوں کو گوشت کھانے کی اجازت دے دی۔ مہوبا کے چمپت رائے نے بھی بغاوت کی لیکن آخر میں اس سے صلح ہوگئی۔ مالوہ کے کھاتاکھیڑی کے بھاگیرتھ بھیل، چھوٹا ناگپور کے راجا پرتاپ اور نورپور کے زمیندار جگت سنگھ نے بھی شاہ جہاں کے دور میں بغاوت کی تھی۔

7.2.5 احمد نگر کا الحاق (Annexation of Ahmednagar)

1633ء میں احمد نگر کو مغل سلطنت میں ملا لیا گیا اور آخری نظام شاہی سلطان حسین شاہ کو قید کرکے گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔ فتح خاں احمد نگر مہم میں مغلوں کا ایک سپہ سالار تھا۔ احمد نگر کے زوال کے بعد شاہ جی بھونسلے احمد نگر کو چھوڑ کر بیجاپور کی خدمت میں چلے گئے تھے۔ اسی وقت شاہ جہاں نے مراد کے کہنے پر شاہ جی کو پانچ ہزار کا منصب اور پونا کی جاگیر دی تھی۔ 1636ء کے بعد شاہ جہاں کی دکن

پالیسی کافی حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس نے کافی وقت جنوب میں لگا دیا اسے جنوب کا تجربہ اور علم حاصل ہو گیا تھا۔

7.2.6 گولکنڈہ کی مہم (Campaign against Golconda)

1636ء میں گولکنڈہ کے حکمراں عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر کے معاہدہ کر لیا۔ گولکنڈہ میں ایران کے شاہ کی جگہ پر شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر بھی شاہ جہاں کا نام شامل کر لیا گیا۔ گولکنڈہ جو چار لاکھ ہنوں کا ٹکس بیجاپور کو دیتا تھا، وہ معاف کر دیا گیا۔ اسی وقت گولکنڈہ کا وزیر میر جملہ گولکنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی خدمت میں آگیا۔ میر جملہ پہلے فارسی بیوپاری تھا۔ میر جملہ نے شاہ جہاں کو کوہ نور ہیرا نذر کیا تھا۔

7.2.7 بیجاپور کی مہم (Campaign against Bijapur)

1631ء میں شاہ جہاں نے آصف کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن آصف خاں کا حملہ ناکام رہا۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے مہابت خاں کو جنوب کا صوبہ دار متعین کیا۔ 1636ء میں ہی بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ نے بھی مغلوں سے معاہدہ کر کے مغل ماتحتی قبول کر لی۔ شاہ جہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبے داروں کی راجدھانی برہان پور تھی۔

7.2.8 شاہ جہاں کی بلخ مہم (Shah Jahan's Campaign against Balkh)

شاہ جہاں کے لیے قندھار کی فتح ایک بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے محض ایک وسیلہ تھی۔ اسے دراصل زیادہ تشویش کابل پر ازبکوں کے حملوں کے امکانات نیز بلوچیوں اور افغان قبائل کے ساتھ ان کی سازشوں کے بارے میں تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب بلخ اور بخارا دونوں پر ہی نظر محمد کا قبضہ ہو گیا تھا۔ نظر محمد اور اس کا بیٹا عبدالعزیز دونوں ہی کافی خواہش مند واقع ہوئے تھے اور کابل نیز غزنی پر بھی قبضے کے لیے افغان قبائل کی مدد سے حملے کرتے رہے تھے۔ لیکن عبدالعزیز نے بہت جلد ہی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا، اور صرف بلخ ہی نظر محمد کے قبضے میں رہ پایا۔ اس نے شاہ جہاں سے مدد کی درخواست کی۔ شاہ جہاں اس وقت ایران کی طرف سے مطمئن تھا ہی، اس لیے مدد کی اس درخواست کو شاہ جہاں نے فوراً منظور کر لیا۔ شاہ جہاں لاہور سے چل کر کابل پہونچ گیا اور شہزادہ مراد کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج نظر محمد کی مدد کے لیے روانہ کی۔ اس فوج میں پچاس ہزار گھوڑے اور دس ہزار پیادے تھے، پیادوں میں توپچی بھی تھے۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کا ایک دستہ بھی اس فوج میں شامل تھا۔ یہ فوج 1646ء کے وسط میں کابل سے روانہ ہوئی تھی۔ شاہ جہاں نے شہزادہ مراد کو خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ وہ نظر محمد کے ساتھ انتہائی نرمی اور شرافت سے پیش آئے اور اگر وہ انکساری اور تابعداری کا مظاہرہ کرے تو بلخ اسے دے دیا جائے۔ مزید یہ کہ اگر نظر محمد سمرقند اور بخارا کو بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ظاہر کرے تو شاہزادہ اس کی ہر طرح سے مدد کرے گا۔ ظاہر ہے کہ شاہ جہاں یہ چاہتا تھا کہ بخارا میں ایک ایسا حکمراں ہو جو اس کا دوست ہو اور مغلوں کی مدد اور تائید کا متمنی ہو۔ لیکن مراد کی بے صبری کی وجہ سے شاہ جہاں کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ مراد نے نظر محمد کے ساتھ کسی صلاح مشورے کے بغیر ہی بلخ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اور اپنے فوجیوں کو بلخ کے قلعے میں داخل ہو جانے کا حکم بھی دے دیا، جہاں پر نظر محمد قیام پذیر تھا اور مراد نے اسے اپنے سامنے حاضر

ہونے کا سختی سے حکم بھی دیا۔ نظر محمد، شہزادہ مراد کے اصل ارادوں سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔اور ایسے حالات میں مغلوں کو بلخ پر قبضہ کرنا پڑااور وہاں کی مغموم اور برہم آبادی کی مخالفت کے باوجود بھی اپنا تسلط قائم رکھنا پڑا۔دوسری طرف نظر محمد کے سامنے کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں تھا۔اس کے لڑکے عبدالعزیز نے ماوراء النہر کے علاقے کے ازبکوں کو مغلوں کے خلاف بھڑکا دیا اور ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر دریائے آمو تک پہنچ گیا۔اس اثناء میں شہزادہ مراد کی جگہ پر جو کہ وطن واپس لوٹ جانے کا خواہش مند تھا اورنگ زیب کو بھیج دیا گیا۔مغلوں نے دریائے آمو کے دفاع کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے کافی آسانی سے پار کیا جاسکتا تھا۔البتہ انہوں نے جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے اہم مقامات پر اپنے دستے تعینات کیے اور فوج کے مرکزی حصے کو ایک ساتھ رکھا تاکہ وہ کسی بھی مقام پر حملے کی صورت میں آسانی سے وہاں بھیجی جاسکے۔اس طرح مغلوں کی مورچہ بندی بہت اچھی تھی۔عبدالعزیز دریائے آمو تو پار کر گیا لیکن اپنے سامنے ایک بڑی مغل فوج کو موجود پایا۔مغلوں نے واپس بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کر کے ازبکوں کو بلخ کے دروازہ پر پسپا کر دیا(1647ء)

بلخ پر مغلوں کی فتح کے لیے نتیجے میں ازبکوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔عبدالعزیز کے ازبیک حمایتی منتشر ہو کر رہ گئے اور خود اس نے بھی مغلوں کے ساتھ صلح صفائی کی خواہش کے اشارے دیے۔نظر محمد نے جو کہ اس وقت تک ایران میں پناہ لے چکا تھا اپنی سلطنت کی بحالی کے لیے مغلوں سے درخواست کی۔شاہ جہاں نے کافی غور و فکر کے بعد نظر محمد کے حق میں فیصلہ دے دیا لیکن سب سے پہلے اورنگ زیب سے معافی مانگنے کی شرط بھی لگادی۔شاہ جہاں کی یہ غلطی تھی کیونکہ غیور ازبیک حکمران اس حد تک ہرگز نہیں جھک سکتا تھا خاص طور پر جب وہ یہ بھی جانتا ہو کہ مغل زیادہ عرصے تک بلخ میں نہیں ٹک پائیں گے۔مغل نظر محمد کی ذاتی حاضری کا فضول انتظار کرنے کے بعد آخر کار اکتوبر 1647ء میں بلخ سے روانہ ہوگئے کیونکہ سردی کا موسم تیزی سے آرہا تھا اور بلخ میں رسدات کی قلت ہوتی جارہی تھی۔مغلوں کے لیے یہ واپسی کافی مہنگی ثابت ہوئی کیونکہ باغی ازبکوں نے چھاپہ مار حملے شروع کر دیے تھے۔اگرچہ مغلوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن اورنگ زیب کی مستقل مزاجی کام آئی اور حالات قابو سے باہر نہیں ہونے پائے۔شاہ جہاں کی بلخ مہم کے معاملے پر جدید مؤرخین میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔سابقہ تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں دریائے آمو کو مغل سلطنت کی سائنٹفک سرحد بنانے کے لیے کوشش نہیں کر رہا تھا۔دریائے آمو ایک محفوظ سرحد ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔شاہ جہاں کو سمرقند اور فرغنہ پر قبضے کی بھی کوئی تمنا نہیں تھی جو کہ مغلوں کے اصل وطن تھے۔اگرچہ مغل حکمراں ان کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ایسا لگتا ہے کی شاہجہاں کا مقصد یہ تھا کہ بلخ اور بدخشاں میں ایک ایسا حکمراں ہو،جو ان کا دوست ہو،کیونکہ یہ دونوں علاقے کابل کی سرحد سے ملے ہوئے تھے اور 1585ء تک تیموری حکمرانوں کے تسلط میں رہ چکے تھے۔شاہ جہاں کا خیال تھا کہ اس طرح غزنی اور دڑہ خیبر کے علاقے میں آباد باغی افغانوں کو بھی قابو میں رکھا جاسکے گا۔جنگ حکمت عملی کے اعتبار سے مغلوں کی یہ مہم کامیاب ہی رہی،کیونکہ مغلوں نے بلخ کو فتح کر لیا تھا اور بے دخل کر دینے کی ازبکوں کی تمام کوششوں کو بھی ناکام بھی بنا دیا تھا۔اس علاقے میں ہندوستانی فوجوں کی یہ پہلی اہم کامیابی تھی اور شاہ جہاں کا اس پر خوشی منانا بالکل فطری بات تھی۔لیکن بلخ پر اپنے اقتدار کو لمبے عرصے تک قائم رکھنا مغلوں کے مقدور سے باہر کی بات تھی۔ایران کی شدید مخالفت اور دشمنی نیز مقامی آبادی کے مخالفانہ روئے کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے بھی ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔بہ حیثیت مجموعی بلخ کی فتح سے مغل فوج کے وقار میں

اضافہ تو ہوا لیکن اس سے کوئی خاص سیاسی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔اگر شاہ جہاں ،اکبر کے ذریعے کافی جان فشانی سے قائم کی گئی کابل،غزنی،قندھار خطہ سرحد پر قائم رہا ہوتا تو یہ مغلوں کے لیے کافی سود مند ثابت ہوا ہوتا اور جان ومال کا بھی اتنا نقصان نہ اٹھانا پڑا ہوتا۔بہر حال نظر محمد جب تک زندہ رہا اس نے مغلوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور دونوں کے درمیان سفیروں اور ایلچیوں کا تبادلہ بھی جاری رہا۔

فن تعمیر (Architecture)

شاہ جہاں نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کی گئی عمارتوں کا ایک عظیم ورثہ چھوڑا۔ وہ مغل فن تعمیر کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک تھا۔اس کے دور حکومت نے مغل فن تعمیر کے سنہری دور کا آغاز کیا۔اس دور کی سب سے مشہور عمارت تاج محل تھی، جسے اس نے اپنی بیوی، ملکہ ممتاز محل کے لیے محبت کی یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ ممتاز محل کے ساتھ اس کے تعلقات کو ہندوستانی فن،ادب اور سنیما میں خصوصاً ظاہر کیا گیا ہے۔ شاہ جہاں کے پاس ذاتی طور پر شاہی خزانے اور کئی قیمتی پتھر جیسے کوہ نور تھا۔تاج محل کا ڈھانچہ بڑی احتیاط سے تیار کیا گیا اور اس مقصد کے لیے ماہرین تعمیرات کو بلایا گیا۔ اس عمارت کو مکمل ہونے میں بیس سال لگے تھے اور اسے سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس کی بیوی ممتاز محل کو دفن کیا گیا تھا۔ شاہجہاں کی موت کے بعد، ان کے بیٹے اورنگزیب نے انہیں ممتاز محل کے پاس دفن کیا۔ان کی دیگر تعمیرات میں لال قلعہ، آگرہ قلعہ کے بڑے حصے، جامع مسجد، وزیر خان مسجد، موتی مسجد، شالیمار باغ، قلعہ لاہور کے حصے، پشاور میں خان مسجد، ہستسال میں چھوٹا قطب مینار، جہانگیر کا مقبرہ ان کے والد کا مقبرہ، جس کی تعمیر کی نگرانی ان کی سوتیلی ماں نور جہاں اور شاہجہاں نے خود کی۔اس کے پاس ایک عظیم تخت طاؤس بھی تھا، جو اپنی حکومت کا جشن منانے کے لیے بنایا گیا تھا۔شاہ جہاں نے اپنے فن تعمیر کے شاہکار پر قرآن کی کئی آیات بھی کندہ کروائی تھیں۔پاکستان کے صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں واقع شاہ جہاں مسجد (کراچی سے 100 کلومیٹر) شاہ جہاں کے دور حکومت میں 1647 میں تعمیر کی گئی تھی۔یہ مسجد سرخ اینٹوں سے بنی ہے جس میں نیلے رنگ کی چمکدار ٹائلیں ہیں جو شاید سندھ کے کسی اور قصبے سے درآمد کی گئی ہیں۔ہالا مسجد میں مجموعی طور پر 93 گنبد ہیں اور یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے جس میں اتنے گنبد ہیں۔اسے صوتیات کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔گنبد کے ایک سرے کے اندر بولنے والے شخص کو دوسرے سرے پر سنا جا سکتا ہے۔یہ 1993 سے یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل ہے۔

تصویر 7.2۔تاج محل،آگرہ،(پبلک ڈومین)

جانشینی کی جنگ اور شاہجہاں کی موت (War of Succession and the Death of Shah Jahan)

جب شاہ جہاں 1658 میں بیمار ہوا تو اس کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے اپنے والد کی جگہ نائب کی ذمے داری نبھائی، جس کی وجہ سے اس کے بھائیوں کے درمیان رقابت میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی ولی عہدی کے بارے میں جاننے کے بعد، اس کے چھوٹے بھائیوں، بنگال کے گورنر شجاع اور گجرات کے گورنر مراد بخش نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور تخت پر قبضہ کرنے کے لیے آگرہ پر چڑھائی کی۔ تیسرے بیٹے اورنگزیب نے ایک اچھی تربیت یافتہ فوج جمع کی اور اس کی کمان سنبھالی۔ اس نے آگرہ کے قریب دارا کی فوج کا سامنا کیا اور ساموگڑھ کی لڑائی کے دوران اسے شکست دی۔ دارا کی حمایت کے جرم میں فاتح شہزادے اورنگزیب نے اپنے باپ شاہجہاں کو حکومت کرنے کے لیے نااہل قرار دیا اور اسے آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ ممتاز محل کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم رضاکارانہ طور پر 8 سال اپنے والد کے ساتھ نظر بندی میں رہنا منظور کیا اور باپ کی دیکھ بھال کی۔ جنوری 1666 میں شاہ جہاں بیمار ہو گیا اور بستر سے لگ گیا۔ اس کی کمزوری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ 30 جنوری کو، اس نے شاہی دربار کی خواتین، خاص طور پر اکبر آبادی محل کی اپنی ساتھی، جہاں آرا کی دیکھ بھال کی تعریف کی۔ کلمہ اور قرآن کی آیات کی تلاوت کے بعد، شاہ جہاں 74 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ شاہ جہاں کے مصاحب سید محمد قنوجی اور آگرہ کے قاضی قربان قلعہ میں آئے اور شاہجہاں کی لاش کو قریبی ہال میں لے گئے۔ اسے غسل دیا، کفن دیا اور چندن کے تابوت میں ڈال دیا۔ میت کو تاج محل لے جایا گیا اور وہاں ان کی پیاری بیوی ممتاز محل کی قبر کے پاس سپرد خاک کیا گیا۔

7.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ شاہجہاں کا بچپن کا نام خرم تھا۔ خرم کی پیدائش 5 جنوری 1592 میں لاہور میں ہوئی۔ اس کی ماں مارواڑ کے موٹا راجا اودے کی لڑکی کی جگت گوسائی (جودھا بائی) تھی۔ شاہ جہاں پہلے نور جہاں گروپ کا اہم دعویدار تھا لیکن نور جہاں کی اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی پرویز سے کرنے سے نور جہاں بادشاہی منصب کے لیے شہریار کے لیے کوشش کرنے لگی۔ اس لیے شاہ جہاں نے 1623ء میں بغاوت کر دی۔ 1627 میں میں جہانگیر کی موت کے وقت شاہجہاں دکن میں تھا۔ اس لیے شاہ جہاں کے خسر آصف خان نے خسرو کے بیٹے داور بخش کو تخت پر بیٹھا کر چال چلی۔ اور بنارسی داس نامی پیامبر کے ذریعے سے پیغام بھیج کر شاہجہاں کو بلوایا۔ شاہجہاں نے اپنے بھائیوں کا خاتمہ کر کے آخر میں داور بخش کو بھی قتل کر دیا۔ ہمعصر مورخین نے داور بخش کو بلی کا بکرا کہا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ 1636 میں گلکنڈہ کے حکمراں عبداللہ قطب شاہ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر کے معاہدہ کر لیا۔ گولکنڈا میں ایران کے شاہ کی جگہ پر شاہجہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر بھی شاہ جہاں کا نام شامل کر لیا گیا۔ گولکنڈا جو چار لاکھ ہنوں کا ٹیکس بیجاپور کو دیتا تھا وہ معاف کر دیا گیا۔ اسی دوران گولکنڈہ کا وزیر میر جملہ گول کنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی خدمت میں آ گیا۔ میر جملہ پہلے تاجر تھا۔ اس نے شاہجہاں کو کوہ نور ہیرا پیش کیا۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ کہ 1631 میں شاہ جہاں نے آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن آصف خان کا حملہ ناکام رہا۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے مہابت خان کو جنوب کا صوبیدار متعین کیا۔ 1636 میں بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ نے مغلوں سے معاہدہ کر کے مغل ماتحتی قبول کر لی۔ شاہجہاں کے دور میں دکن کے مغل صوبہ دار کی راجدھانی برہانپور

تھی۔1658کی جانشینی کی جنگ میں داراشکوہ کا ساتھ دینے کے جرم میں شاہجہاں کو اس کے بیٹے اورنگزیب نے نظر بند کر دیا جہاں 8 سال بعد بستر علالت پر اس کا انتقال ہوگیا۔شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے ان آٹھ سالوں میں باپ کی بہت خدمت کی اور اس کے ساتھ ہی نظربندی میں گزارنا منظور کیا۔اس کی تدفین اس کی محبوب بیوی ارجمند بانو یعنی ممتاز محل کے پہلو میں تاج محل میں کی گئی۔

7.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

پیامبر	:	پیغام دینے والا
بلی کا بکرا	:	کسی کو ناحق مارنا
بیش بہا	:	بہت زیادہ قیمتی
انگشت نمائی	:	اعتراض کرنا
چشم پوشی	:	نظرانداز کرنا
گنجان	:	گھنا
تہہ تیغ کرنا	:	قتل کرنا
ڈیرہ ڈالنا	:	ٹھہرنا
حریف	:	دشمن

7.4 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. شاہ جہاں کا نام کیا تھا؟
2. شاہجہاں کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
3. شاہ جہاں کی تخت نشینی کب ہوئی؟
4. شاہجہاں کا جہانگیر سے کس بات پر اختلاف تھا؟
5. نور جہاں کون تھی؟
6. آصف خان شاہجہاں کے رشتے میں کیا تھے؟
7. شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں کس رسم کو ختم کیا تھا؟
8. شہزادہ خرم نے کون سا لقب اختیار کیا؟
9. شاہ جہاں کی تخت نشینی کے سلسلے میں بلی کا بکرا کس کو کہا گیا؟

10. داور بخش کون تھا؟

7.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. شاہجہاں کی تاج پوشی کے بارے میں بتائیے۔
2. جھجھار سنگھ بندیلا کی بغاوت بیان کیجیے۔
3. شاہ جہاں کی فتوحات کے بارے میں تذکرہ کیجیے۔
4. شاہجہاں اور گرو ہر گوبند کے تعلقات کے بارے میں بتائیے۔
5. شاہ جہاں کے دور میں ہونے والی اہم بغاوتوں پر روشنی ڈالیے۔

7.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. شاہجہاں کی بلخ مہم کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھیے
2. احمد نگر کے الحاق کے بارے میں روشنی ڈالی ہے
3. شاہجہاں اور سکھ گرو کے درمیان کیا اختلافات تھے وضاحت کیجئے۔

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Asher, Catherine, and Ella Blanshard, *Architecture of Mughal India*: *The New Cambridge History of India*. Cambridge University Press. 2003.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity*, *Ideas*, *Society*, *and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. 2006)
3. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne*: *The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
4. Mukhia, Harbans, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2005.
5. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
6. Nicoll, Fergus, *Shah Jahan: The Rise and Fall of the Mughal Emperor*, Penguin India, New Delhi, 2018.
7. Richards, John, F., *The Mughal Empire*: *The New Cambridge History of India*. Vol. V., Cambridge University Press, 1993.
8. آر پی ترپاٹھی، مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
9. ستیش چندر، عہد وسطیٰ کا ہندوستان: دہلی سلطنت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 8۔اورنگزیب

(Aurangzeb)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 جانشینی کی جنگ

8.3 اورنگزیب کی حکومت کا آغاز

8.3.1 شمالی ہندوستان

8.3.2 شمال مشرقی اور مشرقی ہندوستان

8.4 عوامی بغاوتیں اور تحریکیں

8.4.1 جاٹ اور ست نامی

8.4.2 افغان

8.4.3 سکھ

8.5 اورنگزیب کی راجپوت پالیسی

8.6 اورنگ زیب کی دکن پالیسی

8.6.1 پہلا مرحلہ

8.6.2 دوسرا مرحلہ

8.6.3 تیسرا مرحلہ

8.6.4 اورنگ زیب اور مراٹھا

8.7 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

8.8 اکتسابی نتائج

8.9 کلیدی الفاظ

8.10 نمونہ امتحانی سوالات
8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

اورنگزیب ہندوستانی تاریخ میں یقیناً نہایت ہی متنازعہ شخصیت ہے جس پر حال میں بھی متعدد بحثیں اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مغل سلطنت کا نہایت طاقتور بادشاہ تھا اور اس کے دور میں مغل سلطنت وسعت کی بلندیوں کو پہنچ گئی تھی، مگر ساتھ ہی اس کے کارنامے اور پالیسیاں خصوصاً مذہبی پالیسی ہمیشہ تنقید کے نشانے پر رہی ہے۔ اورنگ زیب پر متعدد الزامات عائد کیے جاتے ہیں جیسے اس نے مندر توڑے، برہمنوں کو اذیتیں دیں، جبراً مذہب تبدیل کرایا، غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور سب سے اہم مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کیا۔ ایس آر شرما اور جادوناتھ سرکار جیسے قوم پرست مورخ اسے مذہبی تعصب پسند مانتے ہیں تو دوسری طرف شبلی نعمانی، ظہیرالدین فاروقی اور پاکستانی مورخ اشتیاق حسین قریشی بتاتے ہیں کہ وہ مذہبی طور پر روادار تھا اور اس کے کچھ کاموں کی توجیہ پیش کرتے ہیں۔ مشہور مورخ عزیزالدین حسین کے مطابق 'دونوں گروپ کے مورخین ایک نکتے کو بھول گئے کہ اورنگزیب نے ورنداون اور بہار کے کچھ مندروں کو زمینی عطیات بھی دیے'۔۔۔'ممکن ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اس حقیقت کو بیان نہیں کیا جو ان کے اس نظریہ کے خلاف جاتی کہ اورنگزیب ہندؤں کے خلاف تھا یا وہ اسلام کا سورما تھا۔' یہ حقیقت ہے کہ اورنگزیب کے دور حکومت میں بہت سے ایسے کام کیے گئے جو مذہبی رواداری کے خلاف تھے اور روایت پسندی پر مبنی تھے، مگر اگر ہم اس کی پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب اس کے لیے کبھی اولین فوقیت نہیں تھا بلکہ اس کی سیاست ہی اس کی پالیسی طے کرتی تھی۔ داراشکوہ کے قتل اور شاہجہاں کی اسیری سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی کہ اس کی تخت نشینی باپ کی موجودگی میں غیر اسلامی تھی اس لیے اسے دارا کو اسلام مخالف قرار دینا پڑا، ساتھ ہی دارا کے مقدمے میں جس طرح کاروائی کی گئی وہ اسلامی عدالتی قانون کے خلاف تھی۔ یہی بات مندروں کو توڑنے پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ اسلام میں کسی بھی دوسرے مذہب کی پہلے سے موجود عبادت گاہ کے توڑے جانے کی ممانعت ہے۔ جادوناتھ سرکار بتاتے ہیں کہ اورنگزیب کی ہندو مخالف پالیسیوں کی وجہ سے جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے ہتھیار اٹھائے تھے، مگر جاٹ بغاوت میں ہندو کسانوں کے خلاف مقامی ہندو راجاؤں اور زمین داروں نے مغلوں کی طرفداری کیوں کی، یا سکھ بغاوت کو کچلنے میں راجپوت مغلوں کے شانہ بشانہ کیوں تھے، یا پھر راجپوتوں کا دوسرا گروہ راجپوت بغاوت کے دوران مغلوں کی حمایت کیوں کر رہا تھا۔ شیواجی کی مغلوں سے ان بن کی وجہ بھی ان کی مغل دربار میں ذاتی بے عزتی تھی جہاں انہیں اول درجے کے امرا کے بجائے دوئم درجے کی امرا کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ یہ سب معاملات ہمیں اورنگزیب کی شخصیت کے ایک دوسرے پہلو

سے روشناس کراتے ہیں جو عملیت پسند ہے، تجربہ کار ہے اور مذہب کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا جانتا ہے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جانشینی کی جنگ میں اورنگزیب کی کامیابی کے اسباب جان سکیں گے۔
- اورنگزیب کی فتوحات کا جائزہ لے سکیں گے،
- اورنگزیب کے دور کی اہم بغاوتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اورنگزیب کی راجپوت پالیسی، دکن پالیسی اور مذہبی پالیسی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- یہ سمجھ سکیں گے کہ اورنگزیب کیا واقعی مذہبی طور پر متعصب تھا؟ یا نہیں۔

8.2 جانشینی کی جنگ (War of Succession)

شاہجہاں کے عہد حکومت کا آخری دور، اس کے بیٹوں کے درمیان جانشینی کے لیے جنگ سے متاثر رہا۔ تیموری حکمرانوں میں جانشینی کے سلسلے میں کوئی طے شدہ روایت نہیں تھی۔ کچھ مسلم سیاسی مفکرین نے بادشاہ کے ذریعے اپنے جانشین کی نامزدگی کے حق کو تسلیم کیا تھا لیکن عہد سلطنت میں ہندوستان میں اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس طرح سلطنت کو شہزادوں میں تقسیم کر دینے کی تیموری روایت بھی زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی اور ہندوستان میں یہ طریقہ اختیار بھی نہیں کیا گیا۔ جانشینی کے سلسلے میں ہندو روایت بھی کوئی خاص واضح نہیں تھی۔ اکبر کے ہمعصر شاعر تلسی داس کے مطابق اپنے کسی بھی بیٹے کو ٹیکہ لگانے (ولی عہد بنانے) کا ہر حکمران کو حق حاصل تھا لیکن خود راجپوت حکمران خاندانوں میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ راجا کے اس طرح کے انتخاب کو دوسرے بھائیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح گدی پر بیٹھنے سے پہلے سانگا کو اپنے بھائیوں کے ساتھ شدید جنگ کرنی پڑی تھی۔ 1657 کے آخر میں شاہجہاں دلی میں شدید طور پر علیل ہو گیا اور ایک موقع پر تو لوگوں کو اس کے زندہ رہنے کی امید بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ دارا شکوہ کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں اس کی صحت پھر سے بحال ہو گئی اور وہ تندرست ہو گیا۔ اس اثناء میں طرح طرح کی افواہیں پھیل چکی تھیں۔ یہ افواہ تک اڑا دی گئی کہ درحقیقت شاہجہاں کا انتقال ہو چکا ہے اور دارا نے اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے اس کی موت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ کچھ عرصے بعد شاہجہاں دھیرے۔ دھیرے آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس اثناء میں بنگال میں شہزادہ شجاع گجرات میں شہزادہ مراد اور دکن میں شہزادہ اورنگ زیب کو یا تو باور کرایا گیا تھا کہ یہ افواہ صحیح ہے یا پھر یہ کہ اپنے مفاد کے لیے انہیں ایک بہانا مل گیا اور اس طرح جانشینی کے لیے خوں ریز جنگ کی تیاریاں زور شور کے ساتھ شروع کر دی گئیں۔ اپنے آخری وقت کو قریب دیکھ کر اور یہ خطرہ محسوس کر کے کہ جانشینی کے لیے اس کے بیٹوں کا ٹکراؤ سلطنت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے شاہجہاں نے دارا شکوہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دارا کے منصب کو 40000 ذات سے بڑھا کر 60000 ذات تک کر دیا اور اسے اپنے تخت کے پہلو میں بیٹھنے کی جگہ دی اور تمام امراء اور منصب داروں کو یہ

حکم بھی دے دیا کہ وہ دارا کے ساتھ اگلے بادشاہ جیسا سلوک کریں۔ لیکن شاہجہاں جانشینی کے مسئلے کو اپنی امید کے مطابق اس طرح آسانی سے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا اور اس کے باقی تینوں بیٹوں کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ دارا کی جانب داری کر رہا ہے۔ اس طرح تخت کے لیے اپنا دعویٰ پیش کرنے کے لیے ان شہزادوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔

ہمیں ان واقعات کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں جن کے نتیجے میں آخر میں اورنگ زیب کو ہی کامیابی حاصل ہوئی۔ اورنگ زیب کی کامیابی کے کئی اسباب تھے۔ دارا کی شکست کے دو اہم اسباب یہ تھے کہ اسے ایسے صلاح مشورے دینے گئے جو ایک دوسرے سے متضاد ہوتے تھے اور دوسرے یہ کہ اسے اپنے مخالفوں (حریفوں) کی طاقت کا صحیح انداز بھی نہیں تھا۔ شہزادوں کی جنگی تیاریوں اور راجدھانی پر حملے کے فیصلے کا علم ہونے پر شاہجہاں نے شجاع کی سرکوبی کے لیے، جس نے خود کو بادشاہ قرار دے لیا تھا دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج مشرق کے لیے روانہ کی اور اس کی مدد کے لیے مرزا راجہ جے سنگھ کو بھی اس کے ساتھ بھیجا۔ ایک دوسری فوج جودھ پور کے حکمران راجہ جسونت سنگھ کی سرکردگی میں مالوا کی طرف بڑھی۔ مالا پہونچنے پر جسونت سنگھ نے یہ دیکھا کہ وہاں اورنگ زیب اور مراد کی متحدہ فوجیں اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دونوں شہزادے جنگ کے لیے آمادہ تھے۔ انہوں نے راجہ جسونت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ اس لڑائی میں حصہ نہ لے۔ جسونت سنگھ اگرچہ وہاں سے جنگ کے بغیر ہی واپس ہو سکتا تھا لیکن اسے اپنے وقار کے منافی سمجھ کر اس نے جنگ کا ہی فیصلہ کیا حالانکہ حالات اس کے لیے قطعی ناساز گار تھے۔ 15 اپریل 1658 میں دھرمات کی جنگ میں اورنگ زیب کی فتح سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی اور اس کے حامیوں کے وقار میں اضافہ ہو گیا جبکہ دارا شکوہ کی صف حوصلہ شکنی کا شکار ہو گئی۔ اس اثناء میں دارا ایک اور بڑی غلطی کر بیٹھا۔ اسے اپنی طاقت پر زیادہ بھروسہ تھا جس کی وجہ سے اس نے مشرقی مہم پر اپنے عمدہ اور چنیدہ فوجیوں کو بھیج دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجدھانی آگرہ اس کے، اپنے لوگوں سے تقریباً خالی ہو گئی۔ جو فوج سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں مشرق کے لیے بھیجی گئی تھی اس نے اہم کارنامے کر دکھائے۔ اس نے شجاع کے خلاف اچانک چڑھائی کر کے بنارس کے قریب فروری 1658 میں اسے شکست دے دی۔ اس کے بعد اس فوج نے بہار تک شجاع کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا، گویا کہ آگرہ میں مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا ہو۔ دھرمات کی شکست کے بعد مشرق سے فوجوں کو فوراً آگرہ واپس لوٹ آنے کا پیغام بھیجا گیا۔ چنانچہ 17 مئی 1659 کو جلد بازی میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کے بعد سلیمان شکوہ مشرقی بہار کے مقام منگیر سے آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا لیکن اورنگ زیب سے لوہا لینے کے لیے اس کا وقت پر آگرہ پہونچ پانا مشکل ہی تھا۔ دھرمات کے بعد دارا شکوہ نے اپنے حامیوں اور مددگاروں کو اکٹھا کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے جسونت سنگھ کے پاس بھی کئی پیغامات بھیجے جو کہ اس وقت تک جودھ پور واپس پہونچ چکا تھا۔ اودے پور کے رانا سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔ اس اثناء میں جسونت سنگھ، اجمیر کے قریب پشکر تک پہونچ چکا تھا۔ وہاں اس نے دارا کی فراہم کردہ رقم سے ایک بڑی فوج تیار کی اور رانا کی شرکت کا منتظر رہا۔ لیکن اس وقت تک اورنگ زیب، رانا کو سات ہزاری منصب اور 1651 میں شاہجہاں اور دارا کے ذریعے فتح کیے گئے اس کے پرگنے اسے واپس کر دینے کا وعدہ کر کے اسے اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔ اورنگ زیب نے رانا کو نہ صرف آزادی کی ہی یقین دہانی کرائی بلکہ یہ بھی کہا کہ اسے ایسی مراعات دی جائیں گی جیسی کہ رانا سانگا کو حاصل تھیں۔ اس طرح دارا شکوہ اہم راجپوت راجاؤں کو بھی اپنا ہم نوا بنانے میں ناکام رہا۔

سامو گڑھ کی جنگ 29 مئی 1658 کو ہوئی۔ یہ دراصل پر سالاروں کی جنگی مہارت کی جنگ تھی کیونکہ دونوں طرف تعداد کے لحاظ سے پچاس تا ساٹھ ہزار کی برابر برابر فوجیں تھیں۔ اس میدان میں دارا کا اورنگ زیب سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا، سادات بارہ اور باڑ راجپوت جن پر دارا کو پورا بھروسہ تھا دارا کی طرف ہی تھے لیکن جلدی میں تیار کی گئی فوج کی کمزوریوں کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ دوسری طرف اورنگ زیب کے سپاہی تجربہ کار تھے اور ان کی قیادت بھی مضبوط اور تجربہ کار ہاتھوں میں تھی۔ اورنگ زیب نے مسلسل یہی تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بیمار باپ کو دیکھنے اور لا مذہب دارا شکوہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے آگرہ پہونچنا چاہتا ہے۔ لیکن اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی جنگ کو مذہبی کٹر پن اور مذہبی رواداری کے درمیان جنگ قرار دینا درست نہیں ہے۔ دونوں ہی طرف ہندو اور مسلمان سردار تقریباً برابر کی تعداد میں تھے۔ ہم اہم راجپوت راجاؤں کے رویے کا جائزہ پہلے ہی لے چکے ہیں۔ دوسری کئی جنگوں کی طرح ہی اس جنگ میں بھی امراء نے ذاتی اغراض اور مفاد کی بنیاد پر ہی اورنگ زیب یا دارا شکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ دارا کی شکست اور اس کے راہ فرار اختیار کر جانے کے بعد آگرہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں شاہجہاں موجود تھا۔ اورنگ زیب نے قلعے کے لیے پانی کی سپلائی روک کر شاہجہاں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ شاہجہاں کو قلعے کے حرم والے حصے میں رکھا گیا۔ اگرچہ اسے کئی کڑے پہرے کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ کسی طرح کا غلط برتاؤ ہرگز نہیں کیا گیا۔ یہاں شاہجہاں آٹھ سال تک رہا اور اس کی دلعزیز بیٹی جہاں آرا نے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ جہاں آرا نے اپنی مرضی سے قلعے میں اپنے باپ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا۔ شاہجہاں کی موت کے بعد وہ پھر عوامی زندگی میں لوٹ آئی۔ اورنگ زیب نے اسے پوری عزت دی اور سلطنت کی خاتون اول کا خطاب بھی بحال کر دیا۔ اس نے اس کا سالانہ وظیفہ بھی 12 لاکھ روپے سے بڑھا کر 17 لاکھ روپے کر دیا۔

مراد کے ساتھ اورنگ زیب کے سمجھوتے کی شرطوں کے مطابق، سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کیا جانا تھا لیکن اورنگ زیب کی یہ نیت ہرگز نہیں تھی۔ اس نے دھوکے سے مراد کو قید کر دیا اور گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا۔ دو سال بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ سامو گڑھ کی لڑائی میں شکست کھا جانے کے بعد دارا بھاگ کر لاہور چلا گیا تھا جہاں وہ آس پاس کے علاقوں پر اپنی عملداری قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن جلد ہی اورنگ زیب ایک بڑی فوج کے ساتھ لاہور کے پڑوس میں پہونچ گیا۔ دارا ہمت ہار بیٹھا۔ وہ جنگ کے بغیر ہی لاہور چھوڑ گیا اور سندھ چلا گیا۔ اس طرح اس نے اپنی تقدیر پر خود ہی آخری مہر لگا دی۔ اگرچہ خانہ جنگی مسلسل دو سال تک اور جاری رہی لیکن اس کے انجام کے بارے میں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا۔ مارواڑ کے حکمران راجہ جسونت سنگھ کی دعوت پر دارا کا سندھ سے گجرات اور پھر اجمیر آنا اور پھر جسونت سنگھ کا اس کے ساتھ غداری کرنا ایسی باتیں ہیں جن سے سبھی واقف ہیں۔ مارچ 1659 میں اجمیر کے قریب دیورائی کی جنگ، اورنگ زیب کے ساتھ دارا کی آخری جنگ تھی۔ دارا بھاگ کر ایران جا سکتا تھا لیکن اس نے افغانستان میں ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ لیکن راستے میں بولان درہ میں ایک غدار افغان سردار نے اسے قیدی بنا کر اسے اس کے جانی دشمن کے حوالے کر دیا۔ قاضیوں اور مفتیوں کی جماعت نے یہ فیصلہ سنایا کہ مذہبی قانون (شریعت) اور مذہبی اعتقادات کے مفاد کے پیش نظر اور امن عامہ کو نقصان پہونچانے کی پاداش میں دارا کو زندہ نہیں رہنے دیا جا سکتا۔ اورنگ زیب نے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے کس طرح مذہب کو استعمال کیا، یہ فیصلہ اس کی ایک

بین مثال ہے۔ دارا کے قتل کے دو سال بعد گڑھوال کے حکمران نے جس کے پاس دارا کے لڑکے سلیمان شکوہ نے پناہ لی ہوئی تھی اورنگ زیب کے حملے کے خوف سے اسے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ سلیمان شکوہ کا بھی وہی انجام ہوا جو کہ اس کے باپ دارا شکوہ کا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اورنگ زیب، الہ آباد کے قریب کھجوا میں شجاع کو دسمبر 1658 میں شکست دے چکا تھا۔ اس کے خلاف مزید کارروائی کی کمان میر جملہ کو سونپی گئی۔ اس نے شجاع کا اس وقت تک تعاقب کیا جب تک کہ وہ ہندوستان سے بھاگ کر اراکان نہیں پہونچ گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی بغاوت بھڑکانے کے جرم میں اراکانیوں نے اسے اور اس کے کنبے کے دوسرے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دو سال سے زائد تک جاری رہنے والی اس خانہ جنگی سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ تخت شاہی کے امیدوار نہ تو بادشاہ کے ذریعے ولی عہد کی نامزدگی کو ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی سلطنت کی تقسیم کے لیے۔ اقتدار حاصل کرنے کا واحد وسیلہ اب فوجی طاقت تھی اور خانہ جنگیاں زیادہ تباہ کن شکلیں اختیار کرتی چلی گئیں۔

زمام سلطنت پر پکڑ مضبوط ہو جانے کے بعد اورنگ زیب نے بھائیوں کے ساتھ تادم مرگ جنگ کی مغل روایت کے سنگین نتائج کو ہلکا کرنے کی کسی حد تک کوشش کی۔ چنانچہ جہاں آراء کے کہنے پر دارا شکوہ کے لڑکے سپہر شکوہ کو 1673 میں قید سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اسے منصب بھی دیا گیا اور اورنگ زیب کی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ مراد کے بیٹے عزت بخش کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اسے بھی منصب دیا گیا اور اورنگ زیب کی ایک دوسری لڑکی کے ساتھ اس کی بھی شادی کر دی گئی۔ اس سے پہلے یعنی 1669 میں، دارا کی بیٹی جانی بیگم کی شادی اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے محمد اعظم کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ جانی بیگم کو جہاں آرا نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس کے علاوہ بھی، اورنگ زیب کے کنبے اور اس کے ہاتھوں شکست خوردہ بھائیوں کے لڑکوں اور پوتے پوتیوں کے درمیان بھی کئی شادیاں ہوئیں۔ اس طرح تیسری پشت میں اورنگ زیب اور اس کے شکست خوردہ بھائیوں کے کنبے پھر سے ایک ہو گئے۔

8.3 اورنگزیب کی حکومت کا آغاز (Beginning of Aurangzeb's Reign)

8.3.1 شمالی ہندوستان (North India)

جانشینی کی جنگ کے دوران متعدد مقامی زمینداروں اور راجاؤں نے لگان کی ادائیگی روک لی تھی۔ یا مغل علاقوں اور شاہی راستوں کے بشمول اپنے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اورنگ زیب نے باقاعدہ طریقے پر تخت نشینی اختیار کرنے کے بعد ایک سخت حکومت کے دور کی ابتداء کی۔ شمال مشرق اور دکن جیسے کچھ علاقوں میں سلطنت کے علاقوں میں توسیع ہوئی لیکن اورنگ زیب نے توسیع پسندانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ بادشاہ بن جانے کے فوراً بعد اس کا سب سے پہلا کام، بادشاہ کے وقار اور اختیارات کو بحال کرانا تھا۔ اس میں ان علاقوں کی بازیابی بھی شامل تھی جو جانشینی کی جنگ کے دوران ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ مگر مغل انہیں اب بھی اپنا ہی علاقہ سمجھتے تھے۔ اورنگ زیب نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ دوسرے علاقوں کو فتح کرنے یا انہیں اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے زیر اقتدار علاقوں میں حکومت کو مستحکم کیا۔ اس نے مغل سلطنت کی اطاعت قبول کرنے کے لیے بیکانیر اپنی فوج تو بھیجی لیکن بیکانیر کو مغل سلطنت میں ضم کر لینے

کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن بہار میں واقع بالا مؤجیسے کچھ دوسرے مقامات کے سلسلے میں اس نے یہ کیا کہ جس حکمراں پر غداری کاالزام لگایا اسے معزول کر دیا گیااور اس کے زیر اقتدار بڑے علاقوں کو سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ باغی بندیلا سردار چمپت رائے کا بے تحاشہ تعاقب کیا گیا۔ چمپت رائے نے پہلے اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا مگر بعد میں باغی ہو کر اس نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ لیکن بندیلیوں کے علاقوں کو سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا۔

8.3.2 شمال مشرقی اور مشرقی ہندوستان (North-East and Eastern India)

آسام کی وادی میں اہوم طاقت کے عروج، اور ایک طرف کمتا (کامروپ) کے حکمرانوں کے ساتھ اور دوسری طرف بنگال کے افغان حکمرانوں کے ساتھ مغلوں کے ٹکراؤ کا ذکر ایک سابقہ اکائی میں کیا جا چکا ہے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں کمتا ریاست ایک طرف سے ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ پر کوچ (کوچ بہار) کی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ کوچ حکمرانوں نے شمالی بنگال اور مغربی آسام پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور اہوم حکمرانوں کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ بہر حال سترہویں صدی کے اوائل میں اندرونی جھگڑوں کے نتیجے میں یہ سلطنت بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور کوچ حکمرانوں کے اشارے پر مغل بھی آسام تک آپ پہونچے تھے۔ مغلوں نے سلطنت سے الگ ہوئے حصہ کو جیت لیا اور 1612 میں کوچ سلطنت کی فوجوں کی مدد سے مغربی آسام کی وادی میں باڑندی تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ کوچ حکمران کی حیثیت اب مغل بادشاہ کے ایک باج گزار کی ہو کر رہ گئی۔ اس طرح مغلوں کا اہوم حکمرانوں سے رابطہ قائم ہوا جن کی عملداری مشرقی آسام میں باڑندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اہوم حکمرانوں کے ساتھ ایک طویل جنگ کے بعد جو کہ شکست خوردہ خاندان کے ایک راج کمار کو اپنے یہاں پناہ بھی دے چکے تھے، مغلوں اور اہوم حکمرانوں کے درمیان 1638 میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے باڑندی کو اہوم سلطنت اور مغل سلطنت کے درمیانی سرحد مان لیا گیا۔ اس طرح گوہاٹی بھی مغلوں کے زیر تسلط آگیا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں مغلوں اور اہوموں کے درمیان ایک طویل جنگ ہوئی۔ لڑائی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب اہوموں نے گوہاٹی اور آس پاس کے علاقوں سے مغلوں کو بے دخل کر کے اور اس طرح سارے آسام پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب نے میر جملہ کو بنگال کا حکمراں مقرر کیا تھا اور وہ کوچ بہار اور سارے آسام کو مغل سلطنت میں شامل کر کے اپنے اثرات کو بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کوچ بہار پر حملہ کیا جو اب تک مغل تابعداری ماننے سے انکار کرتا آیا تھا اور اس طرح ساری سلطنت کو مغل عملداری میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اہوم سلطنت پر حملہ کیا اور ہوم سلطنت کی راجدھانی گڑھ گاؤں پر تسلط کر لیا اور چھ ماہ تک اپنے ہی قبضے میں رکھا۔ اس کے بعد وہ اہوم سلطنت کے کافی اندر تک گھستا چلا گیا اور آخر کار اہوم بادشاہ کو 1663 میں اہانت آمیز سمجھوتے کے لیے مجبور کر دیا۔ راجا کو بھاری تاوان جنگ ادا کرنا پڑا اور سالانہ 20 ہاتھی بطور خراج دینا قبول کرنا پڑا۔ اب مغل سلطنت کی سرحدیں باڑندی سے بڑھ کر بھر این ندی تک پھیل گئیں۔ اس شاندار فتح کے فوراً بعد ہی میر جملہ کا انتقال ہو گیا۔ آسام میں مغلوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کی افادیت مشکوک ہی رہی کیونکہ یہ خوش حال علاقہ نہیں تھا اور پہاڑوں میں رہنے والے ناگاؤں جیسے لڑاکو قبائل سے بھی گھرا ہوا تھا۔ اور یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ اہوم حکمرانوں کی طاقت کا پوری طرح سے قلع قمع نہیں ہو سکا ہے اور معاہدہ پر مکمل عمل در آمد کرانا مغلوں کی طاقت سے باہر تھا۔ 1667

میں اہوموں نے پھر لڑائی شروع کر دی۔ انہوں نے نہ صرف ہارے ہوئے تمام علاقے مغلوں سے واپس چھین لیے بلکہ گوہائی پر بھی قبضہ کر لیا۔ مغلوں کو کوچ بہار سے پہلے ہی بے دخل کیا جا چکا تھا۔ اس طرح میر جملہ نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا وہ سب مغلوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا تھا۔ اس کے بعد اہوموں کے ساتھ جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً 15 برسوں تک جاری رہا۔ مغل فوج کی کمان ایک طویل عرصے تک آمیر کے راجہ راجہ رام سنگھ کے ہاتھ میں رہی تھی مگر اس طویل جنگ کے لیے اس کے پاس کافی وسائل نہیں تھے۔ آخر کار مغلوں کو گوہائی سے ہاتھ دھونا پڑا اور اب ان کی سرحد گوہائی کے مغرب تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

آسام کے واقعات کے نتیجے میں وہ مشکلات ظاہر ہو گئیں جو مغلوں کو دور دراز کے علاقوں کو اپنے زیر تسلط برقرار رکھنے میں پیش آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اہوموں کی ثابت قدمی اور جنگی مہارت کا بھی احساس ہو گیا۔ اہوم میدان جنگ میں مقابلہ کرنے کے بجائے چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی مغلوں کے مخالفوں نے اسی طریقہ جنگ کے ذریعے کامیابیاں حاصل کیں۔ بہر حال مغل حملوں اور بعد کی طویل جنگوں کے نتیجے میں اہم بادشاہت کی طاقت کافی گھٹ گئی۔ اور نیتاً اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ مشرق میں دوسرے علاقوں میں مغلوں کو نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ شیوا جی سے شکست کھا جانے کے بعد شائستہ خان کو میر جملہ کی جگہ پر بنگال کا حکمراں مقرر کیا گیا جو ایک بہترین منتظم اور حوصلہ مند جنرل ثابت ہوا۔ اس نے میر جملہ کی توسیع پسندانہ پالیسی میں اصلاح و ترمیم کی۔ سب سے پہلے اس نے کوچ بہار کے حکمران سے صلح کی۔ اس کے بعد وہ جنوبی بنگال کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں ماگھ (اراکانی) قزاقوں نے اپنے مرکز چٹاگانگ سے ڈھاکہ تک کے سارے علاقے کو تاراج کر رکھا تھا۔ ڈھاکہ تک سارا علاقہ ویران ہو گیا تھا اور تجارت و صنعت کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ شائستہ خان نے اراکانی قزاقوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑا تیار کیا اور چٹاگانگ کے خلاف فوجی کارروائی کا مرکز بنانے کے لیے سون دیپ جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مال دولت اور دوسری باتوں کا لالچ دے کر فرنگیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اراکانی بحری فوج کو چٹاگانگ کے پاس تباہ کر دیا گیا اور کئی جہازوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ شائستہ خان نے اس کے بعد چٹاگانگ پر حملہ کیا اور 1666 کے اوائل میں اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اراکانی بحریہ کی تباہی کے نتیجے میں سمندری راستے سے کھلی تجارت پھر شروع ہو گئی۔ اس عہد میں بنگال کی غیر ملکی تجارت میں بھاری اضافے اور مشرقی بنگال میں زراعت کی ترقی اور فروغ میں اس واقعے نے کافی اہم رول ادا کیا۔ اڑیسہ میں پٹھانوں کی بغاوت کچل دی گئی اور اس طرح بالاسور بھی تجارت و کاروبار کے لیے پھر سے کھل گیا۔

8.4 بغاوتیں اور تحریکیں (Rebellions and Movements)

اندرون سلطنت بھی اورنگ زیب کو متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں دکن میں مراٹھوں شمالی ہندوستان میں جاٹوں اور راجپوتوں اور شمال مغرب میں افغانوں اور سکھوں کی بقا دمیں بھی شامل تھیں۔ ان میں سے چند مسائل آیسے تھے جو نئے نہیں تھے اور اورنگ زیب کے متقدمین حکمرانوں کو بھی ان کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد میں ان مسائل کی نوعیت بدل گئی تھی۔ پھر مسائل ایک دوسرے سے قطعی مختلف بھی تھے۔ راجپوتوں کے سلسلے میں اصل مسئلہ جانشینی کو پیدا کردہ تھا جبکہ مراٹھوں کا معاملہ، مقامی یا علاقائی آزادی

سے تعلق رکھتا تھا۔ جاٹوں کی بغاوت کے پس پشت کسانوں اور زمین سے متعلق معاملات کار فرما تھے۔ وہ واحد ٹکراؤ جس میں مذہبی عصر شامل تھا، سکھوں کے ساتھ تھا۔ سکھوں اور جاٹوں کی تحریکوں نے آخر کار آزاد علاقائی ریاستوں کے قیام کی کوشش کی شکل اختیار کرلی۔ افغانوں کی بغاوت ویسے تو قبائلی نوعیت کی تھی لیکن یہاں بھی ایک آزاد ریاست کے قیام کا جذبہ ہی کار فرما تھا۔ اس طرح ان تحریکوں اور مزاحمتوں میں معاشی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ علاقائی آزادی کے جذبات نے اہم رول ادا کیا۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ افغانوں کی بغاوت کے سوا باقی تمام تحریکیں دراصل اورنگ زیب کی مذہبر تنگ نظری کے خلاف رد عمل تھیں۔ کسی ایسے ملک میں جہاں کی اکثریتی آبادی ہندو تھی، وہاں اگر کوئی ایسی تحریک اٹھے جو مسلم غلبے والی مرکزی حکومت کے خلاف ہو آسانی سے اسلام کے خلاف چیلینج کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اس طرح ان باغیانہ 'تحریکوں کے رہنما بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا حامی بنانے کے لیے مذہبی نعرے لگا سکتے تھے۔ اس لیے ان تحریکوں کا صحیح جائزہ لینے کے لیے کافی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

8.4.1 جاٹ اور ست نامی بغاوتیں (Jat and Satnami Rebellions)

مغل سلطنت کے خلاف سب سے پہلے دریائے جمنا کے دونوں طرف کے دلی سے آگرہ تک کے علاقے میں آباد جاٹوں نے بغاوت کی۔ ان میں بیشتر کسان تھے اور معدودے چند زمیندار بھی تھے۔ آپسی بھائی چارے کے جذبے اور برابری کی مضبوط بنیاد پر یہ جاٹ پہلے بھی کئی بار بغاوت کر چکے تھے اور اپنے دشوار گذار علاقوں کا فائدہ اٹھا کر حکومت سے ٹکراتے رہے تھے۔ چنانچہ زمین کے لگان کی ادائیگی کے معاملے پر جاٹوں نے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد حکومت میں بھی بغاوت کی تھی۔ چونکہ ڈھاکہ اور مغربی بندرگاہوں تک کا شاہی راستہ اسی علاقے سے گذرتا تھا اس لیے مغل سلطنت وں نے ان تحریکوں پر کافی سنجیدگی سے توجہ دی تھی اور سخت تدارک کی اقدامات بھی کیے تھے۔ 1669 میں متھرا کے علاقے کے جاٹوں نے ایک مقامی زمیندار گوکلا کے جھنڈے تلے بغاوت کردی۔ بغاوت کی آگ اس علاقے کے کسانوں میں تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور آخر میں اورنگ زیب نے اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے خود دلی سے کوچ کیا۔ اگرچہ باغی جاٹوں کی تعداد بڑھ کر 20ہزار تک پہونچ گئی تھی لیکن اورنگ زیب کی منظم فوج کے آگے ان کا کوئی بس نہیں چلا خوفناک جنگ ہوئی جس میں جاٹوں کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کا سرغنہ قیدی بنا کر مار ڈالا گیا۔ اس شکست کے باوجود جاٹوں کی سرکشی کو مکمل طور پر کچلا نہیں جاسکا اور ان کی بے چینی برقرار رہی۔

اس درمیان 1672 میں کسانوں اور مغل سلطنت کے درمیان نارنول میں ایک اور جنگ ہوئی۔ اس مرتبہ مغلوں کے خلاف ایک مذہبی تنظیم نے جھنڈا بلند کیا۔ اس تنظیم کے لوگ خود کو ست نامی کہتے تھے۔ یہ ست نامی، زیادہ تر کسان دست کار اور نچلے طبقے کے لوگ تھے جنہیں اس وقت کے ایک مورخ نے سنار، بڑھئی، خاکروب، چرم ساز اور دیگر پنچ ذات والوں کا نام دیا تھا۔ یہ لوگ نہ تو ذات پات کو مانتے تھے اور نہ ہی ہندو۔ مسلمان کی تفریق کرتے تھے، لیکن اپنے طور و طریقہ پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان کی بغاوت ایک مقامی افسر کے ساتھ جھگڑے کی شکل میں شروع ہوئی اور جلد ہی باقاعدہ اور کھلی بغاوت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک بار پھر بادشاہ کو بذات خود آکر اس بغاوت کو دبانا پڑا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جنگ میں مقامی ہندو زمینداروں نے جن میں بیشتر راجپوت تھے مغلوں کا ہی ساتھ دیا۔ 1685 میں راجہ رام کی قیادت میں جاٹوں نے دوبارہ بغاوت کردی۔ اس مرتبہ جاٹ زیادہ منظم تھے۔ انہوں نے چھاپہ مار حملے کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کا طریقہ

بھی اختیار کیا۔اس سرکشی کو کچلنے کے لیےاورنگ زیب نے کچھواہہ حکمران راجہ بشن سنگھ سے درخواست کی۔ بشن سنگھ کو متھرا کا فوجدار مقرر کیا گیااور سارا علاقہ زمینداری کی شکل میں اسے دے دیا گیا۔ زمینداری کے حقوق کے سوال پر جاٹوں اور راجپوتوں کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ سے معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا کیونکہ بیشتر ابتدائی زمیندار یعنی اصل کاشت کار جو کہ زمین کے مالک تھے، جاٹ تھے، جبکہ لگان وصول کرنے والے درمیانی زمیندار بیشتر راجپوت تھے۔ جاٹوں نے کافی بہادری سے مزاحمت کی لیکن 1691 تک راجہ رام اور پھر اس کے جانشین چوڑا من کو ہار مان لینی پڑی۔ تاہم جاٹ کسانوں میں بے چینی برقرار رہی اور ان کی لوٹ مار کی وجہ سے دلی- آگرہ شاہراہ مسافروں کے لیے غیر محفوظ ہو گئی۔ بعد میں یعنی اٹھارہویں صدی میں مغلوں کی آپسی خانہ جنگی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر چوڑا من اس علاقے میں ایک علیحدہ جاٹ ریاست قائم کرنے اور راجپوت زمینداروں کی طاقت کو ختم کر دینے میں آخر کار کامیاب ہو ہی گیا۔اس طرح جو تحریک کسانوں کی شورش کی شکل میں شروع ہوئی تھی اس کی نوعیت بالکل ہی تبدیل ہوتی چلی گئی اور ایک ایسی ریاست کی تشکیل کا باعث ثابت ہوئی جس میں جاٹوں کو حکمران طبقے کی حیثیت حاصل تھی۔

8.4.2 افغان بغاوت (Afghan Rebellion)

اورنگ زیب کو افغانوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ پنجاب اور کابل کے درمیانی علاقے میں آباد جفاکش افغان قبائل کے ساتھ ٹکراؤ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ان افغانوں سے اکبر کو بھی جنگ کرنی پڑی تھی اور اس میں اسے اپنے عزیز ترین دوست اور معتمد راجہ بیربل سے محروم ہونا پڑا تھا۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں بھی ان افغانوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا۔ان تصادموں کے اسباب کچھ تو سیاسی، معاشی اور کچھ مذہبی بھی تھے۔ان سنگلاخ اور بنجر پہاڑی علاقوں میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے یہ افغان یا تو کاروانوں کو لوٹ لیا کرتے تھے یا پھر مغل فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ لیکن انہیں آزادی سے بھی شدید پیار تھا جس کی وجہ سے مغل فوج میں برقرار رہنا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ مغل انہیں تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات اور امداد دے کر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن آبادی میں اضافے یا کسی جاہ پسند لیڈر کے ابھرنے کی صورت میں اس بندوبست کے ختم ہو جانے کا خدشہ برابر قائم رہتا تھا۔اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہمیں پٹھانوں کی بغاوت میں ایک بالکل نئی شدت کا پتہ چلتا ہے۔ 1667 میں یوسف زئی قبیلے کے سردار بھاگو نے ایک شخص محمد شاہ کو بادشاہ قرار دے دیا، جس کا دعوی تھا۔ کہ وہ ایک قدیم حکمراں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور خود اس کا وزیر بن بیٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاٹوں کی طرح ہی افغانوں میں بھی اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کی خواہش پروان چڑھ رہی تھی۔ اس جدوجہد کو ایک احیاء پسند مذہبی تحریک روشنائی سے اخلاقی اور ذہنی مدد ملی۔ روشنائی تحریک میں ایک مخصوص پیر کے تئیں عقیدت اور سخت اخلاقی زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ بھاگو کی تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑتی گئی یہاں تک کہ اس کے پیروکاروں نے ہزارہ اٹک اور پیشاور جیسے اضلاع میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار شروع کر دی اور درہ خیبر سے آمدورفت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ خیبر کے راستے کو محفوظ بنانے اور اس سرکشی کو کچلنے کے لیے اورنگ زیب نے اپنے صدر بخشی امیر خان کو مامور کیا اور اس کے ساتھ راجپوت سپاہیوں کا ایک دستہ بھی بھیجا گیا۔ متعدد خونریز جنگوں کے بعد افغانوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا اور ان پر نظر رکھنے کے لیے مارواڑ کے حکمران مہاراجہ جسونت سنگھ کو زمرد کا فوجدار مقرر کر دیا گیا۔

1672 میں افغانوں نے پھر بغاوت کر دی۔اس مرتبہ بغاوت کا جھنڈا آفریدی سردار اکمن خان نے بلند کیا تھا جس نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور خطبے میں اپنا نام شامل کرا کر اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا تھا۔اس نے مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کر کے تمام افغانوں کو اپنے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔اس عہد کے ایک مورخ کے مطابق اس کے پیروکاروں نے جو کہ تعداد میں چاکائی یوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ تھے درہ خیبر کے راستے کو بند کر دیا تھا۔راستے کو صاف کرنے کے لیے امیر خان آگے بڑھا اور کافی آگے تک نکل گیا۔لیکن ایک تنگ وادی میں اسے کراری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔امیر خان تو جان بچا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا مگر دس ہزار لوگ کام آ گئے۔دو کروڑ روپے سے زائد کی مالیت کا سامان اور دولت افغانوں کے ہاتھ لگی۔مغلوں کی اس شکست کے بعد دیگر افغان قبائل بھی باغیوں کے ساتھ مل گئے۔ان میں خوش حال خان خٹک بھی تھا جو اورنگ زیب کا کٹر دشمن تھا اور کچھ عرصے کے لیے اس کا قیدی بھی رہ چکا تھا۔1674 میں ایک دیگر مغل منصب دار شجاعت خان کو بھی خیبر میں بھاری ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن جلد ہی جسونت سنگھ نے راٹھور جوانوں پر مشتمل ایک بھاری کمک بھیج دی جس سے اس کی جان بچ پائی۔آخر کار 1674 کے وسط میں اورنگ زیب خود پشاور گیا۔وہ 1675 کے آخر تک آس پاس کے علاقوں میں ہی رہا۔طاقت کے استعمال اور سیاسی حکمت عملی کے ذریعے رفتہ رفتہ افغانوں کے اتحاد کو ختم کر دیا گیا اور پھر امن بھی قائم ہو گیا۔افغانوں کی شورش سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغل اقتدار کے خلاف مزاحمت اور علاقائی آزادی اور خود مختاری کے جذبات صرف ہندو طبقہ جیسے جاٹ اور مراٹھے تک ہی محدود نہیں تھے۔افغانوں کی شورش کی وجہ سے شیواجی کے خلاف مغل دباؤ میں کمی آ گئی تھی جس کے نتیجے میں 1676 تک شیواجی خود تخت نشین ہو چکا تھا اور بیجاپور اور گول کنڈہ کی سلطنتوں کے ساتھ اس کی صلح بھی ہو چکی تھی۔دکن میں مغلوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کو آگے بڑھانا ناممکن نہیں تو مشکل یقیناً ہو گیا تھا۔

8.4.3 سکھ بغاوت (Sikh Rebellion)

اورنگ زیب کے خلاف سب سے آخر میں فوجی بغاوت سکھوں نے کی۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، سکھ گروؤں کے ساتھ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی ٹکراؤ ہو چکا تھا لیکن ان تصادموں کی وجہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور ذاتی تھی۔اب گروؤں نے شان و شوکت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا اور اپنی ایک باقاعدہ مسلح فوج بھی تیار کر لی تھی اور خود کو 'سچا پادشاہ' کہلوانے لگے تھے۔بہر حال 1675 تک سکھ گروؤں اور اورنگ زیب کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔1675 میں گرو تیغ بہادر کو ان کے پانچ پیروکاروں کے ساتھ پکڑ لیا گیا اور دلی لا کر قتل کر دیا گیا۔اس واقعے کے اسباب ابھی تک واضح نہیں ہو سکے ہیں۔چند فارسی تذکروں کے مطابق گرو تیغ بہادر نے ایک پٹھان حافظ آدم کے ساتھ مل کر پنجاب میں بدامنی پیدا کر دی تھی۔سکھ روایات کے مطابق گرو تیغ بہادر کے اپنے ہی کنبے کے کچھ لوگوں نے ان کی جانشینی کو چنوتی دی اور دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔اس طرح گرو تیغ بہادر کے قتل کے پیچھے ان کے کنبے کے لوگوں کی ہی سازش تھی۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب گرو تیغ بہادر سے ناراض تھا کیونکہ انہوں نے کچھ مسلمانوں کو سکھ بنا لیا تھا اور کشمیر میں افغان گورنر کی مذہبی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان میں کون سا الزام صحیح ہے اور کون سا غلط لیکن اتنا تو واضح ہے کہ کشمیر میں کسی افغان کو اورنگزیب نے کبھی گورنر نہیں بنایا۔سکھ مت رفتہ رفتہ جاٹ کسانوں اور نچلی ذات کے دوسرے دستکاروں اور کاریگروں میں

پھیلتا چلا گیا تھا جو کہ اس فرقے کے سادے اور برابری کے اصولوں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ تیغ بہادر نے ان طبقوں کی معاشی بد حالی کے سلسلے میں آواز اٹھائی ہو۔ کشمیر کا سابقہ گورنر، سیف خان ایک انسان دوست اور وسیع النظر حکمراں تھا جس نے انتظامی امور کے سلسلے میں ایک ہندو کو اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔ نئے گورنر کے ہاتھوں مذہب کے نام پر بڑے پیمانے پر زیادتیوں کی کہانی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ پندرہویں صدی سے کشمیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ بہر حال اسباب جو بھی رہے ہوں، اورنگ زیب کا یہ اقدام ہر لحاظ سے غلط تھا اور تنگ نظری کے مترادف تھا۔

گرو تیغ بہادر کے قتل نے سکھوں کو ایک بار پھر پنجاب کے پہاڑوں کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح سکھ تحریک رفتہ رفتہ فوجی جد وجہد کی شکل اختیار کرتی گئی۔ اس سلسلے میں گرو گوبند سنگھ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے زبردست تنظیمی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے 1699 میں ایک فوجی برادری یا خالصہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ اس سے پہلے، پنجاب کے پہاڑوں کی ترائی میں مکھووال یا آنند پور صاحب کو اپنا مرکز بنا چکے تھے۔ شروع میں تو پہاڑی ہندو راجاؤں نے گرو اور ان کے پیروکاروں کو آپسی جھگڑوں میں استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی گرو گوبند سنگھ خود ہی کافی طاقت ور ہو گئے اور پہاڑی ہندو راجاؤں اور گرد گوبند سنگھ کے درمیان کئی معرکے ہوئے جن میں گرد گوبند سنگھ ہی فتح یاب رہے تھے۔ ان لڑائیوں میں فتح اور خالصہ کے استحکام سے گرو گوبند سنگھ کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو گئے۔ گرو گوبند سنگھ اور ان راجاؤں کے درمیان دوبارہ جھگڑا 1704 میں ہی بڑھا جب کئی راجاؤں نے متحد ہو کر آنند پور صاحب میں گرو گوبند سنگھ پر حملہ کر دیا تھا۔ راجاؤں کو اس میں بھی پیچھے ہٹنا پڑا اور انہوں نے گرو گوبند سنگھ کے خلاف مغلوں سے مدد مانگی۔ اس طرح اس کے بعد جو جد وجہد ہوئی وہ مذہبی جد وجہد نہیں تھی۔ یہ جنگ ایک طرف تو پہاڑی ہندو راجاؤں اور سکھوں کی مقامی رقابت کا نتیجہ تھی اور دوسری طرف سکھ مت کی تحریک بھی زور پکڑ چکی تھی۔ اورنگ زیب سکھ گرو کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متفکر تھا۔ اور گرد کو خبر دار کرنے کے لیے وہ پہلے ہی مغل فوجدار سے کہہ چکا تھا۔ اس نے اب لاہور کے گورنر اور سرہند کے فوجدار وزیر خان سے گرو گوبند کے خلاف ہندو راجاؤں کی مدد کے لیے کہا۔ مغل فوجوں نے آنند پور صاحب پر حملہ کیا مگر سکھوں نے کافی بہادری سے مقابلہ کیا اور ان کے سارے حملوں کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد مغلوں اور ان کے اتحادیوں نے سکھوں کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جب قلعے میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو بظاہر وزیر خان کی اس یقین دہانی پر کہ انہیں بہ حفاظت نکل جانے دیا جائے گا گرو گوبند سنگھ کو قلعے کے دروازے کھول دینے پڑے۔ لیکن جب سکھوں کی فوج طغیانی پر آئے ہوئے ایک دریا کو پار کر رہی تھی تو وزیر خان کی فوج نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ گرو کے دو بیٹے قیدی بنا لیے گئے اور جب انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سرہند میں ان کو قتل کرا دیا گیا۔ گرو کے باقی دو بیٹے بھی ایک دوسری جنگ میں کام آگئے۔ اس کے بعد گرو گوبند سنگھ تلونڈی چلے گئے جہاں انہیں پھر پریشان نہیں کیا گیا۔

اس بات میں شبہ پایا جاتا ہے کہ وزیر خان نے اورنگ زیب کے کہنے پر گرو کے بیٹوں کو قتل کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب، گرو گوبند سنگھ کو بالکل ہی نہیں مٹا دینا چاہتا تھا، اور اس نے لاہور کے حکمراں کو یہ بھی لکھا تھا کہ گرو سے صلح کر لی جائے۔ جب گرو گوبند سنگھ نے دکن میں اورنگ زیب کو حالات سے مطلع کیا تھا تو اورنگ زیب نے انہیں ملاقات کی دعوت بھی دی تھی۔ 1706 کے آخر

میں گرو گوبند سنگھ ،اورنگ زیب سے ملاقات کی غرض سے دکن کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ وہ راستے میں ہی تھے کہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا۔ بعض مورخین کے مطابق گرو گوبند سنگھ کو امید تھی کہ وہ آنند پور صاحب کی واپسی کے لیے.اورنگ زیب کو رضامند کر لیں گے۔ اگرچہ گرو گوبند سنگھ ، مغل طاقت کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہیں کر سکے تھے اور نہ ہی ایک الگ سکھ ریاست قائم کر پائے تھے لیکن ایک روایت ضرور قائم کی اور ایک ایسا ہتھیار بھی تیار کیا جس سے بعد میں اس مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ بعض مخصوص حالات میں ایک مساویانہ مذہبی تحریک کو ایک زبردست سیاسی تحریک میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعے علاقائی آزادی کے حصول کی طرف آگے بڑھا جا سکتا ہے۔

8.5 اورنگزیب کی راجپوت پالیسی (Aurangzeb's Rajput Policy)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح 1614 میں جہانگیر نے میواڑ کے ساتھ ایک طویل لڑائی کو سلجھایا تھا۔ جہانگیر نے اہم راجپوت راجاؤں کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے اور ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم رکھنے کی اکبر کی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ شاہجہاں نے بھی راجپوت راجاؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھا۔ اس کے عہد حکومت میں راجپوتوں نے دکن اور وسطی ایشیا میں بلخ اور قندھار جیسے دور دراز علاقوں میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ تاہم کسی بھی راجپوت راجہ کو کسی صوبے کا گورنر مقرر نہیں کیا گیا اور اہم راجپوت راجاؤں کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم نہیں کیے گئے جبکہ خود شاہجہاں ایک راٹھور شہزادی کے بطن سے ہی پیدا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے ساتھ اچھے دوستانہ تعلقات قائم ہو جانے کے بعد اس طرح کے ازدواجی تعلقات کی ضرورت ہی نہیں رہی ہو گی۔ بہر حال شاہجہاں نے دو سر کردہ راجپوت گھرانوں یعنی جودھ پور اور آمیر کے سرداروں کو کافی عزت دی۔ مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ پر شاہجہاں کی خاص نظر کرم تھی۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت راجہ جسونت سنگھ اور راجہ جے سنگھ سات ہزاری منصب پر فائز تھے۔

اورنگ زیب بھی راجپوتوں کے ساتھ اتحاد اور دوستی کو کافی اہمیت دیتا تھا۔ اس نے میواڑ کے مہارانا کی سرگرم تائید حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کا منصب 5000 سے بڑھا کر 6000 کر دیا۔ اگرچہ راجہ جسونت سنگھ خود دھرمات کے مقام پر اس سے جنگ کر چکا تھا اور شجاع کے خلاف مہم کے دوران اس کا ساتھ بھی چھوڑ دیا تھا اور دارا کو بھی اپنے یہاں آنے کی دعوت دے چکا تھا اورنگ زیب نے اسے معاف کر دیا تھا اور اس کا سابقہ منصب بھی بحال کر دیا تھا۔ اسے اہم فوجی خدمات پر بھی مامور کیا گیا اور گجرات کا گورنر بھی بنایا گیا۔ جے سنگھ اپنی موت 1667 تک اورنگ زیب کا دوست اور معتمد رہا۔ 1678 کے آخر میں راجہ جسونت سنگھ کا انتقال ہو گیا جسے شمال مغرب میں افغانوں کی سرگرمیوں اور معاملات کی دیکھ بھال کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ راجہ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے اس کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مغلوں کی یہ دیرینہ روایت تھی کہ جانشینی کا تنازعہ پیدا ہو جانے کی صورت میں امن و قانون کو برقرار رکھنے کی غرض سے ریاست کو مغل انتظام میں لے لیا جاتا تھا اور جانشینی کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد جانشین کو ریاست کی حکمرانی بحال کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ 1650 میں جب جیسلمیر میں جانشینی کا تنازعہ پیدا ہو گیا تھا تو شاہجہاں نے سب سے پہلے ریاست کو خالصہ تحویل میں لے لیا تھا اور پھر بادشاہ کے منتخب شدہ

جانشین کو تخت نشین کرانے کے لیے جسونت سنگھ کی سرکردگی میں فوجی دستہ بھی بھیجا تھا۔

مارواڑ کو خالصہ کے زیر انتظام لانے کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ بیشتر مغل منصب داروں کی طرح ہی مہاراجہ پر بھی ریاست کا بھاری قرضہ تھا جسے وہ واپس ادا نہیں کر سکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے راجپوت جو جسونت سنگھ سے ناراض تھے یا جن کے علاقے جسونت سنگھ کو بطور جاگیر دے دیے گئے تھے وہ جودھ پور کی خالی گدی کا فائدہ اٹھا کر گڑ بڑی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اورنگ زیب کو راٹھوروں کی طرف سے مزاحمت کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ اس نے جسونت سنگھ کے کنبے اور حامیوں کی گذر اوقات کے لیے مارواڑ میں دو پرگنے دے دیے تھے۔ اس نے اپنے احکام کی تعمیل کے لیے ایک بھاری فوج جمع کی اور اجمیر پہونچ گیا۔ جسونت سنگھ کی پٹ رانی ہاڑی، جودھ پور کو راٹھوروں کا وطن سمجھتے ہوئے اسے مغلوں کے حوالے کرنے کے خلاف تھی لیکن مغل فوج کے سامنے اسے بھی ہار ماننی پڑی۔ اس کے بعد جسونت سنگھ کے خزانے کی تلاش شروع کر دی گئی۔ سارے مارواڑ میں مغل افسروں کا تقرر کر دیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ 'نئے' مندر یا تو گرا دیے جائیں یا بند کر دیے جائیں۔ مارواڑ کے ساتھ دشمن ملک جیسا سلوک کیا۔ اس طرز عمل کو درست قرار دینا بہت مشکل ہے۔ بعض جدید مورخین کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ اورنگ زیب مارواڑ کے علاقے پر اس لیے اپنا کنٹرول رکھنا چاہتا تھا کہ یہ علاقہ دلی کو گجرات کی بندرگاہوں سے جوڑنے کی وجہ سے جنگی اہمیت رکھتا تھا۔ جسونت سنگھ کی موت کے بعد لاہور میں اس کی دورانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے جانشینی کے حق پر کافی زور دیا گیا لیکن اورنگ زیب نے دہلی لوٹنے سے پہلے ہی 36 لاکھ روپے جانشینی محصول کے بدلے میں جودھ پور کے ٹیکے کا حق جسونت سنگھ کے بڑے بھائی امر سنگھ کے پوتے اندر سنگھ کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غالباً اورنگ زیب کا خیال یہ رہا ہوگا کہ شاہجہاں نے امر سنگھ کے چھوٹے بھائی جسونت سنگھ کو ٹیکے کا حق دے کر اور امر سنگھ کے حق کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اورنگ زیب مارواڑ میں کسی کم سن (نابالغ) کا انتظام نہ چاہتا ہو۔ بعض جدید تاریخ نویسوں کی رائے کے مطابق، اورنگ زیب نے مرحوم جسونت سنگھ کے بیٹے جیت سنگھ کو اس شرط پر جودھ پور دے دینے کی پیش کش کی تھی کہ اسے مسلمان ہونا پڑے گا لیکن اس عہد کے تاریخی شواہد سے اس طرح کی کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عہد کی ایک راجستھانی تصنیف 'حکومت ری بہی' کے مطابق اجیت سنگھ جب آگرہ کے دربار میں پہونچا تو اورنگ زیب اسے منصب دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مارواڑ کے دو پرگنوں سوجت اور جے تارن اس کی جاگیر کے بطور برقرار رہیں گے۔ گویا اس طرح اورنگ زیب مارواڑ کو دو خاندانوں کے درمیان تقسیم کر دینے پر غور وخوض کر رہا تھا۔

درگاداس کی قیادت میں راٹھور سرداروں نے اورنگ زیب کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات ریاست کے مفاد کے خلاف تھی۔ راٹھور سرداروں کے اس فیصلے سے اورنگ زیب برہم ہو گیا اور یہ حکم دیا کہ راج کماروں اور ان کی ماؤں کو نور گڑھ کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔ اس سے راٹھور سرداروں میں مزید بے چینی پھیل گئی اور وہ کافی بھاری لڑائی کے بعد اجیت سنگھ کے ساتھ آگرہ کے قلعے دھام سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے جودھپور میں بڑی دھوم دھام سے اجیت سنگھ کی تاجپوشی کی۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ اورنگ زیب اس حقیقت کو باوقار طریقے پر تسلیم کر لیتا کہ اندر سنگھ کو راٹھوروں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ اس نے اندر سنگھ کو نااہلیت کی بناء پر الگ تو کر دیا، لیکن اجیت سنگھ کی گدی نشینی کو غلط قرار دے کر اس کے تئیں بہت سخت رویہ اپنایا۔ سلطنت کے تمام علاقوں سے فوجوں کو

Maulana Azad National Urdu University

بلا کر اورنگ زیب ایک بار پھر اجمیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راٹھور اورنگ زیب کی اس بھاری فوج کا مقابلہ نہیں کر سکے اور جودھ پور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ درگاداس، اجیت سنگھ کے ساتھ بھاگ کر میواڑ پہنچا جہاں سے رانا نے انہیں کسی خفیہ مقام پر پہنچا دیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب میواڑ نے اجیت سنگھ کا ساتھ دے کر جنگ میں حصہ لیا۔ رانا راج سنگھ پہلے اورنگ زیب کا حامی تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔ اس نے رانی ہاڑی کے دعوے کی حمایت و تائید کرنے کے لیے اپنے ایک معتمد خاص کی سرکردگی میں 5000 فوجیوں کا ایک دستہ بھی جودھ پور بھیجا۔ وہ راجپوتوں کے اندرونی معاملات، خاص طور پر جانشینی جیسے معاملات میں مغلوں کی دخل اندازی کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی ناراض تھا کہ مغلوں نے اس کی ریاست کی جنوب اور مغربی سرحدوں سے لگی ریاستیں جیسے ڈونگر پور اور بانسواڑہ کو میواڑ سے کاٹ کر الگ اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت دینے کی کوشش کی تھی جو کبھی اس کی باج گزار رہ چکی تھیں۔ لیکن فوری وجہ یہی تھی کہ رانا مارواڑ پر مغلوں کے قبضے اور اورنگ زیب کے ذریعے اجیت سنگھ کے دعوے کے ٹھکرائے جانے سے برہم ہوا تھا۔

پہلا حملہ اورنگ زیب نے کیا۔ نومبر 1679 میں اس نے میواڑ پر چڑھائی کی۔ مغلوں کا ایک طاقت ور دستہ ادے پور پہونچ گیا اور اس نے رانا کے پڑاؤ پر بھی حملہ کر دیا جو کہ پہاڑیوں میں مغلوں پر پریشان کن حملے کرنے کے لیے روپوش ہو چکا تھا۔ بہر حال جنگ میں جلد ہی تعطل پیدا ہو گیا۔ مغل نہ تو پہاڑی علاقوں میں گھس سکتے تھے اور نہ ہی راجپوتوں کے چھاپہ مار حملوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اسی اثناء میں اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ اکبر نے صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے باپ کے خلاف مہم چھیڑ دی۔ راٹھور سردار درگاداس کے ساتھ مل کر اس نے جنوری 1681 میں اجمیر پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت کچھ لاچار سا تھا کیونکہ اس وقت اس کے ساری جنگجو افواج کہیں اور مصروف پیکار تھی۔ اورنگ زیب کی اس کمزوری کے باوجود شہزادہ اکبر نے تاخیر کر دی اور اورنگ زیب جعلی خطوط بھیج کر اس کے سرداروں کے درمیان نفاق پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اکبر کو مہاراشٹر کی طرف بھاگنا پڑا اور اورنگ زیب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اورنگ زیب کے لیے میواڑ کی مہم پہلے جیسی اہم نہیں رہی تھی۔ اس نے اس اثناء میں رانا جگت سنگھ سے صلح کر لی۔ نئے رانا کو جزیہ کی جگہ پر اپنے کچھ پرگنہ دینے پڑے اور وفاداری بنائے رکھنے اور اجیت سنگھ کو کوئی مدد نہ دینے کی شرط پر اسے پانچ ہزاری منصب بھی دے دیا گیا۔ اجیت سنگھ کے سلسلے میں اورنگ زیب نے صرف یہ وعدہ کیا کہ اس کے بالغ ہو جانے پر اس کا منصب اور راج بحال کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ اور اجیت سنگھ کے سلسلہ میں کرائی گئی اس یقین دہانی سے کوئی بھی راجپوت مطمئن نہیں ہوا۔

مغلوں نے مارواڑ پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اور 1698 تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا جبکہ آخر کار اجیت سنگھ کو مارواڑ کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن مغلوں نے جودھپور پر اپنی گرفت کو ڈھیلا نہیں کیا۔ اپنے پرگنے مغلوں کے حوالے کیے جانے پر خود میواڑ کا گھرانہ بھی بھی غیر مطمئن تھا۔ 1707 میں اورنگ زیب کی موت تک اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مارواڑ اور میواڑ کے سلسلہ میں اورنگ زیب نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہیں تھی اور اس کی اس پالیسی سے مغلوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ان ریاستوں کے خلاف مغل مہم کی ناکامی سے مغلوں کے فوجی وقار کو بھی دھکا پہونچا۔ یہ درست ہے کہ 1681 کے بعد میواڑ کی جنگ میں مغلوں کی طرف سے چھوٹی فوجوں نے نہ ہی حصہ لیا اور ان کے کوئی فوجی نتائج بھی نہیں تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ پہاڑی کچھواہا اور دوسرے راجپوت فوجی دستے اور سردار

مغلوں کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن اورنگ زیب کی مارواڑ پالیسی کے نتائج کا اندازہ صرف ان چند باتوں کی بنیاد پر ہی نہیں کیا جانا چاہیے۔ مارواڑ اور میواڑ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے ایک نازک زمانے میں راجپوتوں کے ساتھ مغلوں کے تعلقات کمزور پڑ گئے۔ خاص بات تو یہ ہوئی کہ اپنے خاص اور پرانے اتحادیوں کی تائید و مدد کے سلسلے میں مغلوں کا کردار ہی مشکوک ہو گیا۔ اگرچہ اورنگ زیب کی اس پالیسی سے اس کی سخت گیر فطرت اور ضد کا پتہ چلتا ہے لیکن اس سے یہ ہر گز ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہندو مذہب کو زیر کر دینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس پر الزام لگایا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ 1679 کے بعد کے زمانے میں مراٹھوں کو بڑی تعداد میں منصب دیے گئے۔ جہاں شمال مشرقی علاقوں کے حکمرانوں، جاٹوں، افغانوں اور راجپوتوں کے ساتھ اورنگزیب کی جنگوں کے نتیجے میں مغل سلطنت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن اصل لڑائی کا میدان دکن تھا۔

8.6 اورنگ زیب کی دکن پالیسی (Aurangzeb's Deccan Policy)

دکن کی ریاستوں کے ساتھ اورنگ زیب کے تعلقات کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا مرحلہ 1068 تک کا ہے جس کے دوران مغلوں کا اہم مقصد احمد نگر کے ان علاقوں کو بیجاپور سے واپس لینا تھا جو 1636 کے معاہدے کی رو سے بیجاپور کو ملے تھے۔ دوسرا مرحلہ 1684 تک جاری رہا جس کے دوران دکن میں سب سے بڑا خطرہ مراٹھوں کو سمجھا گیا اور مغلوں نے شیواجی اور بعد میں اس کے بیٹے سامبھاجی کے خلاف کارروائی میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی مغلوں نے دکنی ریاستوں کے علاقوں پر چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے اور انہیں مکمل طور پر اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی۔ ان تعلقات کا آخری مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام ہو جانے پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو مکمل طور پر اپنے زیر تسلط لانے کا فیصلہ کیا۔ شاہ جہاں نے مراٹھوں کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے 1636 کے معاہدے کے ذریعے احمد نگر کا ایک تہائی حصہ انہیں بطور رشوت دینے کے ساتھ ساتھ یہ عہد بھی کیا تھا کہ وہ کبھی بھی بیجاپور اور گولکنڈہ پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کو خود شاہجہاں ہی نے ترک کر دیا تھا۔ 58-1657 میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو نیست و نابود کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ گولکنڈہ کو بہت بڑا ہرجانہ ادا کرنا پڑا اور بیجاپور کو وہ نظام شاہی علاقے واپس کرنے پڑے جو اسے 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل ہوئے تھے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ان دونوں ریاستوں نے کرناٹک کے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے اور چونکہ یہ دونوں ریاستیں مغل سلطنت کی باج گزار ہیں اس لیے انہیں معاوضہ ادا کرنا چاہیے اور یہ کہ مغل فوجوں کی چشم پوشی کے نتیجے میں ہی انہیں یہ فتوحات حاصل ہو سکی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ دکن میں مغل فوج کا خرچ بہت زیادہ تھا اور مغلوں کے ماتحت دکنی علاقوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ناکافی رہتی تھی۔ یہ اخراجات کافی عرصے تک مالوہ اور گجرات کے خزانے سے بھی پورے کیے جاتے رہے تھے۔ دکن میں محدود پیمانے کی پیش قدمی کی پالیسی کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو نہ تو شاہجہاں ہی بخوبی سمجھ پایا تھا اور نہ ہی اورنگ زیب۔ اس سے ایک طرف تو مغلوں کے معاہدوں اور وعدوں پر سے ہمیشہ کے لیے اعتماد اٹھ گیا اور دوسرے مغل حکمران، مراٹھوں کے خلاف دوسری طاقتوں کو بھی متحد نہیں کر سکے۔ اورنگ زیب نے اس پالیسی کی کامیابی کے لیے 25 برسوں تک مسلسل کوشش کی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔

8.6.1 پہلا مرحلہ (First Stage, 1658–68)

تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اورنگ زیب کو دکن کے سلسلے میں دو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مسئلہ تھا اور دوسرا مسئلہ بیجاپور کی ریاست کو اس بات کے لیے راضی کرنے کا تھا کہ وہ 1636 کے معاہدے کے تحت حاصل علاقے مغلوں کو واپس کردے۔ 1657 میں کلیانی اور بیدر کو واپس لے لیا گیا تھا اور 1660 میں رشوت دے کر پرندا بھی حاصل کیا جاچکا تھا۔ لیکن شولا پور کی واپسی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اورنگ زیب نے شیواجی اور عادل شاہ کو سزا دینے کے لیے راجہ جے سنگھ کو دکن بھیجا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کو اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ تھا اور وہ دشمن کی طاقت کو کم سمجھتا تھا۔ لیکن راجہ جے سنگھ ایک مشاق سیاست باز تھا۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا کہ ان دونوں بے وقوفوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا نادانی ہوگی۔ بہر حال جے سنگھ وہ واحد مغل سیاست داں تھا جس نے اس زمانے میں دکن میں بھرپور پیش قدمی کی تائید کی تھی۔ جے سنگھ کا خیال تھا کہ دکن میں بھرپور حملے کی پالیسی اپنائے بغیر مراٹھوں کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ اورنگ زیب اس نتیجے پر پورے 20 سال بعد پہونچ پایا تھا۔ جے سنگھ نے بیجاپور کے خلاف فوجی تیاریوں کے دوران اورنگ زیب کو لکھا تھا 'بیجاپور پر فتح پورے دکن اور کرناٹک پر فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی' لیکن اورنگ زیب اتنا جرات مندانہ قدم اٹھانے سے کترا رہا تھا۔ ہم اس کے اس رویے کے اسباب کے بارے میں صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غالباً اس وقت ایرانی حکمران، ہند کے شمال مغربی علاقوں پر منڈرا رہا تھا، جس سے شمال مغرب کو خطرہ لاحق تھا۔ پھر یہ کہ دکن کی مہم کافی طویل اور دشوار بھی ثابت ہو سکتی تھی اور خود بادشاہ کی موجودگی کی بھی نوبت آسکتی تھی، کیونکہ اتنی بڑی فوج کسی سردار یا آرزومند شہزادے کی کمان میں زیادہ عرصے کے لیے ہرگز نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ اس بات کا تلخ تجربہ شاہجہاں کو تو ہو ہی چکا تھا اور شاہجہاں کے زندہ رہتے اورنگ زیب کسی دور کی مہم پر خود کیسے جاسکتا تھا؟ اس مہم کے نتیجے میں دکن کی تمام ریاستیں، مغل سلطنت کے خلاف متحد ہوگئیں اور قطب شاہ نے بیجاپور کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج بھی بھیجی۔ دکنی ریاستوں نے چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اپناتے ہوئے جے سنگھ کو بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے راغب کیا جبکہ دیہاتی علاقوں میں دھان کی فصلوں کو خود ہی برباد بھی کرتے گئے تاکہ مغلوں کو ان علاقوں میں کسی طرح کی رسد نہ حاصل ہو سکے۔ اب جے سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شہر پر حملہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایسی بڑی توپیں لایا ہی نہیں تھا جو کسی شہر کی فصیل توڑ سکتی تھیں اور اس طرح شہر کا محاصرہ بھی ناممکن تھا۔ پیچھے ہٹنا بھی بہت مہنگا ثابت ہوا۔ نہ تو کسی طرح دولت ہی ہاتھ آئی اور نہ ہی کوئی علاقہ ہاتھ آیا۔ اس مایوسی اور اورنگ زیب کی ناراضگی کی وجہ سے جلد ہی 1667 میں راجہ جے سنگھ کی موت ہوگئی۔ اگلے سال میں مغل رشوت کے ذریعے شولا پور کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح پہلا مرحلہ تمام ہوا۔

8.6.2 دوسرا مرحلہ (Second Stage, 1668–84)

1668 تا 1670 کی درمیانی مدت میں مغل دکن میں پیش قدمی کرنے کے موقعہ کا انتظار کرتے رہے۔ اس عرصے میں گولکنڈہ کی سیاست میں ایک نیا عصر مدنا اور اکھنا کی ابھرتی ہوئی طاقت تھی۔ گولکنڈہ پر 1672 سے 1687 تک دراصل ان دونوں زیرک بھائیوں نے ہی حکومت کی۔ ان دونوں بھائیوں نے گولکنڈہ بیجاپور اور شیواجی کو ملا کر ایک سہ فریقی طاقت قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال یہ

کوشش بیجاپور کے اندرونی خلفشار اور شیواجی کی از حد آرزومندی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ پھر یہ کہ بیجاپور کے مختلف طبقات سے یہ امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی مستقل پالیسی پر کاربندرہ سکیں گے۔ وہ اپنی فوری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق کبھی تو مغلوں کا ساتھ دیتے اور کبھی ان کے خلاف ہو جاتے تھے۔ شیواجی بھی کبھی بیجاپور کو لوٹتا اور کبھی مغلوں کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دیتا۔ اگرچہ اورنگ زیب مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن میں مغلوں کی محدود پیش قدمی کے حق میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بیجاپور کی گدی پر ایسے حکمران کو بٹھانے کی بارہا کوشش کی جو شیواجی کے خلاف مغلوں کے ساتھ تعاون کر سکتا ہو اور گولکنڈہ کے زیر اثر نہ ہو۔ اس پالیسی کے تحت مغلوں نے بیجاپور کے معاملات میں کئی بار مداخلت کی جن کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مغلوں کی سیاسی اور فوجی کوششوں کا ایک ہی نتیجہ ہوا اور وہ یہ کہ اس طرح دکن کی تینوں ریاستوں کو ان کے خلاف متحد ہو جانے کا موقع مل گیا۔ مغل گورنر دلیر خان کی بیجاپور پر قبضے کی آخری کوشش 80-1679 بھی ناکام رہی۔ اس ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغل گورنر کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ وہ دکن کی ریاستوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس جنگ میں کرناٹک کی پیادہ فوج نے بھی اہم رول ادا کیا۔ بیجاپور کی مدد کے لیے وراڑ کے حکمران پریم نایک نے 30000 فوجی بھیجے تھے تاکہ وہ مغل فوج کے محاصرے کا مقابلہ کر سکے۔ بیجاپور کی مدد کے لیے شیواجی نے بھی ایک بھاری فوج بھیجی تھی اور مغل علاقوں پر چاروں طرف سے حملے شروع کر دیتے تھے۔ اس طرح دلیر خان کو بے نیل مرام واپس لوٹنا پڑا بلکہ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اب مراٹھوں کے حملے کے لیے مغل علاقوں کے دروازے پوری طرح کھل گئے۔ اورنگ زیب نے دلیر خان کو واپس بلالیا۔

8.6.3 تیسرا مرحلہ (Third Stage, 1684–87)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 1676 اور 1680 کے درمیان مغلوں کو دکن میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اورنگ زیب 1681 میں اپنے باقی بیٹے شہزادہ اکبر کا تعاقب کرتا ہوا دکن پہونچا۔ اس نے اپنی ساری طاقت شیواجی کے بیٹے اور جانشین سامبھاجی کے خلاف لگاری اور اس کے ساتھ ہی بیجاپور اور گولکنڈہ کو مراٹھوں کا ساتھ چھوڑ دینے کے لیے رضامند کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ لیکن اس کی ان کوششوں کا بھی وہی انجام ہوا جو اس سے پہلے مغل گورنروں کی کوششوں کا ہوا تھا۔ صرف مراٹھا ہی مغلوں کی طاقت کے خلاف ڈھال بن سکتے تھے اور دکن کی ریاستیں اس ڈھال سے محروم ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھیں۔ اورنگ زیب نے اب ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے باج گزار کے طور پر عادل شاہ کو یہ حکم دیا کہ وہ مغل فوج کے لیے رسد فراہم کرے، مغل فوجوں کو اپنے علاقوں سے آزادانہ طور پر گزرنے دے اور مراٹھوں کے خلاف جنگ کے لیے 5000 سے 6000 گھڑسوار فوج بھی دے۔ اس نے مغلوں کی مخالفت کرنے والے ایک اہم بیجاپوری امیر شرزہ خان کو برخاست کرنے کی بھی مانگ کی۔ ایسی صورت میں عادل شاہ اور مغلوں کا اختلاف کھل کر سامنے آنا لازمی تھا۔ عادل شاہ نے گولکنڈہ اور سامبھاجی یعنی دونوں ہی سے مدد کی درخواست کی اور اسے یہ مدد فوراً ہی حاصل بھی ہوگئی۔ تاہم دکنی ریاستوں کی یہ مشترکہ فوج بھی مغل طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکی، خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ مغل فوجوں کی کمان خود شہنشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ تب بھی مغلوں کو اپنا محاصرہ 18 مہینوں تک جاری رکھنا پڑا اور اس محاصرہ کے آخری مرحلوں تک فوج کی کمان اورنگ زیب نے اپنے ہی ہاتھوں

میں رکھی۔ آخر کار 1686 میں بیجاپور نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔ جتنی مشکل سے یہ مغل مہم کامیاب ہو پائی،اس سے 1665 میں جے سنگھ اور 1679-80 میں دلیر خان کی مہموں کی ناکامی کے اسباب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بیجاپور کی شکست کے بعد گولکنڈہ پر مغلوں کا حملہ لازمی تھا۔ قطب شاہ کے گناہ اتنے زیادہ تھے کہ انہیں کسی طور معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس نے غیر مسلموں مدنا اور اکھنا کو بے مہار اختیارات دے رکھے تھے اور کئی موقعوں پر شیواجی کی بھی مدد کر چکا تھا۔ اس کی غداری کا تازہ واقعہ یہ تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی تنبیہہ کے باوجود 40000 سپاہیوں سے بیجاپور کی مدد کی تھی۔ 1686 میں بھاری مزاحمت کے باوجود مغل فوجیں گولکنڈہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں ۔ بھاری تاوان جنگ، کچھ علاقوں اور مدنا اور اکھنا بھائیوں کے ہٹانے کے عوض میں اورنگ زیب قطب شاہ کو معافی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ قطب شاہ بھی یہ شرطیں مان لینے کے لیے تیار ہو گیا اور مدنا اور اکھنا کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ لیکن یہ بھی قطب شاہی حکومت کو نہیں بچاسکا۔ اورنگ زیب اپنی اس مہم میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کا خاتمہ، دراصل اس کے لیے نئی مشکلات کا نقطہ آغاز تھا۔ اب اورنگ زیب کی زندگی کا سب سے اہم اور آخری دور شروع ہوا۔

8.6.4 اورنگ زیب اور مراٹھا (Aurangzeb and the Marathas)

بیجاپور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ زیب نے اپنی ساری طاقت، مراٹھوں کے خلاف لگادی۔ 1689 میں اپنے خفیہ ٹھکانے سنگ میشور پر مغلوں کے ایک اچانک حملے سے سامبھاجی ششدر رہ گیا۔ اسے گرفتار کرکے اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا اور باغی اور کافر قرار دے کر اسے قتل کر دیا گیا۔ بلاشبہ یہ اورنگ زیب کی ایک دوسری بھاری سیاسی غلطی تھی۔ وہ مراٹھوں کے ساتھ سمجھوتا کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ پر اپنی فتح کو مستقل شکل دے سکتا تھا۔ اس نے سامبھاجی کو قتل کر کے نہ صرف یہ کہ اس بات کا موقع کھو دیا بلکہ اس طرح مراٹھوں کے لیے جواز بھی پیدا کر دیا۔ کسی ایک جھنڈے تلے اکٹھے نہ ہونے کی وجہ سے مراٹھے سردار مغل علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے لیے آزاد تھے اور مغل فوج کے آنے پر ادھر ادھر غائب ہو جاتے تھے۔ اورنگ زیب نے مراٹھوں کو ختم کر دینے کے بجائے اس نے انہیں سارے دکن میں اپنی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کا موقع دے دیا۔ سامبھاجی کے چھوٹے بھائی، راجہ رام کی تخت نشینی تو عمل میں آئی، لیکن راجدھانی پر مغلوں کے حملے کی وجہ سے اسے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ راجہ رام نے مشرقی ساحل پر واقع جینجی میں پناہ لی۔ وہیں سے مغلوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس طرح مراٹھوں کی مزاحمت اب مغرب سے مشرقی ساحل تک پھیل گئی۔ بہر حال اس وقت اورنگ زیب اپنے تمام مخالفوں اور دشمنوں کو ختم کر کے اپنے اقتدار کے نقطہ عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اس کے بعض امراء کا خیال یہ تھا کہ اسے اب شمالی ہند واپس لوٹ جانا چاہیے اور مراٹھوں کی سرکوبی کا کام دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایک ایسا حلقہ، جسے ولی عہد شاہ عالم کی بھی تائید حاصل تھی، یہ رائے دے چکا تھا کہ کرناٹک کی ریاست کا بندوبست گولکنڈہ اور بیجاپور کے ماتحت حکمرانوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اورنگ زیب نے ان تمام تجویزوں کو مسترد کر دیا اور دکن کے حکمرانوں سے براہ راست بات چیت شروع کرنے کے جرم میں شاہ عالم کو قید کر دیا۔ یہ سمجھ کر کہ 1690 کے بعد مراٹھوں کی طاقت کا قلع قمع ہو چکا ہے، اورنگ زیب نے اپنی ساری توجہ کرناٹک کے وسیع اور خوش حال علاقوں پر قبضے کی طرف مبذول کی۔ لیکن ان سارے علاقوں پر کنٹرول قائم رکھنا اورنگ زیب کے بس سے باہر کی بات تھی۔

اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ جیسی مفتوحہ ریاستوں میں انتظام اور بندوبست کو نظرانداز کر کے، دور دراز کے علاقوں تک بلاضرورت مواصلاتی بندوبست مجموعی طور پر اچھی طرح کیا گیا مگر بیجاپور کے مراٹھا شورش والے علاقے انتشار اور ابتری کے شکار رہے۔

1690 سے 1703 تک کی درمیانی مدت میں اورنگ زیب، مراٹھوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہ کرنے کی ضد پر ہی قائم رہا۔ تیجی میں راجہ رام کا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہ محاصرہ کافی طول کھینچ گیا۔ 1698 میں بیجی بھی فتح ہو گیا لیکن اصل شکار یعنی راجہ رام نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مراٹھوں کی مزاحمت میں اور شدت آ گئی اور کئی موقعوں پر مغلوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ مراٹھوں نے اپنے کئی قلعے واپس لے لیے اور راجہ رام بھی ستارا واپس لوٹ آنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان ناکامیوں سے اورنگ زیب کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور اس نے مراٹھوں کے تمام قلعوں پر دوبارہ قبضے کی ٹھان لی۔ 1700 سے 1705 تک کے ساڑھے پانچ سال کے سارے عرصے میں اورنگ زیب اپنے مریض اور تھکے ہوئے جسم کو محاصروں کے سلسلے میں ایک قلعے سے دوسرے قلعے تک ڈھوتا رہا۔ طغیانیوں بیماریوں اور مراٹھوں کے چھاپہ مار حملوں سے مغل فوجوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مغل امراء اور فوج میں تکان اور بے چینی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ ان کے حوصلوں میں بھی کمی آتی گئی اور متعدد جاگیرداروں نے مراٹھوں کے ساتھ خفیہ معاہدے بھی کر لیے اور اس شرط پر چوتھ دینا بھی مان لیا کہ مراٹھے ان کی جاگیروں میں گڑبڑی نہیں کریں گے۔ 1703 میں اورنگ زیب نے مراٹھوں کے ساتھ بات چیت شروع کی وہ سامبھاجی کے بیٹے شاہو کو رہا کرنے کے لیے تیار ہو گیا جو ستارا میں اپنی ماں کے ساتھ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ شاہو کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا۔ اسے راجہ کا خطاب اور 7000 ہزاری منصب دیا گیا۔ بڑا ہونے پر اس کی شادی معزز مراٹھا خاندانوں کی دو لڑکیوں کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ اورنگ زیب، شاہو کو شیواجی کا سوراجیہ اور دکن میں سردیش مکھی کا حق دینے اور اس طرح اس کی مخصوص حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ شاہو کا استقبال کرنے کے لیے 70 سے زائد مراٹھا سردار بھی جمع ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر اورنگ زیب کو مراٹھوں کے اصل عزائم کے بارے میں شک ہو گیا اور اس نے ان تمام تیاریوں کو منسوخ کر دیا۔ 1706 میں اورنگ زیب کو یقین ہو گیا کہ مراٹھوں کے سارے قلعوں پر قبضہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ اورنگ آباد کی طرف واپس ہونا شروع کر دیا جبکہ راستے میں مراٹھوں کے حملے بھی جاری رہے۔ اس طرح 1707 میں اورنگ آباد میں اورنگ زیب نے جب آخری سانسیں لیں تو وہ اپنے پیچھے ایک ایسی سلطنت چھوڑ گیا جو بالکل کمزور ہو چکی تھی اور جس میں مختلف قسم کے مسائل سر اٹھانے لگے تھے۔

8.7 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی (Aurangzeb's Religious Policy)

اورنگ زیب نے تقریباً پچاس برس حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کی توسیع نقطہ عروج کو پہونچ گئی۔ دور عروج میں مغل سلطنت شمال میں کشمیر سے جنوب میں جنجی تک اور مغرب میں کوہ ہندوکش سے مشرق میں چٹاگانگ تک وسیع ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب بہت ہی جفاکش حکمران تھا اور حکومت کے معاملے میں نہ تو خود کو بخشتا تھا اور نہ ہی اپنے کسی ماتحت افسر اور عامل کو۔ اس کے رقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حکومت کے سارے معاملات پر کافی گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ نظم و ضبط کا سخت پابند تھا اور اس معاملے میں اپنے

لڑکوں کے ساتھ بھی کسی طرح کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ 1686 میں اس نے اپنے لڑکے شہزادہ معظم کو گول کنڈا کے حکمران کے ساتھ ساز باز کے الزام میں گرفتار کر کے 12 برس تک قید میں رکھا تھا۔ متعدد موقعوں پر اس کے دوسرے بیٹوں کو بھی اس کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اس کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اس کی عمر کے آخری دنوں میں بھی شہزادہ معظم کو جو کہ اس وقت کابل کا گورنر تھا جب کبھی بھی اپنے باپ کا کوئی رقعہ موصول ہوتا تھا تو وہ خوف سے کانپ اٹھتا تھا۔ اورنگ زیب کو اپنے اسلاف کے برخلاف دکھاوے یا ظاہر داری کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ ذاتی طور پر بھی بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لوگ اسے مذہب پسند اور خدا ترس مسلم حکمراں کے طور پر جانتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ ایک زندہ پیر سمجھا جانے لگا تھا۔ بحیثیت ایک حکمران کے اورنگ زیب کی کامیابیوں کے بارے میں مورخین میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو بالکل الٹ دیا تھا جس کی وجہ سے مغل سلطنت نے تئیں ہندوؤں کی وفاداری میں کمی آگئی تھی۔ ان مورخین کی رائے کے مطابق اورنگ زیب کی مذہبی نارواداری کی پالیسی کے نتیجے میں کئی بغاوتیں ہوئیں جس سے سلطنت کی طاقت کو کافی نقصان پہونچا۔ وہ کافی شکی بھی تھا جس کی وجہ سے بھی اس کی مشکلات میں کافی اضافہ ہوا۔ خفی خان کے مطابق اس کے منصوبے کافی لمبے ہوتے تھے اور انجام کار اس کے بیشتر منصوبے ناکام ہو جاتے تھے۔ کچھ دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کے سلسلے میں رائے ظاہر کرتے وقت انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ان مورخین کے مطابق اورنگ زیب کے معتقدین کی نرم پالیسیوں کے نتیجے میں ہی مغل سلطنت کے تئیں ہندوؤں کی وفاداری ختم ہوئی تھی اور اورنگ زیب کے سامنے سخت اقدامات کرنے اور مسلمانوں کی مکمل تائید و مدد حاصل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کیونکہ آخرکار مسلمانوں کی تائید پر ہی مغل سلطنت کی بقاء کا انحصار تھا۔

بہرکیف حال کی کچھ تصنیفات میں اورنگ زیب کے بارے میں ایک نیا رجحان ابھرا ہے جس میں اس کی مذہبی اور سیاسی پالیسیوں کا اس زمانہ کے سماجی معاشی حالات کے پس منظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگ زیب مذہبی اعتقادات کے معاملے میں بہت. سخت تھا۔ اسے فلسفیانہ بحث و مباحثے اور تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، حالانکہ اس نے اپنے لڑکوں کو اس مسلک پر چلنے سے نہیں روکا اور وہ خود بھی صوفیوں کے پاس دعا کے لیے جایا کرتا تھا۔ فقہ حنفی کے تئیں مکمل طور پر پابند رہنے کے باوجود بھی جو کہ کافی پہلے سے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر رائج تھا، اس نے سیکولر (غیر مذہبی) فرمان جاری کرنے میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کیا۔ ان فرمانوں کو ضوابط کہا جاتا تھا۔ اس کے ان فرمانوں کو ضوابط عالم گیری کے نام سے مدون کیا جاچکا ہے۔ اصولی اور نظریاتی طور پر یہ ضوابط بھی دراصل شریعت کا ہی تکملہ ہوتے تھے۔ عملی طور پر مخصوص حالات کے پیش نظر ان ضوابط کے ذریعہ شرعی قوانین میں اکثر اصلاح کی جاتی تھی کیونکہ کچھ ہندوستانی موجودہ حالات ایسے بھی تھے جن کے تقاضے شریعت میں موجود نہیں تھے۔

اورنگ زیب قدامت پرست مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکمران بھی تھا۔ وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی۔ سلطنت کی بیشتر آبادی ہندو ہے جو کہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملے میں کافی پختہ ہیں۔ ایسی کوئی بھی پالیسی جس کے نتیجے میں ہندو خاص طور پر طاقت ور ہندو راجہ اور زمیندار مخالف ہو جائیں، قطعی ناقابل عمل تھی۔ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں سب

سے پہلے اخلاقی اور مذہبی ضوابط کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ اپنے عہد حکومت کے شروع میں ہی اورنگ زیب نے سکوں پر کلمہ کندہ کرانا بند کردیا تاکہ پیروں کے نیچے آکر ان کی بے حرمتی نہ ہو یا لین دین میں گندے نہ ہو جائیں۔ اس نے نوروز کی تقریب بھی بند کرادی کیونکہ اسے زرتشتی فرقے کا تہوار مانا جاتا تھا اور اس کی ایران کے صفوی بادشاہوں نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ تمام صوبوں میں محتسب مقرر کیے گئے جن کے ذمے اس بات کی نگرانی تھی کہ لوگ شریعت کے مطابق رہتے ہیں یا نہیں۔ یہ افسران اس بات پر بھی نظر رکھتے تھے کہ عوامی مقامات پر شراب یا بھنگ جیسی نشہ آور چیزوں کا استعمال تو نہیں ہو رہا ہے۔ ان لوگوں پر طوائف خانوں، جوئے خانوں اور ناپ تول کی نگرانی کی بھی ذمہ داری ہوتی تھی دوسرے لفظوں میں محتسبوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے لوگ شریعت اور ضوابط کی کھلم کھلا خلاف ورزی نہ کر سکیں۔ محتسبوں کے تقرر کی شکل میں اورنگ زیب نے دراصل اس بات پر زور دیا کہ شہریوں کی اخلاقی اصلاح کی ذمہ داری حکومت پر ہے لیکن ان افسروں کو یہ واضح ہدایت تھی کہ وہ لوگوں کے نجی معاملات اور نجی زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہ کریں۔ بعد میں یعنی اپنی حکومت کے گیارہویں سال (1669) میں اورنگ زیب نے ایسے کچھ اقدامات کیے جنہیں قدامت پرستانہ اقدامات قرار دیا جاتا ہے حالانکہ ان میں سے کچھ اقدامات محض معاشی اور سماجی اصلاح کے طور پر کیے گئے تھے اور جن کا اصل مقصد توہم پرستی کو ختم کرنا تھا۔ اورنگ زیب نے دربار میں موسیقی پر پابندی لگادی اور سرکاری موسیقاروں کو پینشن دے دی گئی۔ اس کے باوجود سازوں اور نوبت کو باقی رکھا گیا۔ حرم کی خواتین اور امراء کی بیگمات نے موسیقی کی سرپرستی کو جاری رکھا۔ ایک اہم بات جس کا پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے، یہ ہے کہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے موضوع پر فارسی میں سب سے زیادہ کتابیں اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی ہیں اور خود اورنگ زیب بھی دینا بجانے میں ماہر تھا۔ اس لیے احتجاجی موسیقاروں سے اورنگ زیب کا یہ کہنا کہ موسیقی کے جنازے کو اتنی گہرائی میں دفن کرنا کہ اس کی بازگشت پھر نہ سنائی دے سکے 'صرف غصے کے عالم میں کہی ہوئی ایک بات تھی۔ اورنگ زیب نے جھروکہ درشن کی روایت کو بھی ختم کردیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ محض ایک توہم پرستی اور اسلام مخالف بات تھی۔ اسی طرح اس نے بادشاہ کو اس کے یوم پیدائش کے موقع پر سونے چاندی یا دوسری قیمتی اشیاء میں تولنے کے سلسلے کو بھی بند کردیا۔ یہ روایت اکبر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور ایک کثیر العام روایت بن چکی تھی۔ اس سے چھوٹے امراء پر کافی بوجھ پڑتا تھا۔ لیکن اس کے حق میں رائے عامہ کا اتنا دباؤ تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے بیٹوں کی صحت یابی پر یہ رسم انجام دینے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ اورنگ زیب نے جیوتشیوں کے زائچہ تیار کرنے کے کام پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن خود اس کے خاندان کے لوگوں کے بشمول بیشتر لوگوں نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جیوتشیوں سے رابطہ قائم ہی رکھا۔

اسی طرح کے کچھ دوسرے فرمان بھی جاری کیے گئے۔ ان میں سے کچھ فرامین تو اخلاقی نوعیت رکھتے تھے اور کچھ کا تعلق کفایت شعاری قائم کرنے سے تھا۔ دربار کی، جہاں تخت رکھا جاتا تھا، سجاوٹ بہت سادگی اور ارزان طریقہ سے ہوتی تھی۔ منشیوں کو چاندی کی دوات کی جگہ پر مٹی کی بنی دواتیں دی گئیں۔ ریشمی کپڑوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور دیوان عام میں سونے کی ریلنگ کی جگہ پر لاجورد کی ریلنگ لگائی گئی جس پر سونے کی ملمع کاری کی گئی تھی۔ معاشی پہلو کے مد نظر تاریخ نویسی کے سرکاری دفتر کو بھی بند کردیا گیا۔ ان مسلمانوں میں جو کہ مکمل طور پر ریاست کی مدد پر انحصار کرتے تھے تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے کے لیے اورنگ زیب نے سب سے پہلے مسلمان تاجروں

کے محصول کو ختم کر دیا۔ لیکن اسے جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ مسلمان تاجر اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور حکومت کو دھوکہ دینے کے لیے ہندو تاجروں کی اشیاء کو بھی اپنی اشیاء بتا رہے ہیں۔ اس لیے اورنگ زیب نے مسلمانوں پر یہ محصول پھر لگا دیا لیکن دوسروں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے اس کی شرح نصف کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اس نے پیشکاروں اور کروڑیوں (چھوٹے درجے کے مالیاتی افسروں) کے عہدے صرف مسلمانوں کے لیے محفوظ کر دینے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی امراء کی مخالفت نیز قابل مسلمانوں کی کمی کی وجہ سے اس فرمان کو بھی واپس لینا پڑا۔ اب ہم اورنگ زیب کے چند ان دوسرے اقدامات کا جائزہ لیں گے جن کی بنیاد پر اسے متعصبی اور دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے تئیں امتیازی رویہ اختیار کرنے والا حکمراں کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اقدام مندروں کے تئیں اس کا رویہ اور جزیہ کا نفاذ ہے۔ اورنگ زیب نے زمام حکومت سنبھالتے ہی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے مندروں، یہودیوں کے عبادت خانوں، عیسائیوں کے گرجاگھروں وغیرہ کے بارے میں شریعت کے موقف کی ہی تائید کرتا ہے یعنی یہ کہ قدیم مندروں کو منہدم نہیں کرانا چاہیے لیکن مندروں کی تعمیر کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی۔ مزید یہ کہ چونکہ عمارتیں دوامی نہیں ہوتیں۔ اس لیے پرانی عبادت گاہوں کی مرمت کی اجازت دی جاسکتی تھی۔ اورنگ زیب کی اس پالیسی کا مشاہدہ بنارس (وارانسی) اور ورندابن (متھرا) وغیرہ جیسے مقامات کے برہمنوں کے نام جاری کیے گئے فرامین سے کیا جاسکتا ہے۔

مندروں کے سلسلے میں اورنگ زیب کے یہ فرامین کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان فرمانوں کے ذریعے دراصل اس پالیسی کا ہی احیاء کیا گیا تھا: جو عہد سلطنت میں بھی اپنائی جاچکی تھی اور جن پر شاہجہاں نے بھی اپنے عہد حکومت کے شروع میں عمل کیا تھا۔ عملاً مقامی افسروں کو کافی چھوٹ تھی کہ وہ الفاظ 'قدیم مندروں' کی وضاحت کس طرح کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں بادشاہ کے ذاتی خیالات اور جذبات سے افسروں کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔ مثال کے طور پر جب شاہجہاں کے مرغوب اور مذہبی رواداری کے علمبردار دارا شکوہ کا عروج ہوا تو بادشاہ کے مندروں سے متعلق فرمان کے باوجود بہت کم مندر توڑے گئے۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے گجرات کا صوبہ دار ہونے کی حیثیت سے کئی مندروں کو منہدم کرنے یا تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اس میں سوم ناتھ کا مندر بھی شامل تھا جسے اب بحال کر دیا گیا ہے۔ جب اورنگ زیب بادشاہ بنا اور یہ دیکھا کہ مندروں میں مورتیوں کو بحال کر دیا گیا ہے اور ان میں پوجا پاٹھ بھی شروع ہوگئی ہے، تو اس نے 1665 میں ان مندروں کو پھر تباہ کر دینے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد حکومت کے شروع میں نئے مندروں کی تعمیر پر پابندی لگانے کا جو حکم جاری کیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی حکومت کی ابتداء ہی سے مندروں کو بڑے پیمانے پر توڑا گیا۔ چونکہ اورنگ زیب کو مراٹھا، جاٹ، اور دوسرے لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا اس لیے اس نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ چنانچہ اس نے مقامی لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں تنبیہ اور عبرت کے طور پر ہندوؤں کے قدیم مندروں کو منہدم کرانا اب جائز سمجھ لیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اب اس نے ان مندروں کو ایسے تخریبی افکار کی تبلیغ کا مرکز سمجھنا شروع کر دیا تھا جو قدامت پرست عناصر کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ چنانچہ 1669 میں جب اسے یہ علم ہوا کہ ٹھٹھہ، ملتان اور خاص طور پر بنارس کے مندروں میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی برہمنوں سے حصول علم کے لیے دور دور سے آتے ہیں تو اس نے مندروں کے خلاف کڑی کارروائی کی۔ اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لیے تمام صوبوں کے حکمرانوں کے نام فرمان جاری کیا

اور یہ کہا کہ جن مندروں میں ایسا ہوتا ہے انہیں منہدم کر دیا جائے۔ ان احکامات کے تحت ہی بنارس (وارانسی) میں وشوناتھ مندر کو، اور جہانگیر کے عہد میں متھرا میں ویر سنگھ دیو بندیل کے ذریعہ تعمیر کردہ کیشورائے جیسے مشہور مندروں کو تباہ کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ ان مندروں کو منہدم کرنے کے پس پشت سیاسی مقاصد بھی کارفرما تھے۔ معاصر عالم گیری کے مصنف مستعد خان نے متھرا کے کیشورائے مندر کے گرائے جانے کے بارے میں لکھا ہے 'بادشاہ کی زبردست قوت ارادی اور خدا میں اس کے پختہ یقین کو دیکھ کر، خوددار راجے بھونچکارہ گئے تھے اور اچنبھے میں اس طرح کھڑے رہے جیسے دیواروں کی طرف منہ کیے ہوئے مجسمہ کھڑے ہوں۔' اسی پس منظر میں دس بارہ برسوں میں اڑیسہ میں جو کئی مندر تعمیر ہوئے تھے انہیں منہدم کر دیا گیا۔ لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مندروں کو منہدم کرانے کے لیے کوئی عام حکم جاری کیا گیا تھا۔ بہر حال جنگ کے زمانے میں یہ ہوتا تھا۔ چنانچہ 80-1669 کے دوران، جبکہ میواڑ کے راٹھور حکمرانوں اور اودے پور کے رانا کے ساتھ جنگ چل رہی تھی، راجپوتوں کے علاقے میں اودے پور اور جودھ پور اور آس پاس کے پرگنوں کے متعدد قدیم مندروں کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔

پروفیسر سید عزیزالدین حسین کے مطابق مندروں کے سلسلے میں اپنی پالیسی میں اورنگ زیب نے شریعت سے تجاوز کیا تھا، اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ شریعت کسی قدیم مندر یا عبادت گاہ کو توڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس معاملے میں اس کے رویے سے اس کے اسلاف کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو دھکا پہونچا۔ اس رویے کے نتیجے میں یہ تصور پیدا ہو گیا کہ کسی بھی بہانے سے مندروں کو توڑنے کی کارروائی کو بادشاہ نہ صرف درگزر کر دے گا بلکہ وہ اس اقدام کا استقبال کرے گا۔ اگرچہ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ اورنگ زیب نے ہندو مندروں اور مٹھوں کو عطیات دیے تھے مگر مجموعی طور پر ہندو مندروں کے تئیں اورنگ زیب نے جو پالیسی اپنائی تھی اس کے نتیجے میں ہندوؤں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1679 کے بعد مندروں کو توڑنے کے اورنگ زیب کے جوش میں کافی کمی آ گئی تھی۔ کیونکہ 1681 سے 1707 میں اس کی موت تک کے زمانے میں دکن میں مندروں کو توڑے جانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس اثناء میں بے چینی کے ایک دوسرے عنصر یعنی جزیہ کو پھر سے نافذ کر دیا گیا۔ شرع کے مطابق کسی بھی مسلم ریاست میں غیر مسلموں کو جزیہ محصول کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔ اکبر نے بعض اسباب کے تحت جزیہ کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن کٹر مذہبی علماء کا ایک طبقہ جزیہ کے پھر سے نفاذ پر زور دیتا رہا تھا تاکہ سب پر یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ہندوستان میں اسلام اور ان علماء کو برتری حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد جزیہ کو پھر سے نافذ کرنے کا کئی بار سوچا لیکن سیاسی مخالفت کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ آخر کار 1679 میں یعنی اپنی حکومت کے بائیسویں سال میں اس نے جزیہ کو دوبارہ نافذ کر دیا۔

اورنگ زیب کے اس اقدام کے بارے میں مورخین میں کافی بحث و مباحثہ ہے۔ سب سے پہلے ہم دیکھیں گے کہ جزیہ کیا نہیں تھا؟ اول تو اس کا مقصد قبول اسلام کے لیے ہندوؤں پر معاشی دباؤ ڈالنا ہرگز نہیں تھا کیونکہ ایک تو یہ بہت کم لوگوں پر نافذ ہوتا تھا۔ عورتیں، بچے، معذور افراد، نادار لوگ جن کی آمدنی بہت ناکافی تھی اور سرکاری ملازمین اس سے مستثنیٰ تھے اور نہ ہی حقیقت میں جزیے کی وجہ سے ہندوؤں کے کسی خاص گروہ یا طبقے نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے یہ کہ یہ محصول کسی شکل اقتصادی مسئلے کو حل کرنے کے مقصد سے بھی نہیں لگایا گیا

تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ جزیے سے کافی بڑی آمدنی حاصل تھی، لیکن اورنگ زیب نے کئی ٹیکسوں کو جنھیں ابواب کہا جاتا تھا ختم بھی کر دیا تھا جو شرع کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے غیر قانونی تھے۔ دراصل جزیہ کے دوبارہ نفاذ کی وجہ سیاسی اور نظریاتی تھی۔ اس کا مقصد برسر جنگ راجپوتوں اور مراٹھوں کے مقابلے پر مسلمانوں کو متحد کرنا تھا۔ اور غالباً یہ جزیہ ایک طرح سے دکن کی ان مسلم ریاستوں، خاص طور پر گول کنڈا کے خلاف بھی تھا جو کہ غیر مسلموں کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ جزیے کی وصولی ایماندار اور خداترس مسلمانوں کے ذریعے ہی کرائی جاتی تھی جو خاص طور پر اس کام کے لیے مامور کیے جاتے تھے اور ساری آمدنی علماء کے مصارف میں استعمال ہوتی تھی۔ گویا اس طرح اس رقم کو مذہبی رہنماؤں یعنی علماء کو جن میں سے بیشتر بے روزگار ہی ہوتے تھے ایک بڑی رشوت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بہر حال، جزیہ کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ تھے۔ ہندوؤں میں اس پر کافی برہمی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ کھلا ہوا امتیازی سلوک تھا۔ اس کی وصولی کا طریقہ بھی کچھ مخصوص قسم کا تھا۔ جزیہ والے کو یہ محصول ذاتی طور پر جمع کرانا پڑتا تھا اور بعض اوقات مذہبی رہنماؤں (علماء) کے ہاتھوں انہیں اہانت بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ دیہاتوں میں جزیہ کی وصولی چونکہ لگان کے ساتھ ہی کی جاتی تھی۔ اس لیے اس طریقہ کار سے شہری علاقوں کے متمول ہندو زیادہ متاثر تھے۔ اس لیے ہم ایسے کئی واقعات کے بارے میں سنتے ہیں جہاں شہری علاقوں کے ہندو تاجروں نے جزیہ کے خلاف کئی بار ہڑتالیں کیں۔ اس معاملے میں بدعنوانی بھی کافی ہوتی تھی۔ اور جزیہ وصول کرنے والے کئی امین تومار بھی ڈالے گئے۔ لیکن ان تمام باتوں سے بھی اورنگ زیب ہرگز متاثر نہیں ہوا اور کسانوں کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے سے انکار کر دیا جبکہ قدرتی آفات کے زمانے میں کسانوں کو لگان کی ادائیگی کے سلسلے میں رعایت دی جاتی تھی۔ آخر میں اس کو دکن میں جنگ کے دوران 1705 (جس کا اختتام نظر نہیں آرہا تھا) جزیہ کی وصولی کو روکنا پڑا تھا۔ لیکن اس کا یہ اقدام مراٹھوں کے ساتھ گفت وشنید کو متاثر نہیں کر سکا بلکہ رفتہ رفتہ یہ جزیہ پورے ملک میں ہی ختم ہوتا چلا گیا اور اسے 1712 میں باقاعدہ طور پر ختم کر دیا گیا۔

بعض جدید مورخین کا خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب کے ان اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو دار الحرب سے دار الاسلام میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اورنگ زیب غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کو جائز سمجھتا تھا لیکن ہندوؤں کو بڑے پیمانے پر اور جبریہ مسلمان بنانے کے شواہد نہیں ملتے۔ اسی طرح نہ ہی ہندو امراء کے خلاف بھی کوئی تفریقی سلوک کیا جاتا تھا۔ حال کے ایک مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے نصف آخر میں اعلیٰ مرتبے کے ہندو جاگیر داروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مراٹھوں کے بشمول ان کا تناسب ایک تہائی تک پہنچ گیا جبکہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں اعلیٰ طبقہ کے ہندو امراء کا تناسب ایک چوتھائی تھا۔ ایک دفعہ ایک ایسی درخواست پر جس میں کسی عہدے پر مذہبی بنیاد پر تقرر کی گذارش کی گئی تھی، اورنگ زیب نے یہ لکھا تھا کہ 'دنیاوی امور میں مذہب کا کیا کام اور مذہبی امور میں مذہبی جانبداری یعنی تعصب کا کیا واسطہ؟ تمہارا مذہب تمہارے لیے ہے اور میرا مذہب میرے لیے ہے۔ اگر تمہارے سمجھائے گئے قاعدے کو میں مان لوں تو ایسی صورت میں سبھی (ہندو) راجاؤں اور ان کے پیروکاروں کو ختم کر دینا مجھ پر فرض ہو جائے گا۔' اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ اورنگ زیب نے ریاست کی ہیئت کو بدل ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس نے بنیادی اسلامی عناصر پر یقیناً زور دیا۔ لیکن اورنگ زیب کے اپنے مذہبی عقائد کو اس کی سیاسی پالیسیوں کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے

کے ناطے اسلامی قوانین پر سختی سے عمل در آمد پر یقین رکھتا تھا، لیکن ایک حکمران (بادشاہ) کی حیثیت سے اورنگ زیب کی ساری دلچسپی اپنی سلطنت کی توسیع اور اس کے استحکام میں تھی۔ چنانچہ جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا وہ ہندوؤں کی تائید سے ہرگز محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ بارہا اس کے مذہبی اعتقادات و تصورات اور اس کی سیاسی اور عوامی پالیسیوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آئی اور اسے صحیح فیصلہ کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور جن سے سلطنت کو نقصان ہوا۔

8.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد ہم نے معلوم کیا کہ سترہویں صدی میں ہندوستان میں مغل سلطنت اورنگزیب کے عہد حکومت میں اپنے عروج پر پہنچی اور اس کے ساتھ ہی اتنی بڑی سلطنت کے سنبھالنے کے مسائل بھی ابھرنے لگے۔اس دور میں متعدد بغاوتیں جیسے جاٹ، راجپوت اور افغان اور مذہبی تحریکیں جیسے سکھ اور ست نامی وغیرہ ابھریں۔ کچھ مورخین نے ان بغاوتوں اور تحریکوں کے ابھرنے کے پیچھے اورنگزیب کو ذمے دار ٹھہرایا۔ان کے مطابق اورنگزیب نے غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا،ان پر جزیہ عاید کیا، مندروں کو تباہ کیا اور جبری تبدیلی مذہب کرائی۔ویسے اس طرح کے واقعات اورنگزیب کے دور میں پیش آئے جن سے تعصب جھلکتا تھا، مگر یہ اس کی کوئی مقررہ پالیسی نہیں تھی۔شرع پر عمل کو لے کر اس کی ہر کوشش ناکام ہی ہوئی جسے اس کے مسلمان عوام اور امراء نے ہی قبول نہیں کیا۔اس نے ہندوؤں کو بڑی تعداد میں منصب داری نظام میں داخل کیا اور یہاں تک کہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو بڑے صوبوں اور مہموں پر متعین کیا۔مندروں کو توڑنے کے حوالوں کے ساتھ ان کو دیے جانے والے عطیات کی بھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔غالباً جنگی حالت میں دشمن علاقے میں مندر توڑنے کے واقعات سامنے آئے تاکہ سامنے والے کو عاجز ثابت کیا جا سکے۔عام طور پر حالت امن میں مندر توڑے جانے کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔دوسری طرف متعدد افسران بھی اپنی طرف سے ایسی متعصبانہ کاروائیاں کرتے تھے جیسے وزیر خان نے سکھ گرو کا قتل کیا۔اورنگزیب کی طرف سے کسی ایسے حکم نامے کا تذکرہ نہیں ملتا۔پھر بھی یہ کاروائیاں شریعت کے خلاف تھیں اور شریعت کی آڑ لے کر کی گئیں جس کی بدترین مثال داراشکوہ کا قتل تھی۔اورنگزیب شریعت کا ذاتی زندگی میں پابند ضرور تھا لیکن اگر اسے اپنی سیاست کے لیے شرعی حد توڑنا پڑتی تو وہ دریغ نہیں کرتا تھا۔باپ کی زندگی میں تخت نشین ہونا اس کی صرف ایک مثال تھا۔تیرتھ یاترا محصول کا ذکر شریعت کی کسی کتاب میں نہیں تھا مگر اسے مغل خزانے کو بھرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔اسی طرح جزیہ کی ادائیگی صرف جمہور کے ذریعے منتخب شدہ خلیفہ کے ذریعے کی جا سکتی تھی جب کہ سلطنت کا ادارہ تو بذات خود شرع کے خلاف تھا تو ایک سلطان یا شہنشاہ کیسے جزیہ عائد کر سکتا تھا۔

اورنگزیب کی راجپوت پالیسی بھی اس کے خلاف پڑی کیونکہ اس سے اسے غیر ضروری راجپوت جھگڑوں میں الجھنا پڑا۔اس میں مذہبی عنصر تلاشنا بے وقوفی ہوگی کیونکہ راجپوتوں کی اصل ناراضگی کی وجہ مراٹھوں کو منصب داری نظام میں شامل کیا جانا تھا جو کہ ان کے مطابق کمتر درجے کے تھے۔اسی طرح دکن کی طویل مہمات سے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔دکنی ریاستوں کے خاتمے سے درمیانی حد فاصل (buffer zone) بھی ختم ہو گئی اور مغلوں کو مراٹھوں کے چھاپہ مار حملوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی دکنی افواج تو عادی تھیں مگر

مغلوں کی توپ بردار فوج کے لیے یہ بے حد خطرناک اور مہنگا ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں دکن میں مصروفیت نے شمال میں مغل انتظامیہ میں بد نظمی پیدا کردی تھی جس کے پیچھے اہم محرک مذہب نہ ہو کر اجارہ داری یا زمین کی مالگزاری ٹھیکے پر دینے کا رواج تھا۔ اکبر کے ضبطی نظام کی جگہ اجارہ داری پھیلنے سے کسانوں پر مالگزاری کا بوجھ کافی بڑھ گیا اور وہ بغاوت پر اتر آتے تھے۔ اس طرح اورنگزیب کے بعد کسی طاقتور مغل شہنشاہ کی غیر موجودگی اور امراء کی گروہ بندی سے سلطنت کا مرکزی ڈھانچہ ٹوٹنے لگا اور متعدد خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔

8.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

درمیانی حد فاصل : (Buffer Zone) وہ علاقہ جو دو ریاستوں کے درمیان پڑتا تھا۔

جزیہ : اسلامی مملکت میں غیر مسلموں سے ان کی جان مال کی حفاظت کے لیے لیا جانے والا محصول، اس کے عوض وہ فوجی خدمات سے آزاد تھے جو مسلمانوں پر ضروری تھی۔ ساتھ ہی برہمنوں، بوڑھوں، نادار اور کمزوروں سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔

اہوم : آسام میں رہنے والی ایک قوم

8.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جانشینی کی جنگ میں کسے فتح حاصل ہوئی؟
2. ساموگڑھ کی جنگ کب ہوئی؟
3. اورنگ زیب نے کسے سلطنت کی خاتون اول کا درجہ دیا؟
4. اہوم کون تھے؟
5. جاٹ کون تھے؟
6. 1685 میں کس کی قیادت میں جاتوں نے بغاوت کی؟
7. جزیہ سے کیا مراد ہے؟
8. کس کی قیادت میں راجپوتوں نے اورنگزیب کے فیصلے کی مخالفت کی؟
9. شہزادہ اکبر نے کس کے ساتھ مل کر اجمیر پر حملہ کیا؟
10. اورنگ زیب کی وفات کب ہوئی؟

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اورنگزیب کی حکومت کے آغاز میں شمالی ہندوستان کے حالات بیان کیجیے۔
2. جاٹ اورست نامی بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
3. افغان بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
4. سکھ بغاوت پر نوٹ لکھیے۔
5. اورنگزیب اور شواجی کے بعد مراٹھوں سے جنگوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جانشینی کی جنگ پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. اورنگزیب کی مذہبی پالیسی کے حوالے سے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔
3. اورنگزیب کی دکن مہمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Athar Ali, M., *The Mughal Nobility under Aurangzeb*, Oxford University Press, New Delhi, 2001.
2. Azizuddin Husain, S. M., *Structure of Politics Under Aurangzeb*, *1658– 1707*, Kanishka Publishers Distributors, New Delhi, 2002.
3. Eaton, Richard Maxwell, *India in the Persianate Age 1000-1765*, University of California Press, California, 2019.
4. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne*: *The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
5. Gascoigne, Bamber, *A Brief History of the Great Mughals*, *India's Most Flamboyant Rulers*, Robinson, London, 2002.
6. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
7. Sarkar, Jadunath. *A Short History of Aurangzib*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2009.
8. Truschke, Audrey, *Aurangzeb*: *The Man and the Myth*, Penguin Books, New Delhi, 2018.

اکائی 9۔ بعد کے مغل حکمران

(Later Mughals)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 بہادر شاہ

9.2.1 سکھوں کے خلاف مہم

9.3 جہاندار شاہ

9.3.1 ذوالفقار خان کا عروج

9.4 فرخ سیر

9.4.1 سید برادران

9.4.2 جاٹوں اور سکھوں کے خلاف مہم

9.5 رفیع الدرجات

9.6 شاہجہاں ثانی

9.7 محمد شاہ

9.7.1 نادر شاہ

9.7.2 ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ

9.8 احمد شاہ

9.9 عالمگیر ثانی

9.9.1 احمد شاہ ابدالی سے تعلقات

9.9.2 مراٹھوں کا دہلی پر قبضہ

9.9.3 دیگر ریاستوں سے تعلقات

9.10 شاہجہاں ثالث
9.11 شاہ عالم ثانی
9.11.1 پانی پت کی تیسری جنگ
9.11.2 بکسر کی جنگ اور مغل شہنشاہ کی انگریزوں کی ماتحتی
9.11.3 انگریزوں کا دہلی پر قبضہ
9.12 اکبر شاہ ثانی
9.13 بہادر شاہ ظفر
9.14 اکتسابی نتائج
9.15 کلیدی الفاظ
9.16 نمونہ امتحانی سوالات
9.16.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.16.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

عظیم مغلیہ سلطنت جو تقریباً پوری دو صدیوں تک اپنی ہمعصر سلطنتوں کے لیے بارش رشک رہی تھی، اٹھارویں صدی کے نصف اول میں انتشار کا شکار ہو کر زوال پذیر ہو گئی۔ اورنگ زیب کے مضبوط اور طویل عہد حکومت میں سلطنت کے اتحاد و استحکام کی جڑیں اگرچہ ہل گئی تھیں تاہم کئی طرح کے زرعی اور معاشی بحران اور مسلسل بغاوتوں کے باوجود اس کے انتقال کے وقت 1707ء میں مغل نظم و نسق خاصہ موثر تھا اور مغل فوج بھی کافی طاقتور تھی۔ مزید برآں خاندان مغلیہ کو اس وقت بھی ملک میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بعد کے مغل حکمراں اس عظیم سلطنت کی حفاظت نہیں کر سکے اور امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئے۔ وہ اپنی طاقت و عظمت کھو بیٹھے اور ان کی سلطنت سمٹ کر دہلی کے آس پاس کے چند مربع میل علاقہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ امرا بھی بیرونی حملوں اور اندرونی خطروں کے باوجود متحد نہ ہو سکے۔ انگریزوں کے ذریعے بنگال اور جنوبی ہند پر قبضے کا سن کر بھی یہ لوگ کوئی متحدہ محاذ نہ بنا سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک غیر ملکی طاقت نے سب کو شکست دے ملک پر اپنا اقتدار قائم کر دیا۔ بالآخر 1803 میں خود دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا اور عظیم مغل شہنشاہ ایک غیر ملکی

حکومت کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری اور رسمی بادشاہ بہادر شاہ کو پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جلاوطن کر دیا گیا۔ یوں مغل سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس عظیم سلطنت کے زوال کے عمل کی داستان کا مطالعہ عبرت انگیز ہے۔ اس سے عہد وسطی کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی ڈھانچے کی وہ خامیاں اور کمزوریاں منکشف ہوتی ہیں جن کے باعث بالآخر ملک انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اقتدار آ گیا۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اورنگزیب کے جانشینوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جانشینی کی جنگوں کے ذریعے اقتدار کی امراء کے پاس منتقلی کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سکھوں، مراٹھوں اور انگریزوں کے عروج سے واقف ہو سکیں گے۔
- مغل سلطنت کے زوال میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے کردار کا معائنہ کر سکیں گے۔
- پہلی جنگ آزادی اور مغل سلطنت کے مکمل خاتمے سے واقف ہو سکیں گے۔

9.2 بہادر شاہ (Bahadur Shah,1707–12)

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹوں اس کے تین بیٹوں معظم (کابل کے گورنر)، محمد کام بخش (دکن کے گورنر) اور محمد اعظم شاہ (گجرات کے گورنر) میں تخت و تاج کے لیے جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں 65 سالہ معظم کامیاب ہوا اور بہادر شاہ کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ وہ صاحب علم، ذی وقار اور باصلاحیت تھا۔ اس نے مصالحت اور صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی اور اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے اورنگزیب کی اختیار کردہ بعض پالیسیوں سے انحراف کیا۔ ہندو سرداروں اور راجاؤں کے ساتھ اس نے زیادہ رواداری کی روش اختیار کی۔ اس کے عہد حکومت میں کوئی مندر ڈھایا نہیں گیا۔ ابتدا میں اس نے امبر (جے پور) اور مارواڑ (جودھپور) کی راجپوت ریاستوں کو زیادہ قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ امبر میں جے سنگھ کی جگہ پر اس کے چھوٹے بھائی وجے سنگھ کا تقرر کیا اور مارواڑ کے اجیت سنگھ کو مغل اقتدار کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے امبر اور مارواڑ کے شہروں میں فوجیں تعینات کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کی سخت سے مزاحمت کی گئی۔ اپنی غلطی کا اس کو شاید احساس ہو گیا کیونکہ جلد ہی اس نے ان ریاستوں کے ساتھ مصالحت کر لی۔ اگرچہ یہ مصالحت زیادہ معقول نہیں تھی کیونکہ جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو اگرچہ ان کی ریاستیں بحال کر دی گئیں تاہم ان کا اعلیٰ منصبوں کا اور گجرات و مالوہ جیسے اہم صوبوں کی صوبیداری کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا۔ مراٹھا سرداروں کے ساتھ بھی اس نے بے دلی کے ساتھ صلح جوئی کی روش اختیار کی۔ اس نے دکن کی سردیش مکھی تو انہیں دے دی مگر چوتھ نہ دے کر انہیں مکمل طور پر مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ شاہو کو بھی جائز مراٹھا حکمران تسلیم نہ کر کے اس نے شاہو اور تارا بائی کو مراٹھا سلطنت کے حصول کے لیے لڑنے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہو اور مراٹھا سردار غیر مطمئن رہے اور دکن

انتشار کا شکار ہوتا رہا۔ جب تک مراٹھا سردار آپس میں نیز مغلوں کے خلاف برسرپیکار رہے اس وقت تک دکن میں امن وامان بحال نہ ہو سکا۔

9.2.1 سکھوں کے خلاف مہم (Campaign against the Sikhs)

بہادر شاہ نے گرو گوبند سنگھ سے مصالحت کر کے اور اس کو اعلیٰ منصب دے کر بغاوت پر آمادہ سکھوں کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن گرو کی وفات کے بعد پنجاب میں سکھوں نے بندہ بہادر کی قیادت میں جب دوبارہ علم بغاوت بلند کیا تو شہنشاہ نے سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا اور باغیوں کے خلاف مہم کی بنفس نفیس قیادت کی۔ اس کے باوجود جلد ہی ستلج اور جمنا کے تقریباً پورے علاقے پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ دہلی کے قریب تک پہنچ گئے۔ حالانکہ بہادر شاہ نے گرو گوبند سنگھ کے تعمیر کردہ قلعہ پر قبضہ کر لیا جو انبالہ سے شمال مشرق میں ہمالیہ کے دامن میں واقع تھا اور سکھوں کے دوسرے قلعوں پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا، تاہم سکھوں کو کچلا نہ جا سکا اور انہوں نے بہادر شاہ کے مرتے ہی 1712ء میں لاہور کا قلعہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ بہادر شاہ نے بندیلا سردار چھترسال کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو اس کا وفادار باج گزار رہا اور جاٹ سردار چوڑامن کو بھی بہادر شاہ نے اپنا حلیف بنا لیا تھا جس نے بندہ بہادر کے خلاف مہم میں اس کا ساتھ دیا۔

بہادر شاہ کے عہد حکومت میں نظم و نسق کی حالت زیادہ ابتر ہوگئی۔ بے تحاشا جاگیریں عطا کرنے اور ترقیاں دینے کے نتیجے میں ریاست کی مالی حالت کمزور ہوئی۔ شاہی خزانہ جس میں 1707ء میں کوئی 13 کروڑ روپے تھے اس کے عہد میں خالی ہو گیا۔ سلطنت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی سمت بہادر شاہ نے قدم بڑھایا تھا۔ اگر اس کو کچھ اور موقع ملتا تو سلطنت کی قسمت کو شاید وہ پلٹ دیتا۔ لیکن 1712ء میں اس کی وفات نے بدقسمتی سے سلطنت کو ایک بار پھر خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ اسے خافی خان جیسے مغل مورخین نے 'شاہ بے خبر' کا خطاب دیا تھا۔

9.3 جہاندار شاہ (Jahandar Shah, 1712–13)

9.3.1 ذوالفقار خان کا عروج (Rise of Zulfiqar Khan)

جانشینی کی اس جنگ نے نیز اس کے بعد ہونے والی جنگوں نے مغل سیاست میں ایک نئے عنصر کو داخل کر دیا۔ سابق میں اقتدار کے لیے مقابلہ شاہزادوں میں ہوتا تھا اور امراء امیدوار شاہزادوں کی حمایت کیا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ امراء اقتدار کے براہ راست دعویدار بن جاتے اور اس کے حصول کے لیے شہزادوں کو مہرے کے طور پر استعمال کرتے۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد جانشینی کی جنگ میں اس کے ایک کم باصلاحیت بیٹے جہاں دار شاہ کو کامیابی ہوئی جسے اس عہد کے سب سے طاقتور امیر ذوالفقار خان کی حمایت حاصل تھی۔ جہاں دار شاہ ایک نہایت کمزور اور بدکردار شہزادہ تھا جسے صرف عیش و عشرت سے غرض تھی۔ اس میں خوش اطواری اور وقار کا فقدان تھا اور شائستگی سے بھی وہ محروم تھا۔ جہاں دار شاہ کے عہد حکومت میں کاروبار سلطنت عملاً ایک انتہائی باصلاحیت اور ہوش مند شخص ذوالفقار خان کے ہاتھ میں تھا جو اس کا وزیر بن گیا تھا۔ ذوالفقار خان کو یقین تھا کہ دربار میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور سلطنت کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ راجپوت راجاؤں اور مراٹھا سرداروں کی دل جوئی کی جائے اور باغی سرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں چنانچہ

باغی سرداروں اور ریاستوں کو منانے کی کوشش شروع کی گئی۔ جزیہ کی رسم ختم کی گئی۔امبر کے راجہ جے سنگھ کو مرزاراجہ سوائی کا خطاب عطا کیا گیا۔مارواڑ کے راجہ اجیت سنگھ کو مہاراجہ کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ذوالفقار خان نے ان سابقہ نجی سمجھوتوں کی بھی توثیق کر دی جو اس کے نائب داؤد خان پٹی نے مراٹھا حکمران شاہو سے 1711ء میں کیے تھے۔اس سمجھوتے میں یہ طے پایا تھا کہ مراٹھا حکمرانوں کو چوتھ اور سردیش مکھی اس شرط پر دی جائے گی کہ یہ رقم مغل افسران وصول کر کے مراٹھا حکام کے حوالے کریں گے۔

ذوالفقار خان نے چوڑامن جاٹ اور چھتر سال بندیلا سے بھی مصالحت جاری رکھی۔ صرف بندہ بہادر اور سکھوں کو دبائے رکھنے کی پالیسی پر وہ قائم رہا۔ذوالفقار خان نے جاگیروں اور منصبوں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافے کو روک کر سلطنت کی مالی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ منصبداروں کو مقررہ تعداد میں فوج رکھنے پر بھی اس نے مجبور کیا لیکن مالگزاری کی وصولیابی کے سلسلے میں اس نے 'اجارہ' (revenue farming) کی بری رسم کو بڑھاوا دیا۔یعنی اب مالگزاری مقررہ شرح پر وصول نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ ٹوڈر مل کے بندوبست مالگزاری کے تحت ہوتا تھا، بلکہ حکومت بچولیوں، ساہوکاروں اور زمینداروں سے معاہدے کرتی تھی جو حکومت کو تو ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے مگر کسانوں سے من مانی محصولات وصول کرنے کے لیے آزاد تھے۔اس سے کسانوں کے بوجھ میں مزید اضافہ ہوا۔ذوالفقار خان کی ترقی دیکھ کر حاسد امراء نے اس کے خلاف خفیہ سازشیں شروع کر دیں۔اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ شہنشاہ نے نہ تو اس پر اعتماد کیا اور نہ اس کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ بعض مقرب درباریوں نے ذوالفقار خان کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرے اور اسے یقین دلایا کہ اس کا وزیر بہت زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا ہے اور اس کے حوصلے بہت بڑھ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک دن وہ خود بادشاہ بن بیٹھے۔ بزدل شہنشاہ میں وزیر کو برخاست کر دینے کی تو ہمت تھی نہیں اس لیے اس کے خلاف خفیہ سازشیوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ایک عمدہ نظم نسق کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہاندار شاہ کے عہد حکومت میں اس کی پسندیدہ خاتون، لال کنور (ایک رقاصہ) دربار پر حاوی تھی اور سبھی سیاسی معاملات میں مداخلت کرتی تھی۔ جہاں دار شاہ کے ناکارہ دور حکومت کا جلد ہی خاتمہ ہو گیا اور جنوری 1713 میں اس کے بھتیجے فرخ سیر نے آگرہ میں اسے شکست دی۔

9.4 فرخ سیر (Farrukhsiyar, 1713–1719)

9.4.1 سید برادران (Syed brothers)

فرخ سیر نے اپنے چچا جہاندار شاہ کو آگرہ میں 1713ء میں شکست دی۔ فرخ سیر کی یہ کامیابی بارہا کے سید برادران، عبداللہ خان اور حسین علی خان کی مرہون منت تھی۔ سید برادران نے ذوالفقار خان کو قتل کر کے خود کو اہم عہدوں پر تعینات کر دیا۔ چنانچہ یہ دونوں بالترتیب وزیر اور میر بخشی بن گئے۔ جلد ہی ان دونوں بھائیوں نے حکومت کے تمام معاملات اپنی پکڑ پوری طرح مضبوط کر لی۔ سید برادران نے مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ہم آہنگی کے ساتھ حکومت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کاروبار سلطنت میں مسلم امراء کے ساتھ ہندو سرداروں اور امراء کو بھی شامل کیا جائے۔ فرخ سیر اور حریف امراء کے خلاف جدوجہد میں بھی انہوں نے

مراٹھوں، راجپوتوں اور جاٹوں کو اپنانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی۔فرخ سیر کے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی انہوں نے جزیہ ختم کر دیا۔اسی طرح بہت سے مقامات پر تیر تھ ٹیکس بھی معاف کر دیا گیا۔ماروا ڑ کے اجیت سنگھ، امبر کے جے سنگھ اور بہت سے دوسرے راجپوت راجاؤں کو بھی اعلیٰ منصب دے کر انہوں نے اپنا طرفدار بنالیا۔جاٹ سردار چوڑا من سے بھی انہوں نے اتحاد کر لیا۔اپنے اقتدار کے آخری برسوں میں انہوں نے مراٹھا حکمران چھترپتی شاہو سے بھی معاہدہ کر لیا، جس کے مطابق اسے سوراجیہ (جو شیواجی کا مطالبہ تھا) ملا اور دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوا۔اس کے معاوضہ میں شاہو نے دکن میں مغلوں کی امداد کے لیے پندرہ ہزار سواروں کا رسالہ دینے کا وعدہ کیا۔سید برادران نے بغاوتوں کو کچلنے اور سلطنت کو انتظامی انتشار سے بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس کام میں وہ صرف اس لیے ناکام رہے کیونکہ انہیں سیاسی رقابتوں، جھگڑوں اور دربار کی سازشوں کا مسلسل سامنا کرنا پڑا۔حکمران حلقوں کے باہمی تصادم نے نظم ونسق کو درہم برہم ہی نہیں بلکہ مفلوج کر دیا تھا۔ہر طرف نراج اور بدنظمی کا دور دورہ تھا۔سلطنت کی مالی حالت تیزی سے گرنے لگی کیونکہ زمیندار اور باغی عناصر نے مالگزاری ادا کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔سرکاری اہلکار سرکاری آمدنی کو خورد برد کر رہے تھے اور مالگزاری کی اجارہ داری کی وجہ سے مرکزی آمدنی کم ہو گئی تھی۔ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسروں اور سپاہیوں کو جو کہ وقت پر تنخواہیں نہیں ملتی تھی اس لیے ان میں بھی بدنظمی پھیلی بلکہ وہ باغی بھی ہو گئے۔

مشہور مورخ ولیم ارون (William Irvine) کے مطابق، فرخ سیر کے قریبی ساتھیوں میر جملہ سوم اور خان دوراں نے اس کے ذہن میں شک کے بیج بوئے کہ شاید سید برادران اسے تخت سے معزول کر دیں۔اس پیش رفت کا علم ہونے پر، حسین علی خان نے عبداللہ کو لکھا: "شہزادے کے الفاظ اور اس کے اعمال کی نوعیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس نے انجام دی گئی خدمات پر کوئی توجہ نہیں دی۔بے ایمان اور مکمل بے شرمی کے ساتھ اپنے الفاظ سے پھر جانے والا ہے۔" حسین علی خان نے نئے شہنشاہ کے منصوبوں سے بے پرواہ اپنے مفادات میں کام کرنا ضروری محسوس کیا۔فرخ سیر ان کا سامنا نہ کر سکا، کیونکہ سید برادران نے فوج کے مضبوط ترین حصے پر اپنا قبضہ برقرار رکھا، اور اس طرح وہی سلطنت کے اصل حکمران بن گئے۔سید برادران نے جزیہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور متعدد مقامات پر حج ٹیکس بھی ختم کر دیا۔فرخ سیر خود بھی حکومت چلانے کی اہلیت سے عاری تھا۔وہ بزدل، ظالم، ناقابل اعتبار اور بے وفا تھا۔مزید برآں نکمے درباریوں اور خوشامدیوں نے اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود فرخ سیر سید برادران کو مختار کل بنانے پر آمادہ نہیں تھا اور خود اپنے اختیارات کو کام میں لانا چاہتا تھا۔دوسری طرف سید برادران کو یقین تھا کہ نظم ونسق کو معقول طور پر چلانے اور سلطنت کے زوال کو روکنے نیز خود ان کی حیثیت کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ طاقت کا سرچشمہ ان کے ہاتھوں میں ہو اور شہنشاہ صرف برائے نام بادشاہت کرے۔چنانچہ شہنشاہ فرخ سیر اور اس کے وزیر اور میر بخشی میں اقتدار کے لیے طویل کشمکش کا آغاز ہو گیا۔احسان ناشناس شہنشاہ سالوں تک دونوں بھائیوں کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں کرتا رہا۔لیکن اسے مکمل ناکامی حاصل ہوئی۔

9.4.2 جاٹوں اور سکھوں کے خلاف مہم (Campaign against Jats and Sikhs)

اورنگ زیب کی 25 سالہ دکنی مہم کی وجہ سے، شمالی ہندوستان میں مغل اقتدار، مقامی حکمرانوں کے عروج کے ساتھ کمزور پڑ گیا۔

صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جاٹوں نے پیش قدمی کی۔ 1713 کے اوائل میں فرخ سیر نے آگرہ کے صوبیدار چھبیلا رام کو جاٹ رہنما چورامن کو شکست دینے کے لیے بھیجا جو کہ ناکام رہا۔اس کے بعد بھیجے گئے مغل سالار صمصام الدولہ خان نے چورامن کو مغل بادشاہ سے مذاکرات کرنے کے لیے مجبور کر دیا اور راٹھور راجا بہادر ان کے ساتھ مغل دربار میں گیا۔فرخ سیر کے ساتھ ہونے والے یہ مذاکرات ناکام ثابت ہوئے۔ ستمبر 1716 میں، راجہ جے سنگھ دوم نے چورامن کے خلاف ایک مہم شروع کی جو تھون (موجودہ راجستھان) میں رہتا تھا۔ 19 نومبر سے جے سنگھ دوم نے تھون قلعے کا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔ دسمبر میں چورامن کے بیٹے، محکم سنگھ نے قلعہ سے باہر نکل کر دھاوا بولا اور جے سنگھ سے لڑا جس میں محکم سنگھ نے فتح پانے کا دعویٰ کیا۔ مغلوں کے پاس گولہ بارود ختم ہونے پر سید مظفر خان کو آگرہ کے اسلحہ خانے سے بارود، راکٹ اور سیسے کے ذخیرے لانے کا حکم دیا گیا۔ جنوری 1718 تک، محاصرہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ 1717 کے آخر میں بارشیں شروع ہونے سے اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں اور راجہ جے سنگھ کو محاصرہ جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔اس نے کمک کے لیے فرخ سیر کو لکھا، اور کہا کہ اس نے جاٹوں کے ساتھ کئی مقابلوں میں پر فتح حاصل کی ہے۔ یہ پیغام فرخ سیر کو متاثر کرنے میں ناکام رہا، چنانچہ جے سنگھ نے سید عبداللہ کو اطلاع دی کہ اگر وہ شہنشاہ کے روبرو اس کا موقف پیش کریں تو وہ تیس لاکھ روپے حکومت کو اور بیس لاکھ روپے وزیر کو ادا کریں گے۔ سید عبداللہ اور فرخ سیر کے درمیان بات چیت کامیاب رہی اور اس کے بعد جے سنگھ کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ کمک کے طور پر سید خان جہاں کو بھیجا گیا۔ محاصرے کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے راجہ جے سنگھ دوم کو ایک فرمان (شاہی حکم نامہ) بھی دیا۔ خان جہاں کے پہنچنے سے چورامن کی حالت خراب ہو گئی اور وہ صلح کی گذارش کرنے لگا۔ چنانچہ 19 اپریل 1718 کو چورامن کو فرخ سیر کے سامنے پیش کیا گیا۔اس نے صلح کی درخواست کی اور مغلوں کی حکومت کو قبول کر لیا۔ خان جہاں کو بہادر کا خطاب دیا گیا۔ یہ طے پایا کہ چورامن، سید عبداللہ کے ذریعے فرخ سیر کو پچاس لاکھ روپے نقد اور جنس کی ادائیگی کرے گا۔

بندہ سنگھ بہادر ایک سکھ رہنما تھا جس نے تقریباً 1710ء میں پنجاب کے علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول اور جہاندر شاہ اس بغاوت پوری طرح دبانے میں ناکام رہے۔ 1714 میں سرہند کے فوجدار زین الدین احمد خان نے روپڑ کے قریب سکھوں پر حملہ کیا۔ علاوہ ازیں 1715 میں فرخ سیر نے بہادر کو شکست دینے کے لیے قمر الدین خان، عبدالصمد خان اور زکریا خان بہادر کی قیادت میں 20,000 سپاہی بھیجے۔ گورداسپور میں آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد، گولہ بارود ختم ہونے کی وجہ سے بندہ بہادر نے ہتھیار ڈال دیے۔ بہادر اور اس کے 200 ساتھیوں کو گرفتار کر کے سرہند شہر کے چاروں طرف نمائش کی گئی اور اس کے بعد انہیں دہلی لایا گیا۔ دہلی میں ان سب کو پھانسی کا حکم دیا گیا۔ شاہ عنایت سندھ کے غریب کسانوں کے رہنما تھے جنھوں نے سندھ کے زمینداروں کے خلاف ایک فیصلہ کن تحریک کی قیادت کی اور غریب کسانوں اور جوت داروں میں زمین کی دوبارہ تقسیم کی۔اسے اٹھارویں صدی کے اوائل میں شہنشاہ فرخ سیر کے حکم پر پھانسی دے دی گئی۔ 1717 میں، فرخ سیر نے ایک فرمان جاری کیا جس نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں رہنے اور تجارت کرنے کا حق دیا۔ انہیں 3000 روپے کی سالانہ ادائیگی کے علاوہ آزادانہ تجارت کرنے کی اجازت تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ کمپنی سے وابستہ ایک ماہر ڈاکٹر ولیم ہیملٹن نے فرخ سیر کو ایک بیماری سے ٹھیک کیا تھا۔اس فرمان نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو صوبہ بنگال میں بنا

محصول دیے تجارت کرنے کی اجازت دی۔ انہیں دستک (پاس) دیے گئے، جن کا کمپنی کے ملازمین نے غلط استعمال کیا۔ انہوں نے دستک کو اپنی ذاتی تجارت کے لیے استعمال کیا جس سے بنگال کے نواب علی وردی خان کو شکایت ہونے لگی کیونکہ مقامی تاجران سے تجارتی مقابلے میں پچھڑنے لگے۔ آگے چل کر یہی دستک انگریزوں اور بنگال کے نوابوں کے درمیان اختلاف کی جڑ بنا۔

1715 تک، فرخ سیر نے میر جملہ سوم کو اپنی طرف سے دستاویزات پر دستخط کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ میر جملہ سوم نے وزیر اعظم سید عبداللہ سے مشورہ کیے بغیر جاگیروں اور منصبوں کی تقسیم شروع کر دی۔ سید عبداللہ کے نائب رتن چند نے بھی رشوت لے کر اس کے لیے فائدے کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ رتن چند بذات خود زمینوں کو اجارے پر دینے کے معاملے میں ملوث تھا، جسے مغل بادشاہ نے سختی سے ممنوع قرار دیا تھا۔ صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، میر جملہ سوم نے فرخ سیر کو بتایا کہ سید برادران عہدے پر برقرار رہنے کے لائق نہیں ہیں اور شاہی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ سید بھائیوں کو معزول کرنے کے مقصد سے، فرخ سیر نے فوجی تیاریاں شروع کیں اور میر جملہ سوم اور خان دوراں کے ماتحت فوجیوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ فرخ سیر کے منصوبوں سے آگاہ ہونے کے بعد سید برادران نے محسوس کیا کہ ہم صوبوں کو کنٹرول کر کے اپنی حیثیت مضبوط کی جا سکتی ہے۔ اس نے شہنشاہ سے خود کو نظام الملک کی بجائے دکن کا وائسرائے مقرر کرنے کے لیے کہا جسے فرخ سیر نے مسترد کر دیا اور دکن کی طرف اس کا تبادلہ کر دیا۔ فرخ سیر کے حامیوں کے حملے کے خوف سے دونوں بھائیوں نے فوجی تیاری شروع کر دی۔ اگرچہ فرخ سیر نے ابتدائی طور پر محمد امین خان کو سید برادران کی طاقت کو کچلنے کا کام دینے پر غور کیا، جو بدلے میں وزیر اعظم کا عہدہ چاہتا تھا، لیکن بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کہیں امین خان ہی اس کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔ دکن پہنچ کر سید حسین نے فروری 1718 میں مراٹھا حکمران شاہو اول کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ شاہو کو دکن میں سردیش مکھی جمع کرنے کی اجازت دی گئی اور برار اور گونڈوانہ کی زمینیں اس کے حوالے کر دی گئیں۔ اس کے بدلے میں شاہو نے دس لاکھ روپے سالانہ دینے اور سیدوں کے لیے 15000 گھوڑوں کی فوج رکھنے پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ معاہدہ فرخ سیر کی منظوری کے بغیر کیا گیا تھا۔ جب اسے اس معاہدے کا علم ہوا تو وہ غصے میں آگ بگولہ ہو گیا: 'ایک شریر دشمن کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ محصولات اور حکومت کے معاملات میں بڑا شراکت دار ہو۔' اس نے سید برادران کے مکمل استیصال کا بیڑا اٹھایا۔ بالآخر اجیت سنگھ اور مراٹھوں کی مدد سے، فرخ سیر کو 1719 میں سید برادران نے اندھا کر کے قید میں ڈال دیا جہاں بعد میں اسے پھانسی دے دی تھی۔ اس کی موت کے بعد، اجیت سنگھ نے اپنی بیوہ بیٹی کو جو فرخ سیر کے نکاح میں تھی، اس کے جہیز سمیت واپس لے لیا اور جودھ پور واپس چلا گیا۔

9.5 رفیع الدرجات (Rafi ud-Darajat, 1719)

جیسا کہ سابقہ شہنشاہ فرخ سیر کو سید برادران نے معزول کر دیا تھا، رفیع الدرجات بھی اپنے تخت کے لیے سید برادران کا مقروض تھا، جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ اسے کٹھ پتلی حکمران رکھنا چاہتے تھے اور اس لیے اس کی طاقت کو کم کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ رفیع الدرجات کا دور ہنگامہ خیز تھا۔ 18 مئی 1719 کو، اس کی تخت نشینی کے صرف تین مہینے بعد، رفیع الدرجات کے چچا، نیکو سیر نے ایک

ناگر برہمن متر سین کی حمایت سے آگرہ میں اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس عہدے کے لیے زیادہ اہل ہے۔ سید برادران اپنے کٹھ پتلی شہنشاہ کے اقتدار کے استحکام اور اس کے باغیوں کو سزا دینے کے لیے انتہائی پر عزم تھے۔ وہ تیزی سے آگرہ کی طرف بڑھے۔ نیکو سیر کی تاج پوشی کے صرف تین مہینے بعد، قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور نیکوسیار کو اسیر بنالیا گیا۔ امیر الامرا نے اس کا پر تپاک استقبال کیا اور اسے تاحیات سلیم گڑھ قلعے میں قید کر دیا گیا، جہاں 1723 میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے پہلے رفیع الدرجات نے درخواست کی کہ اس کے بڑے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ اس کے وصیت کے مطابق 6 جون 1719 کو 3 ماہ اور چھ دن کی حکومت کے بعد اس نے تخت سے گوشہ نشینی اختیار کی۔ دو دن بعد اس کے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ رفیع الدرجات کا انتقال تپ دق سے ہوا یا 6 جون 1719 کو اسے آگرہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے جنازے کو دہلی کے مہرولی میں چشتی صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے قریب دفن کیا گیا۔ اس کے بعد سید برادران نے رفیع الدولہ کو مغل تخت پر بٹھایا۔

9.6 شاہجہاں ثانی (Shahjahan–II, 1719)

رفیع الدولہ کا لقب شاہ جہاں ثانی تھا۔ اس نے بہت کم مدت تک حکومت کی اور تپ دق کی وجہ سے انتقال کر گیا۔ محمد ہادی کامور خان نے دعویٰ کیا کہ شاہ جہاں ثانی کو سید برادران نے زہر دیا تھا، لیکن مورخ ولیم اروِن اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہنشاہ کو زیادہ افیون کھانے کی وجہ سے یہ عارضہ ہوا تھا۔ دراصل کامور خان اس لیے مضطرب ہو گیا کیونکہ رفیع الدولہ کی موت کی وجہ سے اس کی ترقی کے امکانات ختم ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سید برادران کو شہنشاہ کی موت سے کچھ ملنے والا نہیں تھا۔

9.7 محمد شاہ (Muhammad Shah, 1719–1748)

اب سید برادران نے ایک 18 سالہ نوجوان محمد شاہ کو مغل تخت پر بٹھایا۔ فرخ سیر کے مندرجہ بالا تینوں جانشین سید برادران کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کی نقل و حرکت کی شخصی آزادی پر بھی پابندی عائد تھی۔ اس طرح سید برادران 1713ء سے 1720ء تک، جب ان کا تختہ الٹا گیا، سلطنت کے نظم و نسق پر چھائے رہے۔ سید برادران نے اگرچہ امراء کے ہر طبقے سے مفاہمت کرنے اور ان کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر نظام الملک اور اس کے والد کے ایک چچازاد بھائی محمد امین خان کی قیادت میں امراء کے ایک طاقتور گروہ نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ یہ امراء سید برادران کی روز افزوں طاقت سے جلتے تھے۔ فرخ سیر کی معزولی اور قتل نے بھی بہت سے امراء کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ جب شہنشاہ کو قتل کیا جا سکتا ہے تو امراء کی زندگی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کے قتل سے عوام میں بھی دونوں بھائیوں کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ انہیں غدار سمجھ کر حقارت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا اور نمک حرام سمجھا جانے لگا۔ اورنگزیب کے عہد کے بہت سے امراء نے راجپوت اور مراٹھا سرداروں کے ساتھ سید برادران کے اتحاد کو اور ہندوؤں کے ساتھ نرمی اور رواداری کے برتاؤ کو بھی پسند نہیں کیا تھا۔ ان امراء نے اعلان کیا کہ سید برادران کی روش مغل دشمن اور اسلام دشمن ہے۔ اس طرح سے انہوں نے امراء کے متعصب طبقے کے جذبات برانگیختہ کرنے کی کوشش

کی۔ان امراء کو محمد شاہ کی حمایت بھی حاصل تھی جو سید برادران کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کا متمنی تھا۔1720ء میں ان امراء نے حسین علی خان کو قتل کر دیا جو دونوں بھائیوں میں چھوٹا تھا۔عبداللہ خان نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے جنگ کی مگر آگرہ کے قریب اسے شکست ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مغل سلطنت سے ہندوستان کی تاریخ میں بادشاہ گر کہے جانے والے سید برادران کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد شاہ کا تقریبا تیس سالہ طویل دور حکومت 1719تا1748ء سلطنت کو بچانے کا آخری موقع تھا۔1707تا1720ء کے دور کی طرح اس زمانے میں جلد جلد شاہی اقتدار میں تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں۔ محمد شاہ کا دور حکومت جب شروع ہوا تو اس وقت عوام کی نظروں میں مغلوں کا وقار ابھی تک قائم تھا۔اس وقت بھی مغل فوج خصوصاً مغل توپ خانے کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شمالی ہند میں نظم و نسق کی حالت ابتر ضرور ہوگئی تھی لیکن وہ درہم برہم نہیں ہوا تھا۔ مراٹھا سرداروں کا اقتدار دکن ہی تک محدود تھا اور راجپوت راجگان اب بھی مغل خاندان کے وفادار تھے۔ایک قوی اور دانشمند حکمران جسے ہوشمند امراء کی حمایت حاصل ہوتی وہ اب بھی حالات کو سدھار سکتا تھا۔ لیکن محمد شاہ وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل نہیں تھا۔ وہ ضعیف الارادہ، سبک سر، عیش پسند اور عشرت و آرام کی زندگی کا دلدادہ تھا۔ سلطنت کے کام کاج کو اس نے نظر انداز کیا۔ نظام الملک جیسے لائق وزراء کے ساتھ تعاون کرنے کی جگہ پر رشوت خور اور نالائق خوشامدیوں کے زیر اثر اس نے خود اپنے وزراء کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اس کے مقرب رشوت خور درباری جو رشوت لیتے تھے ان میں وہ بھی حصہ لگاتا تھا۔1721ء میں میر قمرالدین خان، یا چین قلیچ خان کو جو نظام الملک آصف جاہ کے نام سے مشہور ہوا، وزیر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ وہ اس دور کا سب سے طاقتور اور ذی اثر امیر تھا۔ اس نے نظم و نسق کو درست کرنے کی زبردست کوشش کی اور شاہی خزانے کی بے جا بربادی پر روک لگائی۔ حالانکہ متلون اور شکی مزاج شہنشاہ سے نیز دربار کے پیہم جھگڑوں سے تنگ آکر اس نے عہدہ وزارت سے استعفی دے کر خود اپنے حوصلوں کی تکمیل کا فیصلہ کیا۔ مغل شہنشاہ اور اس کی سلطنت کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود اپنی سلطنت قائم کرنے کا اس نے فیصلہ کیا۔ اکتوبر 17سو چوبیس میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا اور حیدر آباد دکن میں اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی سلطنت سے وفاداری اور دوسرے خصائل بھی رخصت ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ہی سلطنت مغلیہ کی شکست و ریخت بھی شروع ہو گئی۔ دوسرے طاقتور اور حوصلہ مند امراء نے بھی نیم خود مختار ریاستوں کے قیام کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کرنا شروع کر دیا۔ اب ملک کے مختلف حصوں مثلاً بنگال، حیدرآباد اور پنجاب میں پشتینی نوابوں نے اپنی نیم خود مختار ریاستیں قائم کر لی جو شہنشاہ دہلی کی برائے نام اطاعت گزار تھیں۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے زمینداروں، راجوں اور نوابوں نے بغاوت کا راستہ اپنایا۔ مراٹھا سرداروں نے بھی توسیعی اقدامات شروع کیے اور مالوہ گجرات اور بندیل کھنڈ پر چڑھ دوڑے۔

9.7.1 نادر شاہ (Nadir Shah)

نادر شاہ بچپن میں ایک چرواہا تھا، جہاں سے اس نے شہنشاہ بننے کا سفر شروع کیا۔ اس نے ایران کو قطعی زوال اور انتشار سے بچایا تھا۔ ایران جو ایک زمانے تک مستحکم اور وسیع سلطنت رہی تھی اٹھارویں صدی کے اوائل میں وہاں صفوی خاندان کی کمزور زوال آمادہ حکومت تھی۔ اسے داخلی بغاوتوں اور خارجی حملوں کا سامنا تھا۔ مشرق میں ابدالی قبائلیوں نے بغاوت کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا اور غلزئی قبائلیوں نے

قندھار کا صوبہ الگ کر لیا۔ شمال مغرب میں بھی اسی طرح کی بغاوتیں ہوئیں۔ شروان میں کٹر شیعوں نے سنیوں پر مظالم کیے جس کے نتیجے میں وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہاں سنی ملاؤں کو قتل کیا گیا مساجد کی بے حرمتی کی گئی اور انہیں اصطبلوں میں تبدیل کیا گیا اور مذہبی کتابیں بھی برباد کی گئیں۔ 1721 میں پندار کے ایک غلزئی سردار محمود نے ایران پر حملہ کیا اور اس کی راجدھانی اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف پیٹر اعظم کی حکومت کے تحت روس جنوب کی سمت بڑھنے پر تلا ہوا تھا۔ جولائی 1722 میں پیٹر نے ایران پر حملہ کر کے اسے ایک ایسی صلح پر مجبور کر دیا جس کے تحت بہت بحیرہ خزر کے کنارے پر واقع متعدد صوبوں سے اسے دستبردار ہونا پڑا جن میں شہر باکو بھی شامل تھا۔ ترکی بھی یہ آس لگائے ہوئے تھا کہ اپنے بیشتر یورپی مقبوضات جو وہ کھو چکا تھا ان کی تلافی ایران میں کر سکے گا۔ 1723 کے موسم بہار میں ترکی نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کیا اور تیزی کے ساتھ پیش قدمی کر کے جارجیا ہوتا ہوا شمالی ایران میں داخل ہو گیا جون 1724 میں روس اور ترکی نے ایک معاہدے کے تحت سارے شمالی ایران اور بیشتر جنوبی ایران کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس موقع پر 1726 میں شاہ طہماسپ کے زبردست حمایتی اور اس کے انتہائی باصلاحیت سپہ سالار کی حیثیت سے نادر شاہ نمودار ہوا۔ 1729 میں ابدالیوں کو شکست دے کر اس نے ہرات پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور غلزئیوں کو اصفہان سے نیز وسطی و جنوبی ایران سے نکال باہر کیا۔ ایک طویل اور شدید جنگ کے بعد اس نے ترکی کو تمام مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ 1735 میں روس سے صلح کر کے سارا مقبوضہ علاقہ واپس لے لیا۔ دوسرے سال آخری صفوی حکمران کو معزول کر کے وہ خود بادشاہ بن بیٹھا اور اگلے سال قندھار کا صوبہ بھی اس نے فتح کر لیا۔

9.7.2 ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ (Nadir Shah's Invasion of India)

ہندوستان کی بے اندازہ دولت جو ہمیشہ سے دنیا میں ضرب المثل رہی تھی نادر شاہ کے لیے وجہ کشش بنی۔ مسلسل حملوں اور جنگوں نے ایران کو عملاً دیوالیہ بنا دیا تھا۔ بھاڑے کی فوج کے اخراجات کے لیے روپیوں کی ضرورت تھی، جو صرف ہندوستان کے مال غنیمت سے پوری کی جا سکتی تھی۔ مغل سلطنت کی خستہ حالی نے مال غنیمت کے حصول کے امکان کو قوی کر دیا تھا۔ 1738 میں بلا کسی مزاحمت کے وہ ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ شمال مغربی سرحدوں کا دفاع بہت سالوں سے نظرانداز کیا جا رہا تھا۔ دشمن کے لاہور پر قابض ہو جانے کے وقت تک اس حملے سے پیدا ہونے والے خطرات کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکا۔ بہرکیف جلدی جلدی دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے لیکن دشمن کی موجودگی کے پیش نظر بھی آپس میں کٹے پھٹے امراء متحد نہ ہو سکے۔ وہ کسی دفاعی منصوبے یا دفاعی افواج کے سپہ سالار کی تقرر پر بھی متفق نہ ہو سکے۔ عدم اتحاد، آپسی پھوٹ، کمزور قیادت اور باہمی حسد اور بے اعتمادی کا نتیجہ شکست ہی کی شکل میں سامنے آ سکتا تھا۔ 13 فروری 1739 کو کرنال کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ حملہ آوروں نے مغل فوج کو بری طرح شکست دی اور شہنشاہ محمد شاہ گرفتار ہوا۔ پہلے تو 60 لاکھ روپے کی ادائیگی پر سمجھوتہ ہو گیا تھا، مگر برہان الملک سعادت خان کے بھڑکانے پر نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا۔ اپنے چند سپاہیوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے نادر شاہ نے شاہی پایہ تخت کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ لالچی حملہ آور نے شاہی خزانے اور دوسری شاہی املاک پر قبضہ کیا، بڑے بڑے امراء پر خراج عائد کیا اور دہلی کی دولت بے تحاشہ لوٹی۔ اس لوٹ کی مجموعی رقم کا اندازہ 70 لاکھ روپے لگایا جاتا ہے۔ اسی کی بدولت خود اپنی سلطنت میں اس نے تین سال کے لیے ٹیکس معاف کر دیے۔ مشہور عالم ہیرا کوہ

نور اور شاہ جہاں کا جواہرات سے مرصع تخت طاؤس بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا۔اس نے محمد شاہ کو مجبور کیا کہ دریائے ستلج کے اس پار واقع سلطنت کے تمام صوبوں سے وہ اس کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ نادر شاہ کے حملے سے مغلیہ سلطنت کو شدید دھکا لگا اور اس کے وقار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ وہ کمزوریاں جواب تک نظروں سے اوجھل تھیں، مراٹھا سرداروں اور غیر ملکی تجارتی کمپنیوں پر ظاہر ہو گئیں۔ مغل مرکزی نظم ونسق بھی عارضی طور پر مفلوج ہو گیا۔اس حملے نے مغل مالیاتی نظام کو تباہ کر ڈالا اور ملک کی معاشی زندگی پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔امرہ جو مفلس وقلاش ہو گئے تھے انھوں نے اپنی کھوئی ہوئی دولت کی کمی پوری کرنے کے لیے کسانوں پر اور زیادہ مظالم شروع کر دیے۔ عمدہ جاگیروں اور اعلی منصبوں کے لیے وہ اب اور زیادہ شدت سے آپس میں لڑنے لگے۔ کابل اور دریائے سندھ کے مغرب کا علاقہ مغل سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے ایک بار پھر سلطنت کو شمال مغرب کی جانب سے حملے کا خطرہ لاحق ہو گیا کیونکہ ایک اہم دفاعی دیوار تباہ ہو گئی تھی۔ یہ یقینا حیرت ناک ہے کہ نادر شاہ کی واپسی کے بعد اگرچہ مغلیہ سلطنت کے موثر اقتدار کا علاقہ تیزی سے سمٹا تھا تاہم وہ دوبارہ قوت حاصل کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ لیکن یہ محض فریب نظر تھا

9.8 احمد شاہ (Ahmad Shah, 1748–1754)

محمد شاہ اور ایک رقاصہ قدسیہ بیگم کا بیٹا احمد شاہ 1748ء میں مغل شہنشاہ بنا۔ایک شہزادے کے طور پر،اس نے 1748 میں منوپور کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی کو شکست دی۔ احمد شاہ بہادر کو وراثت میں ایک بہت کمزور مغل ریاست ملی۔اس نے تمام ریاستی امور حریف دھڑوں پر چھوڑ دیے۔ حریف امراء میں صلابت جنگ، جاوید خان، عمادالملک اور صفدر جنگ تھے۔ خود بادشاہ کی ماں بھی اس سیاسی گروہ بندی میں شامل تھی۔ مئی 1753 میں،احمد شاہ نے صفدر جنگ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے انضام الدولہ کے 18 سالہ بیٹے غازی الدین فیروز جنگ، جو عمادالملک کے نام سے مشہور تھا، کا انتخاب کیا۔ عمادالملک نے صفدر جنگ کے خلاف اس کے مخالفین کو متحد کیا، جس میں حافظ رحمت خان، قدسیہ بیگم اور خود احمد شاہ شامل ہوا۔ صفدر جنگ کو شکست ہوئی اور اس کی جاگیریں اور اختیار چھین لیا گیا لیکن سورج مل جاٹ جیسے اس کے حامیوں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے اسے اودھ واپس جانے کی اجازت دی گئی۔انتقام کی غرض سے صفدر جنگ نے اکبر عادل شاہ کو شہنشاہ مقرر کر کے دہلی پر حملہ (1753) کر دیا۔اس حملے میں جاٹوں نے بھی اس کی مدد کی۔ نتیجتاً عمادالملک نے مراٹھوں کے ساتھ اتحاد کیا۔اس طرح عمادالملک طاقتور ہو گیا۔احمد شاہ کو اس کی طاقت کا خوف ستانے لگا کیونکہ عمادالملک نے جو 15 لاکھ دام جمع کیے تھے ان سے مغل فوج اور شاہی اہلکاروں کو تنخواہیں دینے سے انکار کر دیا۔احمد شاہ بہادر نے صفدر جنگ کو اپنے عظیم وزیر کے طور پر بحال کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے عمادالملک کو شاہی دربار سے ہٹانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے عمادالملک نے عاقبت محمود کو شہنشاہ کو گرفتار کرنے بھیجا۔احمد شاہ کو اس کے وزیر عمادالملک نے معزول کر دیا اور بعد میں اسے اس کی والدہ کے ساتھ اندھا کر دیا گیا۔اس نے اپنی زندگی کے بقیہ سال اسیری میں گزارے اور 1775ء میں وفات پائی۔اس کے دور حکومت میں گجرات اور اڑیسہ مراٹھوں کے قبضے میں چلے گئے اور کرناٹک کی جنگوں کی شروعات بھی اسی کے دور میں ہوئی جس میں انگریز اور فرانسیسی جنوبی ہندوستان میں جانشینی کے جھگڑوں کا فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے علاقوں اور دائرہ اختیار کو بڑھانے میں لگے رہے۔

9.9 عالمگیر ثانی (Alamgir-II, 1754–1759)

مرزا عزیزالدین محمد 6 جون 1699 کو برہان پور میں پیدا ہوا اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ (شاہ عالم) کے بیٹے معزالدین جہاندار شاہ کا دوسرا بیٹا تھا۔ عزیزالدین کی عمر 7 سال تھی جب دکن میں اس کے پردادا اورنگزیب کا انتقال ہو گیا۔ جب اس کے والد جہاندار شاہ کو فرخ سیر نے شکست دی تو اسے بھی 1714 میں قید کر لیا گیا جس سے انہیں 1754 میں وزیر عمادالملک نے رہائی دلائی۔ عمادالملک، عزیزالدین کو ایک ایسی کمزور شخصیت سمجھتا تھا جو کبھی بھی اس کے اقتدار کو چنوتی نہیں دے سکتی۔ لہذا عمادالملک نے احمد شاہ بہادر کو معزول کرنے کے بعد 2 جون 1754 کو عزیزالدین کو عالمگیر دوم کے لقب کے ساتھ تخت نشین کرایا۔ یہ پندرہواں مغل بادشاہ تھا، جس نے 3 جون 1754 سے 29 نومبر 1759 تک حکومت کی۔ تخت نشینی کے وقت وہ 55 سال کا تھا اور انتظامی امور اور جنگی معاملات میں ناتجربہ کار تھا کیونکہ اس کی زیادہ تر زندگی قید و بند میں گزری تھی۔ وہ ایک بے اختیار حکمران تھا جس کے تمام اختیارات اس کے وزیر عمادالملک کے ہاتھ میں تھے۔ عمادالملک نے اپنی جگہ بولی لگوانے کے لیے مراٹھا رضاکاروں کی خدمات حاصل کیں اور تمام مالگزاری کا غبن کر گیا۔ اس نے عالمگیر دوم کے خاندان کو بھوکا رکھا اور اس کے بڑے بیٹے علی گوہر کو بھی کافی ستایا۔ 1755 میں، ڈی بسی کو نئے مغل شہنشاہ عالمگیر دوم کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں مراٹھا وفاق کو ختم کرنے کے لیے فرانسیسی مدد کی درخواست کی گئی۔ عالمگیر دوم نے پوچھا کہ کیا ڈی بسی کے لیے دہلی میں مغل سلطنت کے دارالحکومت کی حفاظت کے لیے 1000 فوجیوں کا طاقتور فرانسیسی دستہ روانہ کرنا ممکن ہے۔ عالمگیر دوم نے فرانسیسیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھاری رقم ادا کرنے اور کرناٹک جنگوں کے تنازعات کو فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں طے کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

9.9.1 احمد شاہ ابدالی سے تعلقات (Relations with Ahmad Shah Abdali)

عالمگیر دوم کی تخت نشینی کے بعد بظاہر مغل سلطنت نے دوبارہ مرکزیت حاصل شروع کر دی، خاص طور پر جب کئی امراء اور نوابوں نے مغل بادشاہ کی تشفی کے لیے اور مراٹھوں کے خلاف مزاحمت میں اس کے ساتھ شامل ہونے کا اعلان کیا۔ یہ سب عمادالملک کو انتہائی ناگوار گزرا جو کہ مراٹھا اقتدار کے ساتھ اپنی تمام تر توقعات وابستہ کر چکا تھا اور ان کی قوت کے بل بوتے اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت امیر الامراء اور میر بخشی، خان دوران ہفتم کا بیٹا (فرخ سیر اور محمد شاہ کے دور میں ایک نامور امیر) مرزا اشرف تھا۔ 1755 میں پنجاب کے مشہور مغل گورنر معین الملک کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوہ مغلانی بیگم نے جانشینی کی کسی بھی ممکنہ جنگ کو روکنے اور مشرقی علاقوں میں سکھ باغیوں سے نمٹنے کے لیے احمد شاہ ابدالی سے مدد طلب کی۔ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کا ایک قابل ترین جرنیل تھا جس نے اپنے آقا کے انتقال کے بعد افغانستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے 1756 میں لاہور پر چڑھائی کی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کو کمانڈر جہاں خان کی سرپرستی میں لاہور کا نیا گورنر مقرر کیا۔ ادینہ بیگ کو دوآب کا فوجدار بنایا گیا۔ ابدالی نے پھر پنجاب کے بغاوت پر آمادہ مشرقی علاقوں میں لوٹ مار مچائی۔ احمد شاہ ابدالی نے 1757 کے آغاز میں چوتھی بار شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور جنوری 1757 میں دہلی کے قریب پہونچا۔ اکتوبر 1757 میں عالمگیر دوم، اپنے درباریوں جیسے شاہ ولی اللہ، امیروں جیسے نجیب الدولہ اور شاہی خاندان کے ساتھ احمد شاہ ابدالی سے ملنے گیا، جس کی افواج مراٹھوں کے ساتھ جنگ میں مشغول تھیں اور عمادالملک کے اقتدار کے لیے چنوتی

بنی ہوئی تھیں۔

1757ء میں عالمگیر دوم نے درانی امارت اور مغلیہ سلطنت کے درمیان کامیابی سے امن قائم کیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے تعلقات مغل بادشاہ کے ساتھ اس وقت مزید مضبوط ہوئے جب اس کے بیٹے اور ولی عہد تیمور شاہ کی شادی عالمگیر دوم کی بیٹی گوہر افروز بیگم سے ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی نے خود سابقہ مغل شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے شادی کی تھی۔ اپریل 1757 میں اپنی واپسی پر، ابدالی نے مغل بادشاہ عالمگیر دوم کو دہلی کے تخت پر ایک رسمی حکمراں کے طور پر دوبارہ متعین کیا۔ تاہم، دہلی کی اصل حکومت نجیب الدولہ کے ہاتھ میں دے دی گئی، جس نے ابدالی کو 20 لاکھ روپے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ نجیب الدولہ نے ابدالی کے چوتھے حملے میں اس کی مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ افغان شہنشاہ کا اعتماد جیت چکا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دہلی کے دربار میں ابدالی کے نمائندے کے طور پر کام کیا۔ چنانچہ نجیب الدولہ اب دہلی کا اصل حکمران تھا اور عالمگیر دوم ایک کٹھ پتلی شہنشاہ کے طور پر اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے دور دراز کے فوجی کمانڈروں، نوابوں اور نظام کو مراٹھوں کے خلاف ایک مشترکہ مقصد کے تحت متحد کرکے مغل سلطنت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ان کارروائیوں سے خوفزدہ ہو کر معزول عمادالملک نے خود کو مراٹھا لیڈر سداشیو راؤ بھاؤ کے ساتھ جوڑ لیا اور نجیب الدولہ کے خلاف جوابی حملہ شروع کیا۔ احمد شاہ ابدالی اپنی فوج کو اپنے بیٹے تیمور شاہ کے ماتحت چھوڑ کر لاہور واپس آیا، جہاں تیمور شاہ نے قلعہ بندی کو مضبوط کیا اور مغل لوہاروں اور دھات سازوں کی مدد سے زمزمہ توپ بنوائی۔ بہاولپور کے نواب محمد بہاول خان دوم اور قلات کے خان محمد ناصر خان اول اس کے حامی و مددگار تھے۔

9.9.2 مراٹھوں کا دہلی پر قبضہ 1757 (Capture of Delhi by the Marathas)

عمادالملک نے عاقبت محمود کو پیشوا نانا صاحب اول کے بھائی رگھوناتھ راؤ کے ماتحت مراٹھوں کے ساتھ اتحاد کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہ دہلی میں ابدالی کے نمائندوں سے چھٹکارا پانے میں اس کی مدد کریں۔ جولائی 1757 میں، رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں مراٹھوں نے درانی سلطنت اور مغل سلطنت کے درمیان قائم ہونے والے اتحاد کو مسترد کردیا۔ چنانچہ دہلی کو آزاد کرانے کے لیے 40,000 مراٹھا فوجیوں کا دستہ روانہ کیا گیا تھا۔ مراٹھوں نے لال قلعہ کے بالمقابل 30 کلومیٹر دور ڈیرے ڈالے اور جمنا کے ارد گرد تمام دیہاتوں پر قبضہ کرلیا۔ عالمگیر دوم کے میر بخشی نجیب الدولہ نے اپنے نائب قطب شاہ اور امان خان کو 2500 کی مغل فوج کے ساتھ دہلی میں مضبوطی سے قلعہ بند کیا اور خود 5,000 بہترین افغان فوجیوں اور بھاری توپ خانے کے ساتھ ایک پیادہ فوج کی سربراہی کی۔ اس نے مراٹھوں کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ مشتعل مراٹھوں نے تجارتی کشتیوں کو آگ لگادی اور کھانے پینے کی اشیاء کو دہلی میں داخل ہونے سے روک دیا۔ نجیب الدولہ، احمد شاہ ابدالی سے کوئی مدد حاصل کرنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ ہرات کے قریب متعدد بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔ نجیب الدولہ نے پانچ مہینے تک مراٹھا وفاق کی مشترکہ افواج کے خلاف شدید مزاحمت کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور اپنی شکست تسلیم کرلی۔ مراٹھا کمانڈر رگھوناتھ راؤ نے 50 لاکھ روپے کے خراج کے ساتھ نجیب الدولہ کو دہلی سے فوراً واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ اس سے یہ بھی وعدہ لیا گیا کہ وہ کبھی دہلی واپس نہیں آئے گا اور نہ ہی کسی مراٹھا قلعے کے لیے خطرہ بنے گا۔ چنانچہ نجیب الدولہ نجیب آباد واپس چلا گیا۔ جب مراٹھے دہلی میں داخل ہوئے تو شہنشاہ عالمگیر دوم اور اس کا شاہی خاندان کسی نہ کسی طرح جاٹ ریاست بھرت پور چلا گیا تھا۔ مراٹھوں نے

دہلی شہر میں بری طرح لوٹ مار مچائی۔ مغلوں کی بنائی ہوئی مساجد اور مزارات کی بے حرمتی کی گئی یہاں تک کہ پیشوا نے تو وشواس راؤ کو مغل تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔ مراٹھوں کی حمایت سے عماد الملک کو دوبارہ میر بخشی مقرر کیا گیا۔ دہلی میں داخل ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد مراٹھوں کو جاٹ حکمراں سورج مل کی طرف سے بھیجی گئی ایک جاٹ فوج سے مقابلہ کرنا پڑا جس نے مغل خاندان کو پناہ دینے کی وجہ سے دہلی پر حکمرانی کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ جاٹوں نے دہلی پر حملہ کیا اور ساتھ ہی عالمگیر دوم اور مغل شاہی خاندان کے لیے بھرت پور سے دہلی واپس آنے کی راہ بھی ہموار کی۔ دہلی کی حکومت کھونے کے باوجود نجیب الدولہ اور اس کے ساتھیوں، جیسے قطب خان اور سرہند کے مغل فوجدار عبدالصمد خان، سہارنپور اور شاہ آباد مارکنڈا میں لڑائیوں کے دوران مراٹھا وفاق اور اس کے اتحادیوں کو چنوتی دیتے رہے۔ جواب میں مراٹھوں نے، تروڑی، کرنال اور کنج پورہ میں قتل وغارت مچائی۔ کنج پورہ پر مراٹھا حملے نے احمد شاہ ابدالی کی طرف سے فوجی رد عمل کو پیدا کیا۔ اس کی افواج اپنے مراٹھا دشمنوں کی تلاش میں ہندوستان کے پنجاب میں داخل ہوئی۔ 1756 میں، عالمگیر دوم نے کرنول، کڈپا اور ساونور کے اپنے وفادار نوابوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، جب ان کے علاقوں کو 1757 تک مراٹھا سردار بالاجی باجی راؤ نے تباہ و برباد کر دیا۔

9.9.3 دیگر ریاستوں سے تعلقات (Relations with Other States)

عالمگیر دوم نے بنگال کے مشہور نواب علی وردی خان کی موت کا غم منایا، جو شاہی خزانے میں ہر سال 50 لاکھ دام بھیجا کرتا تھا۔ اس کے جانشین سراج الدولہ کو بنگال کے اگلے نواب کے طور پر تسلیم کیا گیا، لیکن اسے اندرونی حریفوں جیسے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا سامنا کرنا پڑا جس نے عالمگیر دوم کی طرف سے سراج الدولہ کو دیے گئے فرمان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان اندرونی جھگڑوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سراج الدولہ نے مغل شہنشاہ عالمگیر دوم اور صلابت جنگ کی اجازت کے بغیر نواب کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گڑھ کلکتہ پر حملہ کر دیا۔ سراج الدولہ کو جلد ہی کلائیو نے 1757 میں پلاسی کی جنگ میں شکست دی اور کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اپنی فوج کی تباہی کے بعد سراج الدولہ کو اس کے غدار سپہ سالار میر جعفر کی فوج نے قتل کر دیا۔ عالمگیر دوم نے میر جعفر کو بنگال کا اگلا نواب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہی دربار کے فیصلے کے رد عمل کے طور پر میر جعفر نے شاہی خاندان کے خلاف مراٹھوں سے جوڑ توڑ کرنے والے عماد الملک کے ساتھ اتحاد کر کے اپنی حیثیت مضبوط بنائی۔

عالمگیر دوم کے دور حکومت میں فرانسیسی سپہ سالار، بسی اور امیر البحر لیلی اور ان کے اتحادیوں جیسے صلابت جنگ اور حیدر علی نے مراٹھا باغیوں کے مکمل غلبے کے خلاف دکن میں فوجی کاروائیاں کیں۔ ان کی کامیابیوں نے انہیں مغلیہ سلطنت کے اندر بااثر حلقوں میں شہرت بخشی۔ 1756 میں، صلابت جنگ کی افواج نے بھاری بندوقوں کا استعمال کیا جسے کیٹ یوک (Catyocks) کہا جاتا تھا۔ یہ زمین پر رکھ کر چلائی جاتی تھیں اور توپ سے زیادہ تیزی سے فائر کرنے کے لیے مشہور تھیں۔ ان نئے ہتھیاروں نے مراٹھا باغیوں کی قسمت کو پوری طرح مہر لگا دی۔ پلاسی کی جنگ کے فوراً بعد، فرانسیسی کمانڈر ڈی بسی کو مغل بادشاہ عالمگیر دوم کی طرف سے سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب عطا کیا گیا اور 7000 کا منصب دار مقرر کیا گیا۔ اس نے صلابت جنگ اور مغل سلطنت میں فرانسیسیوں کے ترجمان 'وکیل' حیدر جنگ کے ساتھ مل کر انگریزوں سے شمالی سرکاروں کا علاقہ چھین لیا۔ تاہم 1758 میں انگریز کمانڈر فورڈ نے شمالی سرکاروں کو دوبارہ حاصل کر لیا اور بسی

کو فرانس واپس بلالیا گیا۔ بدترین حالات سے بچنے اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے صلابت جنگ نے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ صلح کر لی اور ان کی محافظت (protectorate) کو تسلیم کر لیا۔ جلد ہی اسے اس کے اپنے بھائی نظام علی خان نے معزول کر دیا۔ 1758 میں، حیدر علی اور اس کے سپاہیوں نے مراٹھا وفاق کے کھانڈے راؤ سے بنگلور چھین لیا۔ کرناٹک جنگوں کے دوران ان کی کامیابیوں کے اعزاز میں شہنشاہ نے انہیں 'نواب حیدر علی خان بہادر' کا خطاب دیا۔

1760 میں مراٹھا وفاق اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ پیشوا نے مغل سلطنت کو ختم کرنے اور وشواس راؤ کو دہلی میں شاہی تخت پر بٹھانے پر تبادلہ خیال کیا۔ 1758 میں رگھوناتھ راؤ کی قیادت میں مراٹھوں نے عمادالملک سے شاہی خزانے میں سے بڑا حصہ لینے کے بعد لاہور پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مل کر نوجوان تیمور شاہ کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ رگھوناتھ راؤ نے احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ اور وائسرائے جہان خان کو باہر نکال دیا۔ تیمور شاہ اور اس کی فوجیں سکھوں اور مراٹھوں کے حملوں کی وجہ سے لاہور سے پشاور کی طرف پسپائی پر مجبور ہو گئیں۔ اس فتح نے حملہ آور پیشوا کو بڑی شان سے دہلی کو تباہ کرنے اور وشواس راؤ کو مغل تخت پر بٹھانے کے اس کے ارادوں کو تقویت دی۔ عمادالملک کو ڈر تھا کہ مغل شہنشاہ عالمگیر دوم احمد شاہ ابدالی کو واپس بلالے گا، یا اپنے بیٹے شہزادہ علی گوہر کو اسے اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔ چنانچہ عمادالملک نے مغل شہنشاہ عالمگیر دوم اور اس کے خاندان کو قتل کرنے کی سازش کی۔ چند مغل شہزادے جن میں علی گوہر بھی شامل تھے، قتل سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ نومبر 1759 میں مغل شہنشاہ عالمگیر دوم کو بتایا گیا کہ ایک متقی آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔ عالمگیر دوم، جو کبھی بھی مقدس آدمیوں سے ملنے کے لیے بے چین رہتا تھا، فوری طور پر کوٹلہ فیروز شاہ میں اس سے ملنے کے لیے روانہ ہوا جہاں عمادالملک نے اس پر خنجر سے کئی وار کیے۔ ان زخموں سے مغل شہنشاہ عالمگیر دوم جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی موت پر پوری مغل سلطنت میں سوگ منایا گیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عالمگیر دوم نے 1759 میں اپنی موت سے پہلے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان مفاہمت کی کوشش بھی کی تھی۔

9.10 شاہجہاں ثالث (Shahjahan-III, 1759)

1759 میں عالمگیر دوم کے قتل کے بعد، سداشیو راؤ بھاؤ کی قیادت میں مراٹھا سلطنت کچھ مدت کے لیے پورے ہندوستان کے سیاسی افق پر چھا گئی۔ مغل شہنشاہ کے قتل میں ان کے شامل ہونے کا واضح ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ انہوں نے دہلی میں عمادالملک کو رشوت دے کر یا معزول کر کے مغل سلطنت کے خاتمے اور وشواس راؤ کو تخت نشین کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ بعد میں انہوں نے عوامی رد عمل کے خوف سے ایک برائے نام مغل شہنشاہ کے باقی رکھنے اور اس کے نام سے پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنے میں ہی بہتری سمجھی۔ اس مقصد کے لیے سداشیو راؤ بھاؤ نے مغل شہزادے شاہجہاں سوم کو نئے مغل شہنشاہ کے طور پر منتخب کیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے شہنشاہ اور اس کے حرم پر سختیاں کرنا شروع کر دیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ دولت کے بیجا مطالبات شروع کر دیے۔ مراٹھوں نے کھلی لوٹ مار بھی شروع کر دی اور عوام پر ظلم و ستم شروع کر دیا۔ بنگال کے مشہور شاعر گنگارام بنگال پر ان کے حملوں اور لوٹ مار کا حال لکھتے ہیں

کہ : 'مراٹھوں نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کردیا تو کچھ لوگوں کے انہوں نے ہاتھ ناک اور کان کاٹ لیے اور کچھ کو مار ڈالا۔ خوبصورت عورتوں کو رسیوں سے باندھ کرلے گئے اور ان عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کرتے تھے۔'

جادوناتھ سرکار نے بھی مراٹھوں کے زنا کے معاملہ میں شہرت کا اعتراف کیا ہے-علاوہ ازیں جب مراٹھوں نے لال قلعے پر قبضہ کرلیا تو مال ودولت کی ہوس میں دیوان خاص کی سونے کی چھت کو اتروالی اور اسی طرح نظام الدین اولیاء کے مزار اور محمد شاہ کی قبر پر جو سنہری شمع دان اور عود سوز تھی اسے بھی گلوا کر سکوں میں تبدیل کردیا- مراٹھے طاقت کے نشہ میں اس قدر چور ہوگئے کہ انہوں نے دلی کی جامع مسجد کے منبر پر شیو کی مجسمہ نصب کرنے کا ارادہ کرلیا تھا-مراٹھوں نے آگرہ اور دہلی میں مغلوں کی تعمیر کردہ مساجد، مقبروں اور مزاروں کو بھی مسخ کردیا۔ شاہی موتی مسجد کی بے حرمتی کی گئی اور اس کے شاندار جواہرات سے مرصع زیب وزینت کے سامان کو لوٹ لیا گیا۔ یہ ایک ایسی توہین تھی جس کی جرأت نادر شاہ بھی نہ کرسکا تھا۔ عوام اب مراٹھوں سے مکمل مشتعل ہوگئے تھے اور امراان کے خاتمے کے لیے وقتی طور پر متحد ہوگئے۔ مراٹھوں کی بڑھتی سرکشی سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نواب نجیب الدولہ کو اپنے خطوط کے ذریعہ آگاہ کیا- نجیب الدولہ، شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھا اور اس نے نجیب آباد میں ان کے درس وتدریس کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ یوپی کا نجیب آباد شہر (ضلع بجنور) 1740 میں نجیب الدولہ نے آباد کیا تھا- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نواب کو مراٹھوں کے دست درازیوں کو روکنے کی طرف توجہ دلائی اور جنگ کی صورت میں فتح کی بشارت بھی دی- نجیب الدولہ پہلے ہی مراٹھوں اور عماد الملک سے شکست خوردہ تھا، محدث دہلوی کی حوصلہ افزائی اور عوامی جوش وخروش دیکھ کر فوراً تیار ہوگیا اور اس نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور دیگر مغل امراء کو بھی شامل کرلیا۔ اس اتحاد میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی شامل کرلیا جو پہلے ہی 1760 میں مراٹھوں کے ہاتھوں عالمگیر دوم کے داماد تیمور شاہ کی شکست اور اپنے نائب نجیب الدولہ کی دہلی سے بے دخلی سے غیض وغضب میں تھا۔ ہرات کی مہم اور دیگر بغاوتوں کو دبانے کے بعد اس نے مراٹھوں کو مکمل طور پر کچلنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ فوج جمع کرنے کے لیے ایک زبردست مہم شروع کردی تھی۔ فوج جمع کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف کوچ کیا جہاں دہلی پر مراٹھوں کا اقتدار تھا۔ اس کی فوج اور اتحادیوں کی افواج نے دہلی کے تخت سے 10 اکتوبر 1760 کو مراٹھوں کے قائم کردہ شاہجہاں سوم کو بے دخل کردیا۔ اس طرح اس کی قلیل مدت حکومت کا خاتمہ ہوا۔

9.11 شاہ عالم ثانی (Shah Alam-II, 1760–1806)

9.11.1 پانی پت کی تیسری جنگ (The Third Battle of Panipat)

اس طرح مغل امراء کے اس فوجی اتحاد میں شاہ ولی اللہ نے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ ابدالی کو شریک ہونے کی دعوت بھیجی اور نواب نجیب الدولہ نے اس کی ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا- احمد شاہ ابدالی نے 1 نومبر 1760ء کو پانی پت کے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس فوجی اتحاد میں احمد شاہ ابدالی، نواب نجیب الدولہ، نواب شجاع الدولہ، حافظ رحمت خاں، سعد اللہ خان اور دوسرے مغل امراء اور سالار شامل تھے- پانی پت کی جنگ میں نواب نجیب الدولہ ہراول دستے کے سالار تھے- نجیب الدولہ اور مغل سلطنت میں اہم مسلم امرا اور احمد شاہ

ابدالی کے مضبوط اتحاد نے پہلے دہلی پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا اور اس پر مفرور شہزادے علی گوہر کی شاہ عالم ثانی کے نام سے حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ جنوب میں حیدر علی اور اس کی میسور فوج نے مراٹھوں پر زبردست حملہ کیا۔ شاہ عالم دوم نے مراٹھوں کے خاتمے کا اندازہ لگاتے ہوئے شجاع الدولہ کو اپنا وزیر اعظم اور نجیب الدولہ کو اپنا اعزازی مختار خاص قرار دیا۔ ان سرگرمیوں کے نتیجے میں مختلف مذہبی اور سیاسی وفاداریوں وجود میں آئیں اور بالآخر 1761 میں پانی پت کی تیسری جنگ واقع ہوئی۔

ادھر طاقت کے نشے میں چور مراٹھے اپنی فتح کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنے عظیم لشکر کے ساتھ پانی پت کے میدان میں پہنچ گئے۔ بدھ کے دن 14 جنوری 1761ء کی صبح دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئیں۔ یہ جنگ دن چڑھنے سے لے کر ظہر کے وقت تک چلتی رہی جس میں دونوں طرف کے جنگجوؤں نے جم کر مقابلہ کیا، لیکن روہیلہ نواب نجیب الدولہ کی فوج کے افغان سپاہیوں نے موت سے بے پرواہ ہو کر جو حملہ شروع میں کیا تھا اس نے مراٹھا سپاہیوں کو بددل کر دیا۔ مراٹھے جو، اب لوٹ مار کے عادی ہو چکے تھے اور اتنا مال و دولت حاصل کر کے زندہ سلامت گھر واپس جانا چاہتے تھے، وہ اس جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ ساتھ ہی مراٹھوں کے ظلم و ستم کے شکار لوگ بھی اس لشکر میں شامل تھے اور جوش انتقام میں مراٹھوں کو کاٹ اور کچل دینا چاہتے تھے۔ اس اسباب کی وجہ سے احمد شاہ ابدالی کی فوج کا دبدبہ مراٹھوں پر ابتدائے جنگ سے ہی قائم ہو گیا۔ نتیجتاً مراٹھوں کو اپنی تاریخ کی بدترین شکست ہوئی اور ان کے 27 بڑے سردار مارے گئے۔ اس جنگ میں لاکھوں کی تعداد میں سپاہی مارے گئے جن میں اکثریت مراٹھوں کی تھی۔ اس جنگ نے مراٹھوں کی طاقت کو ایسا دھچکا کیا کہ ان کے کل ہند اقتدار کا خواب بری طرح چور چور ہو گیا۔ ابدالی نے مراٹھوں کی اس آرزو کو خاک میں ملا دیا کہ مغل شہنشاہ کو قابو کر کے پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کریں۔ بہر کیف ابدالی نے ہندوستان کسی افغان حکومت کی داغ بیل نہیں ڈالی بلکہ وہ اور اس کے جانشین پنجاب پر بھی اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکے جو جلد ہی سکھ سرداروں کے قبضے میں چلا گیا۔ اگرچہ اس جنگ نے مراٹھوں کی طاقت کو نقصان پہنچایا تھا لیکن اس جنگ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس جنگ کے بعد انگریزوں کو ملک میں پیر جمانے کا پورا موقع مل گیا تھا جس کے نتیجہ میں ملک انگریزوں کا غلام بن گیا۔ اس موقع پر احمد شاہ ابدالی نے علی گوہر کو تخت نشیں کر کے اور خود واپس افغانستان جا کر بڑی سیاسی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا کہ ایسے مرد بیمار کو مغل تخت سونپ دیا جو اس وقت کسی طاقتور شخصیت کا منتظر تھا۔ اس جنگ اور اس سیاسی چوک نے انگریزوں کا کام آسان کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے جاتے ہی مغل امراء کے آپسی جھگڑے پھر شروع ہو گئے اور وہ ایک دوسرے کی مدد سے قاصر رہے۔

9.11.2 بکسر کی جنگ اور مغل شہنشاہ کی انگریزوں کی ماتحتی

(The Battle of Buxar and the Subjugation of Mughal Emperor to the British)

شاہ عالم کے دور حکومت میں مغلوں کی طاقت تقریباً ختم سی ہو گئی۔ فارسی کی ایک کہاوت 'سلطنت شاہ عالم، از دہلی تا پالم' مشہور ہوئی جس کا مطلب تھا، شاہ عالم یعنی دنیا کے بادشاہ کی سلطنت دہلی سے پالم تک ہی ہے۔ پالم چونکہ دہلی کا ہی ایک مضافاتی علاقہ ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ اس کی حکمرانی صرف دہلی تک ہی ہے۔ دہلی میں اپنے وزیر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خان کے ساتھ کسی جھگڑے کی سبب، شاہ عالم اودھ چلا گیا جہاں وہ 1764 تک رہا اور 1764ء میں بکسر کی جنگ میں حصہ لیا جو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور بنگال کے نواب میر قاسم، اودھ کے

نواب شجاع الدولہ اور مغل شہنشاہ شاہ عالم دوم کی مشترکہ افواج کے درمیان ہوئی۔ الہ آباد معاہدے (1765ء) کے ذریعے جنگ کا خاتمہ ہوا جس کے تحت بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی حقوق (زمین کی آمدنی جمع کرنے کا حق) برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیے گئے۔ الہ باد اور کڑا شجاع الدولہ سے چھین لیے گئے۔ شاہ عالم کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار بننا پڑا۔

1771 میں مہادجی شندے کی قیادت میں مراٹھا افواج نے افغان نجیب الدولہ کے بیٹے زابتہ خان کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور مفرور مغل شہنشاہ شاہ عالم دوم کو ایک معاہدہ کے بعد دوبارہ دہلی میں تخت نشین کیا۔ دہلی پر قبضے کے ساتھ ہی مراٹھوں نے پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار دوبارہ قائم کر دیا اور کھوئے ہوئے زیادہ تر علاقوں کو فتح کر لیا۔ انہوں نے جاٹوں، راجپوتوں اور روہیلوں کو بھی شکست دی۔ مراٹھوں نے، 1772 میں ایک بڑی فوج روہیلکھنڈ بھیجی تاکہ کچھ عرصہ پہلے پانی پت میں روہیلوں کو احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کی سزا دی جاسکے۔ مراٹھوں نے روہیل کھنڈ کو لوٹ مار کے ذریعے تباہ کر دیا اور نواب کے لوگوں کو بھی قید کر لیا۔ مہادجی سندھیا عرف شندے نے 1772 میں نجیب آباد کے قلعے کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ نواب نجیب الدولہ کی قبر کو بھی تباہ کر دیا گیا اور اس کی ہڈیاں چاروں طرف بکھیر دی گئیں۔

صفوی خاندان سے تعلق رکھنے والے مہم جو سردار نجف خان نے شاہ عالم کی دہلی واپسی کے بعد عہدہ وزارت سنبھالا۔ اس نے مغل مالیاتی نظام، انتظامیہ اور بطور خاص فوج میں اصلاحات کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس نے 20000 سپاہیوں کی ایک طاقتور مغل فوج بنائی جو توپخانے اور گھوڑ سواروں پر زیادہ منحصر نہیں تھی۔ 1777 میں اس نے زابتہ خان کو شکست دی اور سکھوں کے بھی حملوں کی روک تھام کی۔ اگلے ہی سال اسے ہٹا کر مجد الدولہ کو وزیر اعظم بنایا گیا جو سکھوں کے حملے کو پسپا کرنے میں ناکام رہا۔ نتیجتاً 1779 میں نجف خان کو واپس لایا گیا۔ اس نے زابتہ خان اور اس کے سکھ اتحادیوں کو بدترین شکست دی جس کے بعد وہ اس کے رہتے واپس آنے کی جرات نہ کر سکے۔ نجف خان کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ شہنشاہ نے نجف خان کے لائق بھتیجے مرزا شفیع کی جگہ دوسروں کو متعین کیا۔ یہاں تک کہ غدار مجد الدولہ کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ شہنشاہ کی احمقانہ تقرریوں کی وجہ سے فوج کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی انہوں نے شہنشاہ کو بنانے پر مجبور کیا۔ اس نے سکھوں سے ساز باز کر کے مغل فوج کی تعداد 20000 سے 5000 کر دی۔ سکھوں نے حملہ کر کے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ سکھ سردار جسا سنگھ اہلووالیہ تو بگھیل سنگھ کے نام سے مغل تخت پر بھی بیٹھ گیا تھا۔ مگر بعد میں بیگم سمرو کے کہنے پر نذرانہ لینے پر راضی ہو گیا۔ سکھوں نے نجیب الدولہ کے پوتے اور زابتہ خان کے بیٹے، غلام قادر کو وزیر اعظم بنانے پر شہنشاہ کو مجبور کیا۔ غلام قادر نے عظیم مغل خزانے کے لالچ میں 1788 میں بوڑھے شہنشاہ کو اندھا کر دیا اور مغل شہزادیوں کے بدن سے کپڑے اتار کر انہیں اپنے سامنے برہنہ ناچنے پر مجبور کیا۔ مارے ذلت اور شرم کے شہزادیوں نے دریائے جمنا میں کود کر جان دے دی۔ مغل خاندان ذلت و رسوائی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ مہاد سندھیا سے رہا نہیں گیا۔ اس نے فوری طور پر غلام قادر کو قتل کروا کے اس کے ناک کان کاٹ کر شہنشاہ کو بھیجے اور ایک معاہدے کے بعد شہنشاہ کو تخت بھی واپس کروایا۔ اس حادثے کے بعد ایک باقاعدہ مراٹھا فوج دہلی میں تعینات کی گئی۔ شہنشاہ، مہادجی سندھیا کا بہت ممنون ہوا اور اسے وکیل مطلق اور امیر الامرا کا خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد دو دہائی تک دہلی پر مراٹھوں کا قبضہ رہا۔

9.11.3 انگریزوں کا دہلی پر قبضہ (British Occupation of Delhi)

11 ستمبر 1803 کو دوسری انگریز مراٹھا جنگ کے دوران، جنرل لیک کی ماتحتی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستوں اور جنرل لوئس بورکوئن اور سردار راؤ صاحب والے کی قیادت میں مراٹھا سردار مہاد جی سندھیا کی فوج کے درمیان دہلی کی جنگ یا پٹپڑ گنج کی لڑائی ہوئی۔ مراٹھوں نے ابتدا میں دریائے جمنا کو اپنے عقب میں رکھ کر پیچھے سے حملے کا راستہ بند کر دیا، لیکن، جنرل جیرارڈ لیک نے فرار ہونے کا دکھاوا کرتے ہوئے، انہیں اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکال لیا۔ بھاگتی ہوئی انگریز فوج اچانک مڑ کر بے ترتیب مراٹھا فوج پر ٹوٹ پڑی۔ زیادہ تر مراٹھا سپاہی پیچھے ہٹتے ہوئے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ تین دن محاصرے کے بعد دہلی شہر بھی انگریزوں نے فتح کر لیا۔ اس کے نتیجے میں مغل شہنشاہ شاہ عالم کی سیاسی طاقت مکمل طور پر ختم ہو گئی اور وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا۔ نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں اور مغل امراء کے داخلی جھگڑوں کے نتیجے میں 1761 تک ایک کل ہند سلطنت کی حیثیت سے مغلیہ سلطنت کا وجود عملاً پہلے ہی ختم ہو چکا تھا اور وہ صرف دہلی ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ انگریزوں کے دہلی فتح کرنے سے رہے سہے مغل اقتدار کا بھی جنازہ نکل گیا۔ 1806 میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہو گیا۔

9.12 اکبر شاہ ثانی (Akbar Shah-II, 1806–1837)

اکبر دوم نے 1806 سے 1837 تک برائے نام حکومت کی۔ وہ شاہ عالم ثانی کا دوسرا بیٹا اور آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ثانی کا والد تھا۔ ہندوستان میں بڑھتے ہوئے برطانوی اقتدار کی وجہ سے اکبر دوم صرف رسمی حکمراں بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے رام موہن رائے کو برطانیہ میں سفیر بنا کر بھیجا اور انہیں راجہ کا خطاب دیا۔ اس کے دور حکومت میں، 1835 میں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو مغل شہنشاہ کی رعایا کہلانے اور اس کے نام پر سکے جاری کرنا بند کر دیا۔ اس سلسلے میں کمپنی کے سکوں میں فارسی تحریریں حذف کر دی گئیں۔ اکبر دوم نے ہندو مسلم اتحاد کا تہوار، پھول والوں کی سیر بھی شروع کیا۔ اس کی قبر مہرولی میں قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے پاس موجود ہے۔

9.13 بہادر شاہ ظفر (Bahadur Shah Zafar, 1837–1857)

ابو ظفر، محمد سراج الدین، بہادر شاہ غازی یا بہادر شاہ ظفر، اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ بادشاہ ہونے کے ساتھ ہی وہ اردو کا ایک بہترین شاعر اور ابراہیم ذوق کا شاگرد تھا۔ ذوق کی وفات کے بعد اس نے مرزا غالب کے ساتھ شاعری کا پڑھنا سیکھنا جاری رکھا۔ 1837ء میں اکبر شاہ ثانی کے بعد انہیں تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ مغلوں کا آخری حکمران تھا۔ دہلی پر ان کی حکومت رسمی تھی اور اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اردو، عربی، فارسی زبانوں کے ساتھ گھڑ سواری، تلوار بازی، تیر اندازی اور بندوق چلانے کی کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ 1857ء تک وہ علامتی طور پر حکمراں بنے رہے۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں باغیوں نے انہیں اپنا رہنما بنایا۔ بغاوت کی ناکامی کی صورت میں انہیں قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور اس طرح مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

9.14 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہندوستان میں متعدد علاقائی سیاسی اکائیوں کا ظہور ہوا۔علاقائی طاقتوں جیسے مراٹھا اور سکھ، سابقہ مغل ریاستوں جیسے اودھ،بنگال اور حیدرآباد نے اپنی خود مختار پہچان پر زور دینا شروع کر دیا۔ایک زمانے کی طاقتور مغل سلطنت ٹوٹ پھوٹ کا شکار بن گئی اور مغل دربار، طاقتور امرا اور منصب داروں کی گروہ بندیوں کا اکھاڑا بن گیا۔سلطنت کی کمزوری اس وقت صاف طور پر ظاہر ہوگئی جب 1739ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے مغل شہنشاہ کو قید کر لیا اور دہلی میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔اورنگ زیب کے بعد کوئی بھی مغل حکمراں اس لائق ثابت نہیں ہوا کہ وہ اس تنزل پذیر سلطنت کو زوال اور تباہی سے روک سکے۔زوال کے اس دور میں بھی کچھ امرا جیسے چن قلیچ خان نے کچھ حد تک اصلاحات کی کوشش کی مگر وہ مغل شہنشاہوں کی نااہلی اور درباری رقابتوں کا شکار ہو کر کچھ بھی نہ کر سکے۔خود مغل حکمراں، امرا کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہے۔ان بعد کے مغل حکمرانوں کے بارے میں اس اکائی میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے،ساتھ ہی یہ اس زوال کے دور کی مکمل کہانی ہے جس کا اختتام 1857 کی پہلی جنگ آزادی پر ہوا۔

9.15 کلیدی الفاظ (Keywords)

چوتھ	:	کل پیداوار کا چوتھائی حصہ، مراٹھوں کے ذریعے لگایا گیا ٹیکس
سردیش مکھی	:	پیداوار کا دس فیصد، مراٹھوں کے ذریعے لگایا گیا ٹیکس
امبر	:	موجودہ جے پور اور اس کا گردونواح
مارواڑ	:	موجودہ جودھپور اور اس کا گردونواح
اجارہ	:	زمین کے لگان کو ٹھیکے پر وصولنے کے لیے دینا
فرمان	:	شاہی حکم نامہ

9.16 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.16.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جہاندار شاہ کی تخت نشینی کب ہوئی؟
2. چوتھ کسے کہتے ہیں؟
3. سردیش مکھی کسے کہتے ہیں؟
4. امبر کہاں واقع ہے؟
5. دستک کس کو دیا جاتا تھا؟

6. اجارہ کسے کہتے ہیں

7. فرمان سے کیا مراد ہے؟

8. نادر شاہ نے کب حملہ کیا؟

9. پانی پت کی تیسری جنگ میں کسے شکست ہوئی؟

10. بہادر شاہ ظفر کا انتقال کب ہوا؟

9.16.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بہادر شاہ کی سکھوں کے خلاف مہم کے بارے میں نوٹ لکھیے۔
2. سید برادران کے بارے میں مختصراً بیان کیجیے۔
3. نادر شاہ کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
4. مراٹھوں کے دہلی پر پہلے قبضے کے بارے میں لکھیے۔
5. پانی پت کی تیسری جنگ کے بارے میں لکھیے۔

9.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. فرخ سیر کے عہد حکومت پر ایک تفصیلی لکھیے۔
2. محمد شاہ کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. پہلی جنگ آزادی میں بہادر شاہ کے کردار، ان کی گرفتاری اور مقدمہ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

9.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chandra, Satish (2007), *Medieval India: From Sultanat to the Mughal Empire*, Har Anand Publications Pvt. Ltd.,
2. Irvine, William (2006), *The Later Mughals*, Low Price Publications.
3. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
4. صفدر حیات صفدر عہدِ مغلیہ مع دستاویزات، نیو بک پیلیس، اردو بازار، لاہور۔
5. آر پی ترپاٹھی سلطنتِ مغلیہ کا عروج و زوال۔
6. ستیش چندرا عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان۔

اکائی 10۔ مغل سلطنت کا زوال

(Decline of the Mughal Empire)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب۔ماہیت ونوعیت
10.2.1 اورنگ زیب کے جانشین
10.2.2 مغل دربار میں امراء کی گروہ بندی
10.2.3 معاشی وزرعی بحران
10.2.4 جاگیرداری نظام
10.2.5 مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی ذمہ داری
10.2.6 مرہٹہ کا عروج
10.2.7 بیرونی حملے
10.2.8 مغلوں کا فوجی نظام
10.3 اکتسابی نتائج
10.4 کلیدی الفاظ
10.5 نمونہ امتحانی سوالات
10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

10.0 تمہید (Introduction)

مارچ 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی مغل تاریخ میں ایک نئے باب عہد کا آغاز ہو گیا۔اورنگ زیب کے عہد تک مغل سلطنت اپنی وسعت اور ترقی کے لحاظ سے بام عروج پر تھی مگر اس کے انتقال کے ساتھ ہی اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں عظیم حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔اورنگ زیب کی وفات کے پچاس برسوں کے اندر ہی بہت سی نئی طاقتیں علاقائی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ہندوستان پر بیرونی حملے ہوئے اور مغل بادشاہ کی طاقت اور وقار ختم ہو گیا۔ مغل دربار سیاسی گروہ بندی اور سازش کا مرکز بن گیا۔اس کا فائدہ اٹھا کر ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔1957ء کی بغاوت کی سربراہی کرنے کے الزام میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو تخت سے ہٹا کر انگریزوں نے ہندوستان میں مغلوں کے اقتدار کو ختم کر دیا اور ہندوستان برٹش راج کے کنٹرول میں میں آ گیا۔18ویں صدی کی ابتداء میں بہت سی مغل مخالف طاقتیں ابھریں جنہوں نے مغل سلطنت کے زوال میں گونا گوں کردار ادا کیا۔18ویں صدی کی ابتداء ہی سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا۔نئی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔سکھ، جاٹ اور مراٹھوں نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کی اور بیرونی حملے بھی اسی دوران ہوئے۔18ویں صدی نے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی پیمانے پر زبردست تبدیلی کا مشاہدہ کیا۔ہندوستان میں اس تبدیلی کی اہمیت اس لیے ہے کہ عظیم مغل سلطنت جو دنیا بھر کی ہمعصر سلطنتوں میں اپنی وسعت، شان وشوکت اور استحکام کیوجہ سے ممتاز تھی اور اتحاد کے شعور کو بیدار کرنے رکھتے ہوئے مختلف جہات میں ترقی کی طرف رہنمائی کی تھی بالآخر 18ویں صدی کی ابتداء یعنی اورنگ زیب کی وفات معاً بعد ہی سے زوال پذیر ہونے لگی تھی۔اور اس کا رقبہ سمٹ کر نواح دہلی تک محدود ہو گیا۔عام طور سے مغل تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(1)از بابر تا اورنگ زیب (1526-1707)(2)1707تا 1857 جبکہ بہادر شاہ ظفر کو تخت وتاج سے محروم ہونا پڑا۔پہلے دور کو ہم سیاسی استحکام اور فتوحات کا دور کہہ سکتے ہیں جبکہ دوسرے دور کو سیاسی انتشار اور زوال کا دور کہہ سکتے ہیں۔یہی وہ عہد ہے جس میں مغل سلطنت بتدریج کمزور ہوئی اور اس کی جگہ دوسری طاقتوں نے لینی شروع کر دی۔1757ء میں پلاسی کی جنگ میں برطانیہ نے بنگال کو اپنے قبضہ میں کر کے سات سال کے اندر مشرقی ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔اس کے بعد 1764ء میں بکسر کی جنگ اور سو سال کے اندر 1857 کا واقعہ ہو گیا اور ہندوستان مکمل طور سے ایک غیر ملکی حکومت کا حصہ بن گیا۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عظیم مغل سلطنت کے زوال کے اسباب جان سکیں گے۔
- مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی ذمے داری کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کے جانشینوں کے کردار سے واقف ہو سکیں گے۔
- مغل دربار میں سیاسی گروہ بندیاں کس طرح مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنیں، اس کی وضاحت کر سکیں گے۔

- جاگیرداری اور زرعی نظام کے وہ کون سے نقص تھے جس نے زوال کی راہ ہموار کی، سمجھ سکیں گے۔
- مراٹھوں کا عروج اور بیرونی حملے مغل سلطنت کے زوال کے کس حد تک ذمے دار تھے؟ وضاحت کر سکیں گے۔

10.2 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب (Causes for the Decline of Mughal Empire)

اِرون اور جادو ناتھ سرکار نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کا انتہائی آرام طلب ہو جانا ہی مغل سلطنت کے زوال کا خاص سبب مانا ہے۔ ان دانشوروں کے اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو شاہجہاں کے زمانے میں ہی مغل سلطنت کا پوری طرح زوال ہو جانا چاہیے تھا۔ 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی لیکن مغل سلطنت 1857ء تک برقرار رہی۔ البتہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی سے مغل سلطنت کا طمطراق اور دبدبہ کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں حکومت کے عزت و وقار اور اس کی شان و شوکت میں کمی آگئی تھی اور شاہ عالم کے عہد میں مغل سلطنت سمٹ کر دلی تک محدود ہو گئی تھی 'حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم'۔ اطہر عباس رضوی لکھتے ہیں کہ 'اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی اکبر اعظم جیسا پیدا ہو جاتا تو مغل سلطنت زوال سے بچ سکتی تھی۔' اس کا مطلب ہے کہ اورنگ زیب کے بعد وسیع حکومت کو چلانے کے لیے جس قسم کے اہل حکمرانوں کی ضرورت تھی اس کا فقدان رہا۔ اس طرح اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کو حکومت کو زوال کا واضح سبب کہا جا سکتا ہے۔

جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب کی مذہبی اصول پرستی سے پیدا شدہ ہندو مسلم کی تفریق کو زوال کی اصل وجہ بتایا ہے۔ ستیش چندر نے منصب داری اور جاگیرداری نظام میں مغلوں کے زوال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اس کی تائید عرفان حبیب نے بھی کی۔ کچھ دانشوروں کی رائے میں حکومت کی وسعت ہی زوال کا سبب بنی۔ ابن حسن کا کہنا ہے کہ 'ملک میں کوئی قومی جذبہ کارفرما نہیں تھا اس لیے زوال ہوا۔ راجپوت سرداروں کی طرح مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی اور جذبہ رقابت ہی حکومت کی بنیادوں کو ہلا دینے والا اہم سبب تھا اور آخر کار اسی سبب نے اس حکومت کا خاتمہ بھی کر دیا۔' اکبر سے اورنگ زیب تک کے حکمراں کا کرشمہ تھا جس کی وجہ مغل سلطنت کو خوشحالی اور حاصل ہوئی اور اعلیٰ و ادنیٰ ہر سطح کے علاحدگی پسند عناصر کو سر اٹھانے کا موقع مل نہ سکا۔ ان عظیم مغل حکمرانوں کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے فطری رجحان کا مظاہرہ کیا اور تاریخ نے اپنے آپ کو اس راہ پر دہرایا جس پر چل کر قومیں اور ریاستیں تباہ و برباد ہوتی آئی تھیں۔ سکھ، راجپوت، سید، شیخ، افغان، ایرانی و تورانی جو معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقہ کے نمائندہ تھے اس حکومت کے زوال میں برابر کے شریک ہیں۔ اس حکومت کے زوال کی ذمہ داری کسی ایک سبب یا کسی ایک بادشاہ کو ذمہ دار نہیں مانا جا سکتا۔ بلکہ اس حکومت کے زوال میں مختلف قسم کے اسباب ذمہ دار تھے جن میں نااہل جانشین اور بعد کے کمزور و بزدل مغل حکمراں، دربار میں سیاسی گروہ بندیاں، معاشی و زرعی بحران، جاگیری و منصب داری بندوبست کی کمیاں، مراٹھوں کا عروج، بیرونی حملے، بادشاہوں اور امراء کا عیش پسند ہونا شامل ہیں۔

10.2.1 اورنگ زیب کے جانشین (Successors of Aurangzeb)

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی متعین اصول و ضابطہ نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ مغل حکمراں تخت حاصل کرنے کے لیے طاقت کا

استعمال کرتے تھے جیسے شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور اس کی پیروی میں اس کے بیٹوں اور پوتوں نے بھی بغاوت کی۔ جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی شہزادہ خسرو نے بغاوت کر دی اور جہانگیر کے آخری عہد میں شاہجہاں بھی باغی بن گیا۔ اسی طرح شاہجہاں جب بیمار پڑا اور اس نے دارا شکوہ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تو شجاع، اورنگ زیب اور مراد نے اس کی مخالفت کی اس طرح بھائیوں کے مابین تخت نشینی کی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس طرح جانشینی کے سوال کو لیکر بیٹوں اور بھائیوں کی بغاوت ایک روایت بن گئی تھی جو حکومت کے لیے نقصاندہ ثابت ہوئی۔

اورنگ زیب کے جانشینوں میں انتظامی صلاحیت، سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کی کمی تھی جس کے باعث یہ عظیم مغل سلطنت کو استحکام نہیں دے سکے اور حکومت آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو گئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت معظم، اعظم اور کام بخش بالترتیب کابل، گجرات اور بیجاپور کے صوبیدار تھے۔ اورنگ زیب نے اپنی وصیت میں اپنے بیٹوں سے پر امن طریقہ سے حکومت کو تقسیم کرنے کے لیے کہا تھا لیکن تینوں نے ہی اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد حکومت حاصل کرنے کے لیے بھائیوں کے بیچ جنگ شروع ہو گئی اور اس جنگ میں فتح کے بعد بہادر شاہ (شاہ عالم اول) مغل سلطنت کا وارث بنا۔ اس میں ہمہ جہت صلاحیت نہیں تھی اس لیے یہ مغل سلطنت کو مستحکم نہیں کر سکا۔ اس طرح جہاندار شاہ (13-1712) فرخ سیر (19-1713) محمد شاہ (48-1719) محمد شاہ (48-1719) احمد شاہ (54-1748) عالمگیر ثانی (59-1754) شاہ عالم ثانی (1806-1760) اکبر ثانی (37-1806) اور بہادر شاہ (57-1837) کل آٹھ مغل حکمران ہوئے لیکن یہ عظیم مغل سلطنت کو زوال سے بچا نہیں سکے۔ محمد شاہ کے عہد میں مغل سلطنت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ سکھ، جاٹ، مرہٹے، سرکشی پر اتر آئے اور بیرونی حملے خصوصاً نادر شاہ کے حملے نے مغل سلطنت کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی کے دور میں نئی ریاستوں کو عروج کا موقع ملا۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں مغل بادشاہ محض نام کارہ گیا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے کچھ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا لیکن بعد میں امراء کی سیاست کا شکار ہو گیا۔ اسی کے زمانے میں مراٹھوں کا دلی پر قبضہ کرنے کا خواب پورا ہوا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے اور آخر کاران مغل حکمرانوں کی نااہلی اور امراء کی سازش نے مغل سلطنت کو زوال کے دہانے پر پہنچا دیا۔ ولیم ادون نے مغل سلطنت کے زوال کو حکمرانوں اور امراء کے ذاتی معیار اور عدم صلاحیت کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کا اہم سبب بعد کے مغل حکمراں کا نااہل ہونا تھا ساتھ ہی یہ عیش پرست ہو گئے اور اتنے بزدل تھے کہ وہ حکومت پر کنٹرول نہیں کر سکے۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں حکومت معاشی لحاظ سے بحران کا شکار ہو گئی تھی اور حکومت کا کاروبار پوری طرح سے امراء کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

10.2.2 مغل دربار میں امراء کی گروہ بندی (Groupism of Mughal Nobles)

18 ویں صدی کے نصف اول میں مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کے خلاف فوجی کاروائیوں کی ناکامی اور مغل امراء کی بے عملی کی وجہ سے یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کی خاص وجہ خود امیر طبقہ کی نالائقی اور ان کی بداخلاقی تھی۔ ستیش چندر کا یہ کہنا ہے کہ مغل سلطنت کا زوال امیر طبقے کی بدکرداری کے باعث ہوا ٹھیک نہیں لگتا۔ مغل بادشاہوں نے امراء حکومت کی جو تنظیم قائم کی تھی وہ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ امور انتظامیہ کی صحیح طور پر انجام دہی، سماجی اقدار کی استواری، حکومت کی فوجی اور سیاسی ذمہ داریوں کا سر

انجام اور حقیقت میں خود حکومت کے استحکام اور تنظیم کا انحصار امراء کی تنظیم کی کارفرمائی پر منحصر تھا۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد حکومت پر امراء کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور چھوٹے چھوٹے علاقوں کے آزاد حکمراں اور مرہٹہ سرداروں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔

امراء طبقہ اپنے مفاد کے حصول، آپسی رنجش اور حسد جلن میں مصروف ہو گیا اور دربار ایرانی و تورانی گروہ میں تقسیم ہو گیا جس میں تورانی سنی تھے اور ایرانی شیعہ۔ ان دونوں گروہ کے امیر حکومت کے مفاد کی فکر نہ کر کے ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے میں مشغول رہتے۔ امراء کی اس سیاسی گروہ بندی اور آپسی حسد و جلن کے باعث بادشاہ کی پوری طاقت سرکش اور باغی عناصر کی بیخ کنی میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ان دونوں گروہ کی آپسی کشمکش و دشمنی کے باعث ہی نادر شاہ کے حملے کے وقت مغل سلطنت کو بے پناہ جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا اور مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرا۔ امیروں کی ایک جماعت یہ چاہتی تھی کہ مغل سلطنت کی بنیاد صرف مسلمان ہوں اور ان میں بھی اختیارات خاص طور سے یعنی ایرانی اور تورانی امیروں کے ہاتھ میں رہیں۔ دوسری جماعت یہ سمجھتی تھی کہ حکومت کا انحصار ہندو مسلمان دونوں پر ہونا چاہیے۔ اس لیے حکومت کا کوئی خصوصی تعلق اسلام سے نہ ہو۔ دربار میں گروہ بندی کی بنیاد ذات برادری و مذہب نہ ہو کر ذاتی مفادات تھے۔ امراء حکومت کے مفاد کے مقابلے اپنے فائدے کو اہمیت دینے لگے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم خان، مرزا راجہ جے سنگھ، فاضل خان جعفر خان اور رائے رگھوناتھ جیسے لائق اور وفادار امراء کا فقدان ہو گیا تھا۔ بعد کے مغل حکمرانوں کے عہد میں سوائی جے سنگھ، ذوالفقار خان، نظام الملک اور خان دوران وغیرہ ایسے امیر تھے جن کی وفاداری مشکوک تھی اور یہ سب اپنے مفاد کے حصول ہی میں مصروفِ عمل رہتے۔

اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے اواخر میں دربار میں جو گروہ بندیاں وجود میں آئیں وہ قبیلہ، خاندان اور تعلقات اور شخصی مفادات پر مبنی تھیں۔ چنانچہ ذوالفقار خان جو ایرانی تھا اس کی پشت پناہی عبد الصمد خاں جیسے تورانی مراء، داؤد خان جیسے افغان امراء اور راؤ رام سنگھ ہاڑا اور دلپت بندیلہ جیسے ہندو سردار کر رہے تھے۔ سید برادران جو ہندوستانیوں کے ہمدرد کہے جاتے تھے انہوں نے ایسے تورانی امراء جیسے نظام الملک، محمد امین خان اور عبد الصمد خان وغیرہ کی وابستگی حاصل کرنے کی کوشش کی، دربار میں گروہوں کے وجود میں آنے کا سبب یا پس منظر مغل سلطنت کے وقار کے زوال کے سبب تھا جو مراٹھوں، جاٹوں اور سکھوں مخالف تحریکوں سے اطمینان بخش حد تک نہ نپٹنے کی وجہ سے معروض وجود میں آیا اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد کی خانہ جنگی نے حکومت کی صورت حال کو مزید کمزور کر دیا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے بعد سے کوئی کامیاب حکمراں تخت نشین نہیں ہوا۔ اس طرح نااہل مغل جانشین اور امراء کی گروہ بندی، ان کی بدکرداری و بداخلاقی نے مغل سلطنت کو زوال سے ہم کنار کیا۔

10.2.3 معاشی وزرعی بحران (Economic and Agricultural Crisis)

مغل سلطنت معاشی نکتہ نظر سے اورنگ زیب کے عہد تک مستحکم تھی۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شاہی خزانہ خالی ہونے لگا اور حکومت کی معاشی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ معاشی بحران کے سلسلے میں مورلینڈ کا کہنا ہے کہ 'غیر محتاط عیش و عشرت کی وجہ

سے ملکی آمدنی کا بڑا حصہ غیر پیداواری مشغلوں میں ضائع ہو جاتا تھا اور چونکہ آبادی کا وہ حصہ جو کچھ پیدا نہ کرتا تھا خاص طور پر شہروں اور چھاؤنیوں میں آباد تھا۔ جبکہ پیدا کرنے کا عمل بیشتر دیہات میں انجام پاتا تھا۔ 'لٰہذا مور لینڈ کے الفاظ میں 'اسی معاشی نظام کے تحت کسان خود بھوکارہ کر دوسروں کا پیٹ بھرنے اور بنکر خود ننگا رہ کر دوسروں کو کپڑا مہیا کرنے پر مجبور تھا۔' اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہی تھی کہ 'پیداوار' سے زیادہ صرف تھا اور یہی اس نظام کی تباہی کا سبب ثابت ہوا۔ عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ جاگیروں کے تبادلے کے باعث کسان استحصال کا شکار ہوا۔ اس طرح کسان نے اس کا حل آبائی پیشے یعنی کاشت سے فرار کی شکل میں دریافت کیا جس کی وجہ سے پیداوار گھٹی جسے معاشی وزرعی بحران سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عرفان حبیب کے مطابق مغل سلطنت کے زوال کے اسباب اس کے زرعی نظام میں موجود تھے جس کی وجہ سے نہ صرف کاشت کاری میں انحطاط رونما ہوا بلکہ پیدا کرنے والے بھی پیداوار کے صارفین کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور ہوئے اور جس عمل اور رد عمل کے طور پر حکومت مالی خسارے سے دوچار ہوئی اور جنگوں کے طویل سلسلوں نے مزید شدت پیدا کردی ۔مارکسسٹ نظریہ کے مؤرخین مغل سلطنت کے زوال کی وجہ سماج کے معاشی ڈھانچے میں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح اقتصادی بدانتظامی کو مغل سلطنت کے زوال کی بنیادی وجہ کہا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مالیات اور تجارت میں اضافہ کے باوجود کاشت کی پیداوار بقدر ضرورت نہیں بڑھ سکی۔ لگان میں اضافہ کی وجہ سے قابل کاشت زمین ہونے کے باوجود بے روزگار کاشت کار مزدور کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اسی طرح منصب داروں کی تعداد میں اضافہ نے بھی اقتصادی حالت کو اور کمزور کیا۔ اخراجات کم کرنے کے لیے فوجی اخراجات میں تخفیف کی گئی جس سے فوجی قوت میں تنزل آیا۔

عرفان حبیب مغل سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ، مغل سلطنت کی وسعت کے ساتھ ہی حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ حکومت کی آمدنی کا اصل ذریعہ زراعتی ٹیکس تھا۔ مغل حکمرانوں نے اپنے بڑھتے ہوئے خرچے زراعتی ٹیکس میں اضافہ کرکے پورے کیے مگر زراعت کی پیداوار کو جدید طریقوں سے بڑھانے کی کوشش نہیں کی اسی وجہ سے کسانوں بغاوت ہوئی اس طرح حبیب مغل سلطنت کے زوال کے اسباب زراعتی نظام کے ساتھ ہی طبقاتی کشمکش میں بھی ڈھونڈتے ہیں۔

10.2.4 جاگیرداری نظام (Feudal System)

مغل سلطنت کی انتظامی اور اقتصادی ناکامی جاگیری بحران یا جاگیروں کے فقدان کے باعث ہوئی۔ مسئلہ جاگیر نے بہت سے نئے مسائل کو پیدا کیا جنہیں بعد کے حکمراں حل نہ کرسکے، اس طرح مغل عہد کا جاگیردارانہ نظام مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنا۔ منصب داروں کو جاگیریں ان کی تنخواہ کے عوض ملتی تھیں۔ جاگیریں تبدیل ہوتی رہتی تھیں اور عموماً یہ جاگیریں کسی منصب دار کے پاس تین چار سال سے زیادہ نہیں رکھی جاسکتی تھیں جس کی وجہ سے جاگیرداروں کسانوں کے مفاد کو دھیان میں نہیں رکھتے تھے۔ اطہر علی کا کہنا ہے کہ مغلوں کے زوال کے اسباب ان کے جاگیرداری نظام میں مضمر تھے جب جب تک یہ نظام صحیح طریقے پر کام کرتا رہا حکومت کے لیے کوئی خطرہ اس سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن ایک خاص دور میں جب اس نظام میں بحران پیدا ہونے لگا تو حکومت بھی بحرانی دور سے گزرنے لگی۔ ان کے مطابق جاگیرداری نظام اپنی حقیقی شکل اور مغل معیار کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد کے وسط تک کام کرتا رہا لیکن اورنگ زیب کے آخری 26

برسوں میں دکن کی متواتر جنگوں کیوجہ سے حکومت کے مالی وسائل پر پڑنے والے منفی اثرات شمالی ہند میں دربار اور حکمراں کے نہ ہونے کی وجہ سے انتظامی مشنری کا متاثر ہونا نیز اس انتظامی طریقہ کار کا پیچیدہ ہونا جس کے ذریعہ جاگیریں تفویض کی جاتی تھیں وغیرہ وغیرہ ایسے اسباب تھے جنھوں نے مل کر جاگیرداری نظام کو متاثر کیا۔ جس چیز نے جاگیرداری نظام کی جڑیں ہلائیں اسے معموری کے الفاظ میں 'بے جاگیری' کہا جاسکتا ہے۔ یعنی حکومت کے پاس پائے باقی ختم ہوچکی تھی یعنی جاگیریں دی جانے والی زمین کی قلت تھی۔ پائے باقی کی کمی سے حکومت آگاہ تھی۔ خود اورنگ زیب نے شاہزادہ اعظم کو لکھا تھا 'پائے باقی کی کمی ہے اور تنخواہ کے دعویداروں کی کثرت'۔ پائے باقی کی کمی کی وجہ سے اورنگ زیب نے 1691ء میں بخشیوں کو منع کردیا تھا کہ وہ منصب دلانے کے لیے نئے آدمیوں کو پیش نہ کریں۔ پائے باقی کی کمی نے جاگیرداری نظام کی کارکردگی کو دشوار بنادیا تھا۔ جن لوگوں کو منصب مل جاتے وہ اکثر جاگیر پانے میں ناکام رہتے۔ جاگیر پانے کے لیے دربار میں رشوت اور جوڑ توڑ کا دور شروع ہوا اور امراء اپنے فرائض منصبی اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے اپنی جاگیر حاصل کرنے اور اس کی برقراری پر توجہ دینے لگے۔

ستیش چندر نے مغلوں کے زوال کے اسباب منصب داری اور جاگیرداری نظام کی ناکامی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں نظاموں کی صحیح کارکردگی پر ہی مغلوں کی مرکزیت پسند سیاست کی بنیاد تھی۔ جب منصب داری اور جاگیرداری نظام میں بحران آیا تو یہ مغل سلطنت کا زوال ثابت ہوئی۔ نورالحسن کا نظریہ ہے کہ تمام سرداروں کو اعلیٰ مناصب اور اسی مناسبت سے جاگیریں نہیں دی جاسکتی تھیں جس کے نتیجہ میں جاگیروں پر دباؤ بڑھنے لگا اور بادشاہ تمام سرداروں کی خواہشات پوری کرنے کے قابل نہ رہا۔ رچرڈز نے اطہر علی کے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے کہ حکومت کو جاگیروں اور پائے باقی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مطابق حکومت کو کسی قسم کی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لیے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے انضمام کے بعد مغلوں کے مالی وسائل کافی بڑھے بلکہ ان صوبوں کا مالی استحصال بھی کیا گیا، اور جہاں تک پائے باقی کی قلت کا مسئلہ ہے، رچرڈز کا کہنا ہے کہ یہ قلت مصنوعی تھی اور اورنگ زیب نے فوجی مصارف کے پیش نظر ملک کی بہترین زمینوں کو خالصہ میں تبدیل کرنا شروع کیا چنانچہ ان کے مطابق صرف 1695ء اور 1695ء میں ہی 17 لاکھ روپئے کی جمع کی پائے باقی کو خالصہ میں تبدیل کیا گیا۔ اس طرح رچرڈز کے مطابق پائے باقی کی قلت مصنوعی تھی اور یہ اقدام حکومت حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تھا۔ جب جاگیرداری اور منصب داری نظام میں بحران آیا تو یہ مغل سلطنت کے زوال کو نہ روک سکا۔

10.2.5 مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی ذمہ داری

(Aurangzeb's Responsibility in the Decline of Mughal Empire)

سرجادوناتھ سرکار عظیم مغل سلطنت کے زوال کا باعث اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کی غیر رواداری کی پالیسی کے تحت ہندو مسلم کے اختلافات بڑھے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس نے اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو بدل کر حکومت کے تئیں ہندوؤں کی وفاداری کو ختم کردیا۔ جس ہندو مسلم کے اتحاد کو اس کے اجداد نے بڑی محنت کے بعد پروان چڑھایا تھا وہ ختم ہونے لگی۔ نیز حکومت میں جذب ہونے کا جو عمل جاری تھا وہ نہ صرف رک گیا بلکہ اس دور میں وہ ہندو جو حکومت میں رچ بس گئے تھے یا حکومت کی

ج لائیفک بن چکے تھے خود کو اس سے علاحدہ کرنے لگے۔ جادو ناتھ سرکار کی رائے کو مختصر الفاظ میں یوں کہا کیا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے خلاف جو ہندورد عمل ہوا وہی مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنا۔یعنی اورنگ زیب کی مذہبی اصول پرستی سے پیدا شدہ ہندو مسلمان کی تفریق مغل سلطنت کے زوال کا سبب تھی۔

اکثر مؤرخین مغل سلطنت کے زوال کی تمام تر ذمہ داری اورنگ زیب پر عائد کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے سیاست کو مذہب میں داخل کرکے مغل سلطنت کے آزاد خیال کردار کو کمزور کیا۔اس نے مغل سلطنت کے اداروں میں تبدیلیاں شروع کیں جبکہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو مغل سلطنت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔اور اس نے مغل سلطنت کو چلانے کے لیے وہی سیاسی حکمت عملی اپنائی جو اس سے قبل کے حکمرانوں کی پالیسی تھی۔ بعض مؤرخین تنہا اورنگ زیب کو مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ولیم ارون کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی نے نہ صرف سپاہی پیشہ راجپوت قبائل کو بلکہ عام ہندؤں کو بھی اس کا مخالف بنادیا اور ایسے دور میں جبکہ قوم پرستی اور وطن پرستی کا وجود نہ تھا صرف حکمراں کی ذات ہی مختلف طبقات اور گروہوں کو ایک مشترکہ مقصد فراہم کرتی تھی۔ چنانچہ بابر اور اکبر اس سلسلے کی بہترین مثالیں ہیں۔ مگر اورنگ زیب مختلف مفادات کے حامل طبقات اور گروہوں کو مطمئن رکھتے ہوئے ایک مشترکہ مقصد فراہم کرنے میں ناکام رہا جس کی بڑی وجہ بقول ولیم ارون اس کی مذہبی تنگ نظری تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے عہد میں ہی مغل سلطنت اپنی قوت و مرکزیت کھو چکی تھی۔اس کے علاوہ ولیم ارون کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی پالیسیوں کے رد عمل میں مرکز گریز رجحانات بڑھے جو اورنگ زیب کی حیات میں تو کافی حد تک دبے رہے تاہم اس کے جانشینوں اور بعد کے مغل حکمرانوں کے عہد میں پوری طرح سامنے آگئے۔

اورنگزیب کا انتقال 1707ء میں ہوا اور پوری طرح سے مغل سلطنت کا خاتمہ 1802ء میں ہوا پھر بھی کچھ مؤرخین نے اورنگ زیب کو یہ کہتے ہوئے ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ جنوب کی مسلم ریاستوں کو مراٹھوں کے خلاف منظم نہیں کرسکا۔ جنوب کے ہندو اس کے مذہبی رجحانات کو بنیاد بنا کر ناخوش رہے۔راجپوت سرداروں کی مکمل حمایت حاصل کرنے میں بھی وہ ناکام رہا۔ جبکہ جنوب کی مسلم ریاستوں نے نہ صرف اورنگ زیب کے خلاف مراٹھوں سے دوستی کی بلکہ اس کے بیٹے اکبر کو باغی بنانے میں سب سے زیادہ یہی مسلم ریاستیں ذمہ دار ہیں۔ ہر ایک چیز پر غور کرنے سے مذکورہ بالا سارے ثبوت اور جواز بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں۔ راجپوتوں کی ریاست میں دو دعویداروں کے درمیان جھگڑے کو سلجھانے کے لیے اس نے دخل اندازی کی۔ راجپوت علاقوں پر اسے براہ راست یا بالواسطہ قابو رہا۔ بہت سے راجپوت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ مغل سلطنت کا زوال اورنگ زیب کی وجہ سے ہوا۔اورنگ زیب کے بعد مذہبی پالیسی اور بغاوت کے بیشتر مسائل کا حل بہادر شاہ اول کے زمانہ میں نکالا جاچکا تھا اور مغلوں کے مخالف گرو گوبند سنگھ، جاٹ، ستنامی اور مراٹھوں وغیرہ کی بغاوتوں کو خاموش کردیا تھا پھر بھی مغل سلطنت انتشار سے بچ نہ سکی۔اورنگ زیب سخت گیر، ہندو مخالف اور مغل سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی حکومت کے قیام کے لیے اتنا ذمہ دار نہیں تھا جتنا کہ اسے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔

10.2.6 مراٹھوں کا عروج (Rise of the Marathas)

بیجا پور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ زیب نے اپنی تمام تر طاقت مراٹھوں کے خلاف لگادی۔اورنگ زیب نے تقریباً25سال مراٹھوں کے خلاف جنگ میں صرف کیا تھا مگر مراٹھوں کے خلاف یہ جنگ فیصلہ کن نہیں رہی۔مرہٹہ سردار سنبھاجی نے اورنگ زیب کے باغی بیٹے اکبر کو پناہ دیکر اورنگ زیب کو ایک بڑا چیلنج دیا تھا۔مرہٹہ سرداروں نے کھلے عام مغل علاقوں میں لوٹ مار شروع کردی تھی اور مغل فوج کو دیکھ کر وہ ادھر ادھر چھپ جایا کرتے تھے۔مراٹھوں کا خاتمہ کرنے کے بجائے اورنگ زیب نے انہیں سارے دکن میں اپنی حرکات و سکنات مزید مزید تیز کرنے کا موقع دیا تھا۔ سمبھاجی کے چھوٹے بھائی راجہ رام کی حکومت تو قائم ہوئی لیکن راجدھانی پر مغلوں کا حملہ ہوتا دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ گیا۔راجہ رام نے بھاگ کر مشرقی سرحد پر جنجی میں پناہ لی اور وہاں سے اس نے مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔اس طرح مراٹھوں کی بغاوت مغرب تا مشرق پھیل گئی۔اورنگ زیب نے جنجی میں راجہ رام کو محاصرہ میں لے لیا۔یہ محاصرہ کافی دنوں تک جاری رہا۔1698ء میں جنجی کا زوال ہوا لیکن راجہ رام وہاں سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔مراٹھوں کے حملوں میں تیزی آگئی۔کئی مرتبہ مغلوں کو کثیر نقصان اٹھانا پڑا۔مراٹھوں نے کھوئے ہوئے کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا۔راجہ رام ستارا واپس آنے میں کامیاب ہوا۔مغلوں اور مراٹھوں کی کشیدگی برقرار رہی۔1702ء میں اورنگ زیب نے مراٹھوں سے بات چیت شروع کی۔سمبھاجی کے بیٹے ساہو کو وہ رہا کرنے پر آمادہ ہوگیا۔اس وقت ساہو ستارا میں اپنی ماں کے ساتھ قید تھا۔ساہو کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔شیواجی کی ریاست اور دکن میں 'سردیش مکھی' کا اختیار ساہو کو دیکر اس کی خصوصی حیثیت تسلیم کرنے کے لیے اورنگ زیب تیار تھا لیکن خفیہ معلومات کی بناء پر اورنگ زیب نے آخر میں مراٹھوں سے مشتبہ ہو کر اس سارے منصوبہ کو رد کردیا۔1706ء میں اورنگ زیب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مراٹھوں کے تمام قلعوں پر قبضہ کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی جنگ جاری رہی۔ 1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور مراٹھوں کو دم لینے کا موقع مل گیا۔جنوبی ہند میں اورنگ زیب کے برسرپیکار رہنے کی وجہ سے شمالی ہند کی خبر گیری وہ اچھی طرح سے نہیں کرسکا جس سے یہاں کے جاٹوں، سکھوں، ستنامیوں اور راجپوتوں کو بغاوت کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور ان بغاوتوں نے مغل سلطنت کی بنیاد کو کمزور کردیا۔ اورنگ زیب کے جانشین ان باغی طاقتوں کو کچلنے میں موثر کردار ادا نہیں کرسکے اس طرح جنوبی ہند میں مراٹھوں کا عروج مغل سلطنت کے زوال میں مددگار ثابت ہوا۔

10.2.7 بیرونی حملے (External Attacks)

18ویں صدی میں یعنی 1739ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔اس میں مغل فوج کو شکست ہوئی۔ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے۔نادر شاہ نے پورے دلی شہر میں قتل عام کا حکم جاری کیا اور خود شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔اپنے نام کے سکے جاری کیے اور خطبہ میں اپنا نام شامل کرایا۔اور جب وہ ہندوستان گیا تو بیش بہا دولت اپنے ساتھ لے گیا۔تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی اپنے ساتھ لے گیا۔نادر شاہ کے اس حملے سے شاہی خزانہ خالی ہوگیا۔بہت سے صوبے مغل سلطنت سے الگ ہوگئے اور مغل بادشاہ کے عزت و وقار میں کمی کے ساتھ ہی مغل سلطنت بالکل کمزور ہوگئی۔احمد شاہ ابدالی کا حملہ 1761ء تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔یہ حملہ مراٹھوں کے خلاف تھا۔ہندوستان کی

بعض مقتدر شخصیات نے مراٹھوں اور دیگر باغی عناصر کی سرکوبی کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔اس میں نجیب الدولہ ،شاہ ولی اللہ اور جے پور کے راجہ مادھو سنگھ اور مارواڑ کے راجہ سر فہرست ہیں۔ مذکورہ شخصیات نے ابدالی سے مراٹھوں کے خلاف مدد مانگی تھی ۔ان لوگوں کی اپیل پر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت کے میدان میں 1761ء میں افغانی فوج اور مراٹھوں کے بیچ زبردست جنگ ہوئی اس میں مراٹھوں کو شکست ہوئی۔ جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو شہنشاہ تسلیم کیا۔احمد شاہ ابدالی کے حملے سے مغل سلطنت کمزور ہوئی اور انہیں بیرونی حملوں نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ ولیم ارون لکھتا ہے کہ ان دونوں حملوں سے مغل سلطنت کی شان وشوکت ختم ہوگئی۔

10.2.8 مغلوں کا فوجی نظام (Military System of the Mughals)

مغل سلطنت کی کمزوری کے ساتھ ہی فوج کا ادارہ بھی کمزور ہوا اور اس کمزوری کی وجہ مغل سلطنت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ مغلوں کا فوجی نظام منصب داری نظام پر منحصر تھا اور بادشاہ منصب داروں کی فوج پر منحصر ہوا کرتے تھے۔ ہر منصب دار کی اپنی فوج ہوا کرتی تھی اور فوج کی بھرتی منصب دار خود کیا کرتا تھا۔ منصب داروں کے فوجیوں کی تنخواہ بھی منصب داروں کے ذریعہ ملتی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ اور فوجیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ فوجی اپنے منصب دار کو ہی اپنا مالک سمجھتے اور اس کے وفادار رہتے تھے۔ منصب داری نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی منصب دار بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دیتا تو اسے اپنے فوجیوں کا تعاون حاصل ہو جاتا تھا۔اس لیے مغل بادشاہ اپنے طاقت ور منصب دار سے ہمیشہ خوف محسوس کرتے تھے۔ جب تک بادشاہ مضبوط اور طاقت ور رہا تب تک تو منصب داروں پر پورا کنٹرول رہا اور منصب داروں کا پورا تعاون حاصل رہا۔ بعد کے مغل حکمراں کمزور اور بزدل ثابت ہوئے جس کی وجہ سے منصب داروں پر کنٹرول نہیں رہا اس وجہ سے فوجی نظام میں کمزوریاں آئیں اور مغل سلطنت کا زوال ہوا۔ مستقل فوج کے نہ ہونے کے باعث بیرونی حملوں کے مقابلے اور اندرونی بغاوت کے کچلنے میں مغل ناکام رہے۔

پیٹر ہارڈی مغلوں کی ناکامی اور زوال کے اسباب مغلوں کی فوج میں تلاش کرتے ہیں۔ خصوصاً فوج اور منصب داروں کی تنخواہ کی ادائیگی کے بارے میں حکومت کی پالیسی کو اس کا اہم سبب بیان کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ شروع میں ان لوگوں کو تنخواہ جاگیر کی شکل میں دی جاتی تھی لیکن 1580ء اور 1583ء کی بغاوتوں کے دوران اکبر نے یہ محسوس کیا کہ منصب داروں کو اسی صوبے میں جاگیر دینا مناسب نہیں جہاں ان کا تقرر ہو اس کے علاوہ اس نے نقد تنخواہ دینے کا ارادہ بھی کیا۔ نقد تنخواہ دینے کا طریقہ پوری طرح رائج نہیں ہو پایا تاہم منصب دار کو اس سے متعلقہ صوبے کے باہر جاگیر دیے جانے کا طریقہ رائج رہا۔ لیکن اورنگ زیب نے 1694ء میں یہ حکم جاری کیا کہ دکن میں ان ہی امراء کو جاگیر دی جائے جو وہاں مقرر ہوں۔ شاید اس کے پیچھے یہ نظریہ کارفرما تھا کہ اپنی جاگیروں کے تحفظ کے لیے وہ زیادہ دلجمعی سے کام کریں گے۔ لیکن اس سے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ حکومت کا وفادار بھی رہے اور یہی بے وفائی اورنگ زیب کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مغل سلطنت کو روبہ زوال کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہی۔ 18ویں صدی میں پورے عالم میں صنعتی تبدیلیاں عروج پر تھیں ان تبدیلیوں سے فوج سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ غیر ممالک میں توپیں تیار ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان ان تبدیلیوں کا فائدہ نہیں اٹھا سکا اور یہاں غیر

سائنسی طریقہ سے بندوق اور چھوٹی توپ ہی بنتی رہی جو 1700ء تک کافی پرانی تکنیک ہو چکی تھی۔ مغل اب بھی تلواروں سے لڑنے والے گھوڑے سواروں پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ 1739ء میں ہونے والی لڑائی میں نادر شاہ کی فتح مندی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس کی فوجوں نے یوروپین اور عثمانی توپ خانہ کی نقل پر بنایا ہوا توپ خانہ استعمال کیا تھا۔ اس طرح مغل سلطنت کے زوال میں جہاں منصب داری نظام نے اپنا اہم رول ادا کیا وہیں نئی تکنیک اور نئے اسلحہ کے عدم استعمال نے بھی مغل سلطنت کے زوال کی راہ ہموار کی۔

10.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عظیم مغل سلطنت کے زوال کے لیے تنہا کوئی سبب ذمہ دار نہیں تھا۔ متعدد اسباب کیوجہ سے مغل سلطنت کا زوال ہوا۔ اورنگ زیب کے جانشینوں اور بعد کے نااہل مغل حکمرانوں کو مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار مانا جاسکتا ہے۔ اکبر سے اورنگ زیب تک جو بھی مغل حکمراں تھے ان جیسی سیاسی حکمت عملی اور صلاحیت بعد کے مغل حکمراں میں ناپید تھی ان کی یہی نااہلی حکومت کے زوال کا باعث بنی۔ معاشی وزرعی بدحالی کو بھی مغل سلطنت کے زوال کی وجہ کہا جاسکتا ہے۔ پیداوار بقدر ضرورت نہیں بڑھ سکی۔ منصب داروں کی تعداد میں اضافہ نے بھی اقتصادی حالت کو کمزور بنایا۔ جاگیروں کی کمی کے باعث منصب داروں میں بے چینی بڑھی اور ان منصب داروں نے جاگیروں کو موروثی بنانے کی کوشش کی اور خالصہ زمین پر قبضہ کیا۔ مغل سلطنت کا زوال کسی ایک سبب یا صرف اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کیوجہ سے نہیں ہوا بلکہ مغل سلطنت کی انتظامی و اقتصادی ناکامی۔ جاگیرداری نظام، زرعی و معاشی بحران، جاگیروں (پاے باقی) کی کمی اور فوجی نظام کی کمزوری، مراٹھوں کے عروج اور بیرونی حملے کیوجہ سے ہوا۔ جاگیرداری نظام اور منصب داری نظام نے بہت سے نئے مسائل پیدا کیے جنہیں بعد کے مغل حکمراں حل نہ کر سکے۔ اسی طرح مقامی بغاوتیں، مذہبی تنازعات، دربار کی گروہ بندی جیسے بحران شدید ہوتے گئے اور یہ مغل سلطنت کی بربادی کا باعث بنے۔

10.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

پے باقی	:	جاگیریں دی جانے والی زمین
خالصہ زمین	:	خالص سرکاری زمین
ستنامی	:	ہندو فقیروں، جوگیوں کا گروہ، یہ لوگ زیادہ تر مسلح رہتے تھے۔

10.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1707ء میں کس مغل بادشاہ کی وفات ہوئی؟
2. پلاسی کی جنگ کس سن میں ہوئی؟

3. بکسر کی جنگ کب ہوئی؟

4. مغل سلطنت مکمل طور پر کس سن میں ختم ہوئی؟

5. جہاندار شاہ کب سے کب تک بادشاہ رہا؟

6. اورنگ زیب کے فوراً بعد کون بادشاہ جانشین ہوا؟

7. محمد شاہ کا دور حکومت کب سے کب تک تھا؟

8. فرخ سیر کا انتقال کس سن میں ہوا؟

9. نادر شاہ نے ہندوستان پر کب حملہ کیا؟

10. احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر کب حملہ کیا؟

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اورنگ زیب کے جانشین مغل سلطنت کے زوال میں کس حد تک ذمہ دار ہیں۔ تحریر کریں۔

2. مغل سلطنت کے زوال میں فوجی نظام کس حد تک ذمہ دار ہے۔ وضاحت کریں۔

3. احمد شاہ ابدالی کے حملے کی اہمیت لکھیں۔

4. جنوبی ہند میں مراٹھوں کا عروج مغل سلطنت کے زوال میں کہاں تک مددگار ہوا واضح کریں۔

5. معاشی و زرعی بحران مغل سلطنت کے زوال میں کتنے مددگار ثابت ہوئے جائزہ لیں۔

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کے زوال کے اسباب کی نوعیت و ماہیت واضح کریں۔

2. مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی ذمہ داریوں کا جائزہ پیش کریں۔

3. مغل سلطنت کے زوال میں امراء کی گروہ بندیاں کہاں تک ذمہ دار ہیں واضح کریں۔

10.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Farhat Nasreen, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
2. Jadu Nath Sarkar. *A Short History of Aurangzeb*, 1962.
3. M. Ather Ali. *The Mughal Mobility under Aurangzeb*.
4. Satish Chandra. *Parties and Politics at the Mughal Court*. New Delhi, 1972.
5. S.R. Sharma. *Mughal Empire in India*, Agra, 1971.

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

اکائی 11۔ مغلوں کا مرکزی نظام حکومت

(Central Administration of the Mughals)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 مغل نظریہ بادشاہت

11.3 مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ

11.3.1 وکیل (وزیر اعظم)

11.3.2 دیوان (وزیر مالگزاری و خزانہ)

11.3.3 میر بخشی (وزیر عساکر)

11.3.4 میر سامان (سرکاری فرنیچر کا نگران)

11.3.5 صدر الصدور

11.3.6 نظام عدل و انصاف

11.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران

11.4 اکتسابی نتائج

11.5 کلیدی الفاظ

11.6 نمونہ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

11.0 تمہید (Introduction)

1526ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ظہیرالدین محمد بابر نے 1526ء میں رکھی جسے اس کے جانشینوں نے پروان چڑھایا۔ ہمایوں کی شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد شیر شاہ نے ایک بہترین انتظامیہ شمالی ہند میں قائم کی جس سے بعد میں اکبر نے فائدہ اٹھایا۔ اکبر سے اورنگ زیب تک تمام مغل حکمرانوں نے مغل سلطنت کو بہتر نظم ونسق کے ذریعہ استحکام بخشا اور ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس اکائی میں ہم مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی نوعیت، مغل نظریہ بادشاہت اور مرکزی ڈھانچے کے تحت ان محکموں اور افسروں کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے جن کی موجودگی سے مغل سلطنت کا مرکزی نظام بحسن خوبی چل رہا تھا۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغلوں کے نظریہ بادشاہت سے واقف ہو سکیں گے۔
- مرکزی نظام حکومت کی نوعیت اور اس کے ڈھانچہ کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔
- بادشاہ کے فرائض اور رعایا کے ساتھ اس کے طریق کار و طرز عمل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغل انتظامیہ میں رائج محکمہ جات اور ان کے افسران مثلاً وکیل، وزیر، دیوان، میر بخشی، میر سامان، صدر الصدور کے کاموں، ان کے فرائض اور شعبہ پر پڑنے والے ان کے اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔
- نظام عدل وانصاف سے متعلق معلومات فراہم کر سکیں گے۔

11.2 مغل نظریہ بادشاہت (Mughal Theory of Monarchy)

مغل سلطنت کے فرمانرواں ظہیرالدین محمد بابر نے مغل بادشاہت کی بنیاد ترک اور منگول نظریہ بادشاہت پر رکھی جس میں کچھ عنصر ترک نظریہ حکومت سے لیے اور کچھ منگول نظریہ بادشاہت سے۔ ترک سلاطین سے لیکر اورنگ زیب تک سبھی مطلق العنان فرنرواں تھے لیکن دونوں (سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ) میں جو ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مغلوں نے سلاطین دہلی کی طرح خلیفہ کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ مغل سمجھتے تھے کہ اقتدار اعلیٰ ان کو حاصل ہے۔ اس لیے انہوں نے سلطان کے بجائے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ مسلم دور حکومت میں جو نظام رائج تھا وہ شخصی حکومت واقتدار کا مظہر تھا۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اپنے طور پر ایسا نظام تجویز کیا تھا جس سے ان کی مطلق العنانی بھی قائم رہ سکتی تھی اور وہ ظالم بھی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ پوری سلطنت میں کسی مفتی اور عالم کو یہ اختیار نہ تھا کہ بادشاہ کے فیصلہ کے خلاف کوئی قدم اٹھالے۔ اگر علماء بادشاہ کے کسی فیصلے کے خلاف آواز اٹھاتے انہیں جلاوطنی کی سزا دی جاتی۔ اکبر تو مذہبی معاملات میں آخری حجت تسلیم کیا گیا تھا۔ بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ تھا۔ تمام سیاسی افکار اور ریاست کے فرائض بادشاہ میں مرکوز سمجھے جاتے تھے۔

مغل نظریہ بادشاہت جو ترک منگول نظریہ بادشاہت پر مشتمل تھا اس میں فرمانروا ایک عام رہنما سے زیادہ اعلیٰ و برتر سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہت کا مطلب ہوتا تھا طاقت، عام طور پر روز مرہ کی زندگی میں شریعت کو عام قانون سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھیں ۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستان سے باہر کسی بھی طاقت کی فکری اور عملی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا۔ باہر سے اورنگ زیب تک سبھی نے یہ تسلیم کیا کہ بادشاہت عطیہ خداوندی ہے۔ مغل نظریہ بادشاہت بھی خدائی نظریہ پر قائم تھا۔ انہوں نے بھی ظل اللہ کا لقب اختیار کیا لیکن یہ نظریہ بادشاہت جو فرایزدی پر قائم تھا شاہجہاں تک چلا۔ شاہجہاں کی نظر میں بادشاہت کا مطلب ان لوگوں کی زندگی کو آسان اور آرام دہ بنانا ہے جو خدا کی امانت اور دولت ہیں۔ بادشاہ کو اپنی ساری دولت کمزوروں کی بہتری اور خدا کے بندوں کے لیے صرف کر دینی چاہیے۔ ابوالفضل نے مغل نظریہ بادشاہت کی تفصیل درج ذیل لفظوں میں بیان کی ہے۔

'بادشاہت خدا کا نور پر اور آفتاب کی ضیاء ہے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں ہم اسے فرایزدی کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اسے پر عظمت حلقہ انور کہتے تھے۔ یہ روشنی براہ راست خدا کی جانب سے بادشاہوں کو ودیعت کی جاتی ہے اور انسان اس کو دیکھ کر ان کی بارگاہ میں اپنا سر عقیدت سے خم کر دیتا ہے۔' شاہجہاں عادل خاں کے نام ایک فرمان میں اپنے آپ کو سایہ خداوندی قرار دیتا ہے۔ 'سایہ خدا ئیم۔' ابوالفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہت خدا کا عطیہ ہے جو اس وقت تک کسی کو ودیعت نہیں کیا جاتا جب تک اس میں ہزاروں اوصاف جمع نہیں ہو جاتے۔ ابولفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہ کو مذاہب سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اسے تقلید کے بجائے تحقیق سے کام لینا چاہیے۔ جہانگیر بھی بادشاہت کو عطیہ خداوندی سمجھتا ہے۔ شاہجہاں اور جہانگیر دونوں نے اکبر کے ذریعہ نافذ کیے گئے اصول سیاست اور نظم حکمرانی کو اہمیت دی اور اس کی پیروی بھی کی۔

اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے سے پہلے کے حکمرانوں سے متاثر تھا وہ خود اس پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اپنے بیٹوں کو بھی اس طرح کی تلقین کرتا رہتا تھا اس کی شہادت اورنگ زیب کے وہ رقعات ہیں جو اس نے اپنے بیٹے سلطان محمد اعظم کے نام تحریر کیے ہیں۔ 'ایک روز سعد اللہ خان شاہجہاں کی خدمت میں دیر سے حاضر ہوئے اعلیٰ حضرت نے سبب پوچھا اس نے عرض کیا کہ ایک بیاض میں چند فقرے نظر آئے تھے انہیں نقل کر رہا تھا تاکہ خدمت والا میں عرض کر دوں کہ سلطنت کی بنیاد کا قیام انصاف سے ہے، ملک و مال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالموں اور فاضلوں کے ساتھ صحبت رکھنا اور جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔ عقیدوں پر عمل کرنا ۔۔۔ ہنا، مصیبت کی حالت میں مستقل مزاج، دنیا کے کاموں میں کوتاہی نہ کرنا، تدبیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا، خاندان کے دائمی قیام کی بنیاد یتیموں پر رحم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے، ملکی کام وزراء کے صلاح و مشوروں سے انجام پاتے ہیں اور فتح و کامرانی فقیروں کی دعا سے، اور تندرستی دردمندوں کا درد دور کرنے سے نصیب ہوتی ہے، مجرموں کے گناہ معاف کر کے خدا کی جانب سے رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔'

اس خط میں پورا نظریہ بادشاہت اور حکمرانی کے تمام اصول موجود ہیں۔ انہیں خطوط پر اس نے اپنی سیاسی زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت یہ تھا کہ بادشاہ کو لطف و قہر کے معاملہ میں جادہ اعتدال پر رہنا چاہیے۔ اس نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ

بادشاہت کا مطلب ہے کہ لوگوں کو ظلم وزیادتی سے محفوظ رکھنا، عوام کی سرپرستی کرنااور عیش وعشرت کی زندگی سے بچنا چاہیے۔اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے پیشرو حکمرانوں سے ضرور مطابقت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس نے کچھ مذہبی نظریات کو بھی ترجیح دی ہے۔ اس نے جہاں مغل بادشاہت اور شاہی طور وطریق کو تسلیم کیا وہیں وہ فرایزدی کا کہیں قائم نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نظریات قرآن کے سیاسی اصول پر مبنی تھے۔ بحیثیت حکمراں دیگر مغل بادشاہوں کی طرح اس کا یقین تھا کہ بادشاہ بنانے کا اختیار اللہ کو حاصل ہے۔اوپر ابوالفضل کے الفاظ اور اورنگ زیب کے خطوط سے جس نظریہ بادشاہت کو ظاہر کیا گیا ہے وہی دراصل مغلوں کا نظریہ بادشاہت تھا۔

11.3 مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ (Central Structure of Mughal Administration)

مرکزی نظام حکومت میں اگرچہ بادشاہ ہی سب سے اہم ہوتا تھا اور حکومت کے سارے معاملات اسی کے ارد گرد ہوتے تھے پھر بھی مرکز کے سارے معاملات کی نگرانی کرنا تنہا بادشاہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ حکومت کے نظم ونسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک مجلس وزارت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ کتنا ہی لائق، مطلق العنان، اور قابل ہو لیکن بغیر وزیروں وعہدیداروں کی مدد کے وسیع وعریض سلطنت پر کنٹرول ممکن نہیں تھا۔سیاسی مفکرین نے بادشاہ کے لیے وزیروں وصلاح کار کی ضرورت پر خاص زور دیا جاتا ہے اور کہا ہے کہ ان کی ذمہ داری اور فرائض میں سے ہے کہ وہ بادشاہ کی مدد کریں اور نظم ونسق کے سلسلے میں اسے مشورہ دیں اور اس کے کاموں کو عملی جامہ پہنائیں۔ مغل انتظامیہ میں وزیروں کی حیثیت حکمرانوں کے ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ بابر نے مہدی خواجہ کو اپنا وزیر اور زین الدین کو اپنا صدر بنایا تھا۔ مگر ہمایوں کے عہد میں کسی کو بھی سکریٹری سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی گئی۔ وزیروں کی تعداد ہمیشہ غیر متعین رہتی تھی۔ وزراء کی مدد سے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے۔ مغل انتظامیہ میں سب سے اہم عہدہ وکیل یا وزیر کا ہوتا تھا۔ عملاً وہ انتظامیہ کا مالک ومختار ہوتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اکبر کا پہلا وکیل بیرم خان تھا۔

مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ درج ذیل محکموں پر مشتمل تھا۔

1. وکیل (وزیر اعظم)
2. دیوان (وزیر مالگزاری وخزانہ)
3. میر بخشی (وزیر عساکر)
4. سپر سامان (وزیر کارخانہ وذخائر سلطنت)
5. صدر الصدور (وزیر انصاف وامور مذہبی)
6. نظام عدل وانصاف

اس کے علاوہ محتسب، سپر آتش، داروغہ ڈاک چوکی، مستقفی، ناظر بیوتات، سپر براور داروغہ ٹکسال جیسے عہدے بھی تھے۔

11.3.1 وکیل (وزیراعظم) (Prime Minister)

مرکزی حکومت بلکہ پوری سلطنت میں اعلیٰ ترین افسر وکیل ہوتا تھا۔وہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔اس کے خیالات لا محدود ہوتے تھے۔اس کو وکیل/وزیراعظم کہا جاتا تھا۔وہ تمام شاہی اختیارات کا استعمال کرتا تھا۔امور خانہ داری سے لیکر شعبہ انتظامیہ تک اس کے دائرہ اختیار میں تھے۔اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمام کاروائیوں سے بادشاہ کو باخبر رکھے۔وہ کسی افسر کو مقرر یا برخاست کر سکتا تھا۔بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔بابر اور ہمایوں ایک وزیر رکھے جانے کی روایت پر قائم تھے۔ان میں بابر کے تحت نظام الدین خلیفہ اور ہمایوں کے تحت امیر واعظ اور ہندو بیگ کو یکساں درجہ حاصل رہا۔ان کو سارے فوجی اور غیر فوجی اختیارات حاصل تھے۔شیر شاہ سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔اس کے عہد میں بادشاہ پردے کے پیچھے تھا اور حکومت وکیل (بیرم خان) کی تھی۔بیرم خان نے اپنی مرضی سے جاگیریں تقسیم کیں۔وہ ہفتہ میں دو مرتبہ دیوان خاص میں بیٹھتا اور فوجی وغیرہ فوجی امور کی مناسب طور سے انجام دیتا تھا اور اس کی اطلاع بہ کمال ادب بادشاہ کو بھیج دی جاتی تھی۔وہ بادشاہ کے ذاتی معاملات میں مداخلت بھی کیا کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اکبر نے بیرم خان کے اختیارات سلب کر لیے اور اسے معزول کر دیا۔

بیرم خان کے بعد سیاسی و مالی امور شہاب الدین گورنر دہلی کے سپرد کر دیے گئے تھے اور بعد میں بھی اس کی شریک کار بنادی گئی۔ بیرم خان کا علم، طبل اور تمن شمس الدین اتکہ خان کو عطا کر دیا گیا۔ منعم خان کو خانخانان کا خطاب عطا کیا گیا اور منصب وکالت سے بھی نوازا گیا ۔اس طرح بیرم خان کے اختیارات اور اعزازات تین اشخاص کے درمیان تقسیم کر دیے گئے۔ اکبر نے منعم خان کو وکیل بنایا لیکن اسی کے بعد اکبر نے آہستہ آہستہ وکیل کے اختیارات اور طاقت کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس مقصد سے اکبر نے دیوان یا وزیر کے اختیارات میں اضافہ کر دیا اور مستقبل میں وکیل کے عہدے کی اہمیت کم ہو گئی۔منعم خان کے بعد سال بہ سال تک اس عہدے پر کسی کا تقرر نہیں ہوا۔اکبر نے اپنے جلوس کے انیسویں سال مظفر کو ان خدمات کے اعتراف میں منصب وکالت پر سرفراز کیا۔اسے بیک وقت دیوانی اور وکالت دونوں عہدے تفویض کیے گئے لیکن کچھ ہی دنوں میں اسے وکالت سے برطرف کر دیا گیا۔اس کے بعد بالترتیب عبدالرحیم خانخانان تین سال اور خان اعظم دس سال منصب وکالت پر فائز رہے۔اکبر کے جانشیوں کے عہد میں کسی بھی وکیل کو وہ اختیارات حاصل نہ ہو سکے جو ایک شاہی حکومت میں ایک وکیل (وزیراعظم) کو حاصل ہوتے ہیں۔

جہانگیر (1605-1627) کے عہد میں منصب وکالت پر شریف اور آصف خان کا تقرر ہوا دونوں کو دکن روانہ کر دیا گیا اور انہیں دارالسلطنت آنے کا موقع نہیں ملا۔اس لیے وکیل ہوتے ہوئے بھی انہیں اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا۔تخت نشینی کے چوتھے سال جہانگیر نے امور سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اکیس سال تک کسی وکیل کا تقرر نہیں کیا۔اپنے عہد حکومت کے آخری سال میں جہانگیر نے اعتمادالدولہ کے لڑکے آصف خان کو اپنا وکیل مقرر کیا اس طرح جہانگیر کے بائیس سالہ عہد حکومت میں کل تین شخص صرف پانچ سال تک وکالت کے فرائض انجام دیے۔شاہجہاں (1627-1658) نے وکیل کے اہم عہدہ پر آصف خان کا تقرر کیا اور ملکہ کی سفارش پر مہر ازک یا مہر اعظم بھی اسی کے سپرد کر دی تھی۔آصف خان نے شہنشاہ شاہجہاں کی تخت نشینی کے پندرہویں سال وفات پائی

اوراس کے بعد شاہجہاں کے عہد میں کسی نئے وکیل کی تقرری عمل میں نہیں آئی۔

وکیل کے ذمہ جو کام تھے اس میں اتکہ خان اور منعم خان نے سیاست اور مالگزاری سے متعلق سارے امور انجام دیے۔اسی طرح مظفر اپنے منصب وکالت کے دوران انتظام سلطنت میں پوری طرح دخیل تھا۔جہانگیر کے عہد میں آصف کو قطعی طور پر یہ حکم تھا کہ وہ دیوان میں بیٹھے اور سیاست ومالیات سے متعلق معاملات کو سلجھائے۔وکیل حیثیت اور رتبے کے لحاظ سے سلطنت کے اعلیٰ ترین فرد سمجھے جاتے تھے! اس طرح ان کا مقام ومرتبہ دیوان سے کہیں زیادہ بلند تھا۔انہیں اعزاز ووقار حاصل تھا مگر اختیار نہیں حاصل تھا۔

11.3.2 دیوان (وزیر مالگزاری وخزانہ) (Finance Minister)

مغل سلطنت میں دوسرا اہم عہدہ دار وزیر تھا جسے دیوان کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔دیوان یہ ایرانی لفظ ہے اس کا تعلق 'دبیر' بمعنی کاتب سے ہے اور یہ سریانی لفظ 'دیب' سے متعلق ہے جس کے معنی جمع خرچ کے ایسے رجسٹر کے ہیں جن میں ابتدائی فتوحات کے زمانے میں اندراجات کیے جاتے تھے۔ابن خلدون کا کہنا ہے 'دیوان لفظ اس رجسٹر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں مالگزاری اور مالیات کے افسروں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے قواعد وضوابط کا اندراج ہوتا تھا۔' بعد میں اس کا استعمال ان افسروں کے لیے اور ان کے بیٹھنے کے ایوان کے لیے بھی ہونے لگا۔ مغل عہد میں یہ مالگزاری اور مالیات کے سربراہ کے لیے مخصوص ہو گیا۔اکبر کے عہد میں دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جبکہ جہانگیر کے عہد میں لفظ دیوان کی جگہ وزیر کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور شاہجہاں کے عہد میں وزیر کو دیوان کل،دیوان اعلیٰ اور اس کے شرکائے کار کو دیوان کہا جانے لگا۔وکیل کے بعد سب سے بااختیار افسر دیوان تھا جو وزیر یا دیوان کل بھی کہلاتا تھا۔اکبر کے عہد میں اس شعبے کے لیے کبھی کبھی وزیر اور عام طور پر دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے۔جہانگیر کے عہد میں دیوان یا وزیر شاہجہاں کے عہد میں دیوان کل یا دیوان اعلیٰ اور اورنگ زیب کے عہد میں وزیر،وزیر اعظم جیسے الفاظ کا استعمال شعبہ مالیات کے وزیر کے لیے ہوتا تھا۔دراصل دیوان ہی شعبہ مال ومالگزاری کا اہم وزیر ہوتا تھا مگر سبھی دیوان وزیر نہیں ہوتے تھے۔

دیوان شعبہ مالیات کا مستقل صدر ہوتا تھا۔وہ جملہ انتظامی شعبہ جات کی باقاعدہ کارکردگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔اس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ابوالفضل کے مطابق مال سے متعلق تمام معاملات میں وہ بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔وہ ہر اہم وضروری کاغذ پر دستخط کرتا تھا۔وہ مالگزاری کی تشخیص وتعیین اور اس کی وصولی کا نظم کرتا تھا اور ان کاموں سے متعلق بادشاہ کی رائے بھی لیا کرتا تھا۔شعبہ مالگزاری کے اہم عہدیدار ہونے کی وجہ سے اس کا تعلق سبھی سرکاری عملے سے تھا جو کہ نقد تنخواہ یا جاگیر حاصل کرتے تھے۔اس کی نیابت میں نائب نائب دیوان ہوتے تھے۔ایک 'دیوان تن' کہلاتا تھا جو جاگیروں کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا 'دیوان خالصہ' کہلاتا تھا جو شاہی املاک کا ذمہ دار ہوتا تھا ۔تیسرا 'دیوان بیوتات' کہلاتا تھا جس کا کام مختلف کارخانوں کی آمد وصرف کا بیورا رکھنا ہوتا تھا۔مرکزی شاہی خزانے کی دیکھ بھال کے لیے 'مشرف خزانہ' نامی عہدیدار ہوتا تھا جو دیوان کے ماتحت ہوتا تھا۔اس کے علاوہ دیوان وزارت میں واقعہ نویس اور دوسرے عہدیدار بھی ہوا کرتے تھے۔حسب ذیل عہدیدار براہ راست وزیر (دیوان) سے متعلق تھے۔

1. مستوفی یا محاسب اعلیٰ: یہ سلطنت کی آمدنی اور خرچ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھا۔اس کو اختیار تھا کہ اخراجات کی مد کم کردے۔شعبہ جات مالگزاری کے جملہ کاغذات پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔
2. صاحب توجیہہ: تنخواہ تقسیم کرنے والا،اس کی ذمہ داری صرف دارالسلطنت کے ملازمین کی تنخواہ بانٹنا تھا۔معماروں اور دستکاروں کی فرد حساب پر پہلے وہ دستخط کرتا تھا۔تب مستوفی کے پاس کاغذات جاتے تھے۔

حسب ذیل عہدیداروں کا تقرر دیوان کے ذریعہ ہوتا تھا۔

1. صدر مقام : صوبیدار، فوجدار، دیوان، کروڑی، امین اور داروغہ
2. صوبائی : مشرف، تحویلدارانِ دیہات (جو دفتر خزانہ میں تعینات رہتے تھے) خزانچی اور خزانے کے داروغہ اور محرران دفتر خزانہ
3. امین اور کروڑی :: وہ اشخاص جو اہم اور ضروری کاموں کی عمل درآمد کرانے کی خدمات پر مامور ہوتے تھے۔
4. تحصیل دار : بقایہ جات کی وصولی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔
5. زمین دار : مالگزاری وصول کرنے والے ایجنٹ

اکبر کے دیوان میں مظفر خان، ٹوڈر مل اور شاہ منصور جہانگیر کے دیوانوں میں اعتمادالدولہ اور خواجہ ابوالحسن اسی طرح شاہجہاں اور اورنگ زیب کے وزیروں میں بالترتیب سعداللہ خان اور اسد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

11.3.3 میر بخشی (وزیر عساکر) (Defence Minister)

مغل سلطنت میں بخشی اعلیٰ عہدے پر فائز عہدیدار ہوا کرتا تھا جس کے ذمہ فوجیوں کی بھرتی اور ان کی تنخواہ دینے کا کام سپرد تھا۔میر بخشی کا منصب ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مغل سلطنت میں میر بخشی کو محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو ولی سلطنت میں دیوان عرض کو حاصل تھے۔اس کے اختیارات مرکزی حکومت کے تمام شعبے تک پھیلے ہوئے تھے۔ محکمہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا ہر منصب دار سے تعلق تھا۔سپاہیوں کی بھرتی کا جائزہ اور دوسرے عسکری معاملات کا نگران بھی تھا۔اس کی مدد کے لیے ایک نائب بخشی بھی رہتا تھا جس کو بخشی دوم کہا جاتا تھا۔نئے سپاہیوں اور منصب داروں کے گھوڑوں کو داغ ونشانی کے بعد بخشی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔اسی طرح مستقل عہدیداروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی مقررہ وقفہ کے بعد وہی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ صوبوں سے آنے ولے تمام عہدیداروں کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔میر بخشی غسل خانے (خلوت خانہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا۔اس طرح سلطنت کے تمام اہم معاملات سے اس کا تعلق ہوتا تھا۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔اکثر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اور اس کے رفقاء کار خود میدان جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ کرتے۔میر بخشی اور اس کے شریک کار روزانہ کے دفتری کام بھی انجام دیا کرتے تھے۔میر بخشی کی غیر موجودگی میں بخشی دوم دربار میں حاضر ہو کر رہنے والے منصب داروں کی فہرست تیار کرتا تھا لیکن

اس کی غیر موجودگی میں جاری ہونے والے تمام احکام اس کے سامنے اس کے دفتر میں پیش کیے جاتے تھے جہاں تک منصب داروں کی تنخواہوں کے حساب کا تعلق تھا میر بخشی اپنے دفتر میں وہ تمام کاغذات محفوظ رکھتا تھا جن پر اس کی مہر لگتی اور اس کے دستخط ہوتے تھے۔ لیکن تنخواہ پر اثر انداز ہونے والی رخصت اور غیر حاضری کے کاغذات بخشی دوم کے دفتر میں رکھے جاتے تھے۔ میر بخشی شہزادوں اور بڑے بڑے امراء کا کام انجام دیتا۔ بخشی دوم اس سے کچھ کم درجہ کے منصب داروں کے کام انجام دیتا اور بخشی سوم کے ذمہ منصب داروں سے متعلق کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا وہ صرف یومیہ داران کے تقرر اور ان کی تنخواہوں میں ترقی سے متعلق کام انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اختیارات، حیثیت اور اثر ورسوخ میں دیوان اعلیٰ کا ہم پلہ تھا۔ میر بخشی کو عموماً فوجوں کی تنخواہ تقسیم کرنے والا عہدیدار سمجھا جاتا تھا لیکن یہ اس کے روزمرہ کے مستقل فرائض میں داخل نہیں تھا۔

11.3.4 میر سامان (سرکاری فرنیچر کا نگران) (Minister of the Royal Household)

میر ساماں کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا تھا، صرف ان کو دیا جاتا تھا جو باصلاحیت اور قابل اعتماد ہوں۔ چنانچہ افضل خان، سعد اللہ خان اور فاضل خان اس عہدہ پر کام کر چکے تھے اور بعد میں وزرائے سلطنت ہوئے۔ اس محکمہ کے عہدیدار دربار میں بادشاہ کے سامنے تمام اہم معاملات اور بڑے بڑے کاموں کے خرچ کے تخمینے پیش کرتے تھے۔ یہ محکمہ مصنوعہ سامان بادشاہ کے سامنے نمائش کے لیے رکھتا اور متعلقہ دستکار کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ میر ساماں کے محکمہ کو کارخانہ جات کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ محکمہ ان گوداموں اور کارخانوں پر مشتمل تھا جنہیں مرکزی حکومت نے سرکاری اغراض سے قائم کر رکھا تھا۔ اس کا تعلق ہیرے جواہرات، تلواروں، بندوقوں اور قیمتی پتھروں سے ہوتا تھا۔ یہ محکمہ فوج کے لیے گھوڑے اور ہاتھی، نقل وحمل کے لیے بار برداری کے جانور اور شاہی شکار کے لیے دوسرے جانوروں کا انتظام رکھتا تھا۔ میر ساماں لفظ کا استعمال اکبر کے زمانے میں نہیں ملتا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں میر ساماں اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں تقررات اور دربار شاہی کے دوروں کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے تمام ہمعصر مؤرخین نے میر ساماں ہی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ آئین وضوابط جن کا تعلق اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے ہی ان میں زیادہ تر 'خان سامان' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میر ساماں کا لفظ صرف ایک دستور میں ملتا ہے جو اس میں خان ساماں ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میر ساماں اپنے محکمہ کا سب سے بڑا انتظامی عہدیدار ہوتا تھا جو محکمے کی عام نگرانی اور اس کی کامیاب کارکردگی کا ذمہ دار ہوتا تھا اس کے ماتحت جو دوسرے عہدیدار تھے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ دیوان بیوتات، مشرف کل و جزء، داروغہ، تحویلدار، مستوفی، داروغہ کی کچہری، ناظر وغیرہ مغل انتظامیہ میں داروغہ اور تحویل دار کا ذکر جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں اکثر ملتا ہے لیکن ناظر محکمہ کا ذکر نہیں ملتا۔ میر ساماں صدر محکمہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا اور ہر شعبے کی عام نگرانی بھی کرتا تھا۔ وہ تمام امور اور تجارتی معاملات کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کراتا اور بقیہ کام خود ہی انجام دیا کرتا تھا۔ شاہی کارخانے اور بھنڈار اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ وہ مختلف چیزوں کی پیداوار اور ان کی فراہمی کے لیے بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ بادشاہ کے لیے اسلحہ وغیرہ کا بھی انتظام کرتا تھا۔ اسے دیوان عام وخاص کا انتظام، کارخانوں کا انتظام وانصرام، اشیاء، شاہی اصطبل کے جانوروں اور لائق صنعت کاروں کے بارے میں بھی بادشاہ کو اطلاع دینی ہوتی تھی اور ششماہی بجٹ بنا کر بھی دینا ہوتا تھا۔ بادشاہ تین طرح سے میر ساماں

کے محکمہ پر کنڑول رکھتا تھا۔

1. وہ ہر چھ مہینہ پر اس محکمہ کے حساب کی جانچ کرتا تھا اور اس کے معاشی انتظام کے لیے حکم دیا کرتا تھا۔
2. وہ دربار میں اس محکمہ کے کام کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا، اشیاء کی قیمتیں متعین کرتا تھا اور احکام صادر کیا کرتا تھا۔
3. وہ شاہی کارخانوں میں تیار کی گئی اشیاء کی خرید و فروخت کی جانچ کرتا تھا اور اچھے و قابل صنعت کاروں کو انعامات و اعزازات سے نوازتا تھا۔

11.3.5 صدر الصدور

صدر بادشاہ اور رعایا کے درمیان بیچ کی ایک کڑی، شریعت کا محافظ اور علماء کا نقیب ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت میں صدر الصدور کا عہدہ بڑا اہم ہوتا تھا۔ وہ محکمہ عدل وانصاف، خیرات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ صدر معاش میں دی جانے والی زمینوں کا منتظم تھا اور یہ زمین کس کو دی جائے اس کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ نئی گرانٹ کے لیے درخواستوں کی چھان بین کرنا اس کے فرائض میں تھا۔ وہ بادشاہ کو مذہبی معاملات میں مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ خیرات و مدد معاش میں دی جانے والی زمین کا تقسیم کار بھی تھا۔ چیف قاضی کی شکل میں مقدمہ کی سماعت کرکے فیصلے بھی دیتا تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضی کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کرتا اور فیصلے بھی دیا کرتا تھا۔ عدل وانصاف کے میدان میں بادشاہ کے بعد اسے دوسرا اہم مقام حاصل تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضیوں کی تقرری کے لیے بادشاہ سے سفارش بھی کیا کرتا تھا۔ اکبر کے ابتدائی دور حکومت میں صدر کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ صدر الصدور کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔ اکبر کے اولین صدر شیخ گدائی کے متعلق بدایونی کہتا ہے کہ وہ قدیم خاندانوں کی مقبوضہ اراضی ضبط کرکے ان لوگوں کو عطا کرتا تو جو کی خوش آمد کرتے تھے جبکہ لائق اور اچھے خاندان کے افراد کو ہر طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی تقرری بیرم خان نے 59-1558 میں کی تھی اس کے بعد خواجہ محمد صالح ہردی صدر بنے۔ بحیثیت صدر خواجہ محمد صالح ہردی کو بھی یہی اختیارات حاصل تھے۔ اس کے بعد 1565 میں شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال پوری آزادی سے کیا اور بڑی بڑی آراضی مستحقین کو عطا کیں۔ اکبر نے انہیں خرد برد میں ملوث ہونے کے باعث 1579 میں ہٹا دیا اس کے بعد سلطان خواجہ اس عہدے پر تقرری ہوئی۔ 1581 میں اکبر نے نو 9 صوبوں میں صدر کی تقرری کی جس سے صدر الصدور کے اختیارات کم ہوئے۔

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کا محکمہ بہت بڑا نہیں معلوم ہوتا۔ آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اہم فرائض کی انجام دہی میں ایک ممتاز کلرک بتیچی صدر کی مدد کرتا تھا جو دیوان سعادت کہلاتا تھا۔ وہ تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔ محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔ اکبر کے عہد میں شیخ گدائی، خواجہ محمد صالح، شیخ عبدالنبی، سلطان خواجہ، میر فتح اللہ شیرازی، اور میران صدر جہاں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔ اسی طرح جہانگیر کے عہد میں میران صدر جہاں تاحیات صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا اس کے بعد موسوی خان صدر الصدور بنا۔ شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں موسوی خان پندرہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا 1642 میں بادشاہ کی غیر اطمینان بخش کردار کی بنا پر برخاست کرکے اس کی جگہ پر سید جلال الدین

گجراتی کا تقرر کر دیا اس کے بعد سید ہدایت اللہ دوسرے سن جلوس سے اختتام حکومت تک صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا۔اور نگ زیب نے اپنے عہد میں آٹھ صدر الصدور کی تقرری کی۔ شاہجہاں کے عہد میں سید جلال الدین تمام صدور میں بہترین تھا اور اپنی علمی فضیلت، دیانت ،ایمانداری اور بے لوثی کے لیے مشہور تھا اور محترم تھا۔

11.3.6 نظام عدل وانصاف (Judicial System)

مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔اس محکمہ کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔وہ سلطنت میں محکمہ عدل وانصاف کا اعلیٰ افسر ہوا کرتا تھا۔وہ عدل وانصاف سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار اور جوابدہ ہوتا تھا۔وہ فوجداری اور دیوانی دونوں طرح کے مقدمات کو سنتا اور فیصلے صادر کرتا تھا اس کی مدد کے لیے بہت سے مفتی اور افسر ہوتے تھے۔ مغل عہد میں قاضی صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی مقرر کیے جاتے تھے۔جج ہونے کے ساتھ قاضی اپنے علاقے کے تمام اوقاف کا متولی بھی ہوتا تھا۔بادشاہ عدل سے متعلق امور میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔روزانہ دربار میں معمولی مقدمے کی سماعت ہوتی ہے۔اہم مقدمات ہفتہ میں ایک بار،ایک دن صرف عدالتی کاموں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔بادشاہ کے سامنے زیادہ تر فوجداری مقدمے پیش ہوتے تھے۔دیوانی کے مقدمات بھی پیش ہوا کرتے تھے۔اکبر نے پنج شنبہ،جہانگیر نے سہ شنبہ اور شاہجہاں نے چہار شنبہ اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔اکبر کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ 'وہ باب عدل کھولتا ہے اور ایک عام دربار منعقد کرتا ہے۔اس کی عدالت میں صداقت وانصاف کا بول بالا ہے اس کام کے لیے وہ ساڑھے چار گھنٹے صرف کرتا ہے۔وہ کسی شخص کی شہادت اور قسم پر اعتبار نہیں کرتا۔'ہاکنز یہی باتیں جہانگیر کے لیے لکھتا ہے۔'بادشاہ اس جگہ تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور روزانہ تقریباً دو گھنٹوں تک دادرسی کے بیٹھتا ہے۔'ڈیلائٹ لکھتا ہے۔'جہانگیر ہفتے میں ایک دن سہ شنبہ کو کرسی عدالت پر بیٹھتا ہے اور پیش کیے جانے والے تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات پورے سکون کے ساتھ سنتا ہے اور اپنے فیصلے صادر کرتا ہے جو آخری اور قطعی ہوتا ہے۔'لاہوری کے مطابق 'شاہجہاں چہار شنبہ کو جھروکہ درشن کرتا اور وہاں سے اٹھ کر دولت خانہ خاص میں بیٹھا کرتا تھا۔اس روز متصدیان عدالت، دادخواہوں کے لیے یادیگر کے لیے استغاثے پیش کرتا ہے۔بادشاہ توجہ سے ان کی باتیں سنتا اور نرمی سے ان پر جرح کرتا اور وہاں موجود علماء کے فتوے کے مطابق فیصلہ صادر کرتا تھا۔

مغل بادشاہوں کا نظام عدل بالکل اسی نہج پر تھا جسے سلاطین دہلی نے شمالی ہندوستان میں قائم کیا تھا۔بادشاہ ایک قاضی القضاۃ کا تقرر کرتا تھا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے۔ قاضی القضاۃ کو سلطنت میں ماتحت قاضیوں کو مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا لیکن بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں، قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کیے جاتے تھے۔ قاضیوں کی نقد تنخواہ ملتی اور ملازمت کی مدت تک کے لیے آراضی مدد معاش عطا کی جاتی۔ہر پرگنے کی بازاروں کے صحیح نرخ کی تصدیق قاضی کیا کرتے تھے جسے دارالحکومت میں بطور اطلاع بھیج دیا جاتا تھا۔مغلوں کے نظام عدل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔کسی کے ساتھ کسی طرح کی رورعایت روا نہیں رکھتے اور قانون کی نگاہ میں سب کو برابر سمجھتے تھے۔

11.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران (Other Officers of the Mughal Administration)

مذکورہ عہدیداران کے علاوہ دوسرے افسران بھی تھے۔ان کا ذکر درج ذیل ہیں۔

1. محتسب: یہ عوام کے اخلاق و کردار سے متعلق شعبہ کا اعلیٰ افسر تھا اس کا کام لوگوں کو بااخلاق بنائے رکھنا تھا۔ محتسب یہ دیکھتا تھا کہ مسلمان شریعت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں یا نہیں۔ عوام کے اخلاق کو درست بنائے رکھنے کے لیے اکبر نے شہروں میں شراب کی خرید و فروخت اور طوائفوں کی رہائش کو ممنوع قرار دیا تھا۔

2. مستوفی (چیف آڈیٹر): یہ کارخانہ جات کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ پورا حساب تیار کرتا۔ مستوفی تحویلدار کی نگرانی میں رہنے والے ہر محکمے کی آمد و خرچ کے گوشوارے تیار کرتا تھا۔

3. میر آتش: یہ داروغہ توپ خانہ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ مغل فوج میں توپ خانے کا اہم افسر ہوا کرتا تھا۔اس کے ذمہ توپ خانے کا نظم ونسق ہوتا تھا۔

4. داروغہ ڈاک چوکی: یہ محکمہ ڈاک و خفیہ شعبہ کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا وہ اپنے ماتحت عملہ کے تعاون سے حکومت کے مختلف حصوں میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات کی جانکاری اکٹھا کرتا تھا اور اس کی اطلاع بادشاہ کو ارسال کرتا تھا۔ سلطنت کے مختلف مقامات پر ڈاک لے جانے کا نظم وہی کرتا تھا۔اس کام میں اس کی مدد کے لیے واقعہ نویس، سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے ہوا کرتے تھے۔

11.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

قانونی طور پر بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا تھا اور قانون الٰہی کے مطابق حکومت کرنا اس کا فرض تھا۔ آئین کے مطابق وہ مختار کل تھا۔ مغل انتظامیہ کی پوری مشین کی قوت کا مخرج بادشاہ ہوتا تھا۔ پوری انتظامیہ کو بحسن وخوبی سرگرم رکھنے کے لیے مرتبہ اور حیثیت رکھنے والے وزراء کی تقرری ہوئی تھی اور ان کے درمیان کاموں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔اس طرح وکیل، دیوان، میر بخشی، میر ساماں، صدر الصدور جیسے محکموں کے علاوہ قاضی القضاۃ، محتسب، مستوفی، میر آتش، داروغہ ڈاک چوکی جیسے افسروں کا تقرر بھی ہوا کرتا تھا۔اس کے علاوہ ناظر بیوتات، میر بر، میر بحر اور داروغہ ٹکسال نامی افسران بھی ہوتے تھے جن کی نگرانی میں مرکزی نظام حکومت پورا انظام متحرک تھا اور ہر شعبہ باقاعدگی سے کام کرتا تھا۔ اہل کار سے لیکر صدر محکمہ تک اپنے فرائض، حیثیت اور روز مرہ کے کام سے واقف تھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں بادشاہ انصاف پرور تھے۔ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ کسی کے ساتھ کسی کسی طرح کی رعایت نہیں ہوتی تھی اور قانون کی نگاہ میں سب برابر تھے۔ مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم، نوعیت، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔

11.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

فرایزدی	:	خدا کا نور، آفتاب کی روشنی، پر عظمت حلقہ نور۔
مہرازک	:	شاہی مہر، مہر اعظم۔
تمن	:	دس ہزار سواروں کا دستہ۔
دبیر	:	چیف سکریٹری۔
میر بخشی/بخشی	:	فوجی محکمہ کا سربراہ اعلیٰ۔
دیوان	:	مالگزاری یا مالیات کا ذمہ دار۔
میر سامان	:	حکومت کے خار خانوں اور مال خانوں کی دیکھ بھال کرنے والا سب سے بڑا عہدیدار۔
صاحب توجہ	:	فوجی محاسب۔
یومیہ داران	:	روزانہ کا بھتہ پانے والا۔ اصطلاحاً وہ عہدیدار اور دوسرے افراد جو کسی منصب کے بغیر نقد تنخواہ یا بھتہ پاتے تھے۔
مشرف کل و جز	:	چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب۔

11.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فرایزدی کسے کہتے ہیں؟
2. مہرازک کسے کہتے ہیں؟
3. تمن کسے کہتے ہیں؟
4. دبیر کسے کہتے ہیں؟
5. میر بخشی/بخشی کون ہوتا تھا؟
6. دیوان کون ہوتا تھا؟
7. میر سامان کسے کہتے ہیں؟
8. صاحب توجہ کسے کہتے ہیں؟
9. یومیہ داران کسے کہتے ہیں؟
10. مشرف کل و جز کسے کہتے ہیں؟

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل انتظامیہ کی مرکزی ساخت کا جائزہ پیش کریں۔
2. وکیل (وزیر اعظم) کے فرائض پر روشنی ڈالیں۔
3. مغل انتظامیہ میں دیوان کی حیثیت اور اس کی ذمہ داریوں پر تبصرہ کریں۔
4. میر ساماں کے اختیارات و فرائض تحریر کریں۔
5. صدر الصدور کی اہم ذمہ داریوں پر نوٹ لکھیں۔

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل نظریہ بادشاہت پر تفصیلی نظر ڈالیں۔
2. مغل سلطنت کے مرکزی ڈھانچہ پر تفصیلی مضمون لکھیں۔
3. مغل انتظامیہ میں میر بخشی کی حیثیت اور اس کے فرائض منصبی کی وضاحت کریں۔

11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Ibne-Hasan. *The Central Structure of the Mughal empire* London,1936.
2. I.H. Qureshi. *The Administration of the Mughal Empire*. Patna, 1979.
3. J.N. Sarkar. *The Mughal Administration*. Calcutta, 1935.
4. U.N. Day. *The Mughal Government*. Delhi, 1970.

اکائی 12۔ مغلوں کی صوبائی نظم حکومت

(Provincial Administration of the Mughals)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 صوبائی نظم ونسق
12.2.1 صوبائی انتظامیہ کی نوعیت
12.2.2 صوبائی گورنر
12.2.3 دیوان صوبہ
12.2.4 صدر صوبہ
12.2.5 قاضی صوبہ
12.2.6 میر عدل
12.2.7 بخشی
12.2.8 کوتوال
12.2.9 دیگر انتظامی محکمہ جات
12.3 مقامی نظم ونسق یا انتظامیہ
12.3.1 سرکار
12.3.2 پرگنہ
12.3.3 گاؤں
12.4 اکتسابی نتائج
12.5 کلیدی الفاظ
12.6 نمونہ امتحانی سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

سلطنت کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنا نظم ونسق کے نقطہ نظر سے بہت ہی ضروری تھا۔قدیم ہندوستان اور مسلم دنیا میں یہ روایت پہلے سے موجود تھی۔دہلی سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلسل سیاسی کمزوری کے باعث سلاطین،صوبائی نظم ونسق کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔بابر اور ہمایوں کو صوبائی نظم ونسق میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے یا نئی روایت قائم کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔شیر شاہ سوری کے عہد میں سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم تھی اس کے عہد کے اہم صوبوں میں بنگال،مالوہ،راجپوتانہ اور ملتان وغیرہ تھے۔صوبائی نظم ونسق کو نئی شکل دینے اور اس کو اچھی طرح عمل میں لانے کا سہرا مغل بادشاہ اکبر کے سر بندھتا ہے۔اکبر نے 1576ء میں خالصہ زمین (جس میں بنگال،بہار اور گجرات شامل تھے) کو مالگزاری وصول کرنے کے لیے 182 اکائیوں میں تقسیم کیا۔اس نے ہر ایک اکائی کی مالگزاری ایک کروڑ دام متعین کی۔وہاں مالگزاری وصول کرنے والا افسر (عامل) اور ایک کروڑی کی تقرری کی مگر یہ عمل کامیاب نہ ہو سکا۔جنوری 1580 میں اس نے اپنی سلطنت کو بارہ 12 صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ان صوبوں سے اکبر کو 90744000 روپئے مالگزاری ملتی تھی۔اکبر نظم ونسق میں یکسانیت لانا چاہتا تھا جس کے باعث اس نے اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا۔اس کے عہد کے صوبے درج ذیل ہیں۔

1۔الٰہ آباد	2۔آگرہ	3۔اودھ	4۔اجمیر	5۔احمد آباد(گجرات)	6۔بہار
7۔بنگال	8۔دلی	9۔کابل	10۔لاہور	11۔ملتان	12۔مالوہ

اکبر نے ہر صوبے میں صوبائی صدر مقام متعین کیا۔اکبر نے جب برار،خاندیش اور احمد نگر کے قلعہ کو فتح کیا تو تین اور صوبے قائم کر دیے اس طرح اکبر کے عہد میں کل صوبوں کی تعداد 15 ہو گئی۔قندھار،کشمیر ٹھٹھہ اور اڑیسہ کی فتح کے بعد اس نے کشمیر اور قندھار کو صوبہ کابل اور ٹھٹھہ کو صوبہ ملتان میں ملا دیا اسی طرح اڑیسہ کو صوبہ بنگال سے ملحق کر دیا گیا اس سے صوبوں کی تعداد 15 تھی۔جہانگیر کے عہد میں اڑیسہ اور ٹھٹھہ نئے صوبے بن گئے۔اس طرح جہانگیر کے عہد میں کل سترہ صوبے تھے۔شاہجہاں کے عہد میں صوبوں کی تعداد بائیس ہو گئی۔اس میں سے قندھار 1648 میں مغلوں کے کنٹرول سے نکل گیا۔دکن میں شاہی ریاست کو فتح کرنے کے بعد دکن کے صوبوں دولت آباد،احمد نگر،تلنگانہ،خاندیش اور برار کے نظم ونسق کو بہتر اورنگ زیب نے اپنی صوبیداری کے دوران کیا۔ان صوبوں کی راجدھانی پہلے دولت آباد تھی بعد میں اورنگ آباد میں قائم کی گئی۔اورنگ زیب کے عہد حکومت میں خصوصاً اس کی وفات کے وقت صوبوں کی تعداد 21

تھی۔صوبائی نظم ونسق مرکزی انتظامیہ کی ایک چھوٹی شکل تھی۔صوبائی نظم ونسق یا انتظامیہ میں جو اعلیٰ افسر ہوتے تھے ان میں سپہ سالار یا صوبیدار، دیوان، بخشی، صدر کوتوال وغیرہ اہم تھے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اس اکائی کے مطالعہ سے طلباء مغل انتظامیہ کے صوبائی ومقامی نظم ونسق کی ماہیت اور نوعیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- صوبائی نظم ونسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے کون سے اہم محکمے اور شعبہ جات تھے اس کی معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- صوبہ کے گورنر یا حکمراں کے فرائض اور اس کے امور واختیارات کا علم ہو سکے گا۔
- دیوان اور بخشی کے فرائض منصبی اور ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں گے۔
- مقامی انتظامیہ کے شعبہ جات اور اس کے اعلیٰ افسران کے فرائض واختیارات کا علم ہو سکے گا۔
- سرکار، پرگنہ، اور گاؤں سطح کے بڑے اور چھوٹے افسران اور ان کے ماتحت کام کرنے والے عملہ کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔

12.2 صوبائی نظم ونسق (Provincial Administration)

12.2.1 صوبائی انتظامیہ کی نوعیت (Nature of Provincial Administration)

صوبائی انتظامیہ، مرکزی نظم ونسق کا عکس تھا۔اکبر نے ملک کو چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم کرنے کے بجائے بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کرکے منظم ومستحکم کیا۔اس طرح اس نے سارے ملک میں دارالحکومت کے زیر اثر یکساں نظام اور ادارے قائم کیے۔اکبر نے ہر صوبے میں ایک سپہ سالار، دیوان، بخشی، میر عدل، صدر، کوتوال، میر بر، میر بحر اور واقعہ نویس مقرر کیے۔صوبوں میں میر ساماں اور دیوان بیوتات نہیں ہوتے تھے۔نظام مالگزاری کی نگرانی کے لیے عامل، بتکچی، فوطہ دار یا خزانہ دار، قانون گو اور پٹواری ہوتے تھے اور گاؤں کی سطح پر مقدم اور چودھری ہوتے تھے۔خفیہ نظام کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے واقعہ نویس ہوتے تھے۔صوبے کے اہم شہروں میں پولیس کوتوال کے ماتحت ہوتی تھی۔ان سبھی افسروں کی تقرری مرکزی حکومت کیا کرتی تھی۔اگرچیکہ تمام آفیسر صوبیدار یا حکمراں کے زیر نگرانی کام کرتے تھے مگر وہ مرکزی حکومت کے ساتھ جوابدہ ہوا کرتے تھے۔

12.2.2 صوبائی گورنر (Governor)

صوبے کے اہم افسر کو ناظم، سپہ سالار، صوبہ دار، صاحب صوبہ یا ولی کہتے تھے۔اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔عموماً اس عہدہ پر تجربہ کار اور انتظامی امور سے متعلق بادشاہ کے بھروسے مند افراد ہی کا تقرری ہوا کرتی تھی۔امراء کے علاوہ شہزادے بھی اس عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے۔جب کبھی صوبیدار بادشاہ کے ساتھ فوجی مہم پر روانہ ہوتا تھا یا راجدھانی میں موجود ہوتا تھا تو ایسے حالات میں اس کا کام دیکھنے کے

لیے صوبے میں اس کا نائب یا نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا۔ صوبیدار کے لیے اپنے عہدہ پر کام کرنے کی کوئی میعاد یا وقت مقرر نہیں تھا۔ پھر بھی وہ تین چار سال تک اپنے عہدہ پر رہتا تھا۔ اس کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ صوبیدار کے عہدے پر عموماً بڑے منصب داروں یا اعلیٰ درجہ کے امیروں کی تقرری ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ شہزادے بھی صوبیدار بنائے جاتے تھے۔ سلطنت کے ہر صوبے کا ایک صوبیدار یا سپہ سالا ہوتا تھا۔ ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار رہتا تھا۔ ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار صرف بادشاہ کی عدم موجودگی میں مقرر کیا جاتا تھا۔ بلخ و بخارا قلیل مدت کے لیے شاہی مقبوضات میں رہے۔ قندھار ایرانیوں نے واپس لے لیا تھا اور دکن کے چار صوبہ جات کبھی کبھی ایک ہی افسر کے ماتحت رہے۔ باقی صوبوں میں صوبہ داروں کا انتظام ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سپہ سالاروں اور صوبہ داروں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ شاہجہاں کے عہد حکومت کے صرف بائیسویں سال مرزا خان کی جگہ اعتقاد خان کا اودھ کے صوبیدار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

صوبیدار صوبہ میں بادشاہ کا نمائندہ اور صوبہ کا اہم افسر ہوتا تھا۔ مغل حکمراں چونکہ مرکزیت میں پورا یقین رکھتے تھے اس لیے وہ صوبیداروں کو بہت زیادہ اختیار دینے کے حق میں نہیں تھے۔ صوبیدار کے اختیارات اور فرائض پوری طرح متعین تھے۔ جس وقت ان کی تقرری کی جاتی تھی انہیں ان کے عہدہ کے مطابق منصب اور اعزازی نشانات انعامات کے ساتھ ہی عہدے کے مطابق انہیں یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری اور فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دیں گے۔ ابوالفضل کے مطابق صوبیدار، رعایا کا اتابک اور نگہبان ہوتا ہے۔ رعایا کی بھلائی اس کے عدالت پسندی پر منحصر ہوتی ہے۔ اسے سماج کے سبھی طبقوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور کمزور طبقوں پر ہونے والے ظلم کو اسے روکنا چاہیے۔ اسے ہدایت تھی کہ وہ ہمیشہ اسلحہ کا استعمال کرتا رہے۔ گھڑ سواری اور شکار کرتا رہے تاکہ وہ چاق و چوبند رہے اور ہمہ وقت اپنے فرائض کے تئیں بیدار رہے۔ اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لیے یہ بھی ہدایات تھیں کہ وہ شان و شوکت میں بادشاہ کے دربار کی نقل نہ کریں۔ مجرموں کی کھال کھنچوانے، انہیں ہاتھی کے پیروں تلے روندوانے کی کوشش نہ کرے۔ جو بھی صوبیدار ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اسے سزا دی جاتی تھی۔ صوبہ کے صوبیداروں کا انتخاب ان فوجی افسروں میں سے ہوتا تھا جن میں انتظامی امور کی سبھی خداداد صلاحیت ہوتی۔ امید کی جاتی کہ وہ صاحب کردار و ایمان دار ہونگے۔ شاہجہاں صوبہ داروں کی نااہلی یا صوبہ جات کی بدنظمی گوارانہ کرتا تھا۔ بادشاہ تک جس کی شکایت پہنچتی اسے برطرف کرنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا اس کی مثال اعظم خان اور شائستہ خان ہیں۔ ان دونوں کو گجرات کی صوبیداری سے برطرف کردیا گیا چونکہ یہ لوگ نااہل تھے اور تربیت خان کو کشمیر کی صوبیداری سے اس لیے برخاست کیا گیا کیونکہ لوگوں نے اس کی شکایت کی تھی۔ برخلاف اس کے ظفر خان کو کشمیر کا صوبہ دار اس لیے بنایا گیا کہ لوگ اس کو چاہتے تھے۔ صوبہ دار کی برطرفی کی ایک اور مثال وزیر خان کی ہے وہ پنجاب کی صوبیداری سے اس لیے برطرف کیا گیا کہ وہ ظلم کرتا تھا۔

صوبہ داروں کے اختیارات، شہری، عدالتی اور فوجی تین ضمروں میں منقسم تھے۔ بحیثیت شہری افسر کے وہ پوری انتظامیہ کے نظم و نسق کا سربراہ تھا۔ بحیثیت حکمراں عدل و انصاف وہ قاضی و میر عدل کے فیصلوں کی اپیل سنتا تھا۔ اور بہ لحاظ فوجی افسر اپنے صوبے کے مخصوص عسکری حصہ پر حکمرانی کرتا اور اس کی نگہداشت کا ذمہ دار ہوتا۔ وہ اپنے ماتحت افسروں کو برطرف کرسکتا تھا بجز ان لوگوں کے جو براہ راست

بادشاہ کے زیر اثر ہوتے تھے۔وہ کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جن کی سزائے موت کی اجازت مرکز سے حاصل کرلیتا۔وہ لوگوں کے شہری حقوق کا نگران ہوتا اس سے امید کہ جاتی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مشورہ سے انتظامی امور فیصل کرے گا۔صوبیدار کو اپنے پاس فوج رکھنی پڑتی تھی اس فوج کا وہ سربراہ ہوتا تھا۔اس کا کام مقامی بغاوتوں کو فرو کرنا۔ڈاکوؤں کے خلاف مہم چلانا اور صوبے میں امن و آشتی قائم کرنا تھا۔صوبہ دار کی مدت ملازمت کا دار و مدار بادشاہ کی مرضی پر تھا۔اس کے لیے کوئی اصول متعین نہیں تھا۔

12.2.3 دیوان صوبہ (Diwan of Province)

وزارت مال کے براہ راست نمائندے کی حیثیت سے 'دیوان صوبہ' کے عہدے کا قائم کرنا اکبر کا کام تھا۔صوبائی دیوان بشمولیت دیگر افسران کے ہر صوبے میں چوبیسویں سال جلوس مقرر کیا گیا۔اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک صوبائی دیوان کا اقتدار اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ صوبیدار سے آزاد ہو گیا تھا۔وہ دیوان اعلیٰ کے ذریعہ بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھا اور اپنے کاغذات براہ راست وزیر کو پیش کرتا تھا۔دیوان صوبہ کو صوبائی انتظام میں ایک اہمیت حاصل تھی اور اس کا اختیار و اقتدار صوبے کے انتظامی اور مالی معاملات تک وسیع تھا۔اس کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ زیر کاشت رقبے کی توسیع کے سلسلے میں اقدامات کرتا رہے۔ خزانے کا تحفظ اور نگرانی اس کے اہم امور میں شامل تھے۔دیوان کے ذمہ یہ بھی تھا کہ کوئی غیر قانونی رقومات جو حکومت کی طرف سے ممنوع یا معاف کر دی گئی ہیں وصول نہ کرے۔دیوان مالیات کا افسر خاص ہوتا تھا۔ نظریاتی اعتبار سے وہ صوبہ دار کا ماتحت ہوتا مگر عملی اعتبار سے مرتبہ میں اس کا ہم پایہ ہوتا۔اس کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا اور اس سے امید کی جاتی کہ وہ صوبیدار پر بھی نظر رکھے گا۔ مغل عہد میں صوبا جاتی دیوان بیک وقت مقتدر عہدوں پر مامور ہوتا۔ محمد وارث نے شیخ موسیٰ گیلانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ شاہجہاں کے سن جلوس کے اکیسویں سال میں دیوان، امین اور فوجدار کے مختلف عہدوں پر ملتان میں بیک وقت کام کرتا رہا۔اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔دیوان صوبہ صرف مالیات کا خاص افسر ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ مرکزی نظام مالگزاری کے شعبہ کا صوبہ میں نمائندہ ہوا کرتا تھا۔اس کا عہدہ صوبہ دار کے بعد تھا۔اکبر کے عہد میں اس عہدہ کی تشکیل ہوئی۔دیوان مرکزی حکومت کے تئیں جوابدہ ہوتا تھا۔ وہ مرکزی سرکار کے دیوان اعلیٰ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا اور اس کے لیے وہ برابر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔وہ صوبہ دار کے دربار میں ضرور حاضر ہوتا تھا مگر اس کا عہدہ صوبہ دار کے عہدہ کے برابر ہوتا تھا۔دیوان کی تقرری کے وقت مرکز سے کچھ خاص ہدایات ملتی تھیں وہ زیر کاشت زمین کی توسیع کرے اور زراعت کو فروغ دے۔ایماندار، تجربہ کار اور لائق عامل کی تقرری کرے تاکہ وہ کسانوں کو پر امن طریقے سے مالگزاری ادا کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔دیوان کے محکمے میں دو طرح کے افسر ہوتے تھے:

1۔مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر۔ 2۔صوبائی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر۔

اس کے شعبہ میں پیش کار اور داروغہ مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے جاتے تھے۔بقیہ افسران و عملہ مثلاً منشی، حضور نویس اور محرر وغیرہ کی تقرریاں وہ خود کرتا تھا۔یہ تمام لوگ اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔صوبائی دیوان کے کام درج ذیل تھے۔

1. خالصہ محالوں سے مالگزاری وصول کرنا۔
2. وصول شدہ بقایا مالگزاری کا حساب رکھنا۔

3. مدد معاش میں دی گئی زمینوں کی تفصیل کا تعین رکھنا۔

4. صوبوں میں تعینات افسروں کے کام کے مطابق ان کی تنخواہ متعین کرنا اور ادا کرنا۔

5. خالصہ علاقوں میں دی گئی جاگیروں کا انتظام کرنا۔

6. زراعت کو فروغ دینا۔

7. خانہ زادوں پر نظر رکھنا۔

8. عاملوں کے حساب کی جانچ کرنا اور خراب عاملوں کو عہدے سے ہٹانے کی سفارش کرنا۔

9. بقایہ مالگزاری و نقادی وصول کرنا۔

10. مختلف شعبوں کے خرچ پر کنٹرول رکھنا اور صوبائی ٹکسالوں کا نظم کرنا وغیرہ۔

صوبائی دیوان کے دفتر میں مالگزاری سے متعلق آمد و صرف کے تمام حساب کتاب محفوظ رہتے تھے۔ یہیں حساب کی جانچ ہوتی تھی اور اس کی تلخیص تیار کرکے مرکز کو ارسال کردی جاتی تھی۔ اسے مہینہ میں دوبارہ دیوان اعلیٰ کے پاس صوبہ میں ہونے والے واقعات و حادثات اور خزانہ میں نقدمال کی اطلاع ارسال کرنی پڑتی تھی۔ صوبائی دیوان مالگزاری سے متعلق مقدمات کو بھی فیصل کرتا تھا۔ سرکاری پرگنوں کی مالگزاری سے متعلق مقدموں پر ہوئی اپیل کی سماعت کرتا تھا اور فیصلے بھی دیتا تھا۔ دیوان کے ذریعہ دیے گئے فیصلوں کی اپیل مرکز میں دیوان اعلیٰ کے حضور پیش کی جاسکتی تھی۔

12.2.4 صدر صوبہ

مرکزی صدر الصدور کی سفارش پر بادشاہ صوبائی صدر کی تقرری کرتا تھا۔ صوبائی صدر مرکزی صدر کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ اس کا دفتر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے افسروں کی طرح اس کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا کام صوبہ میں مسلمانوں کے مذہبی امور سے متعلق بھی تھا۔ وہ سیورغال اور مدد معاش گرانٹ جیسے اہم کام کی نگرانی کرتا تھا۔ علماء اور دانشوروں کو دیے جانے والے وظائف کا انتظام کرنا اور کن لوگوں کو وظائف، پنشن یا مدد معاش دی جاتی ہیں ان کے ناموں کی سفارش بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے پاس دانشوروں، علماء، مشائخ اور مذہبی شخصیات کی فہرست بھی رکھتا تھا۔

12.2.5 قاضی صوبہ (Qazi of Province)

ہر صوبہ میں ایک قاضی جسے قاضی صوبہ کہتے تھے کی تقرری مرکزی حکومت کے قاضی القضاۃ کی سفارش پر بادشاہ کیا کرتا تھا۔ اسے دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات سننے اور فیصلہ دینے کا اختیار تھا۔ وہ مسلمانوں کی شادی وغیرہ کے مراسم ادا کراتا۔ املاک وغیرہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ عدل وانصاف سے متعلق کاموں میں اس کی مدد میر عدل، مفتی، قاضی، محتسب اور داروغہ عدالت کیا کرتے تھے۔ اس کی سفارش پر سرکاروں کے قاضی کی تقرری بھی ہوتی تھی۔

12.2.6 میر عدل (Mir Adl)

اس کا کام گواہوں کی گواہی کی جانچ پڑتال کرنا تھا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پہنچنے سے پہلے وہ گواہی کی جانچ کر کے اس پر اپنی رپورٹ دیا کرتا تھا جس کی بنیاد پر مقدمے کا فیصلہ ہوتا تھا۔

12.2.7 بخشی (Bakshi)

مرکزی حکومت کی انتظامیہ کی طرح صوبہ میں بھی ایک بخشی ہوتا تھا۔ یہ صوبہ میں ان تمام امور کا ذمہ دار ہوتا تھا جو مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں بخشی ہوتے تھے۔ میر بخشی کی سفارش پر صوبائی بخشی کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔ صوبہ میں فوج کا انتظام کرنا اس کی اہم ذمہ داری تھی۔ وہ صوبائی فوج کی صلاحیت بنائے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ بخشی اپنے صوبے میں خفیہ محکمہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا اور صوبہ کی تمام سرگرمیوں کی اطلاع مرکز کو بھیجتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مرکز کی مدد کے لیے صوبائی فوجیوں کو بھی بھیجتا تھا۔ فوجیوں کی بھرتی، رہن سہن، ڈسپلن، نظم وضبط اور ان کے فوجی ساز وسامان کا انتظام بھی کرتا تھا۔ فوجیوں کا حلیہ رکھنا اور میر بخشی کے حکم سے فوجیوں اور گھوڑوں کی سالانہ جانچ بھی اسی کے ذمہ تھی۔ باغی اور نافرمان زمین داروں و دیگر سرکش عناصر کے خلاف صوبیدار کی مدد بھی کرتا تھا اور خود بھی حکومت کے مفاد کے تحفظ کے لیے فوجی مہم کی نمائندگی کرتا تھا۔ بخشی صوبیدار کے ماتحت کام کرتا تھا۔ منصب دار کی وفات ہو جانے پر بخشی اس کی جاگیر کو اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور اس کی اطلاع اعلیٰ افسران کو بھیج دیتا تھا۔ بخشی مہینہ میں دو بار اہم اطلاعات بادشاہ کو بھیجتا تھا۔ ان میں مالگزاری کی وصولی، صوبائی امن وامان اور فوجی نظم ونسق کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔

12.2.8 کوتوال (Kotwal)

ہر صوبے کے ہیڈ کوارٹر پر ایک کوتوال ہوتا تھا جو شہر کوتوال کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کوتوال کے امور، اختیارات اور فرائض منصبی کا علم ہمیں 'مرآۃ احمدی' سے ہوتا ہے جس میں کوتوال کے امور سے متعلق اکبر کی ہدایات درج ذیل ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ 'کوتوال کلرک کے تعاون سے اس جگہ کے مکانوں، عمارتوں اور اس میں رہنے والوں کی فہرست تیار کرے گا اور اس بات کا بھی ذکر کرے کہ وہ کس طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں سے کتنے لاوارث ہیں، کتنے کاریگر ہیں، کتنے فوجی ہیں اور کتنے درویش ہیں۔' اس کے علاوہ کوتوال کے فرائض میں درج ذیل چیزیں بھی آتی ہیں۔ یومیہ (روز وشب) جاسوس کوتوال کے دفتر میں محلے میں ہونے والے واقعات وحادثات کے اسباب وعلل کو درج کرائیں۔ ایک مہمان کی آمد چاہے وہ قریبی ہو، تعلقاتی ہو یا اجنبی اس کی اطلاع اس محلے کے مکھیا کو ہو جانی چاہیے۔ کوتوال کو ہر آدمی کی آمد ورفت کے بارے میں جانکاری ہونی چاہیے کیونکہ جب ایک آدمی اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے تو یہ یقینی ہے کہ وہ بدعنوانی میں ملوث ہے۔ کوتوال کو بازاروں میں اشیاء کی قیمتیں متعین کر دینی چاہیے اور اسے اپنے علاقہ میں شراب نوشی اور اس کی آمد وفروخت پر بھی پابندی لگا دینی چاہیے۔ مذکورہ اقوال کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ کوتوال صوبائی صدر مقام کا اہم پولیس افسر ہوتا تھا۔ اس کا کام عوام کی نگرانی اور حفاظت کے ساتھ امن وامان قائم کرنا ہے تھا۔ وہ رات کو شہر کا گشت لگاتا۔ خفیہ شعبہ میں کام کرنے والوں کی تقرری کرتا۔ گھروں اور سڑکوں کی فہرست تیار کرتا ۔ آلہ ناپ وتول کی جانچ کرتا۔ شہر شہر میں آمد ورفت رکھنے والے مسافروں پر نظر رکھتا۔ چوری اور ڈکیتی کو روکنا، چوروں پر کنٹرول رکھنا

،شراب بنانے اور بیچنے پر پابندی عائد کرنا۔لاوارث جائداد کی فہرست تیار کرنا وغیرہ اس کے اہم امور تھے۔اس کے علاوہ کوتوال سزا دینے والا افسر بھی ہوتا تھا۔ شہر میں پکڑے جانے والے مجرم کو کوتوال کے سامنے پیش کیا جاتا۔ابتدائی جانچ پڑتال کے بعد جس نوعیت کا معاملہ ہوتا مقدمہ اس نوعیت کی عدالت میں بھیج دیتا۔ابوالفضل لکھتا ہے کہ 'کوتوال کا دفتر ایک طرح کی چوکی تھی جہاں وہ سزا دینے والے افسر کی حیثیت سے مقامی تنازعات و مقدموں کو فیصلہ کرتا۔'

12.2.9 دیگر انتظامی محکمہ جات (Other Administrative Departments)

اوپر زیر بحث آئے شعبوں اور عہدیداروں کے علاوہ کچھ دیگر اہلکار بھی ہوا کرتے تھے جو بالائی افسران کے معاون تھے۔

محتسب: ہر صوبے میں ایک محتسب ہوتا تھا اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔ یہ صدر الصدور کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس عہدے پر صوبائی صدر بھی کام کرتا تھا۔ محتسب کا کام عوام کے اخلاق و کردار کو بنائے رکھنا تھا۔ شریعت (اسلامی قوانین) کے متعلق مسلم عوام کو زندگی گزارنے کی تلقین کرنا اور ممنوع (حرام) چیزوں سے بچانا اس کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔

میر بحر: صوبے میں میر بحر کا کام فوج کو ندی پار کرنے کے لیے پل کی تعمیر اور کشتیوں کا انتظام کرنا تھا۔ بندرگاہوں اور ندیوں کی چنگی وغیرہ کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔

واقعہ نویس: ہر صوبہ میں ایک واقعہ نویس ہوا کرتا تھا۔ عموماً صوبہ کا بخشی ہی واقعہ نویس کی حیثیت سے کام کرتا تھا جو صوبہ کے تمام اہم واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ارسال کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ صوبے میں سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے بھی ہوتے تھے۔ سوانح نگار کا کام ریاسر کے افسروں ان کے عملہ اور دفاتر سے متعلق اطلاعات بھیجنا ہوتا تھا۔ خفیہ نویس اہم مقامات پر مقرر کیے جاتے تھے جو ریاست کا کام کرنے والے افراد اور رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع مرکزی سرکار کو بھیجتے تھے۔ ہرکارے صوبے کے چاروں اطراف کی خبریں اور اس کی تفصیلات صوبیدار کے حضور پیش کرتے تھے۔

12.3 مقامی نظم ونسق (Local Administration)

انتظامی امور کو بحسن وخوبی انجام دینے کی غرض سے صوبہ متعدد انتظامی اکائیوں میں تقسیم تھا۔ مقامی انتظامیہ کے لیے سرکار، پرگنہ اور گاؤں انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

12.3.1 سرکار

صوبہ کے بعد ایک انتظامی اکائی سرکار کہلاتی تھی۔ کئی پرگنہ کو ملا کر ایک سرکار بنتی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے متعدد سرکاروں کے لیے افسر مقرر کیے۔ سرکار میں ایک افسر دیوان کا ہوتا تھا جو مالگزاری کے بعض معاملات سے متعلق تھا مثلاً جاگیروں کی تفویض

وغیرہ۔ سرکار کے انتظامی امور کے لیے درج ذیل افسران مقرر کیے جاتے تھے۔

1. **فوجدار:** ہر سرکار میں ایک فوجدار تعینات کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری سطح پر اہم افسر ہوتا تھا جس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ وہ سرکار میں صوبہ دار کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ابوالفضل اپنی کتاب آئین اکبری میں فوجدار کے فرائض منصبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'اسے تمام فوجیوں کے ساز وسامان کا معائنہ کرتے رہنا چاہیے۔ گھوڑوں کی فراہمی کرنی چاہیے مگر بغیر ضرورت باغی و سرکش زمین داروں اور کسانوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔' سرکار میں انتظام اور امن وامان کے لیے فوجدار جوابدہ تھا۔ وہ اپنی سرکار میں شاہی احکام کا نفاذ کرتا تھا اور مالگزاری کی وصولی میں عمل گزار کا مددگار تھا۔ وہ سرکاری فوج پر کنٹرول رکھتا تھا۔
2. **عمل گزار:** سرکار میں مالگزاری کا اعلیٰ افسر عمل گزار تھا جو مرکزی حکومت کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا اہم کام مالگزاری کی تعیین اور اس کی وصولی کرنا تھا۔ ساتھ ہی بدعنوان کسانوں کو سزا دینا تھا۔ سرکار کے ماتحت سیورغال زمین کی نگرانی کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ مالگزاری سے متعلق کاموں کے لیے اس کے ماتحت بہت سے مددگار افسر ہوتے تھے۔ عمل گزار سرکار کی زمین کی پیمائش اور ٹیکس کی تفصیل مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا، بتکچی، خزانہ دار جیسے افسروں کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا معائنہ بھی کرتا تھا۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق عمل گزار و سرکار میں مالگزاری کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا۔
3. **قاضی:** ہر سرکار میں ایک قاضی ہوتا تھا جس کی تقرری صدر الصدور کرتا تھا۔ قاضی شریعت کے مطابق مذہبی مسائل کا حل پیش کرتا تھا۔ قاضی کے تعاون کے لیے ایک مفتی ہوتا تھا جو اصول شریعت یعنی اسلامی قوانین کی وضاحت کرتا تھا۔
4. **بتکچی:** عمل گزار کے بعد سرکار میں شعبہ مالگزاری میں اہم افسر بتکچی ہوتا تھا۔ اسے مالگزاری سے متعلق پوری جانکاری ہوتی تھی۔ اس کے پاس زمین کی پیمائش، اس کی درجہ بندی، پیداوار وغیرہ کی تفصیل ہوتی تھی جس کی بنیاد پر عمل گزار مالگزاری کی تعیین کرتا تھا۔ اسے ہر موسم کی فصل اور اس کی مالگزاری کا پورا سالانہ تفصیل کے ساتھ عمل گزار کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔
5. **خزانہ دار:** ہر سرکار میں ایک خزانہ دار ہوتا تھا جو شاہی خزانہ کا انچارج ہوتا تھا۔ اس کے پاس مالگزاری کا روپیہ جمع کیا جاتا تھا جسے وہ مرکزی شاہی خزانے کو بھیج دیتا تھا۔ مگر بغیر صوبائی دیوان کی اجازت کے وہ روپیہ خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

12.3.2 پرگنہ

عام طور سے پرگنہ ایک انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ شیر شاہ کے پرگنہ میں اکبر نے کچھ اصلاحات کیں تھیں۔ پرگنے کا نظم و نسق درج ذیل افسروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔

1. **شقدار:** پرگنے کا اعلیٰ افسر شقدار کہلاتا تھا جو پرگنہ میں امن وامان اور حسن انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ فوجدار کے ماتحت ہوتا تھا۔ کسانوں سے مالگزاری کی وصولی میں وہ عامل کا تعاون بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ شقدار پرگنہ میں ایک مصنف کی حیثیت سے فوجداری مقدمات کو فیصل کرتا تھا۔
2. **عامل:** پرگنہ میں انتظام مالگزاری کا بڑا حکمراں عامل ہوتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک بڑا عملہ ہوتا تھا جس میں سب سے زیادہ اہم بتکچی ہوتا

تھا۔ ہر پرگنے میں تخمینہ اور وصولی کا کام عامل انجام دیتا تھا۔ عامل پرگنہ سطح پر مقامی انتظام کا سربراہ ہوتا تھا۔ پرگنہ میں عامل کا وہی کام تھا جو سرکار میں عمل گزار کا ہوتا تھا۔ عامل کے ماتحت کارکن ہوتے تھے جو کلرک کی طرح اس کی مدد کرتے تھے۔ عامل ایک کام یہ بھی تھا کہ کاشت اراضی پر کاشت برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرے اور اس کی مالگزاری وصول کرائے۔

3. **خزانہ دار (فوطہ دار):** ہر پرگنے کا اپنا خزانہ ہوتا تھا جس کا انتظام خزانہ دار کی سربراہی میں متعدد افسران کے سپرد ہوتا تھا۔ خزانہ دار کو فوطہ دار بھی کہتے تھے۔ اکبر کے عہد میں عامل، کارکن اور شقدار پرگنے کے خزانے کی حفاظت اور رقم کی مناسب ادائیگی کے سلسلے میں مشترکہ طور سے ذمہ دار تھے۔ بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خزانے کے عملے میں داروغہ خزانہ کے عہدہ کا اضافہ کیا گیا۔ فوطہ دار مالگزاری کی شکل میں ہونے والی رقم کو جمع کرکے اسے مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا۔ فوطہ دار کے امور منصبی میں مالگزاری کی وصولیابی، نقد رسیدوں کی حفاظت، حسابات تیار کرنا اور خزانے میں جمع شدہ نقد رقم کی مناسب ادائیگی شامل تھی۔

4. **قانون گو:** ہر پرگنہ میں ایک قانون گو کی ڈگری ہوتی تھی۔ پرگنہ کی سطح پر تعینات قانون گو اپنے جملہ کاغذات تیار کرتا تھا۔ لہٰذا مقامی نظام مالگزاری میں عمل دخل کے اعتبار سے وہ ایک اہم افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ عام طور پر ایک پرگنہ میں ایک قانون گو ہوتا ہے۔ لیکن بعض پرگنوں میں ایک سے زیادہ قانون گو بھی ہوتے تھے۔ قانون گو سب سے اہم کام آراضی سے متعلق مختلف فریقین کے مفادات کے بارے میں مکمل اطلاع اور تخمینے کی شرحیں، طریق کار، رسومات اور قواعد کے بارے میں ضروری کاغذات محفوظ رکھتا تھا۔ اس کے پاس کئی کتابچہ ہوتے تھے جس میں پرگنہ کی زراعت کے تمام احوال و کیفیات اور اس سلسلے کی تمام اطلاعات درج ہوتی تھی۔ قانون گو آراضی سے متعلق اندراج تیار کرتا تھا قانون گو کی مدد کے لیے بہت سے پٹواری ہوتے تھے۔

12.3.3 گاؤں

انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں ہوتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ گاؤں کے اعلیٰ افسر چودھری یا مقدم کہلاتے تھے۔ یہ گاؤں اور انتظامیہ کے بیچ کی کڑی کا کام کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں رائے یا راوت بھی گاؤں کے مکھیا کا کردار ادا کرتے تھے۔ گاؤں کے مکھیا کا کام عام نگرانی رکھنا، تنازعات کو ختم کرنا، پولیس کے فرائض نبھانا اور گاؤں کے کسانوں سے جو مالگزاری وصول کرتے تھے اس کے لیے انہیں گاؤں کی مالگزاری میں سے ڈھائی فیصد دستوری ملتی تھی۔ اس کا کام گاؤں میں امن و امان قائم کرنا اور نقادی کی تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں کا دوسرا اہم افسر پٹواری ہوتا تھا وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے لگان اور قابل کاشت زمین کی تفصیل رکھتا تھا اسے گاؤں کی لگان میں سے ایک فیصد دستوری ملتی تھی۔ پٹواری گاؤں کا سب سے کم تر درجہ کا افسر ہوتا تھا۔ لیکن گاؤں انتظامیہ میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ آج کے دور کے لیکھپاک کی طرح ہوتا تھا۔ ابوالفضل گاؤں انتظامیہ کے سلسلے میں کوئی جانکاری نہیں دیتا۔ البتہ شیر شاہ کے عہد میں گاؤں انتظامیہ کا بہترین تصور تھا جہاں مقدم، چودھری اور پٹواری وغیرہ گاؤں کے نظم و نسق کو چست رکھتے تھے اور ڈکیتی و زنا جیسی واردات اور جرائم کی روک تھام کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اکبر اور بعد کے مغل حکمرانوں نے شیر شاہ کے اسی نظم و نسق کا گاؤں کی سطح پر نافذ کیا۔ گاؤں کے دوسرے اہلکاروں میں چوکیدار، مذہبی رسم و روایت کو ادا کرنے کے لیے مولوی اور پروہت ہوا کرتے تھے۔

12.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغل عہد میں نظم ونسق کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے سلطنت صوبوں میں تقسیم تھی۔ صوبوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اکبر کے عہد پہلے 12 صوبے تھے بعد میں تین صوبوں کا اضافہ ہوا اس طرح کل 15 صوبے ہوگئے۔ جہانگیر کے عہد میں 17 جبکہ شاہجہاں کے عہد میں 22 اور اورنگ زیب کے عہد میں صوبوں کی تعداد 21 ہوگئی۔ صوبہ کا سب سے بڑا افسر صوبہ دار (سپہ سالار) ہوتا تھا وہ صوبہ میں بادشاہ کی طرح ہی کام کرتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے بہت سے عہدیدار ہوتے تھے۔ ان میں دیوان، بخشی، فوجدار، کوتوال، قاضی، صدر اور عامل وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ دیوان صوبے کے نظام مالگزاری سے متعلق کام دیکھتا تھا۔ صوبہ دار کو خفیہ اطلاعات، خفیہ نویس یا واقعہ نویس سے ملتی تھی۔ انتظامیہ کی چھوٹی اکائی سرکار تھی۔ ان کی تعداد بھی متعین نہیں تھی۔ سرکار میں اہم افسر فوجدار، عمل گزار، قاضی، کوتوال، بتکچی اور فوطہ دار ہوتے تھے۔ ان کا کام سرکار میں امن وامان برقرار رکھنا اور مالگزاری وصول کرانا تھا۔ ان کے کاموں کی نگرانی صوبیدار کرتا تھا۔ سرکار کئی پرگنوں کو ملا کر بنتی تھی۔ پرگنہ کا نظم ونسق شقدار، عامل، فوطہ دار، کارکن اور قانون گو دیکھتے تھے۔ انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تھی۔ ایک پرگنہ کئی گاؤں ملا کر بنتا تھا۔ گاؤں کی انتظامیہ مقامی لوگوں کے تعاون سے چلتی تھی۔ مقدم (مکھیا) پٹواری، چوکیدار وغیرہ گاؤں کی انتظامیہ کے اہم لوگ تھے۔

12.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

تقاوی	:	پیشگی قرض، جو کسانوں کو بیج اور جانور وغیرہ کے لیے دیا جاتا تھا
سیورغال	:	لگان سے مستثنیٰ زمین
دستوری	:	کمیشن
مقدم	:	گاؤں کا مکھیا
کروڑی	:	مالگزاری وصول کرنے والا افسر
عامل	:	گاؤں سے لگان وصول کرنے والا روایتی کرمچاری

12.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. برار، خاندیش اور احمد نگر قلعہ کی فتح سے قبل اکبر کے عہد میں کتنے صوبے تھے؟
2. برار، خاندیش اور احمد نگر قلعہ کی فتح کے بعد اکبر کے صوبوں کی تعداد کتنی تھی؟
3. کس سن میں اکبر نے اپنی سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کیا۔
4. جہانگیر کے عہد میں کل کتنے صوبے تھے؟

5. اڑیسہ کس مغل بادشاہ کے عہد میں صوبہ بنا؟
6. اورنگ زیب کی وفات کے وقت کتنے صوبے تھے؟
7. صوبہ دار کی تقرری کون کرتا تھا؟
8. دیوان کی تقرری کس کے ذریعہ ہوتی تھی؟
9. مقامی انتظامیہ کی چھوٹی اکائی کو کیا کہتے ہیں؟
10. مقامی انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی کیا تھی؟

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صدر صوبہ کے فرائض منصبی بیان کریں۔
2. بخشی کے اختیارات پر روشنی ڈالیں۔
3. سرکار کے تحت آنے والے کسی افسر کے دائرہ کار کا جائزہ پیش کریں۔
4. پرگنہ کے افسران پر مختصر نوٹ لکھیں۔
5. قانون گو کے امور واضح کریں۔

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. صوبائی انتظامیہ کی نوعیت کا جائزہ پیش کریں۔
2. صوبہ کے صوبیدار کے فرائض منصبی واضح کریں۔
3. دیوان صوبہ کے امور اختیارات تحریر کریں۔

12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ibne-Hasan. *The Central Structure of the Mughal empire* London,1936.
2. I.H. Qureshi. *The Administration of the Mughal Empire*. Patna, 1979.
3. J.N. Sarkar. *The Mughal Administration*. Calcutta, 1935.
4. U.N. Day. *The Mughal Government*. Delhi, 1970.

اکائی 13۔ سماجی ماحول

(Social Milieu)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 دیہی زرعی معاشرہ

13.2.1 کسان طبقہ: خود کاشت اور پاہی کاشت

13.2.2 حکمران طبقہ: زمیندار

13.2.3 زمین کی ملکیت کا سوال

13.3 شہری معاشرہ

13.4 خواتین

13.5 ذات کا عنصر

13.6 درباری معاشرہ اور ثقافت

13.7 اکتسابی نتائج

13.8 کلیدی الفاظ

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

سلطنت دور کا سماجی ڈھانچہ مغل دور میں بھی جاری رہا حالانکہ اس کے عناصر میں کچھ حد تک تسلسل اور کچھ تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔سب سے اہم تبدیلیاں دیہی سماج کی مزید تفریق اور مختلف طبقوں میں درجہ بندی، ایک ملے جلے حکمران طبقے کا ظہور، شہر کاری کا فروغ، دستکارانہ سرگرمیوں اور پیشوں کی ترقی اور توسیع، حرم کے اندر اور باہر سیاسی سرگرمیوں میں خواتین کی شرکت، ذات پات کے نظام میں شدت اور ساتھ ہی کچھ نرمی اور ایک اعلیٰ درجہ بند درباری معاشرہ تھیں۔اس اکائی میں ہم سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے درمیان رائج سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بات کریں گے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دیہی معاشرے کی ساخت اور شہری ڈھانچہ کی ترتیب سمجھ سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے شمالی ہندوستان میں زمین کی ملکیت کے مسئلہ کو سمجھ سکیں گے۔
- سیاست اور معاشرے میں خواتین کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- ذات پات کے نظام کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مغل دربار کے معاشرہ اور ثقافت کا جائزہ لے سکیں گے۔

13.2 دیہی زرعی معاشرہ (Rural Agrarian Society)

13.2.1 کسان: خود کاشت اور پاہی کاشت (The Peasantry: Khud-kasht and Pahi-kasht)

مغل دور کے دوران، دیہی معاشرہ بڑے پیمانے پر دو کاشت کرنے والے گروہوں میں تقسیم تھا: خود کاشت اور پاہی کاشت۔ خود کاشت (یا رعیتی) وہ کاشتکار تھے جو ان زمینوں کے مالک تھے جنہیں وہ بیلوں اور کاشت کے دیگر ذرائع کی مدد سے کاشت کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ بنیادی کاشتکار تھے جنہیں اپنی کاشت کردہ زمین کے موروثی ملکیت کے حقوق حاصل تھے، جن میں زمین کو الگ کرنے، بیچنے یا منتقل کرنے کے حقوق شامل تھے۔ ان کے مزدور یا تو خاندانی مزدور یا کرائے کی مزدوروں کی شکل میں ہوتے تھے اور بعض اوقات بانٹ کر بھی فصل کی کاشت کی جاتی تھی۔ خود کاشت کا حق ایک قیمتی حق تھا نہ صرف اس لیے کہ اس سے معاشی فائدہ ہوتا تھا بلکہ اس لیے کہ اسے ایک خاص سماجی حیثیت حاصل تھی۔ رہائشی کاشتکاروں نے گاؤں کی برادری کی گورننگ باڈی بنائی۔ یہ بھدرلوک یا معزز طبقہ تھا۔ جب تک وہ زمین کا محصول ادا کرتے رہتے تب تک خود کاشت کو زمین سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ اورنگزیب کے ایک فرمان میں، انہیں 'مالکِ زمین' کہا گیا تھا۔ وہ مراعات یافتہ رہائشی کاشتکار تھے جنہیں مہاراشٹر میں تھانی یا میراثی، راجستھان میں تھیکانہ یا گروہالا کہا جاتا تھا۔ انہیں عام کاشتکاروں،

رعیتی یا پالتیوں سے ممیز کیا جاسکتا تھا۔وہ اس زمین کے مالک یا کرایہ دار ہو سکتے تھے۔

ولسن (1795) کے مطابق پاہی کاشت نقل مکانی کرنے والے یا غیر رہائشی کاشتکار ہوتے تھے جو ایک ایسے گاؤں میں زمین کی کاشت کرتے تھے جس سے ان کا پیدائشی تعلق نہیں ہوتا تھا۔وہ عام طور پر پڑوسی دیہاتوں یا پرگنوں سے اضافی زمین پر کاشت کرنے یا کسی تباہ شدہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے یا نئے گاؤں کو آباد کرنے کے لیے آتے تھے۔ان کا زمین پر کوئی موروثی حق نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک یا مالکِ زمین کی خوشی سے وہاں رہتے تھے۔اس طرح وہ باہر کے لوگ تھے جو اپنی ذات، قبیلہ یا قبائلی بستیوں سے باہر زمینوں کی کاشت یا زمینداری کرتے تھے۔جب کبھی پاہیوں کے پاس اپنا کوئی سامان نہیں ہوتا تو انہیں زمینداروں، مقدم، مہاجنوں یا گاؤں کے کسی دوسرے اعلیٰ زمیندار کی طرف سے بیل، ہل، بیج اور کھاد فراہم کیے جاتے تھے۔زراعت کے لیے درکار آلات کے بغیر، پاہیاں حرکت میں رہتے اور بہتر مواقع کی تلاش میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانے کے لیے بے تاب رہتے۔کاریگر اور دستکار (جن کے بارے میں ہم بعد کے حصے میں بات کریں گے) اور قبائل بھی دیہی سیٹ اپ کے لازمی اجزاء ہوتے تھے۔

13.2.2 حکمران طبقہ: زمیندار (The Ruling Class: Zamindars)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں حکمران طبقے بڑے پیمانے پر دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے: وہ امراجو شاہی طاقت اور مرکزی اقتدار کی نمائندگی کرتے تھے اور زمیندار یا مقامی زمیندار اشرافیہ جن کی مقامی جڑیں گہرائی تک پیوست تھیں۔زمیندار ایک عام اصطلاح تھی جو مغل ہندوستان میں کسانوں سے برتر دیہی سرداروں کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔زمیندار دیہی/مقامی سطح پر سب سے زیادہ بااثر گروہ تھے جو زمین اور اس کی پیداوار کے حقوق رکھتے تھے۔اپنی متعینہ زمینداری جاگیروں کے اندر، زمینداروں کے پاس تقریباً تمام کاشت شدہ زمینوں اور بنجر زمینوں کے وسیع رقبے یا غیر کاشت شدہ جنگلوں اور گھاس کے میدانوں پر قانونی ملکیت کا حق تھا۔ان کی بنیادیں اور طاقت مغل ریاست سے آزاد تھی۔لیکن ریاست ہمیشہ ان کو ریاستی نظام کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔اس عمل میں، انہوں نے اپنے علاقوں اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر اضافی حقوق حاصل کر کے اپنی حیثیت کو بڑھایا۔موروثی مقامی قوت ہونے کے ناطے، وہ اپنے موجودہ علاقوں میں مقامی برادریوں کے رہنما تھے، وہ اپنے آپ میں ذات، قبیلے اور علاقائی خطوط پر کافی حد تک تقسیم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم رہتے تھے۔سلطنت میں بھی وہ مکمل طور پر جذب نہیں ہو سکے تھے۔چونکہ ان کی طاقت کی شناخت عام طور پر علاقوں کے لحاظ سے کی جاتی تھی، اس لیے ریاست کے ساتھ ان کے تعلقات ان کی مقامی برادری اور ان کے تسلط والے علاقے کی طاقت اور کمزوری پر منحصر ہوتے تھے۔تعاون کے رشتے کے باوجود، زمینداروں اور ریاست کے درمیان قوت واقتدار کی بنیادی رسہ کشی جاری رہتی تھی۔ریاست کو زمینی محصول کی ادائیگی میں ان کی جانب مسلسل مزاحمت کی بنا پر انہیں مقامی علاقے اور مقامی برادریوں کا اعتماد حاصل ہوتا تھا۔بہت سے علاقے 'زور طلب' بن جاتے تھے جہاں طاقت کا استعمال ہونے پر ہی ادائیگی کی جاتی تھی۔

مغل دور میں زمینداروں کا دور دورہ تھا اور آئین اکبری اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ حکومت کے ہر صوبے میں زمیندار

پائے جاتے تھے۔ پھر بھی ان کا اثر اتنا نہیں تھا کہ وہ پورے دیہی معاشرے پر چھا جائیں۔ان کے ساتھ کسان بھی موجود تھے، خاص طور پر خود کاشت کسان جو نا قابل تسخیر موروثی ملکیتی حقوق کے مالک تھے۔ دونوں کے درمیان فرق شاید ان کے زیر قبضہ زمینی رقبہ کا تھا۔ زمینداری کے تحت رقبہ عام طور پر ایک گاؤں یا اس کا ایک مخصوص ٹکڑا ہوتا تھا اور یہ شاذ و نادر ہی چند بیگھہ زمین یا چند اکائی زمین پر مشتمل ہوتا تھا۔ زمینداری کے حقوق کی ترقی بھی ناہموار تھی جیسا کہ اسی ضلع کے اندر کچھ دیہات مکمل طور پر زمینداری کے تحت ہو سکتے تھے جبکہ باقی دیگر گاؤں کسانوں کے زیر قبضہ یا رعیتی ہو سکتے تھے جن میں کوئی قابل لحاظ زمیندار نہیں ہوتا تھا۔ زمینداروں اور کسانوں کے حقوق کی حدیں متعین نہیں تھیں۔ کسان زمینداری کے حق میں راہ ہموار کرنے کے لیے زمین کے اپنے ملکیتی حقوق بیچ سکتے تھے یا انہیں اس بات پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ یہاں تک کہ حکومت زمینداروں کو بدل سکتی تھی اور کسانوں کے زیر قبضہ دیہاتوں پر نئے زمیندار مقرر کر سکتی تھی۔ تاہم، زمیندار مغل ریاست کے لیے ایک قابل قدر ادارے کے طور پر ابھرے۔ ان کی غیر مستحکم نوعیت کے باوجود، ریاست زمین کے سروے، وصولی اور محصول کی ادائیگی اور مختلف قسم کے انتظامی کاموں اور مقامی لوگوں کے ساتھ روابط برقرار رکھنے کے لیے ان پر انحصار کرتی تھی۔ ان میں سے کئی منصب دار بھی بن گئے۔

زمینداروں کی بھی مختلف قسمیں تھیں، یعنی خود مختار سردار، مال گزار/بنیادی زمیندار اور خدمت گزار/درمیانی زمیندار۔ خود مختار سردار وہ تھے جو ریاست کو ایک مقررہ خراج ادا کرتے تھے اور اپنے علاقوں میں تمام کارناموں اور مقاصد کو انجام دینے کے لیے آزاد رہتے تھے۔ وہ عام طور پر راجے رجواڑے تھے جن کی حیثیت زمینداروں کے عہدے تک گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بنیادی زمیندار زرعی اور رہائشی زمینوں پر ملکیتی، موروثی اور منتقلی کے قابل حقوق کے حامل تھے۔ انہوں نے یہ حقوق مغل ریاست کو یہ یقین دہانی کراتے ہوئے حاصل کیے کہ وہ غیر کاشت شدہ اور بنجر زمین پر زراعت کو بڑھائیں گے اور ریاست کی طرف سے مقرر کردہ شرح پر خراج یا مال ادائیگی کو برقرار رکھیں گے۔ وہ یا تو خود اپنے طور پر زمینوں پر کاشت کر سکتے تھے، یعنی خود کاشت یا اپنی زمین کاشت کرنے کے لیے کرایہ دار رکھ سکتے تھے۔ وہ اکثر اپنے کرایہ داروں کو زمینیں لیز پر دیتے تھے جو ایک پٹہ کے پابند تھے کہ وہ مقررہ نرخوں پر باقاعدگی سے خراج ادا کریں گے۔ پٹہ داروں کو مدت ملازمت کے دوران موروثی حقوق کا تحفظ بھی فراہم کیا گیا۔ انسان اور زمین کے تناسب کو دیکھتے ہوئے، پٹہ داروں کو زمین سے باندھنا اور انہیں تمام قابل کاشت زمینوں پر کاشت کرنے پر مجبور کرنا دانش مندی کا کام تھا۔ مالگزاروں کو مال گزار اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ریاست کی جانب سے زمینی محصول کا تخمینہ لگائیں۔ انہیں کسانوں سے خراج جمع کرنا تھا اور اسے مغل ریاست اور ریاست کی جانب سے تفویض کردہ لوگوں کو ان کا حصہ دینا تھا۔ یہ مالیاتی دعویٰ، جسے مالکانہ بھی کہا جاتا تھا ایک زمیندار کا حق تھا جیسا کہ وہ زمین کا مالک ہوتا تھا۔ مالکانہ یا تو کل محصول ادا کرنے والی اراضی کا کچھ حصہ محصول سے پاک اراضی کی شکل میں یا پھر کل محصول کی وصولی کے 10 فیصد کے برابر نقد رقم کی ادائیگی ہوتا تھا۔

زمیندار، مال گزار اور خدمت گزار دونوں تھے۔ خدمت گزاری، خدمت کرنے کا حق تھا۔ خدمت گزاروں میں مقدم، چودھری، قانون گو، دیشمکھ، تعلقدار شامل ہوتے تھے، جو سترہویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سامنے آئے۔ وہ سلطنت کے ساتھ ایک معاہدہ

کرتے تھے تاکہ کسی مخصوص علاقے کی آمدنی حاصل کی جاسکے اور زیادہ تر موروثی حقوق سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ ریاست کے لیے محصولات کے تخمینے کی تفصیلات تیار کریں، زراعت کی توسیع میں سہولت فراہم کریں، امن وامان کی بحالی میں مدد دیں اور اگر ضروری ہو تو ریاست کو فوج فراہم کریں۔ان کی خدمت کے بدلے، انہیں 'نانکار' کے نام سے جانا جانے والا بھتہ ادا کیا جاتا تھا جو، یا تو محصول سے پاک زمینوں کی صورت میں یا کل محصول کی وصولی کے 10 فیصد کے برابر نقد رقم کی ادائیگی ہوتا تھا۔

13.2.3 زمین کی ملکیت کا مسئلہ (The Question of Land Ownership)

16 ویں اور 17 ویں صدی میں ہندوستان کا دورہ کرنے والے کئی غیر ملکی سیاحوں جیسے برنیئر، ٹراونیئر، مانکوشائی اور دیگر نے اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں بادشاہ کو زمین پر ملکیت کے حقوق حاصل تھے۔انہوں نے جاگیرداروں کو یورپی جاگیرداروں کے مساوی قرار دیا اور چونکہ بادشاہ جاگیرداروں کو اکثر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کر سکتا تھا، اس لیے یہ اصل بادشاہ ہے جس کے پاس ملکیت کے حقوق ہیں نہ کہ جاگیردار۔ مغل سرکاری دستاویزات میں اس نوعیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا گیا ہے۔نہ ہی قدیم ہندوستانی قانون یا اسلامی قانون میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار مغل دور میں ہندوستان میں زمینوں کی ملکیت کے بارے میں متذبذب تھے۔بادشاہ کے تمام زمینوں کے مالک ہونے کے بارے میں یورپی مسافروں کی تحریروں کو بنیاد بناتے ہوئے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں کی وراثت کے طور پر ان کے زیر تسلط تمام زمینوں پر دعویٰ کیا۔

سولہویں صدی کی دستاویزات، خاص طور پر ابوالفضل کی آئین اکبری میں، کسان کے مستقل حق اور اس کی کاشت کی گئی زمین پر موروثی قبضے کے حقوق، اور ان حقوق کے ناقابل تنسیخ ہونے اور قابل فروخت ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔ سترہویں صدیوں کے کسانوں کو مالک یا 'ارباب زمین' کہا جاتا تھا۔اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کی دستاویزات میں بتایا گیا ہے کہ کسانوں کو اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ اس زمین کی کاشت کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے رہیں جس پر انہوں نے اپنا دعویٰ کیا تھا یا جس زمین کا انہوں نے باقاعدگی سے محصول ادا کیا تھا۔ چنانچہ زمین پر کسانوں کے قبضے کے حقوق قائم رہے۔زمین پر کسان کا حق اس کا انفرادی حق تھا۔تاہم، زمینداروں، کسانوں، کاریگروں، زرعی مزدوروں اور دیگر کی شکل میں پیداوار میں حصہ لینے والے کئی دعویدار تھے اور اسے اجتماعی طور پر استعمال کیا جاتا تھا، جو کہ مخصوص کنٹرول کے سرمایہ دارانہ تصور کے لیے ایک اجنبی عمل تھا۔لہٰذا، عہد وسطیٰ کے دور میں ضروری سوال یہ نہیں تھا کہ زمین کس کی ملکیت تھی بلکہ سوال یہ تھا کہ پیداوار پر دعویٰ کس کا تھا۔مزید یہ کہ کسانوں کی انفرادی پیداوار مساوی نہیں تھی، کسانوں کی مختلف قسمیں تھیں۔اسی طرح ہندوستانی دیہات بھی چھوٹی دیہاتی جمہوریہ یا پرانے طرز کے نہیں تھے۔وہ الگ تھلگ نہیں تھے بلکہ شہروں یا دوسرے دیہاتوں سے ان کے روابط تھے۔گاؤں کی برادری کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ گاؤں کے ارکان کی جانب سے زمین کی مالک ہے۔زمین کی اجتماعی یا طبقہ واری ملکیت یا کسانوں کے درمیان زمین کی متواتر تقسیم در تقسیم کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مغل زرعی نظام کی تشکیل، اضافی زرعی پیداوار، زمینداروں اور ریاست کی طرف سے اس کی تخصیص، اور جاگیرداروں، مدد معاش کے مستحق اور دیگر پر مشتمل حکمران طبقے کے حصے میں اس کی تقسیم سے ہوئی تھی۔اہمیت زمین کی پیداوار/آمدنی کو دی گئی نہ کہ خود زمین کو۔

13.3 شہری معاشرہ (The Urban Society)

جاگیر دار، بادشاہ کے بعد طاقت اور قوت کے لحاظ سے شہری معاشرے کا سب سے اہم جزو تھے۔ مغل دربار میں منصب یا عہدہ کی بنیاد پر جاگیر یا جاگیر کے برابر آمدنی پیدا کرنے والی زمین نوابوں/اشرافیہ کو دی جاتی تھی۔ وہ شہری شعبے میں اشیا کے اہم صارفین تھے اور اشیاء کی طلب پیدا کرنے کا باعث بنتے تھے۔ بابر کے ماتحت اشرافیہ بنیادی طور پر وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے تورانی تھے۔ ہمایوں نے بعد میں اس میں ایرانی عنصر کو بھی شامل کر لیا۔ اکبر نے خاص طور پر تورانی پر انحصار کو کم کر کے اور ایرانیوں یا فارسیوں کو اس زمرہ میں شامل کر کے ایک اور تبدیلی لائی۔ تاہم اشرافیہ بنیاد کو مزید وسیع کرتے ہوئے، اس نے ہندوستانی مسلمانوں (شیخ زادوں) اور راجپوتوں کو بھرتی کیا اور اس طرح نسلی، مذہبی یا قومی بنیادوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ڈھانچے میں مزید توازن پیدا کیا۔ شاہجہاں کے دور اور اورنگ زیب کے پہلے دور میں راجپوتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور بعد کے دور میں مرزا راجہ جے سنگھ اور مہاراجا جسونت سنگھ 7000 سوار کے عہدے پر فائز ہوئے جو کہ اعلیٰ ترین منصب تھا۔ سترہویں صدی میں، خاص طور پر جہانگیر کے دور میں، حکیموں، یعنی پیشہ ور افراد اور پہلوانوں کو ان اشرافیہ میں شامل کیا گیا۔ اگرچہ افغانی، شیخ زادوں کا حصہ تھے لیکن مسلسل مزاحمت کی وجہ سے ان کو شامل کرنا مناسب نہ تھا۔ تاہم، جہانگیر کے دور میں ان کی حیثیت میں ایک بہتری نظر آتی ہے۔ بعد میں سترہویں صدی میں، اورنگ زیب نے دکن میں توسیع کی اور، بیجاپوریوں اور گولکنڈہ کے ساتھ ساتھ مراٹھوں کو بھی اشرافیہ میں شامل کیا۔

سولہویں، سترہویں اور اٹھارویں صدی کے آخر میں کاروبار اور تجارت کی زبردست ترقی نے تاجروں اور سوداگروں اور کاریگروں و دستکاروں کے گروہوں کو واضح طور پر نمایاں کیا۔ اس دور کے ابتدائی جدید ہندوستان میں دیہی شہری معیشتیں الگ یا جدا جدا نہیں تھیں بلکہ مربوط مغل معیشت کے فعال اجزاء کے طور پر وجود رکھتی تھیں۔ یہ تقسیم سخت سے زیادہ لچکدار تھی کیونکہ ایک شہری مرکز کو زرعی علاقے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک قصبے نے اپنے ارد گرد موجود گاؤں کو متعدد سیاسی، علامتی اور تجارتی نیٹ ورکس کے ذریعے منظم کیا۔ لہذا، سماجی زمرے بھی ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی نقد معیشت نے مقامی زمینداروں اور دیہی اشرافیہ کو دولت جمع کرنے میں سہولت فراہم کی۔ اس کی وجہ سے قصبوں کے نام سے جانے جانے والے کئی چھوٹے گاؤں کی ترقی ہوئی جس میں دیہاتوں کی دولت تیزی سے شامل ہوتی رہی جس سے وہ پیداوار اور تبدیلی کے مراکز بن گئے۔ یہ شہروں کو دیہی علاقوں سے جوڑتے ہیں اور دیہاتوں سے شہروں تک سپلائی کے بہاؤ کو ممکن بناتے ہیں۔ کاریگروں نے کاروبار و تجارت میں اضافے اور منڈیوں کی توسیع میں گراں قدر تعاون کیا۔ ان کا تعلق دیہی اور شہری دونوں جگہوں سے تھا۔ دیہی پیداوار کا بڑا حصہ موروثی کاریگروں کی ذاتیں تیار کرتی تھیں۔ تمام دیہاتیوں کو روایتی گاہک کے طور پر مخصوص گاؤں کے کاریگروں سے جوڑا گیا تھا جو کاریگروں کو فصلوں میں سے روایتی حصہ فراہم کرتے تھے تاکہ بدلے میں ان سے دستکاری کی کچھ خدمات حاصل کر سکیں۔ ان کی کمائی زیادہ تر پیداوار کے مقررہ حصے سے حاصل ہوتی تھی، جس کے علاوہ انہیں غیر محصولی زمینیں یا نقد ادائیگیاں کی جاتی تھیں۔

تاہم، شہروں اور دیہاتوں میں بازار کے لیے کاریگروں کی طرف سے تیار کردہ دستکاری مصنوعات موجود تھیں۔اس طرح کی فنکارانہ پیداوار میں ایک بڑا حصہ پارچہ (ٹیکسٹائل) کا تھا۔ جیسے جیسے کاروبار و تجارت میں اضافہ ہوا، تاجروں نے آہستہ آہستہ کاریگروں کو اشیا کی پیداوار کے لیے پیشگی دینا شروع کیا۔ مینابھارگوا لکھتی ہیں کہ پیشگی ادائیگی اور اشیا کے حصول کا نظام، 'دادنی نظام' کے ارتقا کا باعث بنا۔اس نظام کے تحت اشیاء کی خریداری یا تو فوری جگہ پر معاملات یا پھر پیشگی ادائیگی کے ذریعے کی جاتی تھی۔ بڑی مارکیٹوں اور چھوٹی منڈیوں میں جگہ پر خریداری براہ راست اس سوداگر کے دلال کے ذریعہ کی جاسکتی تھی۔ تجارتی سامان کا ایک حصہ اس کے ذریعے حاصل کیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی کے نصف اواخر سے شروع ہونے والی، طویل فاصلے کی تجارت کے لیے اشیا پیشگی معاہدے کے ذریعے حاصل کیے جانے کی شروعات ہوئی۔ یہ اُن بُنکروں کے لیے ایک ضمانت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تصریحات کے مطابق اپنے کرگھے (لوم) کو تبدیل کرنے میں ہچکچا رہے تھے کہ کہیں آخر میں کمپنی انہیں مسترد نہ کردے۔ کاریگروں کو اجرت کمانے والے میں تبدیل کرنے کے خطرے کے باوجود، دادنی نے کاریگروں کی پیداوار کو مارکیٹ پر مبنی پیداوار میں تبدیل کردیا۔

کاریگروں کی پیداوار میں اضافہ شہری شعبہ کو وسعت دینے میں کامیاب ہوا جیسا کہ تاجروں، امراء اور یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد کی جانب سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ٹیکسٹائل کی تجارت نے موجودہ ہندوستانی تجارتی برادری کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھادیا۔ اس میں سیٹھ، بوہرا یا مودی شامل تھے جو طویل فاصلے کی اور بین علاقائی تجارت میں مہارت رکھتے تھے جبکہ بیوپاری یا بانِک مقامی، خوردہ (ریٹیل) تجارت کرتے تھے۔ اشیاء کی خوردہ فروشی کے علاوہ، بیوپاریوں نے اپنے ایجنٹوں کی مدد سے اناج اور نقد فصلیں خریدیں۔ 'بنجارہ' ایک اور تجارتی برادری تھی۔ عام طور پر چھوٹے تاجر ہونے کی بنا پر وہ، وہ تجارتی سامان، خاص طور پر اناج کا نقل و حمل کرتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں اناج اور نمک کی تجارت کے لیے معروف بنجاروں کو ٹیکسٹائل صنعت کے لیے دکن کپاس کی تجارت اور کورومنڈل اور دکن میں عام تبادلے کے لیے جانا جاتا تھا۔ اگرچہ انہیں اکثر دوسرے لوگ اجناس کو دور دراز مقامات پر لے جانے کے لیے کرائے پر ان کی خدمات حاصل کرتے تھے، لیکن وہ خود بھی سوداگر تھے جو سستے داموں اناج لاتے تھے اور اسے منافع بخش قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔

طلب، اخراجات کی نوعیت اور آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر سولہویں اور سترہویں صدی میں ایک بڑا شہری طبقہ موجود تھا۔ کل آبادی کا کم از کم 15 فیصد قصبوں میں رہتا تھا جس کی مجموعی شہری آبادی کل برصغیر کا تقریباً 20 فیصد تھی۔ چنانچہ مغل ہندوستان میں ایک قابل قدر متوسط طبقہ موجود تھا جس میں بیوروکریسی کے نچلے درجوں، حکیموں، ڈاکٹروں، معماروں، فنکاروں، دانشوران، کاتبوں اور مدد معاش کے حامل پیشہ ور افراد شامل تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ، سوداگروں، مہاجنوں، صرافوں اور دلالوں کی شکل میں تجارتی اور مالیاتی گروہوں نے پیسہ کمانے اور اس طرح شہر کاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے لازمی عناصر تھے۔ پیلسارٹ (Pelsaert) نے کئی دستکاری اور خدماتی پیشوں کا ذکر کیا ہے جن میں جولاہا، درزی، حجام، بڑھئی، دھات ساز، معمار اور سنگتراش شامل ہیں جن کے گاہکوں اور خدمات حاصل کرنے والوں میں متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ قصبے کی آبادی میں مزدوروں اور خادمین کی ایک بڑی تعداد شامل تھی جو حکمران طبقے کی ضرورت سے زیادہ بڑے عملے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ گھریلو غلام بھی موجود تھے تاہم ہمیں تیرہویں اور چودھویں

صدی کی طرح کھلے غلام بازاروں یا غلام مزدوروں کے بارے میں سننے کو نہیں ملتا۔

معاشرے کا ایک بڑا حصہ جس میں دیہی اور شہری عناصر پائے جاتے تھے وہ فوج تھی۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ آئین اکبری میں زمینداروں کے خادمین کا تفصیلی بیان ملتا ہے جن کی تعداد 384,558 گھڑسوار اور 4,277,057 پیادہ تھی۔ یہ دستے عملاً مکمل طور پر دیہی تھے۔ پیدل سپاہی صرف مسلح کسان ہی ہو سکتے تھے۔ لیکن گھڑ سوار فوج اعلیٰ طبقہ سے آئی ہو گی، شاید بنیادی طور پر سرداروں اور چھوٹے زمینداروں سے ان کا تعلق ہوتا ہوگا۔ 47-1646ء میں بشمول بشمول منصب دار شاہی فوج، کا تخمینہ سرکاری طور پر 2 لاکھ لگایا گیا تھا۔ عرفان حبیب کے مطابق، وہ بالکل مختلف طبقوں سے آئے تھے جیسے وسطی ایشیا اور ایران سے آنے والے تارکین وطن، افغان اور ہندوستانی پیشہ ور گھڑسوار اور زمیندار قبیلوں کے راجپوت۔ وہ بنیادی طور پر مغل سلطنت کی کامیابی کے ذمہ دار تھے۔ دیہی علاقوں سے نکل کر شاہی فوج کے بہت سے دستے قصبوں میں تعینات کر دیئے جاتے تھے، اس طرح کے قصبے بعض اوقات فوجی کیمپوں کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔

13.4 خواتین کی حیثیت (Position of Women)

خواتین کسی بھی معاشرے کا لازمی حصہ ہیں۔ عہد وسطیٰ کے دربار اور معاشرے میں ان کے بارے میں معلومات نسبتاًان مردوں کے مقابلے میں کم ہیں جو طاقت و قوت رکھتے تھے۔ دوسرے طبقے کی عام خواتین کے مقابلے اعلیٰ مغل خواتین کے بارے میں زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ مغل خواتین نے دربار اور سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ مغل نسل کو برقرار رکھنے والوں میں سے تھیں اور مستقبل کے پادشاہ کی پرورش میں شامل تھیں۔ لہٰذا، وہ صحیح آداب ورسوم کو برقرار رکھتیں اور حرم کے اندر اس کے نفاذ کو یقینی بناتی تھیں۔ ہندل کی ماں، دلدار بیگم نے اپنے ہی بیٹے کو اس وقت مار ڈالا جب اس نے اپنے سوتیلے بھائی ہمایوں کے خلاف بغاوت کی۔ مغل خواتین نے بعض انتہائی اہم لحات میں امن قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب سلیم نے اکبر کے خلاف بغاوت کی اور اس کے نتیجے میں شہنشاہ کے چہیتے ابوالفضل کو قتل کر دیا تو اکبر نے اسے معاف نہ کرنے کا عہد کیا۔ اس موقع پر اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم، اس کی خالہ گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطانہ بیگم نے مداخلت کی اور شہزادے کو معافی دلوائی۔ اس واقعہ نے باپ بیٹے کے تعلقات کو بہتر کیا۔ خواتین نے رضاعی ماؤں کی شکل میں اضافی رشتہ داری کو فروغ دیا۔ اکبر کے جیجی انگا کے خاندان سے قریبی تعلقات تھے، جنہوں نے اسے کھلایا پلایا اور جن کے خاندان کے افراد اس کے دور حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ماہم انگا کی بہت عزت کرتا تھا جو رضاعی ماؤں کی سرپرست تھی۔ اس کے دور میں خواتین کو کچھ انتظامی فرائض بھی سونپے گئے تھے۔ ہمیں اکبر کی سوتیلی بہن بخت النساء کے کابل کے گورنر کا چارج سنبھالنے کی مثال ملتی ہے جب اس کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم نے ان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ مغل خواتین تجارتی سرگرمیوں میں بھی شامل رہیں۔ نور جہاں کے پاس تجارت کے لیے اپنا جہاز تھا اور وہ یورپی تاجروں کے ساتھ تجارت کرتی تھی۔ اس نے حرم کے اندر جدید ترین فیشن کو رائج کیا اور اس کی ماں نے عطر ایجاد کیا۔ اس نے تعمیراتی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لی اور آگرہ میں اعتمادالدولہ کے مقبرے کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔ یہ مقبرہ تعمیری مواد کی سرخ ریت کے پتھر سے مکمل سفید سنگ مرمر کی عمارتوں میں منتقلی کے لیے مشہور ہے۔ یہ پچی کاری طرز (Pietra-dura style) کے تعارف کے لیے بھی

جانا جاتا ہے جس میں کندہ کاری میں قیمتی پتھر اور ہیرے شامل تھے۔اسی طرح، شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بھی اپنی تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھی۔ شاہجہان آباد میں مینا بازار سمیت مسجد اور دیگر عمارتوں کی تعمیر انہوں نے کروائی۔ وہ شاعرہ اور عالم بھی تھیں۔اور نگ زیب کی بیٹی زیب النسا شاعری کرتی تھیں اور ان کا تخلص 'مخفی' تھا۔ روبی لال کا ماننا ہے کہ اکبر سے پہلے مغل دربار درست طور پر منظم نہیں تھا اور یہی معاملہ حرم کا بھی تھا اور اسی لیے سرکاری اور نجی معاملات کے درمیان موجود حدیں زیادہ سخت نہیں تھیں۔ تاہم اکبر کے دور سے سلطنت کو جو استحکام حاصل ہوا تھا اسی کے ساتھ دربار اور حرم دونوں ہی کی حدود متعین ہو گئیں۔ حرم کنکریٹ سے گھری جگہ بن گئی جس کی وجہ سے یہ نجی جگہ بن گئی۔ تاہم، روبی لال کہتی ہیں کہ ایک بند جگہ ہونے کے باوجود، حرم بیرونی دنیا سے منقطع نہیں تھا۔ وہ اپنے استدلال کی تائید میں اس بات کی مثال دیتی ہیں کہ حرم کے پیچھے سے بھی خواتین نے سیاست میں فعال کردار ادا کیا۔ انہوں نے اس بات کو بھی پیش کیا کہ کیسے گلبدن بیگم نے اکبر کے دور حکومت میں 1574 میں مکہ کو جانے والے حج کے ایک قافلے کی قیادت کی تھی۔

تاہم، عام خواتین کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ مغل تصاویر میں آگرہ اور فتح پور سیکری میں تعمیراتی سرگرمیوں میں شامل خواتین کو دکھایا گیا ہے۔ خواتین پانی بھرتیں، سوت کاتا کرتیں، چکی میں مکئی پیستیں اور زراعت میں مدد کرتی تھیں، تاہم وہ کچھ ہمالیائی برادریوں کی طرح مٹی کو جوتنے کا کام نہیں کرتی تھیں۔ بنگال میں عورتیں باریک دھاگہ بناتی تھیں جس سے ململ بُنی جاتی تھی۔ عورتوں کی شادیاں اکثر بچپن میں کر دی جاتی تھیں۔ شادیاں بلوغت سے پہلے ہی انجام دے دی جاتی تھیں۔ نچلی ذاتوں میں بیٹیوں کے والدین کو دلہن کی قیمت ملتی تھی جبکہ اعلیٰ ذاتوں میں، دولہے کے والدین کو عام طور پر دلہن کے والدین سے جہیز ملتا تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں بیوہ کی دوبارہ شادی ممنوع تھی۔ لیکن بہت سے کسانوں اور چرواہا ذاتوں، جیسے جاٹ، آہیر اور میواتی میں، بیواؤں کی اپنے شوہروں کے بھائیوں یا اجنبیوں سے کی دوبارہ شادی کی جاسکتی تھی۔

13.5 ذات کا عنصر (Caste System)

عرفان حبیب کے مطابق ذات، ایک واضح طور پر علیحدہ برادری ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے شادی (marriage) کے ذریعے اور اکثر و بیشتر ایک مشترکہ حقیقی یا مفروضہ موروثی پیشے کی وجہ سے بندھے ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ اس میں مراتب کے تصور کو بھی شامل کرتے ہیں، جس میں اپنی ذات کے لحاظ سے کچھ ذاتیں پاک اور کچھ ذاتیں ناپاک قرار پاتیں۔

لوئی ڈیومونٹ (Louis Dumont) ہوموہائرارشیکس (*Homo Hierarchicus*) میں مراتب کے اس اصول کو ذات پات کے نظام کی اصل خصوصیت سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ذات پات کے نظام کو مذہبی نظریے کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ اس کے لیے مراتب اصل میں، اقتدار یا دولت کی تقسیم سے نہیں ابھرتی بلکہ پاکیزگی اور ناپاکی کے بنیادی اصول سے پیدا ہوتی ہے، مراتب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ برہمنوں کا ہے جو خالص ترین ہیں اور رسوم ورواج کے ماہر ہیں۔ لہٰذا، لوئی ڈومونٹ کے نزدیک، ذات نہ تو طبقات کی انتہائی شکل تھی اور نہ ہی سماجی مراتب کا نظام تھا اور نہ ہی یہ دولت یا اقتدار کی تقسیم سے مطابقت رکھتی تھی۔ یہ سماجی تنظیم کی ایک شکل ہے اور

اسے کل کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ یہ درجہ بندی، اضافی پاکیزگی کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی اور اس میں معیشت کا کوئی کردار نہیں تھا جس کا یقینی طور پر مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے کے اندر معاشی تحریک اثر بہت کمزور تھا۔ مزید برآں، یہ ہندوستان کے ناقابل تبدیل طبقاتی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عرفان حبیب نے ڈومونٹ پر تنقید کی اور کہا کہ معاشی اثرات، ذات پات کی تشکیل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں محنت کی موروثی تقسیم بہت زیادہ تغیر پذیر ہے۔ تاہم، مذہبی پہلو اہم ہے اور معاشی پہلوؤں کو ثانوی سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈی ڈی کوشامبی کی رائے کے مطابق، ذات کو درجہ بند طور پر مختلف سماجی ساختوں کے تناظر میں اس کے کردار میں دیکھنا ہوگا۔ محنت ومزدوری کے عمل پر مبنی ایک سماجی تشکیل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ معاشرے کو اضافی پیداوار فراہم کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ رگ وید میں راجنیہ جو اشرافیہ، برہمن پجاریوں، بڑے لوگوں اور شودروں کی خدمت کرنے والی برادریاں ہیں، کے مقابلے 'پُرش سوکت' سماجی طبقات کی زیادہ وضاحت آئی ہے۔ پیشے یا صرف اپنی ذات میں شادی کی موروثی تقسیم کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ڈی ڈی کوشامبی کا ماننا تھا کہ قبائلی عناصر کا عام سماج میں داخل ہونے کا تاریخی عمل ذات پات کی بنیادوں میں پوشیدہ ہے۔ قبائل میں اکثر صرف اپنے قبیلے کے اندر ہی شادی کرنے کا رواج تھا۔ بہت سے لوگوں نے غیر فعال طرز زندگی اختیار کی۔ لیکن قدیم شکار یا خوراک جمع کرنے والے بہت سے قبائل ایسے تھے جو ترقی کرنے والی کسان برادریوں جیسے ساکیوں، کولی، ناگاؤں کے زیر تسلط آنے پر عام معاشرے میں داخل ہوئے۔ جیسا کہ غذا اکٹھا کرنے والوں کو محکوم بنایا گیا اور انہیں سب سے نچلی ذات مختص کر دی گئی، انہیں اتنا نیچ بنا دیا گیا کہ وہ چاروں ورنوں سے بھی باہر ہو گئے۔ یہ اصل اچھوت ذاتیں تھیں۔ عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ چونکہ انہیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے سے روک دیا گیا تھا، اور ان کے اپنے پیشے معمولی تھے یا وہ موسمی لحاظ کے تھے، اس لیے وہ بے روزگار اور بے زمین مزدوروں کا ایک جتھہ بن گئے جو کسانوں اور اعلیٰ زمینداروں کو کام کے لیے ارزاں طور پر دستیاب تھا۔ دونوں گروہوں کے درمیان تلخ دشمنی کی بنیاد دراصل مفادات کا ٹکراؤ تھا۔ پاکی اور ناپاکی کے تصورات اس بنیادی معاشی حقیقت کی ایک توجیہہ تھے۔

تاہم، کسانوں اور غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کی یہ علیحدگی ایک عمومی نوعیت کی تھی۔ عرفان حبیب نے آر ایس شرما کے دوسری شہری کاری (second urbanisation) کے خیال کے بارے میں کہا کہ یہ اس وقت ہوئی ہوگی جب پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ محنت (دھندوں) کی تقسیم کے دباؤ میں قبائل مختلف پیشوں کی بنیاد پر تقسیم ہو گئے ہوں۔ اصل قبیلے سے الگ ہونے والے مختلف کاریگروں کو مخصوص ذاتوں میں تشکیل دے دیا گیا۔ تجارت پر مبنی تفریق کا ایک ایسا ہی عمل تجارتی ذات کی نمو کا باعث بنا جس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے 'ویشیا' ورن کو تشکیل دے لیا۔ ذات پات کے دائرہ میں برہمن کو ان کا مقام ان کے پجاری کردار کی وجہ سے اور ڈی ڈی کوشامبی کے مطابق کیلنڈر پر ان کی گرفت کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جو کہ زرعی کاموں کے نظم کے لیے بہت ضروری تھا۔ وہ طبقہ جو تبدیلی کا سب سے زیادہ شکار ہو سکتا تھا وہ حکمران اور جنگجو طبقہ، شتریہ تھا۔ حملوں اور بغاوتوں نے اقتدار کی موروثی اجارہ داری کو انتہائی مشکل بنا دیا تھا۔

عرفان حبیب کے نزدیک،ذات پات کے نظام کو رواج دینے کے لیے برہمن ذمہ دار تھے اور اسے مذہب سے جوڑ کر، برہمنوں نے ذات پات کے نظام اور برہمن مت سے جوڑ دیا۔ یہاں تک کہ بدھ مت کے کرم اور اہنسا کے نظریہ نے کسانوں اور غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کے لیے منفی طور پر کام کیا جیسا کہ یہ خوراک اکٹھا کرنے اور جانوروں کا شکار کرنے والی ذاتوں کو محکوم بنانے اور انہیں ذلیل کرنے کا باعث بنا۔ عرفان حبیب کے مطابق ذات پات کا نظریہ اپنے نقطہ نظر میں خصوصی طور پر برہمنی نہیں رہا۔ وہ بدھ مت کے عروج (500 قبل مسیح) سے لے کر گپتا دور تک کے دور کو ذات پات کے نظام اور اس کے حمایتی نظریے کی تشکیل کا دور مانتے ہیں۔ محنت (دھندوں) کی تقسیم کی شکل نسبتاً سخت ہونے کی وجہ سے ذات پات کا نظام پیداواری تعلقات کا حصہ بنا۔ ذات پات کا نظام محنت (پیشوں) کی دو مختلف دنیاؤں میں بھی کام کرتا ہے۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والا کاریگر جس کی نگرانی اور پرورش گاؤں کے ذمہ ہے اور قصبے کا کاریگر جس کا مکمل انحصار بازار کے اتار چڑھاؤ پر ہے۔ مارکس (Marx) گاؤں کے کاریگروں اور خاص ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہنر مند افراد کے بارے میں بات کرتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر پورے گاؤں کے خدمت گزار تھے اور انہیں کسی قسم روایتی ادائیگی کے ذریعے یا زمین مختص کر کے یا اشیا کے تبادلے کے ذریعہ پالا جاتا تھا۔ موروثی کاریگر اور دستکار، گاؤں کی خود کفالت کو برقرار رکھنے میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے اور انہیں اس قابل بنایا جاتا تھا کہ وہ اپنے آقاؤں کو اضافی اشیا کا ایک بڑا حصہ فراہم کر سکیں کیونکہ سامان کی درآمد کی ضرورت بہت کم ہوگئی تھی۔ گاؤں کے باہر کاریگر صرف ایک شخص دکھائی دیتا ہے جو اپنا سامان بازار میں بیچ رہا ہے۔ ذات کی طرف سے موروثی پیشہ انہیں مخصوص مہارتوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ موروثی پیشہ افقی حرکت کو چھوڑ کر مہارت کو برقرار رکھتا ہے۔ کاریگروں کو پست درجہ یا ذات دینے سے اعلیٰ ذات کے حکمران طبقے کو اضافی فوائد حاصل ہوتے تھے۔ منوسمرتی میں وہ مخلوط جاتی (ذات) کے طور پر نمودار ہوئے۔ گیارہویں صدی میں البیرونی نے پیشوں کے آٹھ درجے بتائے ہیں جن میں انتیاجاؤں (اچھوت ذاتوں) میں کے بنکر (weaver) اور چمار بھی شامل ہیں۔ ان کی کم حیثیت کی بنا پر ان کی اجرت کم رہتی تھی جس نے ان کی مزاحمت کی طاقت کو کم کیا ہوگا۔ ذات پات کے نظام نے قدرتی اور بازار پر مبنی معیشت دونوں میں سہولت سے کام کیا۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ اس نے تصوراتی پاکیزگی کے تانے بانے کو نہیں بلکہ طبقاتی استحصال کے نظام کو برقرار رکھا ہے۔

عرفان حبیب کے نزدیک تیرھویں صدی میں کئی تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سب سے پہلے، اس میں سابقہ جاگیردارانہ حکومت کے برعکس مارکس کی مشرقی استبداد (Oriental Despotism) کی تعریف کے مطابق ایک سماج تشکیل ہوا۔ دیہاتوں اور قصبوں دونوں میں ذات پات کا ڈھانچہ بنیادی طور پر پہلے کے دور کی طرح ہی رہا۔ ذات پات کے تئیں مسلمانوں کا رویہ اسے مسترد کرنے کا نہیں تھا۔ جب عربوں نے 12-711ء میں سندھ کو فتح کیا تو انہوں نے سابقہ دور حکومت میں جاٹوں پر عائد پابندیوں کو جاری رکھا جس میں ایک پابندی یہ بھی تھی کہ انہیں اپنے پنچ کردار کی علامت کے طور پر اپنے ساتھ ایک کتا لے کر چلنا پڑتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے دوران فارسی تحریروں میں توحید کی بات کی گئی ہے اور بت پرستی کی مذمت کی گئی ہے لیکن انہوں نے درجہ بندی یا امتیاز پر کبھی سوال نہیں اٹھایا، بلکہ درحقیقت انہوں نے اسے فروغ دیا۔ برنی ہمیشہ اصیل ترکوں (Blue-blooded Turks) کے اقتدار کے حقدار ہونے پر زور دیتے ہیں۔ نیز، ذات پات کے

نظام نے کم لاگت میں زیادہ آمدنی اور اشیائے صرف پیدا کرنے میں مدد دی اور اس طرح یہ نظام حکمران طبقے کے لیے فائدہ مند رہا۔

عرفان حبیب کے نزدیک، ترک اپنی آمد کے ساتھ ساتھ بہت سی نئی دستکاری کی ٹیکنالوجیوں کے علاوہ بہت سی نئی قسم کی مصنوعات اور خدمات کے مطالبات بھی لائے اور قصبوں اور شہروں میں رہنے والے حکمران اشرافیہ کا ظہور ہوا اور ایک ریاست ابھری جو شہری نوعیت کی تھی۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں آنے والے تکنیکی آلات میں دائیں زاویہ والے ایرانی گیئر، چرخی، کاغذ سازی، قوسی چھتوں کی تعمیر، بٹومین اور چونے کے سیمنٹ کا استعمال، گھوڑے کی نعلیں وغیرہ شامل تھے۔ اس سے نئے پیشوں کی تخلیق ہوئی اور بہت سے لوگوں نے ان ہنروں کو سیکھا جس کی بنا پر کاریگر گروہ کے لوگوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جسے عرفان حبیب نے تیسرا انقلاب قرار دیا۔ نئے حالات کے دباؤ کی بنا پر ابتدا میں بڑے پیمانے پر غلاموں کی تجارت شروع ہوئی اور غلام خدمت گزاروں کا ظہور ہوا جو شہری مزدوری کا ایک اہم حصہ تھے۔ غلاموں کو ذات پات سے محروم کر کے اسلام قبول کروالیا گیا جس کی بنا پر انہیں کسی بھی کام پر لگایا جا سکتا تھا اور وہ کوئی بھی ہنر سیکھ سکتے تھے۔ غلامی سے آزاد ہو کر، انہوں نے تارکین وطن کاریگروں کے ساتھ مل کر غالباً مسلم کاریگروں کا بڑا حصہ تشکیل دیا۔ علاوہ ازیں اب وہ ان پیشوں کو بھی اختیار کر رہے تھے جن کی پہلے اجازت نہیں تھی۔ ذات پات کے قوانین بلاشبہ ان برادریوں کو متاثر کرتے رہے۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ، انیسویں صدی کے ریکارڈوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنکر، قصاب، حجام اور دیگر افراد میں اپنی ذات میں شادی کا شدید رجحان تھا۔ غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں کو 'کمین' سمجھا جاتا تھا، جو اچھوت تو نہیں تھے لیکن پھر بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ تاہم، مسلمانوں میں، ذات پات کا ڈھانچہ کمزور رہا کیونکہ سماجی نقل و حرکت اور اپنی ذات میں شادی سے انحراف ہوتا رہا۔

اگرچہ ایک بڑی آزاد آبادی نے ذاتوں کے موجودہ ڈھانچے میں خلل ڈالے بغیر نئے پیشوں کے لیے اضافی مزدور فراہم کر کے ذات پات کے نظام کو تقویت بخشی، عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ذات پات کے نظام کی مکمل برقراری جیسا کہ میکس ویبر نے فرض کیا ہے، مشکوک ہے۔ انہوں نے مورس ڈی مورس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اصل میں ذات پات کا نظام اس سے بالکل مختلف تھا کہ اسے قانون کی کتابوں یا نظریے کے مطابق چلایا جائے۔ ایک طبقہ کو ایک خاص کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے ذاتوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر، 18ویں صدی میں مہاراشٹر میں، درزیوں کا ایک حصہ رنگنے اور دوسرے نے نیل رنگنے کا کام لیا۔ عرفان حبیب نے سندھ کے جاٹوں کی جانب توجہ مبذول کروائی جو 7ویں صدی میں چنڈال برادری تھے اور 11ویں صدی میں شودر ہو گئے اور ثقافت کاری کے عمل کے ساتھ ساتھ 17ویں صدی کسان (ویشیہ حیثیت والے) بن گئے۔ تاہم، ایسے شعبے بھی تھے جہاں ثقافت کاری (Sanskritisation) کے عمل کا وجود ہی نہیں رہا یا بہت سست تھا، اس نے ذات پات کے نظام پر تنقید کرنے والی وحدانی تحریکوں کو جنم دیا۔

توحید پرست تحریکوں کے زیادہ تر سنتوں کا تعلق پیشہ ورانہ یا غیر ہنر مند (خدمت گزار) ذاتوں سے تھا۔ کبیر ایک بُنکر تھے۔ نام دیو سوتی کپڑے پر چھپائی کرتے تھے؛ رائے داس، ایک خاکروب تھے؛ دادو، کپاس دھنتے تھے۔ ان توحید پرست سنت تحریکوں کو نئے ابھرتے ہوئے کاریگر اور پیشہ ور گروہ کی حمایت حاصل ہوئی جن کے معاشی حالات بہتر ہو رہے تھے لیکن درجہ بندی یا مراتب کے ڈھانچے میں ان

سماجی شناخت وہی رہی تھی۔ سولہویں سترہویں صدی میں ان تحریکوں میں سے کچھ نے مذہبی برادری کی شکل اختیار کی۔ سولہویں اور سترہویں صدی کی زیادہ تر تحریکوں نے ذات پات کے نظام کو توڑے بغیر اس کے اندر ضروری انتظامات کیے۔ چنانچہ ذات پات کا نظام عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں استحصال کا سب سے بڑا ہتھیار تھا جس سے فائدہ اٹھانے والے، بنیادی طور پر، حکمران طبقہ اور زمیندار تھے، جس کے بعد بڑے تاجر اور سوداگر تھے۔ ذات کے غلبے اور فوجی طاقت کے درمیان ایک واضح تعلق تھا۔

13.6 درباری معاشرہ اور ثقافت (Court Society, and Culture)

1980 کی دہائی سے سے قبل، تاریخ نویسی میں سیاسی اور معاشی معاملات غالب تھے۔ تاہم، 1980 اور 1990 کی دہائیوں تک، نئے ماخذ، نئی تفتیش اور تحقیق کے ذریعے تلاش کیے گئے، نئے ذرائع کا پتہ لگایا گیا۔ ماضی کی سماجی اور ثقافتی تاریخ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً جذبات کی تاریخ (History of Emotions)، کھانے پینے، لباس اور عادات کی تاریخ وغیرہ۔ حال ہی میں مانسون کی تاریخ پر بھی کام کیا گیا۔ 'درباری معاشرے' کے بارے میں نوبرٹ ایلیا (Norbert Elias) کا تصور کسی بھی دربار کے مطالعہ میں ایک دلچسپ نقطہ نظر فراہم کرتا ہے اور اس کا یہ تصور کہ ثقافتی عظمت (cultural grandeur) کسی بھی ریاست کے وجود کا قانونی جواز ہوتی ہے، بصیرت انگیز ہے۔

دربار ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہر سرگرمی، چاہے وہ غیر معمولی ہو یا روزمرہ کی ہو، باہر کے لوگوں کے لیے تماشہ گاہ کی طرح اثر رکھتا ہے۔ یہ اس کے قانونی جواز کا ذریعہ بھی تھا۔ تماشہ گاہ کی طرح مغل دربار، سماجی نظام کا ایک نظریہ رکھتا تھا جس میں اسے مثالی کردار ادا کرنا ہوتا تھا۔ آداب واخلاق کے لحاظ سے، ہندوستان اور ایران میں اس ادب کو کافی فروغ ملا ہوگا جو کہ زیادہ تر 'اخلاق ناصری' سے متاثر تھا جسے نصیر الدین طوسی نے 13 ویں صدی میں لکھا تھا۔ یہ اکبر کے سامنے پڑھی جانے والی کتابوں میں سے تھی اور جہانگیر کے دور اور اس کے بعد بھی ہمیں بہت سی تصنیفات ملتی ہیں جن کا موضوع طوسی کی تحریروں میں کی طرز پر تھا۔ اخلاقی ادب، دربار کے اندر اور باہر درباری آداب سے متعلق ہے۔ ہربنس کھیا کے مطابق، اخلاق درباری لوگوں کی عام لوگوں پر فوقیت پر زور دینے کے لیے نہیں تھے بلکہ اس کا مقصد اشرافیہ گروہ کے افراد کو ایک طرز میں ڈھالنا تھا، دربار میں اشرافیہ کے درمیان ایک درجہ بندی پیدا کرنا تھا۔ اس میں شاہی طبقے کے سماجی آداب واخلاق کی بات کی گئی ہے۔ لیکن دیگر لوگوں کے لیے، مراعات کے درجات کے درمیان امتیاز ایک بڑا قابل توجہ معاملہ تھا، جو مراتب یا درجوں کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً جہاں بادشاہ مرکز و محور ہو، اس سے فاصلہ بھی درباریوں کے سماجی درجہ/رتبہ کی عکاسی کرتا تھا۔

ہربنس کھیا نے اپنی تصنیف دی مغلس آف انڈیا (*The Mughals of India*) میں مغلوں کے درباری آداب کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مغل ہندوستان میں دولت کے بجائے سماجی حیثیت پر زور دیا جاتا تھا۔ ایسے سماجی ماحول میں، درباری آداب نے درجہ بندی کو تقویت دی۔ مغل امراء دولت سے زیادہ اقتدار کو ترجیح دیتے تھے۔ جہانگیر کے امیر محمد باقر کے مطابق دولت

کا دروازہ اپنے حصول میں بے شمار مصائب لائے بغیر کبھی نہیں کھلتا۔ بے تعلقی کا یہ رویہ عہد وسطیٰ کو جدید دور سے الگ کرتا ہے۔ امرا، درجہ اور آداب کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مغل دربار کے آداب کے پیچھے ایک لمبا سلسلہ ملتا ہے، تاہم ایسا لگتا ہے کہ یہ ایرانی نمونہ سے کافی متاثر تھے۔ بہت سی مغل درباری رسومات اور طرز عمل خاص طور پر شاہی عظمت اور شان و شوکت کا تصور ساسانیوں کے درباری طریقوں سے متاثر ہیں۔ درباری تقاریب جیسے شہنشاہ کے یا اس کے تخت کے سامنے ماتھا ٹیکنا، اس کے ہاتھوں یا پاؤوں کو چومنا، کمر سے نیچے جھک کر سلام کرنے کے طریقے، تہواروں یا شاہی سالگرہ جیسے خاص مواقع پر تحائف، خطابات اور عہدوں کی تقسیم کے رواج کی بنیادیں ساسانی طریقوں میں ملتی ہیں۔

دربار کے اندر آداب کی پابندی کے کئی درجے تھے جن سے انحراف سخت سزا کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ شاہی خاندان کے اندر بھی یہی معاملہ تھا جہاں عمر، رشتہ اور جنس اہم عوامل تھے۔ خاندان کے اندر، ماؤں اور پھوپھیوں کو سب سے زیادہ تعظیم دی جاتی، بابر بالعموم اپنی پھوپھیوں اور اپنے خاندان کی دیگر بزرگ خواتین سے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر ملتا جو کہ حیثیت میں برابری کا علامتی اشارہ تھا۔ 1519 میں جب بابر اپنی بڑی بہن سے ملنے گیا تو اس نے احترام اور تعظیم میں اپنے گھٹنے ٹیک دیے اور بہن نے بھی گھٹنے ٹیکے۔ بابر لکھتا ہے کہ اس نے بعد میں یہی طریقہ اپنائے رکھا۔ اکبر اپنی والدہ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا اور اس کی وہی تعظیم کرتا جو بحیثیت شہنشاہ اسے دربار میں ملتی۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ ایک بار وہ اپنی والدہ سے ملنے گیا تو اس نے احتراماً سجدہ کیا اور کورنش بجالایا اور بعد میں واپسی کی اجازت حاصل کی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ چنگیزی رواج اور تیموری اصولوں کے مطابق چھوٹے سے لے کر بوڑھے تک سب کا احترام کیا جاتا تھا۔

تاہم برابری کے لوگوں میں عمر کے فرق کی بنا پر آداب کے تقاضوں کی شدت میں کمی آئی۔ بابر لکھتا ہے کہ جب وہ اپنے ماموں سلطان محمود خان سے ملنے فرغانہ گیا تو اس نے خان کے سامنے تین بار گھٹنے ٹیکے اور خان اس سے ملنے کے لیے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب بدخشاں کا حکمراں مرزا سلیمان اور مغل خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے تو اکبر ان کے استقبال کے لیے نکلا، جب وہ دوبدو ہوئے تو مرزا گھوڑے سے اترا اور سلام کرنے کے لیے آگے آیا۔ اکبر نے اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے اس رسمی کام سے مستثنیٰ قرار دیا اور اس کے بجائے اسے گلے لگا لیا۔ تاہم، عمر اور حیثیت سے کم تر مرد رشتہ دار کے لیے کوئی عام رعایت نہیں دی گئی تھی۔ اعتمادالدولہ، آصف خان، شائستہ خان کو آداب کے اصولوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ نیز عہد وسطیٰ کے سماج میں عوامی اور نجی حلقوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ افراد کو دونوں جگہوں پر رسومات ادا کرنی پڑتی تھی۔

اکبر نے اپنے دربار میں درباریوں کے لیے واضح حد بندی بنا رکھی تھی۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ جب وہ تخت پر بیٹھا تو باقی سب نے کورنش بجالایا اور اپنے اپنے رتبہ کے مطابق ہاتھ باندھے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ شہزادے اپنی پیدائش کی ترتیب کے لحاظ سے تخت 4-1 اور 1/2-6 گز کی دوری پر ہوتے تھے، پھر ان کے بعد دین الٰہی (15-3 گز) کا نمبر آتا۔ ان کے بعد بزرگ درباری ہوتے اور پھر امراء تخت سے 12-10 گز کی دوری پر ٹھہرتے۔ مغل دور میں دربار کو ایک مقدس مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حرمت شہنشاہ کی موجودگی سے ہوتی۔ لٰہذا دربار میں داخل ہونے پر جوتے مرکزی دروازے پر چھوڑنے پڑتے تھے، جیسے کہ وہ مسجد یا مندر یا مقبرے کے باہر چھوڑے جاتے تھے۔

کسی کو یہاں تک کہ شہزادوں کو بھی شہنشاہ کے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی الّا یہ کہ ایسا کرنے کی ہدایت دی جائے۔ایک بار شہزادہ اعظم نے بے خیالی میں تخت کو اپنے پاؤں سے چھوا، جس پر اورنگزیب اتنا ناراض ہوا کہ اس نے دربار کو دن بھر کے لیے برخاست کر دیا۔ دربار کا تقدس خاموش رہ کر بھی برقرار رکھا گیا۔ شہنشاہ کی موجودگی میں کسی کو بھی بولنے کی اجازت نہیں تھی جب تک کہ ایسا کرنے کو نہ کہا جائے۔ دربار میں شراب پینے پر سخت پابندی تھی اور اس کی خلاف ورزی پر سخت سزا دی جاتی۔شہنشاہ کی موجودگی میں حقیقت میں بولنے کا شرف بہت کم لوگوں کو دیا گیا تھا اور اسی وجہ سے اسے اعلیٰ حیثیت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ درباریوں کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر شہنشاہ کسی درباری سے خوش ہوتا تو اس کی طرف ابرو اٹھا کر دیکھتا۔

سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) اور منوچی (Manucci) نے درباری ترتیب اور اس کے آداب کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ دربار کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہوتا تھا۔ تخت کے قریب ترین سطح کی حد بندی سونے سے، اس سے تھوڑا نیچے کی چاندی سے، اور اس سے نیچے تیسری سطح پر لکڑی کی باڑ ہوتی۔ پہلا حصہ شاہی شہزادوں کے لیے تھا، دوسرا عالی مرتبت شخصیات کے لیے اور تیسرا نچلے درجے کے امراء اور افسروں کے لیے مخصوص تھا۔ کوئی بھی اپنی تفویض کردہ جگہ سے ہٹ نہیں سکتا تھا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک دفتر قائم کیا گیا تھا۔ شہنشاہ اپنے خصوصی اختیارات جیسے شیروں اور ببروں کے شکار، خاص قسم کی چھتری کے استعمال، مخصوص رنگوں بالخصوص سرخ رنگ کے استعمال، تخت اور اس سے مشابہ چیزوں پر بیٹھتے وقت باجا بجانے، جھروکہ میں بیٹھنے، مینا بازار کا دورہ کرنے، سکے جاری کرنے، خطبہ پڑھنے، موت کی سزا سنانے وغیرہ کی انتہائی غیرت حمیت کے ساتھ حفاظت کرتا تھا۔

دربار میں حاضری دینے والے شرفا و نوابوں کو بادشاہ کی کے تئیں تابعداری کو ظاہر کرنے کے لیے کورنش، یا تسلیم بجالانی پڑتی یا پائے بوس یا زمین بوس ہونا پڑتا یا پھر سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ کورنش کا مطلب ہے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھنا اور سر کو نیچے کی طرف موڑنا۔ تسلیم بجالانے کا مطلب ہے دائیں ہاتھ ہتھیلی کو زمین پر رکھنا اور پھر اسے آہستہ سے اٹھانا۔ جب وہ شخص کھڑا ہوتا تو، وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے سر کی پیشانی پر رکھتا۔ پائے بوسی کو بلبن نے متعارف کرایا تھا اور مغلوں نے اپنایا تھا۔ دربار میں ہر کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اس کے لیے حکمران سے قربت کی ضرورت ہوتی تھی جو اسے ایک نادر استحقاق دیتی۔ اکبر نے زمیں بوس متعارف کرایا۔ اکبر نے اسے زمین بوسی کہا۔ دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملنا ایک خاص اعزاز تھا۔ بابر کے امراء میں سے صرف دو کو اس کی موجودگی میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو اس قالین پر بیٹھنے نہیں دیا تھا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ عدالت میں پیشی کے لیے ڈریس کوڈ بھی سخت تھا۔ کچھ رنگ جیسے سرخ مخملی یا پیلے رنگ بادشاہ کے استعمال کے لیے مخصوص تھے۔ سر پر پگڑی باندھنے اور پاؤں ننگے رکھنے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ داڑھی اور پاجامے کی لمبائی بھی متعین تھے۔

اپنی حیثیت کے فرق کی علامت کے طور پر تحائف دینا بھی آہستہ آہستہ مغل دربار میں آداب کا حصہ بن گیا۔ نہ دہلی کی سلطنت میں اور نہ ہی بابر اور ہمایوں کے دور میں حکمران کو تحفہ دینا فرض سمجھا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ رواج بنایا تھا کہ جو کوئی درخواست لے کر دربار میں آئے تو

اس کے ساتھ مناسب تحفہ منسلک کرے۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر نے عام حکم جاری کیا کہ جب بادشاہ کسی امیر کی رہائش گاہ کا دورہ کرے تو اعلیٰ سے ادنیٰ تک ہر شخص اسے تحائف پیش کرے۔ مارچ میں نوروز کے تہوار کے دوران، امرا کے لیے یہ رواج بن گیا کہ وہ اسے اپنے گھروں میں مدعو کرتے اور اسے بہترین تحائف پیش کرتے۔ اکبر جو کچھ بھی پسند کرتا اسے قبول کرلیتا اور باقی میزبان کو واپس کر دیتا، اس کے جانشینوں نے اس عمل کو جاری رکھا۔ جہانگیر نے بالعموم اسے دیا گیا تحفہ واپس کر دیا لیکن اپنے قریبی امراء سے کچھ چیزیں رکھ بھی لیتا تھا۔ مغل خاندان کے اندر عمر کے لحاظ سے ارکان کو تحائف دیے جاتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے دیے جانے والے تمام تحائف خلعت یا اعزاز کا لباس تھے جو وہ شہزادوں اور اہلکاروں کو دیا کرتا تھا۔ خلعت یا سروپا بادشاہوں کے افراد سے وابستہ شان وشوکت، وقار اور اختیار کی توسیع کی علامت تھی۔ خلعت کو پہلے شہنشاہ نے اپنی ہتھیلی سے چھوتا پھر وصول کنندہ کو دینے سے قبل اس خلعت کو بادشاہ کے کندھے سے ہلکے سے رگڑا جاتا۔ بادشاہ کی الماری سے کسی شخص کو دیئے جانے والے لباس کو سلطنت کے لیے ایک غیر معمولی خدمت کے اعتراف کا ایک غیر معمولی عمل سمجھا جاتا تھا۔ مغل دربار کے آداب کی صوبوں میں گورنر نقل کرتے تھے جو اکثر شہزادے اور اعلیٰ سطح کے امراء ہوتے تھے۔

18 ویں صدی میں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ آداب کو نافذ کرنے والے اصول وضوابط درباری شاعروں اور مورخین کے درمیان نوحہ خوانی کا موضوع بن گئے۔ درحقیقت اس دور میں اردو ادب کی ایک پوری صنف پروان چڑھی جسے شہر آشوب کہا جاتا ہے۔ یہ 18 ویں اور 19 ویں صدی میں مغلوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان اختلافی مسئلہ بن گیا۔ برطانوی گورنر جنرل لارڈ منٹو، لارڈ ہیسٹنگز نے آداب کے اصولوں کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ مغل چاہتے تھے کہ وہ اس کی پیروی کریں جس میں دربار میں بادشاہ کو نذرانہ (تحائف) دینا بھی شامل ہے جو بادشاہ کی اعلیٰ حیثیت اور انگریزوں کے ماتحت ہونے کی علامت ہوتی۔ 1826 میں جب لارڈ ایمہرسٹ نے دہلی کا دورہ کیا تو وہ بیٹھے رہے اور کوئی تحفہ نہیں لائے۔ 1851 میں، آخری مغل بہادر شاہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ 'نذر' کے مساوی ایک ماہانہ رقم پر اکتفا کریں۔ دربار، سماج کا چھوٹا نمونہ (microcosm) ہونے اور عدالت عالیہ ہونے کی وجہ سے خود کو منضبط کرکے سماجی تنظیم کی عکاسی کرتا تھا اور سماج کو نچلے درجے تک منظم کرتا تھا۔

13.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں 16 ویں صدی سے 18 ویں صدی کے درمیان سماجی زندگی کے مختلف پہلو، سماج کے مختلف طبقے، ذات پات اور دیگر درجہ بندی کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس دور کے سماج کو درپیش مختلف مسائل، حکمراں طبقے اور درباری زندگی کے متعدد پہلوؤں کو جاننے کا موقع فراہم ہوا۔

13.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

خودکاشت	:	وہ جو اپنی زمین خود کاشت کرتا ہے۔
پاہی کاشت	:	وہ جو دوسروں کی زمین کاشت کرتا ہے۔
دادنی	:	اشیائے صرف کے حصول اور آگے بڑھانے کا نظام
انتیاجہ	:	اچھوت
خلعت	:	عزت و توقیر کا لباس

13.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اورنگ زیب کے فرمان میں کس کو مالکِ زمین کہا گیا؟
2. زور طلب زمیندار کون تھے؟
3. جاگیر دار کون تھے؟
4. دادنی نظام کیا تھا؟
5. حمیدہ بانو بیگم کس مغل بادشاہ کی ماں تھیں؟
6. زیب النساء کا قلمی نام (تخلص) کیا تھا؟
7. ہوموہائرارکِکس کس کی تصنیف ہے؟
8. عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سماج کے کس گروہ کو کمین کہا جاتا تھا؟
9. 'دی مغلز آف انڈیا' کا مصنف کون ہے؟
10. 'اخلاق ناصری' کس کی تصنیف ہے؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خودکاشت اور پاہی کاشت میں کیا فرق تھا؟
2. عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں زمین کا مالک کون تھا؟
3. شہری معاشرے کے مختلف طبقوں پر اظہار خیال کیجیے۔
4. دربار اور سیاست میں مغل خواتین کے کردار پر بحث کیجیے۔
5. مغلوں کے درباری کلچر پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. زمینداروں کی مختلف اقسام پر بحث کریں۔ان کے حقوق وفرائض کیا تھے؟
2. عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں ذات پات کے عنصر پر بحث کریں۔
3. کیادرباری ثقافت مغل سلطنت کی درجہ بندی کی عکاسی کرتی ہے؟

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Catherine B. Asher and Cynthia Talbot, *India Before Europe*.
2. Harbans Mukhia, *The Mughals of India*.
3. K.M. Ashraf, *Life and Conditions of the People of Hindustan*.
4. Irfan Habib and Tapan Ray Chaudhari (eds.), *The Cambridge Economic History of India*.
5. Irfan Habib, *Medieval India: A Study of a Civilization*.
6. Irfan Habib, 'Caste in Indian History' in Irfan Habib, *Essays in Indian History: Towards a Marxist Perception*.
7. Irfan Habib, 'Kabir: The Historical Setting' in Irfan Habib, *Religion in Indian History*.
8. Meena Bhargava, *Understanding Mughal India: Sixteenth to Eighteenth Century*.
9. Ruby Lal, *Domesticity and Power in the Mughal World*.
10. Satish Chandra, *Medieval India: From Sultanate to the Mughals, Mughal Empire (1526- 1748)*, Vol. 2

اکائی 14۔ ثقافت

(Culture)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 مغل فن تعمیر
14.2.1 بابر
14.2.2 ہمایوں
14.2.3 شیر شاہ سوری
14.2.4 اکبر
14.2.5 جہانگیر
14.2.6 شاہ جہاں
14.2.7 اورنگ زیب
14.3 مغل مصوری
14.4 زبان وادب
14.5 اکتسابی نتائج
14.6 کلیدی الفاظ
14.7 نمونہ امتحانی سوالات
14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

کہا جاتا ہے کہ مغل ریاست اپنے جواز اور استحکام کے حصول کے لیے اپنے سیاسی اور سماجی و اقتصادی عمل کے باوجود بنیادی طور پر ایک ثقافتی ریاست تھی۔اس کی ثقافتی عظمت اور شان و شوکت اپنے آپ میں جواز کا ذریعہ تھی۔ مغلیہ سلطنت کا انجذابی کردار اور اس کا جذب و قبولیت اور موافقت کا عمل ایک ایسی ثقافت کی تعمیر میں قابل ذکر تھا جس نے اس اجنبیت کو کم کیا،اسے غیر معمولی استحکام بخشا اور قانونی جواز فراہم کیا۔یہ مرکزی ایشیا اور ایران سے لائی گئی اور مروجہ تکنیکوں اور طرز تعمیر کے امتزاج پر منتج ہوا۔مختلف تصنیفات کے ترجمے اور مقامی زبانوں کی ترقی کی بنا پر ادبی میدان نے بھی علمی فروغ کے ساتھ زرخیز تخلیقی فکری سرگرمی کی فضا کا بھی مشاہدہ کیا۔مغل سلطنت کے باہر، مقامی سلطنتوں کے زیر انتظام علاقوں میں ادبی میدان میں اسی طرح کی ترقی دیکھنے میں آئی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغل فن تعمیر میں استعمال ہونے والی نئی ساختی شکلوں اور تکنیک کو سمجھ سکیں گے۔
- مغل آرٹ کے مخلوط یا ہم آہنگ عناصر کو جان سکیں گے۔
- 16ویں صدی سے 18ویں صدی کے درمیان درباری اور مقامی زبانوں میں ادبی تنوع اور بڑے سرمایہ پر توجہ مرکوز کر سکیں گے۔

14.2 مغل فن تعمیر (Mughal Architecture)

مغل ریاست فن تعمیر، مصوری، موسیقی، زبان اور ادب سمیت جمالیات کی اہم سرپرست تھی۔آرٹ کے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ مغلوں کی حکومت ہندوستانی فن تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ تھا۔اس کی وجوہات بھی ہیں۔

1. مغل بادشاہوں کو حاصل وسائل نے انہیں تعمیراتی منصوبوں پر بہت زیادہ سرمایہ کاری کرنے کے قابل بنایا۔
2. مغل دور میں خصوصاً اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا جس نے ایسے ماحول کو فروغ دیا جس میں فن تعمیر کی ترقی ممکن ہوئی۔
3. سب سے اہم وجہ مغل بادشاہوں کا گہرا جمالیاتی ذوق تھا۔یہ تمام آرٹ اور فن تعمیر کے عظیم سرپرست تھے۔درحقیقت دنیا کی تاریخ میں کسی بھی خاندان نے چھ ایسے عظیم شہنشاہ پیدا نہیں کیے جنہیں آرٹ کا گہرا ذوق ہو۔انہوں نے اپنے جدامجد تیمور کی وضع کردہ روایت کو جاری رکھا۔

14.2.1 بابر (Babur)

درحقیقت مغل فن تعمیر کا فروغ اکبر کے دور میں ہوا اور شاہ جہاں کے دور میں یہ پختہ ہو کر اپنے عروج کو پہنچا۔مغلیہ سلطنت کے

ابتدائی حکمرانوں کو سیاسی غیر یقینی صورتحال اور سلطنت کو لاحق خطرات کی وجہ سے اس پہلو پر توجہ دینے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔ اس معاملے میں جہاں تک فن تعمیر کا تعلق ہے بابر اور ہمایوں دونوں زیادہ کردار ادا نہیں کرسکے۔ بابر نامہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے کارکنان کی تعمیر میں کافی دلچسپی لی۔ بابر نامہ میں وہ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی اور آگرہ میں 1491 سنگتراشوں کو ملازمت دی۔

بنیادی طور پر ہندوستان میں دو طرح کی تعمیرات کا آغاز ہوا۔ بابر کو باغات کا شوق تھا اور اسے آگرہ میں بہت سے باغات لگانے میں دلچسپی تھی جیسا کہ وہ لوگ سرد مقامات کے رہنے والے تھے۔ اس طرح چار باغ کا تصور سامنے آیا۔ آگرہ کے قریب دھول پور میں واقع کنول کا باغ اب جزوی طور پر باقی ہے جو بابر کی سرپرستی کی عکاسی کرتا ہے۔ آگرہ جیسے شہروں میں، باغات اور ان کے محل وقوع کا نام وسطی ایشیا کے مقامات کے نام پر رکھا گیا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کا مقصد ہندوستان میں اپنے آبائی مقام جیسا گھر بنانا تھا۔ بابر کا نام تین مساجد کی تعمیر سے بھی وابستہ ہے، ان میں سے ایک 8-1527 میں پانی پت میں واقع کابلی باغ، دوسری بابری مسجد اور تیسری سنبھل میں واقع مسجد تھی۔

14.2.2 ہمایوں (Humayun)

بابر کا جانشین ہمایوں کا ابتدائی سیاسی سفر مشکلوں میں گزرا۔ اس کے اقتدار سنبھالنے کے ایک دہائی کے اندر، اسے تخت سے ہٹا دیا گیا، 1540 میں ہندوستان سے نکال دیا گیا اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنے مختصر اور ابتدائی دور حکومت میں، اس نے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب رہائشی محل تعمیر کیا جسے دین پناہ (جو آج پرانا قلعہ کے نام سے جانا جاتا ہے) کہا جاتا ہے لیکن عمارت جلد بازی میں تعمیر ہونے کی وجہ سے برقرار نہیں رہ سکی۔ اس کے ایک حصے کا نام شاہ منڈل رکھا گیا جسے لائبریری کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمایوں کی موت اسی لائبریری کی سیڑھیوں سے گرنے سے ہوئی۔

14.2.3 شیر شاہ سوری (Sher Shah Suri)

ہمایوں کی ہندوستان سے بے دخلی کے بعد، سوری خاندان نے 1556-1540 تک ہندوستان پر حکومت کی۔ سوری خاندان کا بانی شیر شاہ سوری تھا، جو اپنی شاندار اور وسیع تعمیراتی سرپرستی کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس نے بالکل ایسی ہی عمارات تعمیر کروائیں جو شاہی سرپرستی کی آئینہ دار ہیں جیسے سڑکیں، مساجد، قلعے۔ شیر شاہ نے ہریانہ کے نارنول میں اپنے طویل عرصہ قبل فوت ہونے والے دادا اور ساسارام میں اپنے والد کے لیے مقبرے بنوائے۔ پہلا مربعی اور دوسرا ہشت پہلو تھا۔ اس نے اپنے لیے، اس نے ساسارام میں ایک بڑا ہشت پہلو مقبرہ بنایا۔

14.2.4 اکبر (Akbar)

اکبر کے دور حکومت میں مغل فن تعمیر اپنے انتہائی متحرک مرحلے کو پہنچا۔ یہ سلطنت کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ اپنی حکمرانی کے دوران، اس نے ایک مخلوط طرز تعمیر کی حوصلہ افزائی کی، جس میں غیر ملکی اور مقامی دونوں عناصر شامل تھے۔ اکبر کی تعمیرات اپنی مضبوطی اور پائیداری کے لیے مشہور تھیں کیونکہ یہ سرخ ریت کے پتھر کے سلیب سے بنی تھیں اور اکبر کے کردار کی مضبوطی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اکبر نے ہندوستانی فن تعمیر کے آرائشی مقصد کا آزادانہ اور بڑے پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ للہذا، اس کی تعمیرات بھی اس کی مذہبی رواداری کی پالیسی اور

ہر قسم کے لوگوں کے لیے اس کے آزاد خیال رویے کی عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر کی رہنمائی میں فروغ پانے والی یکساں جمالیات، تیموری اور ہندی نمونوں کے امتزاج پر مشتمل تھی۔ اکبر کا طرز تعمیر، فن تعمیر کا ایک فعال نمونہ تھا جو اس دیرینہ اسلامی تصور پر مبنی تھا کہ فن تعمیر کسی بھی خاندانی حکمرانوں کے اقتدار کا براہ راست بصری عکاس ہوتا ہے۔

اس کا پہلا تعمیراتی منصوبہ، ہمایوں کا مقبرہ تھا جس کی تعمیر 1556 میں ہمایوں کی موت کے فوراً بعد شروع ہوئی اور جو 1564 میں مکمل ہوا۔ یہ دہلی میں دین پناہ کے قریب اور چشتی صوفی نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے اس پار واقع ہے۔ اس طرح، سلطنت کے جواز کے دوہری مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اکبر آگرہ منتقل ہو چکا تھا، لیکن دہلی مسلم ہندوستان کا روایتی مرکز بن گیا تھا۔ اسے محمد میرک نے ڈیزائن کیا تھا جس کا تعلق تیموری طرز تعمیر کے معماروں کے خاندان سے تھا، ہمایوں کی اہلیہ حاجی بیگم نے اس میں اہم تعاون کیا اور ہمایوں کی بیوہ حمیدہ بانو بیگم نے اس کی تعمیر کی سرپرستی کی۔ اس کا منصوبہ اور اٹھان تیموری روایت میں ڈیزائن کی گئی تھی اور اس کا مقصد خاندانی حسب نسب کا بصری اظہار تھا سنگ مرمر سے مزین اس کا سرخ ریت کا پتھر ہندوستانی روایت سے تعلق رکھتا ہے۔ چار باغ کے بیچ میں واقع یہ مقبرہ زمین پر جنت کی تشکیل ہے۔ یہ مقبرہ ہشت (آٹھ) ضلعی ہے اور اس پر اونچے دوہرے گنبد بنے ہیں۔

اکبر کا ایک اور اہم تعمیراتی کارنامہ قلعوں (یا قلعہ بند محلات) کی تعمیر تھی جو اس نے موجودہ پاکستان میں اٹک سے الہ آباد تک اپنے بڑھتے ہوئے علاقوں کی حفاظت کے لیے بنائے تھے۔ ان سب میں سب سے اہم آگرہ کا قلعہ ہے جو 1565 میں لودی دور کے آگرہ کے مٹی کے قلعے کو سرخ ریت کے پتھر سے بدلنے کے لیے شروع ہوا تھا۔ آگرہ میں اکبر کے تعمیر کردہ تقریباً پانچ سو اندرونی عمارتوں (پویلین) میں سے چند ہی بچ پائی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جہانگیری محل ہے جو زنانہ گاہ کا حصہ ہے۔ ہمایوں کے مقبرے کی طرح اس کا بھی بیرونی حصہ سفید سنگ مرمر کے ساتھ سرخ ریت کے پتھروں سے بنا ہے۔ باب الداخلہ ہندوستانی اور وسطی ایشیائی دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر، کھلے صحن، گوالیار میں طویل عرصے قبل تعمیر کیے گئے محلوں کی یاد دلاتے ہیں جبکہ ستونوں پر مشتمل کچھ اندرونی حصے تیموری عمارتوں میں استعمال ہونے والے ستونوں کی قسم کے سنگی نمونے ہیں۔ دیگر صحنوں میں قوس دار موڑ نمایاں ہیں جو مغربی ہندوستان کی یاد دلاتے ہیں اور آگرہ میں اکبر کے قلعہ بند محل، جہانگیر محل کی سجاوٹ میں ہندوستانی اور تیموری روایات کا امتزاج نظر آتا ہے جو کہ ابوالفضل کے نزدیک ہندوستان کا مرکز تھا۔ اکبر نے سیاست کے میدان میں جن وسطی ایشیائی اور ہندوستانی ثقافتوں کو ملایا اس کی عکاسی اس کے فن تعمیر، مصوری اور دیگر فنون میں ہوتی ہے۔ دیگر قلعوں میں لاہور کا قلعہ (1560-70)، الہ آباد کا قلعہ (1574)، اجمیر کا قلعہ (1570)، صوبہ سرحد میں اٹک کا قلعہ (1581) شامل ہیں۔

اکبر کا سب سے بڑا اور اہم تعمیراتی شاہکار وہ شہر اور محل ہے جسے اس نے اپنی دوسری راجدھانی فتح پور سیکری (آگرہ سے 26 میل دور) میں قائم کیا تھا۔ یہ آگرہ کے قریب واقع ہے۔ اکبر نے 1571 میں فتح پور سیکری کی تعمیر مشہور صوفی شیخ سلیم چشتی کے احترام میں کی، جنھوں نے اکبر کے بیٹے اور وارث کی پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی۔ فتح پور سیکری 1585 میں اس وقت تک اس کا سرکاری دارالحکومت رہا

جب شمال مغرب میں شورش نے دربار کو لاہور منتقل کرنے پر مجبور کر دیا۔ فتح پور سیکری کے نو دروازے ہیں اور چوتھی جانب ایک مصنوعی جھیل ہے (الف) پانی فراہم کرنے کے لیے (ب) دفاع کے لیے۔ قلعے کی عمارتوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. غیر مذہبی نوعیت کی عمارات (محلات، انتظامی اور متفرق قسم کی عمارت)۔
2. مذہبی نوعیت کی عمارات (مسجد، مقبرہ)

مرکزی محل میں فتح پور سیکری کا ایک اہم مقام شیخ سلیم چشتی کے لیے تعمیر کردہ خانقاہ ہے۔ جنوب کی جانب سے داخل ہونے پر ایک بہت بڑی کمان آتی ہے جسے بلند دروازہ کہتے ہیں (یہ دروازہ گجرات میں اکبر کی فتح کے موقع پر بنایا گیا تھا)۔ اس کی اونچائی چون 54 میٹر ہے اور اونچائی کے معاملے میں اس نے ازبکستان میں موجود تیمور کے اپنے محل کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اکبر کی ہندوستان میں یہ مسجد سب سے بڑی تھی جس کا بیرونی اور اندرونی حصہ تیموری اور ہندوستانی عناصر کا مجموعہ ہے۔ تاہم، صحن کا اصل مرکز شیخ سلیم چشتی (وفات 1572) کا سنگ مرمر کا مقبرہ ہے جو 81-1580 میں مکمل ہوا۔ کیتھرین ایشر (Catherine B. Asher) کہتی ہیں کہ فتح پور سیکری میں محل کے احاطہ کے رہائشی اور انتظامی حصے کا مرکزی دروازہ ہتھیا پول (Hathiya Pol) یا ہاتھی کا جھولا ہے۔ کسی وقت محل کے اندر سرخ ریت کے پتھر پر مشتمل متعدد ستونوں پر مشتمل عمارات تھیں جن میں سے زیادہ تر ایک کے بعد ایک مڑی ہوئی تھیں۔ اس طرز کے ستون اور دیواروں کی نوعیت ہندوستانی ہے لیکن اس پر موجود نقاشی ہندوستانی اور تیموری شکل سے ماخوذ ہے۔ ہاتھی دروازے کے مشرق میں ایک بڑا مستطیلی صحن ہے۔ مغربی دیوار میں موجود اکبر کے تخت کے سامنے دیوان عام (عوامی سامعین کے ہال) ہے۔ اس طرح جب اکبر عوام کی جانب رخ کرتا تو عوام کی سمت قبلہ کی طرف ہوتی جو اس ارتقا پذیر سامراجی نظریہ کے عین مطابق ہے جس میں بادشاہ کو خدا کا نائب (نیم الہی) کہا جاتا ہے۔

ایک اور عمارت دیوان خاص / نجی سامعین کا ہال ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جسکا، مرکزی ہال مربع نما ہے۔ کمرے کے درمیان میں سنگ مرمر کا ستون نمایاں طور پر خم دار ہے جو بالکونی سے متصل کمرے کی کل اونچائی کے نصف تک پھیلا ہوا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چبوترہ اکبر کا تخت تھا۔ دیگر عمارات میں محلات جیسے مریم الزمانی، ترکی سلطانہ وغیرہ کے محلات شامل ہیں۔ ایک علاحدہ عمارت پنچ محل ہے (یہ ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جس کے ستونوں کو گھنٹیوں سے سجایا گیا ہے، یہ ہر طرف سے کھلا ہوا ہے اور مربعی تالاب کے کنارے پر واقع ہے۔) فتح پور سیکری ہمایوں کے مقبرے یا یہاں تک کہ جہانگیری محل سے بھی زیادہ ہندوستانی طرز کا ہے۔ پرسی براؤن کا خیال ہے کہ کچھ محلات گجرات کے کاریگروں نے بنائے تھے۔ 1570 میں اکبر غالب وسطی ایشیائی اور ایرانی امرا کی طاقت کو کم کرنے اور اپنے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندو امرا کی طاقت کو بڑانے کے بارے میں فکر مند تھا۔ یہ سیاسی طور پر لیے گئے اقدامات فتح پور سیکری میں استعمال ہونے والے فن تعمیر اسیاسی سوچ کی عکاسی ہیں۔ اکبر کی شاہی سرپرستی میں فن تعمیر اس کے نظریاتی مفادات کی عکاسی کرتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے غیر مسلم پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کا سبب بنتا ہے۔ تاہم، 1580 کے بعد جس طرح سے وہ سخت گیر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، اسی طرح روایتی شاہی تعمراتی سوچ سے دوری اختیار کی۔ اکبر نے فن تعمیر کا ایک طرز کو فروغ دیا جس میں تیموری اور شمالی ہند کے طرز کو ایک خوشگوار توازن میں رکھا گیا تھا۔

اکبر کے فن تعمیر کی مختلف خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1. سجاوٹ کے لیے سفید سنگ مرمر کے ساتھ سرخ ریتیلے پتھر کا استعمال۔
2. لودی طرز پر دوہرے گنبد(Double Dome)۔
3. افقی ستونوں کی تعمیر کا وسیع استعمال
4. شاندار سجاوٹ۔

(a) جانوروں، پرندوں، پتوں، پھولوں کی کندہ کاری (b) جیومیٹرک اشکال (c) رنگین ٹائلیں (d) دیواری مصوری/ مٹی کی پینٹنگ (e) سجاوٹ کے مقصد کے لیے سیاہ/سفید سنگ مرمر کا استعمال۔

14.2.5 جہانگیر (Jahangir)

جہانگیر کا دور سنگ مرمر اور پر چی کاری یا سنگی نقاشی (Pietra dura style) کے استعمال کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس نے شہنشاہ بننے سے پہلے اور بعد میں بڑی تعداد میں عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کی تعمیر کردہ اہم عمارتوں میں آگرہ سے چھ کلو میٹر مغرب میں سکندرا میں واقع اکبر کا مقبرہ بھی تھا۔ اس کی تعمیر 1605 میں شروع ہوئی جس میں جہانگیر نے ذاتی دلچسپی لی۔ یہ ایک بہت ہی غیر روایتی بنا گنبد والی عمارت ہے، یہ پانچ منزلہ عمارت روایتی انداز سے کافی ہٹ کر ہے جس کی اوپری چھت چپٹی ہے۔ یہ پہلا مقبرہ ہے جس میں مینار تعمیر کیے گئے جو کہ مسجد کے ڈھانچہ کا ایک حصہ ہے۔ باغ کے بیچ میں واقع، ان پانچ منزلوں میں، ہر منزل نیچے کی منزل سے چھوٹی ہے جو بدھ مت وہار کا تاثر دیتی ہے۔ اس کی انفرادیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ نہ مکمل طور پر اسلامی ہے اور نہ ہی ہندو یا بدھ مت بلکہ سب کا ایک شاندار امتزاج ہے اور شاید اکبر کی مذہبی رواداری کے لیے موزوں ترین ہے۔ ایک اور تعمیر اعتمادالدولہ کا مقبرہ ہے۔ آگرہ میں جمنا کے کنارے واقع اس مقبرے کو مغل فن تعمیر کا سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ یہ سرخ ریت کے پتھر سے سفید سنگ مرمر میں منتقلی کی ایک نشانی ہے۔ سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا، تدفین کا کمرہ متوازی الاضلاع کی شکل کا ہے۔ اٹلی سے شروع ہونے والی پر چی کاری (سنگی نقاشی طرز) کا استعمال اس کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت ہے۔ ہندوستان میں، یہ انداز سب سے پہلے اس مخصوص مقبرے میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرز میں پرندوں اور پھولوں کے مشکل قسم کے ڈیزائن پتھروں کو کاٹ کر کندہ کیے گئے ہیں اور رنگوں کے بجائے ہیرے اور قیمتی پتھروں کو جڑ دیا گیا ہے۔ یہ بہت مہنگا انداز ہے جو صرف حکمران ہی برداشت کر سکتے تھے۔ اسے 1626 میں نور جہاں نے اپنے والد کے لیے بنوایا تھا۔

14.2.6 شاہ جہاں (Shah Jahan)

شاہ جہاں مغل دور کے فن تعمیر کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ شاہ جہاں کے پاس فن تعمیر پر خرچ کرنے کے لیے کافی وسائل تھے۔ اس نے عمارتیں خالص سفید سنگ مرمر سے بنائیں۔ تعمیراتی مواد میں تبدیلی کے ساتھ فن تعمیر کے انداز میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ ان میں سے ایک تبدیلی یہ تھی کہ، شاہ جہاں کی عمارتوں میں محراب کی شکل، بنیادی طور پر اس کے منحنی خطوط پر بنی ہوئی تھی۔ دوسرا، بصلی نما

(bulbous) گنبدوں کا استعمال، اور تیسرا (پتے دار گول foliated curves) تعمیر کیے گئے تھے۔ 17ویں صدی کے وسط میں باغات ہر ایک مغل بادشاہ کے لیے بنائے گئے عظیم شاہی مقبرے کا حصہ رہے ہیں۔ باغوں والے ان مقبروں میں سب سے مشہور آگرہ کا تاج محل ہے جسے روضہ منور یا روشن مقبرہ کہا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر 47-1632 کے درمیان ہوئی۔ یہ مقبرہ ممتاز محل کے لیے بنایا گیا تھا جو 1631 میں بچہ کی ولادت کے وقت فوت ہوگئی، درحقیقت اسے شہنشاہ کی اپنی قبر کے طور پر بنایا گیا تھا۔ کیتھرین ایشر کہتی ہیں کہ روضہ منور، مدینہ میں موجود پیغمبر حضرت محمدؐ کے روضہ مبارک سے ملتا جلتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ جہاں جو اپنے آپ کو حضرت محمدؐ جیسا کامل انسان سمجھتا تھا، ہمیشہ تاج محل کو خود کا مقبرہ بنانا چاہتا تھا۔ 1666 میں اس کی موت کے بعد اسے وہیں دفن کیا گیا۔ اس کے مقبرے کی ساخت سے متعلق کوئی تحریری مواد موجود نہیں ہے۔ تاریخی معلومات ہیں لیکن مورخین اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ تاج محل کس کی علامت ہے۔ ایک اسکالر کا ماننا ہے کہ یہ قیامت کے دن خدا کے تخت کی تصویری نمائندگی تھی جبکہ دوسرے اس تعبیر سے شدید اختلاف کرتے ہیں۔

یہ عمارت شاہ جہاں کے چیف انجینئر استاد عیسٰی اور احمد لاہوری نے بنوائی تھی جسے نادر العصر (اپنے زمانے کا منفرد معمار) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہمایوں کی قبر کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ عمارت کے لوازمات جیسے باب الداخلہ، اکبر کے مزار سے متاثر ہو کر اور باغ اور اعتماد الدولہ کے مقبرے کی طرز کا بنایا گیا۔ یہ ایک مستطیلی عمارت (1900 x 1000 فٹ) ہے جس کا گنبد بصلی نما، مینار تین منزلہ اور تدفین والا کمرہ ہشت پہلو ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت مختلف حصوں میں انضمام اور ہم آہنگی ہے جس نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ راجستھان میں مکرانہ سے اعلیٰ معیار کا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے جو رنگ بدلتا ہے: یہ دوپہر میں چمکدار سفید، غروب آفتاب کے وقت ہلکا پیلا اور رات کے وقت سبز نظر آتا ہے۔ جیسا کہ مغل شہنشاہوں نے تمام میدانوں میں متعدد مقامات پر تعمیرات کیے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کے درمیان کثرت سے نقل مکانی کرتے رہے۔ ان میں سے بہت سے قلعہ بند تھے اور ان کی تعمیر اکبر کے ذریعہ شروع کی گئی تھی اور بعد کے حکمرانوں نے ان کو دوبارہ بنوایا۔ ابتدائی طور پر شاہ جہاں کی اہم رہائش گاہ آگرہ کا قلعہ تھا، جسے سب سے پہلے اکبر نے تعمیر کیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کی تجدید کی اور اس میں شاہی استعمال کے لیے متعدد سفید سنگ مرمر کی عمارتیں شامل کیں جن میں دیوانِ عام، دیوانِ خاص شامل ہیں۔ ان میں سے ایک موتی مسجد (سفید سنگ مرمر سے بنی) ہے جس میں ایک صحن اور ایک فوارہ ایک ہی مواد کے بنائے گئے ہیں، مسجد کے دونوں جانب سیڑھیاں ہیں جو شاہی خواتین کی رہائش گاہوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ وہ اسی طرف سے مسجد میں داخل ہوتے تھے اور ان کے لیے علاحدہ تعمیر شدہ حجرے میں نماز ادا کرتے تھے۔ بڑی بیٹی جہاں آرا کے اعزاز میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی تھی جو سرخ ریت کے پتھر کی ایک عمارت تھی جو تین گنبدوں سے گھری تھی۔

کیتھرین ایشر بتاتی ہیں کہ شاہ جہاں کو محسوس ہوا کہ آگرہ کی گلیاں شاہی جلوس کے لیے بہت تنگ ہیں۔ اس نے دہلی میں ایک نیا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا جو کہ شمالی ہندوستان میں مسلم اقتدار کی روایتی جگہ تھی جسے اس نے شاہجہان آباد کا نام دیا۔ اس میں اس نے کئی عمارتیں تعمیر کیں جن میں محل کے قلعے کو لال قلعہ اور جامع مسجد کہا جاتا ہے۔ آج شاہجہان آباد قومی دارالحکومت کا علاقہ ہے جسے پرانی دہلی کے نام سے جانا جاتا ہے، جو ابتدائی مغل شہر دین پناہ کے شمال میں واقع ہے۔ شاہ جہاں کے فصیل والے شہر پر کام 1639 میں شروع ہوا اور

1648 میں اس کا افتتاح ہوا۔ 17 ویں صدی میں، دو بازاروں نے شہر کو زینت بخشی۔ ان میں سے ایک سب سے اہم شہر کے مغرب میں واقع تھا جسے چاندنی چوک کے نام سے جانا جاتا ہے جو درختوں سے گھرا ہوا ہے، اس کے مرکز میں سے ایک نہر گزرتی ہے جو غالباً اصفہان کی نہر سے متاثر لگتی ہے جو 40 سال پہلے صفوی ایران میں بنائی گئی تھی۔ شہر کی تزئین و آرائش میں سرکردہ خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ شاہ جہاں کی دو بیویوں نے مساجد تعمیر کروائیں، جہاں آرا نے چاندنی چوک میں سرائے بنوائی۔ شہر بھر میں اشرافیہ کی کوٹھیاں اور چار باغ بنوائے گئے۔ فرانسیسی شہری فرانکوئس برنیئر نے اس کا موازنہ اس کی خوبصورتی، وسعت اور باشندوں کی تعداد کے لحاظ سے پیرس سے کیا ہے۔

شاہ جہاں نے شاہجہاں آباد میں لال قلعہ کے قریب ایک بہت بڑی جامع مسجد بنوائی جس کی تعمیر کا آغاز 1650 میں ہوا اور یہ 1656 میں مکمل ہوئی۔ یہ مغل علاقے کی سب سے بڑی مسجد تھی، جسے دنیا کی شکل کی والی مسجد (مسجدِ جہاں نما) کہا جاتا ہے، یہ شہر کے سب سے اونچے مقام پر واقع ہے اور اسے دور دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ شاہ جہاں نے دعویٰ کیا کہ اس نے اسے فتح پور سیکری کی اکبر جامع مسجد کے نمونے پر بنوایا تھا۔ دونوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں میں اونچی سیڑھیوں والے باب الداخلہ، داخلی دروازے، اندرونی صحن اور مسجد کا احاطہ شامل ہے۔ کیتھرین ایشر لکھتی ہیں کہ بڑی عظیم الشان مساجد دو حریفوں - عثمانیوں اور صفیوں نے پہلے اور اس وقت کے آس پاس تعمیر کی تھیں جن سے شہنشاہ بلاشبہ واقف تھا۔ جامع مسجد کو ان کے تعمیراتی اظہار اور بڑی اسلامی دنیا میں مغلوں کی عظمت کے اشارے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ جامع مسجد کی دیواروں پر منفرد انداز میں لکھے ہوئے کتبے ہیں جو کہ فارسی میں ہیں نہ کہ عربی میں۔ نیز ان کا مواد بھی مذہبی نہیں ہے۔ بلکہ ان میں شاہ جہاں اور اس کی منصفانہ حکمرانی کی تعریف کی گئی ہے۔

مسجد کا مقصد شہنشاہ کو سخت گیر اسلام کے حامی کے طور پر ظاہر کرنا تھا۔ شہر کی بڑی سڑک کی بنا پر وہاں اس کی خواہش کے مطابق پریڈ (Parade) کا انعقاد ممکن ہوا۔ محل تک صرف امرا کے لیے قابل رسائی تھی۔ مغلوں نے اپنے قلعوں کے مختلف حصوں کو باغیچے اور صحنوں میں تقسیم کیا تھا جنہیں 1857 کی بغاوت کے دوران منہدم کیا گیا۔ ستونوں والا دیوانِ عام دربار کی تقریب کا ایک اہم مقام تھا جہاں پرسیپولیس (Persepolis) کے عظیم دیوان عام کو ابھارنے کی کوششیں کی گئیں جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سلیمان نے رکھی تھی اور جو کہ انصاف کی حتمی علامت مانی جاتی ہے۔ اس ہال میں سنگ مرمر کی سجاوٹ کو مسلّح چھت (جسے بنگلہ طرز کی بنا پر بنگلہ کے نام سے جانا جاتا ہے) کے اوپر بنے ہوئے اونچے چبوترے کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے، بصری طور پر یہ حکمران کو نیم الٰہی کے طور پر دکھاتے ہیں۔ پچھلی دیوار کی اندرونی جانب بنے پینل میں بھی آرفیئس (Orpheus) کو جنگلی جانوروں کو پکڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ آرفیئس انصاف کا ایک استعارہ ہے۔ دیوان عام کے علاوہ، اس کے قریب شاہی ایوان ہیں جن میں شاہ جہاں، جہاں آرا کے ایوان، دیوانِ خاص، وغیرہ شامل ہیں۔ شاہ جہاں کی جنت کی منظر کشی کے بارے میں دلچسپی محل کے اس حصے میں جھلکتی ہے۔ دیوان خاص میں، دیواروں پر امیر خسرو کے اشعار پینٹ کیے گئے ہیں، جو اس عمارت کو زمین پر جنت قرار دیتے ہیں۔ شاہ جہاں کے محل کو مغل حکمران کی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے فنی طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ شاہجہان آباد کا محل 17 ویں صدی کے وسط کے مغل دربار کی انتہائی مراتب (درجہ بندی) کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

14.2.7 اورنگ زیب (Aurangzeb)

فن تعمیر کی اصطلاح میں اورنگ زیب کے دور کو زوال کا دور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اب بھی اس کے دور میں تعمیر کی گئی کچھ عمارتیں موجود ہیں۔ مہاراشٹر کے اورنگ آباد میں رابعہ دُرّانی کا مقبرہ جسے بی بی کا مقبرہ بھی کہا جاتا ہے، 1679 میں تاج محل کی طرز پر بنایا گیا لیکن جسامت میں یہ تقریباً نصف چھوٹا ہے۔اسے تاج محل کی ایک عام نقل سمجھا جاتا ہے۔اس کے باوجود اسے جنوبی ہندوستان میں مغلوں کی بہترین اور باوقار عمارت قرار دیا جاتا ہے۔اس میں کچھ اختراعات بھی ہیں جیسے لوہے کا باب الداخلہ وغیرہ۔ باقی تمام مقبروں میں مرکزی دروازہ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ دھاتی سلاخوں پر پھولوں کے ڈیزائن اس دور میں دھاتی کاریگری میں ہندوستان کی ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔
1674 میں لاہور کی جامع مسجد جسے جامع مسجد پر بادشاہی مسجد کے نمونہ کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن یہ زیادہ کشادہ اور سرخ ریت کے پتھر سے بنی ہے۔ بادشاہی مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ چار میناروں کی بجائے آٹھ مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ آرٹ کے جامد نہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔لال قلعہ کی مسجد کو موتی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔شاہ جہاں کی مسجد کے مقابلے میں یہ مسجد جسامت میں چھوٹی ہے لیکن مکمل طور پر سفید سنگ مرمر کے استعمال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فن تعمیر مکمل طور پر ختم نہیں ہو رہا تھا۔اس دور میں بنارس میں دو مسجدیں اور دیگر متھرا میں تعمیر کی گئیں۔اورنگ زیب کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور معاشی ذرائع سکڑ گئے۔آخری مغلوں کے پاس عمارتوں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے وسائل نہیں تھے چنانچہ بعد کے مغل بادشاہوں کے دور میں فن تعمیر زوال پذیر ہو گیا۔

14.3 فن مصوری (Painting)

مغل اپنے ساتھ ایرانی مصوری کا ایک مخصوص انداز لے کر آئے۔ ایرانی مصوری خود منگول آرٹ سے بہت متاثر تھی۔ ایرانی مصوری کا بہترین نمونہ یا عظیم فارسی مصور بہزاد تھا، جس نے آرٹ کی ان دو روایتوں کی ترکیب پیدا کی۔ہندوستان میں مغلوں کی سرپرستی میں تیار ہونے والا مصوری کا مکتب فکر بہزاد کی روایت سے متاثر تھا۔بابر کو اس فن کی طرف توجہ دینے کے لیے وقت نہیں مل سکا، کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنی سلطنت کے قیام واستحکام میں مصروف تھا۔تاہم اس کی یادداشتیں ایرانی مصوری میں اس کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔

بہزاد کے کچھ کاموں پر تنقید کرتے ہوئے بابر کہتے ہے کہ اس کا کام خوبصورت تھا لیکن وہ بغیر داڑھی والے چہرے اچھی طرح نہیں بنا سکتا تھا۔ بابر کی اپنی شاہی لائبریری میں باتصویر مخطوطات موجود تھے۔ بابر کے ذخیرہ میں شاہنامہ اور ظفر نامہ کی بہزاد کی مصوری والی تصویری نقول موجود تھیں۔تاہم، ہندوستان میں اس کے دربار میں مصوری یا مصوروں کی ترقی میں کوئی تعاون نظر نہیں آتا حالانکہ اس کے بیٹے مرزا کامران نے ممکنہ طور اپنے مصور رکھے تھے۔ جب ہمایوں نے کامران سے مقابلہ کیا تو اسے کامران کا مصوری ورکشاپ بھی وراثت میں ملا جس میں بہت زیادہ ایرانی مصوری تیار ہوتی تھی۔ہمایوں نے دراصل ہندوستان میں مصوری کے نئے انداز کو متعارف کرایا۔شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد اس نے ایران میں پناہ لی۔جب وہ ایران پہنچا تو بہزاد مر چکا تھا لیکن اس کی جگہ اس کے شاگرد میر مصور بدخشی نے لے لی جس کی حقیقت سے قریب مصوری نے ہمایوں کو بہت متاثر کیا۔وہ منصور کے بیٹے میر سید علی تبریزی اور عبدالصمد شیرازی سے بھی متاثر ہوا

اور ان دونوں مصوروں کو اپنی ماتحتی میں لے کر ہندوستان لے آیا۔ میر سید علی اور عباس صمد کو مغل طرز کی مصوری کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ ہمایوں نے انہیں مشہور تصنیف 'داستانِ امیر حمزہ' کی تصویر کشی کا کام سونپا۔ یہ کام ہمایوں کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا اور اکبر کی سرپرستی میں 1582 میں جا کر مکمل ہوا۔ 12 جلدوں پر مشتمل یہ منفرد پروجیکٹ تقریباً 2000 تصاویر/تصاویر پر مشتمل ہے جس کا ہر صفحہ تقریباً 20x27 انچ کا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے کئی مصور اس پراجیکٹ میں شامل ہوئے۔ ابتدائی تصویروں میں فارسی انداز کو تقریباً مکمل طور پر برقرار رکھا گیا ہے لیکن ہندوستانی مناظر کو بعد کی ساخت میں ضرور متعارف کروایا گیا۔ مثال کے طور پر، ہندوستانی درخت برگد، آم، کھجور کے درختوں کو اکثر پینٹ کیا گیا ہے۔ ہندوستانی کردار اور ملبوسات بھی متعارف کروائے گئے۔ اس طرح دیسی روایت اپنے آپ کو مضبوط کرنے لگی۔ امتزاج کے اس عمل کو اکبر اور جہانگیر کے مصوروں نے مزید فروغ دیا۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ان تصاویر پر اپنی ذہنی وژن کو پیش کیا جن پر انہوں نے کام کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ایرانی طرز مکمل طور پر ہندوستانی روایت اور مصوری کے ایک نئے مکتب کے ساتھ ضم ہو گیا جسے شاہی قلم یا مصوری کا مغل مکتب فکر کہا جاتا ہے۔

مصوری کا مغلیہ طرز، اکبر کے دور میں اپنے عروج پر پہنچا۔ اکبر مصوری کا بہت بڑا مداح تھا۔ اس نے مصوری کا ایک الگ شعبہ مصوری کا کارخانہ بھی قائم کیا تھا اور خواجہ عباس صمد کو اس کارخانہ کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اکبر کے دور میں شہنشاہ کی سرپرستی حاصل کرنے والے مصوروں کی تعداد 150 سے تجاوز کر گئی تھی۔ ان میں سے بہت سے ہندو تھے۔ ان میں سب سے اہم دسوانت، بسوان، کیسوا، لال مکند، مہیش، منوہر وغیرہ تھے۔ ہندو فنکار ایرانی/فارسی تکنیک پر اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ انہیں مختلف فارسی خواندگی کی عکاسی کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ چنگیز خان کے خاندان کی تاریخ 'جامع التواریخ' میں چھوٹی چھوٹی تصویریں بساوان، لال بھیم، دھرم داس وغیرہ کی دستکاری تھے۔ امیر خسرو کی نظموں کو بساوان، منوہر، دھرم داس اور دیگر نے باتصویر کیا تھا۔ 'اکبر نامہ' کو تصویری شکل بساوان، کیسو وغیرہ نے دی تھی۔ ان تصاویر میں ایرانی طرز کے اثرات کا ذکر کیا گیا تھا۔ ولکنسن (Wilkinson) کا مشاہدہ یہ ہے کہ، 'اکبر کے دور کی تصاویر اجتماعی طور پر ایرانی طرز مصوری کی مرہون منت ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ایرانی طرز مصوری کا اثر دھیرے دھیرے کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں یہ مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

یورپی مصوری کے برخلاف، مغل مصوری مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایک ماہر نے خاکہ تیار کیا، دوسرے نے رنگوں سے بھرا، تیسرے نے اپنے دماغ کو پرچھائی اور پس منظر پر لگایا، ایک اور نے سنہری رنگ کے پتوں، موتیوں کی دھول اور انتہائی قیمتی پتھروں کی عمدہ پینٹنگ بنائی۔ اس مجموعی کام کے لیے زیادہ تر مصور ذمہ دار تھا جس کا نام تصویر اور مصوری میں دیا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں رنگے گئے موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے، عملی طور پر تمام ذاتوں اور طبقات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ہمیں شہزادے اور شہزادی، شاہی وفد، رئیس و نواب، کمانڈروں، معماروں، بڑھئیوں، کسانوں، موسیقاروں، رقاصوں، سپاہیوں اور ہندو اور مسلمان سنتوں کی، ان کے شاگردوں یا پیروکاروں کی تصویریں ملتی ہیں۔ در حقیقت زندگی کا کوئی کام یا پیشہ ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا گیا ہو۔

اکبر کے دور میں ایک اور اہم ترقی فریسکو پینٹنگ تھی۔ سیکری کے فریسکو (Fresco) طرز مصوری اس فن کی ترقی میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ فریسکو مصوری زیادہ تر اکبر اور مریم سلطانہ کے گھروں کی خواب گاہ میں کی گئی ہے۔ اکبر کے خواب گاہ میں پینٹ کیے گئے مناظر میں گھروں کو دکھایا گیا ہے جیسے کشتی رانی کے مناظر، پھول اور پتے، ہاتھیوں کی لڑائی، جنگ کے مناظر میں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سنہری مکان میں جس کے چاروں طرف فریسکو سے پلاستر کیا گیا ہے میں ہاتھیوں کی لڑائی کی پینٹنگ، ایک قلعہ اور اس میں محروس قیدی، شاخوں والا بڑا درخت، شیر کا شکار، ایک ہشت پہلو تخت جس میں ایک شخص تاج پہنے ہوئے ہے، وغیرہ پر مختلف موضوعات اور خیالات کو پینٹ کیا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ یہ فنکاروں کے پورے گروہ کا کام ہے۔

اکبر کے تخت پر فائز ہونے کے فوراً بعد یورپی مصوری کے عنصر کو شامل کیا۔ حجم کی نشاندہی کرنے کے لیے پرکشش سایہ، یورپی میں فطرت پسندی کا عنصر اور پس منظر میں دور دراز کے مناظر کو مصوری میں اپنایا گیا۔ اکبر مصوری پر یورپی فن کا اثر روشنی اور سایہ کے فریب کے ساتھ ساتھ عیسائیت اور اسلام میں مشترک موضوعات جیسے کنواری مریم، فرشتے وغیرہ کی تصویر کشی میں واضح ہے۔ اکبر کے دور حکومت کے دو ابتدائی منصوبے طوطی نامہ اور داستان امیر حمزہ تھے جسے 14ویں صدی کے ہندوستانی شاعر ضیاءالدین نخشابی نے فارسی میں مرتب کیا تھا۔ یہ ایک خاتون کے بارے میں کہانیوں در کہانیوں کا ایک سلسلہ تھا جس کا شوہر ایک طویل عرصے تک ان سے دور رہتا تھا۔ اس کی عفت کو برقرار رکھنے کے لیے طوطا ہر رات ایک کہانی سناتا ہے تاکہ اسے اپنے عاشق سے ملنے سے روکا جاسکے۔ اس میں اکبر کی دلچسپی ضرور ہوگی، جو اچھی کہانیوں کا شوق رکھتا تھا۔ لیکن زیادہ امکان ہے کہ یہ حرم کے لیے تھیں جو متنوع پس منظر اور مختلف حیثیتوں کی خواتین سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ اشر اور تلبوت (C.B. Asher and C. Talbot) لکھتے ہیں کہ 'طوطی نامہ' کے پیغام، عورتوں پر کنٹرول کو طاقتور عمر رسیدہ خواتین کے تناظر میں سمجھنا چاہیے جن کا اس وقت کے معاملات پر اس وقت تک غلبہ تھا جب تک کہ اکبر نے اقتدار سنبھال نہ لیا اور بالادستی حاصل نہ کرلی۔ ایسی خواتین نہ صرف اقتدار ساز اور اقتدار شکن تھیں بلکہ اکثر اہم مشیر بھی تھیں جیسا کہ حمیدہ بانو بیگم کے معاملے میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ یورپی طباعت نے ابتدائی طوطی نامہ اور داستان امیر حمزہ کی کہانیوں پر اثر ڈالا۔ تاہم، 1580 میں Father Jesuits نے اکبر کو بائبل کی تصویری نقل پیش کی۔ فنکاروں نے اس کا مطالعہ کیا جس نے مصوری/تصاویر میں یورپی اثر کو تیز کیا۔

1580 میں، اکبر نے اسلام کی تاریخ اور اپنے نسب پر تصویری کام شروع کیا۔ 'اکبر نامہ' کی تصویری کاپی 116 تصویروں/تمثیلوں کے ساتھ تیار کی گئی تھی۔ ان میں سے تقریباً نصف اکبر پر مشتمل ہے۔ ایک میں، اکبر کو ایک پاگل ہاتھی پر سوار دکھایا گیا ہے جس میں وہ پاگل ہاتھی ایک کمزور پل کو توڑ رہا ہے اور جہاں دوسرے گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں، وہیں اس مشکل صورتحال میں اکبر پر سکون نظر آتا ہے۔ کیتھرئین ایشر کی رائے ہے کہ اکبر نے خدا پر اپنے ایمان کو جانچنے کے لیے اس ہاتھی پر سواری کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں کہ اکبر نے خود کو ہاتھی کے کنٹرولر کے طور پر دیکھا، جو کہ حکمرانی کرنے کی صلاحیت کا ایک استعارہ ہے۔ اکبر اس اور دیگر تصاویر میں ایک سفید کپڑے میں نظر آتا جبکہ دیگر چمکدار کپڑوں میں ہیں، یہاں سفید رنگ کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ خاص طور پر ان مناظر میں جہاں اکبر چشتی صوفیوں سے وابستہ تھا، جیسے کہ وہ مناظر جہاں اکبر پیدل چل کر اجمیر کے مزار پر بیٹے کی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سفید لباس زیب تن کرتا ہے جو کہ ایک شعوری

انتخاب لگتا ہے۔

مغل مصوری جہانگیر کے دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ وہ فن کا بڑے مداح تھا۔ وہ اپنے والد سے زیادہ فن کا ماہر تو نہیں لیکن عظیم ضرور تھا۔ مثال کے طور پر جہانگیر نے مصوری میں ذاتی دلچسپی لی، وہ آگرہ اور لاہور میں مصوری کے تمام پہلوؤں سے وابستہ رہا۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ آگرہ میں Father Jesuits کے گھر پر عیسائی پینٹنگ کا معائنہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ فتح پور سیکری کی دیواروں میں تمام فریسکو پینٹنگ کا مشاہد تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ مصوری کا بڑا علم رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ان کے پاس کوئی ایسی پینٹنگ لائی جائے جو مشترکہ طور پر بنائی گئی ہو تو وہ یہ پہچان سکتا ہے کہ پینٹنگ کا کون سا حصہ کس نے پینٹ کیا ہے۔ وہ قدرتی حسن کا دلدادہ اور عاشق تھا جو اس کے زمانے کی تصاویر میں جھلکتا ہے۔ منصور اس کے دور میں فطرت کا سب سے بڑا مصور تھا۔

جہانگیر کے دور سے مصوری میں 'چہرے کے گرد ایک روشن ہالہ' (Nimbused Head) کو اپنایا گیا۔ دوہرے صفحے کے ایک پورٹریٹ (portrait) میں معین الدین چشتی کو جہانگیر کو ایک گلوب سونپتے ہوئے دکھایا گیا تھا جس کے اوپر تیموری تاج نظر آتا ہے، جو بادشاہ کے حق حکمرانی کی علامت تھا۔ کیتھرین ایشر (Catherine Asher) اور سنتھیا ٹالبوٹ Cynthia Talbot لکھتے ہیں کہ ہالہ پہننا نیم الٰہی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہانگیر کو یہ نشان معین الدین چشتی سے ملا تھا جو اب تک مغل گھرانہ کے روحانی سرپرست کے طور پر مشہور ہو گیے تھے۔ جہانگیر اپنی خودنوشت میں ذکر کرتا ہے کہ بچپن میں سلیم چستی نے اپنی پگڑی نوجوان شہزادے کے سر پر رکھ کر کہا کہ شہزادہ روحانی جانشین ہوگا۔ اسی سوچ کی وجہ سے مغلوں نے زیارت کے موقع پر یا فوجی فتح کے شکرانے کے طور پر چشتی مزارات کو عطیات دیے۔ اس طرح کی سرپرستی کو مغل کی طرف سے دنیاوی حکمرانی کو روحانی امور سے جوڑنے کی کوشش کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ذاتی پرہیزگاری بھی اس کا محرک ہے۔ ولی اور بادشاہ دونوں سفید لباس سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں حالانکہ جہانگیر کے وسیع زیورات حکمران کے طور پر اس کے دنیاوی اور روحانی کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تصاویر (paintings) میں مختلف سیاسی طاقتوں کی دشمنی کو بھی دکھایا گیا ہے اور بادشاہ خود کو دوسرے کے تناظر میں کیسے دیکھتا ہے۔ جہانگیر کی ایک پینٹنگ میں اسے صفوی شہنشاہ شاہ عباس کو گلے لگاتے دکھایا گیا ہے۔ شیر پر کھڑا جہانگیر استعاراتی طور پر شاہ عباس پر غلبہ رکھتا ہے جو غیر فعال میمنے پر کھڑا تھا اور جہانگیر، عباس کو سمندر میں دھکیل رہا ہے۔ وہ دونوں گلوب پر کھڑے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقشہ سازی میں یورپی ترقی، مغل ہندوستان میں تیزی سے منتقل ہو چکی تھی۔ ایک اور پورٹریٹ میں جہانگیر دیوان عام میں نوابوں کے سامنے اور سفید سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے اوپر کنواری مریم کی پینٹ شدہ تصویر ہے، جو اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ شہنشاہ جہانگیر منگول شہزادی 'ایلن قوی' (Alanquwa) سے پیدا ہونے والے نامور بادشاہوں کے سلسلے سے تھا، جو معجزانہ طور پر روشنی کی کرن سے حاملہ ہوئی تھی۔

شاہ جہاں نے اپنے والد اور دادا کی روایت کو جاری رکھا اور مغل دربار میں مصوری کا فن فروغ پاتا رہا۔ جہانگیر کے زمانے کے کچھ مشہور مصور شاہ جہاں کے ملازم تھے۔ جسکے دور کی پورٹریٹ پینٹنگ (portrait painting) بہت مشہور تھی۔ بادشاہ اور اس کے

بزرگوں کے کئی پورٹریٹ پینٹ کیے گئے تھے۔پورٹریٹ پر تفصیلی اور باریک بینی سے کام کیا گیا ہے۔ہر چہرے کے تاثرات،داڑھی کے ہر بال ،پگڑی کی ہر تہہ،لباس کا، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی صاف اور واضح طور پر نشان زد ہے۔شاہ جہاں کے دور حکومت کی کچھ تصاویر مغل دربار کی شان کو ظاہر کرتی ہیں یا شہنشاہ کی بیرونی سر گرمیوں جیسے شکار یا درویشوں سے ملاقات کی عکاسی کرتی ہیں۔ایک پینٹنگ میں شہزادے دارا شکوہ کی شادی کے جلوس کو دکھایا گیا ہے۔شاہ جہان کے دربار کی ایک پینٹنگ دستیاب ہے جہاں 44 انفرادی چہروں کو پینٹ کیا گیا ہے۔ پینٹنگ نامکمل ہے لیکن اعلیٰ حکام اور درباریوں کے چہرے اور چہروں کے تاثرات مکمل ہیں اور تین کے علاوہ باقی سب کے نام ہیں۔

شاہی خواتین کے پورٹریٹ بھی بنائے گئے۔نور جہاں اور ممتاز محل کی تصویر دستیاب ہے۔پورٹریٹ کی صداقت مشکوک ہے۔ چونکہ کسی بھی مرد فنکار کو حرم تک رسائی حاصل نہیں تھی یہ پورٹریٹ فنکاروں کے تخیل کی بہترین پرواز ہے یا ہو سکتا ہے کہ تصاویر خواتین فن کاروں یا کچھ بہت پرانے مصوروں نے بنائی تھیں جنہیں حرم تک رسائی حاصل تھی۔ان تصاویر پر باریک طریقہ کار سے کام کیا گیا ہے، جوانی کی خوبصورتی کی شاندار زینت کو ڈرائنگ میں اضافی نزاکت کے ساتھ خوشی سے پینٹ کیا گیا ہے۔اس طرح شاہ جہاں کے دور حکومت میں پورٹریٹ پینٹنگ کمال کے قریب پہنچ گئی تھی جو کہ ترکیب (کمپوزیشن) میں شاندار مہارت اور عملدرآمد میں باریک بینی اور نفاست سے ظاہر ہوتی ہے۔اس دور کی پینٹنگ میں گرافک رنگ اور آرائشی حاشیہ بھی نمایاں ہیں۔سونے کا بے جا استعمال بھی مجموعی خوش حالی کے احساس کی عکاسی کرتا ہے۔اس طرح مصوری کا فن شاہ جہاں کے زمانے میں ترقی کے عروج پر پہنچا اور اس کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔تصورات پرانے اور دقیانوسی رہ گئے،نئے موضوعات مزید نہیں آرہے تھے اب نئے پن میں کمی آ ئی۔مزید یہ کہ فن تعمیر شاہ جہاں کی پہلی محبت تھی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں مصوری کے فن نے جو رفتار حاصل کی تھی وہ اورنگ زیب کے دور میں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی،عام تصور کے برخلاف، فن معمولی پیمانے پر ہی صحیح ترقی کرتا رہا۔ہمارے پاس شہنشاہ کی ادھیڑ عمری اور بڑھاپے اور آخری ایام کی زندگی خمیدہ اور جھکتی ہوئی تصویریں ہیں۔تصاویر اس کے تمام بیٹوں کی،اس کے دربار اور شہزادیوں کے پورٹریٹ اور دیگر مناظر کی ہیں۔یہ وہ مشہور تصاویر ہیں جن میں وہ 1687 میں گولکنڈہ کے محاصرے کی ہدایت دیتا نظر آتا ہے۔یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شہنشاہ نے اپنے بڑے بیٹے معظم سلطان کی قید کے دوران اس کی تصویر بنانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ جیل میں اس کی حالت دیکھیں۔اس لیے اس بات سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ اورنگ زیب کی سرد مہری کی وجہ سے آرٹ اور زندگی منجمد ہو گئے تھے اور مغل 'شاہی قلم' اس کے دور حکومت میں زوال پذیر ہوا۔یہ وہ مصیبت تھی جسے سلطنت کو اس کے زوال کے بعد برداشت کرنا پڑا جس کا خاتمہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے میں ہوا جو مغل فن کی اعلیٰ ترین شکلوں کی موت ثابت ہوئی۔

14.4 زبان اور ادب (Language and Literature)

جیسا کہ ستیش چندر نے بیان کیا ہیں کہ فارسی اور سنسکرت دونوں نے کل ہند سطح پر فکر کے تبادلہ خیال میں اہم رول ادا کیا ہے اور اس دور میں علاقائی زبانوں کی ترقی بہت حد تک بھکتی تحریک کی ترقی کے نتیجے میں ہوئی۔ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے کے ناطے ، مغلوں نے

فطری طور پر ثقافت اور انتظامیہ کی ایک بڑی زبان کے طور پر فارسی کی سرپرستی کی۔ تاہم، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغلوں نے سنسکرت جیسی دوسری بڑی زبانوں کو نظر انداز کیا۔ آڈری ٹرشکے (Audrey Truschke) نے اپنی کتاب *Culture of Encounters: Sanskrit at the Mughal Court* میں اس بات کو موضوع بنایا ہے کہ سنسکرت کس طرح مغلوں کے دور میں ترقی کرتی گئی۔

فارسی

ابتدائی مغلوں کے دربار میں فارسی ایک ممتاز زبان کے طور پر ارتقاپذیر نہیں ہوئی تھی۔ بابر کو چغتائی ترکی کا ورثہ ملا تھا اور ترک اس کی مادری زبان ہونے کی وجہ سے اس نے اسی زبان میں اپنی خودنشت قلم بند کی۔ ہمایوں نے بھی ترک زبان کی سرپرستی کی اور جہانگیر آخری حکمران تھا جو آسانی سے ترک زبان میں لکھ سکتا تھا۔ سولھویں صدی کے وسط سے مغل بادشاہوں نے ادب اور فنون کی شاندار سرپرستی کی اور اپنے مرکزی دربار کو ایک 'ثقافتی مکہ' (اس اصطلاح کو آڈری ٹرشکے نے استعمال کیا ہے) بنایا، جس نے پورے ایشیا کے فارسی شاعروں، مفکرین، فنکاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اکبر کے زمانے میں فارسی زبان اس قدر پھیل چکی تھی کہ اس نے 1582 میں فارسی کو انتظامیہ کی سرکاری زبان قرار دیا اور مقامی زبان (ہندوی) میں محصول ریکارڈ رکھنے کی روایت کو ختم کر دیا لیکن دکنی ریاستوں میں سترہویں صدی کی آخری سہ ماہی میں اپنے معدوم ہونے تک علاقائی زبانوں میں ریکارڈ رکھنے کی یہ روایت جاری رہی۔ اکبر کے دور میں فارسی نثر اور شاعری اپنے عروج کو پہنچی۔ ابوالفضل فارسی کے عظیم اسکالر اور معروف مورخ تھے جنھوں نے 'آئین اکبری' لکھی۔ دوسرے فارسی اسکالر جیسے عتبی اور نظیری فارسی کے سرکردہ شاعر تھے۔ ابوالفضل اکبر کے شعبہ ترجمہ سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور زیادہ تر ہندو فنکاروں نے ان کی عکاسی کی۔ ان کاموں میں مہابھارت (رزم نامہ)، پنچ تنتر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اکبر کا خیال تھا کہ اس طرح کے تراجم ملک میں بڑے مذاہب اور سماجی نظام کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے میں مدد کریں گے۔ بہت سی ہندو برادریاں، خاص طور پر کائستھ اور کھتری، جو پہلے ہندی یا اس کی کسی مقامی زبان سے واقفیت رکھتے تھے، اگر وہ شاہی خدمات میں بطور کلرک، کاتب اور متعمد شامل ہونا چاہتے تو فارسی زبان کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے کے لیے مدرسوں میں جانے کے پابند تھے۔ اس طرح فارسی مغل دور میں ابلاغ کا سب سے زیادہ فعال اور عملی ذریعہ اور اکتساب، علم اور اعلیٰ ثقافت کی زبان بن گئی۔ یہ 19 ویں صدی کے اوائل تک حاوی رہی جب تک کہ انگریزوں نے انگریزی اور دیگر مقامی زبانوں کی سرپرستی شروع نہ کر دی۔

سنسکرت

جیسا کہ مینا بھارگوا نے بحث کی ہے کہ سنسکرت زبان میں مغل سلطنت کی سرکاری زبان بننے کی صلاحیت موجود تھی، لیکن اس کی مقدس نوعیت اور اونچی ذات کی محدود زبان اور کسی ملیچا (Mlecha) کو اس زبان کو استعمال کرنے کی شکل میں آلودہ کرنے کی نہیں دی جا سکتی تھی جس کی وجہ سے یہ روزمرہ کے استعمال کا ذریعہ نہیں بن پائی۔ دوسری ممکنہ وجہ یہ ہے کہ مغل جن کا تعلق فارسی بولنے والوں کی دنیا

سے تھا، انہوں نے فارسی کو انتظامیہ کی زبان کے طور پر منتخب کرنے اور اسے سیاسی سرپرستی دینے کا فیصلہ کیا۔اس حقیقت کے باوجود کہ اس دور میں سنسکرت میں زیادہ اصلی تصنیفات تخلیق نہیں ہوئیں لیکن پھر بھی ان کی تعداد کافی متاثر کن ہے۔ مغل دربار میں برہمن علماء کی سرپرستی 1560 کی دہائی سے اکبر کی تخت نشینی اور مشرقی ہندوستان میں اس کی علاقائی توسیع کے ساتھ شروع ہوئی۔ سنسکرت کے اسکالر مہاپاترا اڑیسہ کے کرشنا دیوا اور نرسمہا ان لوگوں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے مغل سرپرستی حاصل ہوئی۔ سنسکرت کے دانشور اور اسکالر جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں میں نہ صرف ہندوستانی روایت کے مبلغین یا معلم کے طور پر یا سنسکرت کاموں کے مترجم کے طور پر تعینات تھے بلکہ مغل بادشاہ کے نجومی اور بعض اوقات سیاسی گفت و شنید کے لیے اسٹر یجسٹ کے طور پر بھی سرگرم تھے۔

1575 میں اکبر کی جانب سے مکتب خانہ (Bureau of Translation) کے قیام کے ساتھ ہی، اس نے ہندوستانی مذہبی علوم اور دیگر مقامی روایات کو فارسی سے واقفیت رکھنے والے لوگوں تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ رزم نامہ کے طور پر کیا گیا۔ فارسی میں دیگر تراجم میں رامائن، اتھر وید، سنگھاسن بتیسی، پنچ تنتر، کتھاسرت ساگر، یوگا وسیشٹھا، اور ہری ومسا شامل ہیں۔ بھگوت پران کا ترجمہ ٹوڈرمل نے کیا تھا۔ بعد ازاں سترھویں صدی میں، داراشکوہ نے فلسفیانہ متون جیسے کہ اپنشد (سرِ اکبر) اور بھگود گیتا کے ترجمے کا آغاز 'آبِ زندگی' کے عنوان سے کیا۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب، قانون، اخلاقیات، ریاضی، طب، فلکیات، رومانس، اخلاقی کہانیوں اور موسیقی سے متعلق متعدد دیگر کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، یہ سلسلہ اٹھارویں صدی تک جاری رہا۔

ہندی اور علاقائی زبانیں

برج کی شکل میں، عہد وسطیٰ کی ہندی کو بھی مغلوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اکبر کے زمانے سے ہی ہندی شاعر دربار میں ملازم ہونے لگے تھے۔ عبدالرحیم خان خانان نے بھکتی سے متاثر ہو کر فارسی میں بھکتی شاعری کی۔ اس طرح فارسی اور ہندی دونوں ادبی روایات ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ بااثر ہندی شاعر تلسی داس تھے جن کے ہیرو 'رام' تھے۔

اس عرصے کے دوران، علاقائی زبانوں نے استحکام اور پختگی حاصل کی جس کے نتیجے میں کچھ بہترین شاعری وجود میں آئی۔ دونوں بھکتی اور صوفی تحریک نے اس زمن میں اہم رول ادا کیا۔ اس عرصے کے دوران رادھا کے ساتھ کرشن اور گوالنوں کا میل جول اور بھگوت پران کی کہانیاں بنگالی، اڑیہ، ہندی، راجستھانی اور گجراتی میں شاعری کا موضوع بنی۔ رام کے لیے بہت سے بھجن بھی ترتیب دیے گئے اور رامائن اور مہابھارت کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں شیخ بدھن سہروردی کے شاگرد ملک محمد جائسی نے اودھی بولی میں پدماوت (1540) لکھی جس میں انہوں نے چتور پر علاؤالدین خلجی کے حملے کو مایا اور روح اور خدا کے درمیان تعلق کے پس منظر میں صوفی انداز میں بیان کیا ہے۔۔ صوفیانہ شاعری کی ایک شکل جسے پریما کھیان یا پریم کہانی کے نام سے جانا جاتا ہے کو صوفی شاعروں نے 14 ویں سے 16 ویں صدی کے شمالی ہندوستان میں اودھی یا مشرقی ہندوی میں تحریر کیا۔ بنگال میں، ہندو اور مسلم دونوں دانشوروں نے اپنی بنگالی علاقائی زبان میں لکھا اور فارسی اور عربی متن کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ بنگالی شاعروں سے متاثر ہو کر، جنہوں نے اپنی تخلیقات کا ایک بڑا حصہ کرشنا کے لیے وقف

کیا، مسلم شاعر سید سلطان نے نبی ومشا (پیغمبر اسلامؐ کا نسب) تشکیل دیا جس میں کرشنا بھی شامل تھے۔اس سے پرامن بقائے باہمی اور بنا کسی اختلاف کے ہندو دیوتاؤں اور اللہ یا رسول اللہ کو پوجنے کی راہ ہموار ہوئی۔ کشمیر میں نندرشی (رشی سلسلہ کے بانی) جن کے کلام کو شروخ کہا جاتا ہے اور چودھویں صدی کی کشمیر کی مشہور خاتون لال دید کے کلام کو لل وکھ کہا جاتا ہے۔ان دونوں کے اقوال کافی مشہور ہیں اور لوک ثقافت کے اہم اجزا بن گئے۔بعد میں ان کے کلام نے کشمیری زبان کے پھیلاؤ میں ایک عامل کا کام کیا۔

جزیرہ نما جنوب، شمال کے مقابلے میں، مقامی زبان کی ترقی میں زیادہ جوش وجذبہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی دکن پر مقامی حکمرانوں کی حکومت تھی جو مقامی بولی مراٹھی، کنڑ اور تیلگو بولتے تھے اور سپاہیوں کی شکل میں مقامی لوگوں کا اور ریاستی نظام میں برہمنوں کا زیادہ عمل دخل تھا۔دکنی سلاطین نے نہ صرف تیلگو اور مراٹھی بلکہ دکنی کو بھی پروان چڑھایا جو فارسی اور مقامی زبانوں خاص کر مراٹھی کا مرکب تھی لوگوں سے بات چیت کرنے کے لیے اسکا استعمال کیا۔ جگت گرو یا بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ دوم نے تصوف اور موسیقی کے شوق کی جانب مائل ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب نورس میں نظمیں اور گیت لکھے۔اس کا متن، علم کی ہندو دیوی سرسوتی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، جس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صوفی سنت گیسودراز کی تعریف کی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات بھی جو کہ بھکتی سے متاثر نظموں کا مجموعہ ہے دکنی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔اس دور میں ایک اور ادبی ترقی اردو زبان کی شکل میں تھی۔اس زبان کی ابتدا کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔کچھ کے نزدیک یہ زبان مغل فوجی خیمے میں وجود میں آئی۔دوسری طرف شمس الرحمن فاروقی کہتے ہیں کہ اس کی جڑیں مقامی ہیں،اور یہ کہ اس کی پرورش صوفیوں اور دوسرے گروہوں نے کی۔1721 میں دہلی میں ولی دکنی کی آمد کے ساتھ ہی اردو نے ایک متعین شکل اور اسلوب حاصل کر لیا لیکن یہ میر، درد اور سودا ہی تھے جنھوں نے اردو کو فارسی کے برابر درجہ دیا۔بتدریج اردو شہر کے اشرافیہ کی ادبی زبان بن گئی اور ہندو اور مسلمان دونوں نے یکساں طور پر اس کی نشو ونما کی۔وجے نگر سلطنت نے سنسکرت کے ساتھ ساتھ کنڑ اور تلگو ادب کی بھی سرپرستی کی۔ کرشنا دیورایا سنسکرت اور تلگو کے ایک ماہر اسکالر تھے اور امکتا ملیادا کے لیے مشہور تھے۔ایکناتھ اور تکارام کے ہاتھوں مراٹھی نے اپنا عروج حاصل کیا اور ملیالم نے ایک علاحدہ زبان کے طور پر اپنا ادبی سفر شروع کیا۔

14.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ: مغلوں نے اپنے دور حکومت میں فن اور تعمیراتی تکنیک کی مختلف شکلوں کی سرپرستی کی اور اس دور میں مغلوں اور علاقائی حکمرانوں نے ہندوستان میں مختلف زبانوں میں ادب کا ایک بھرپور ذخیرہ تیار کیا۔

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

14.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

پیٹرا ڈیورا	:	نیم قیمتی پتھروں کا استعمال کرتے ہوئے تصویری جالیوں کا کام۔
پریم اکھیان	:	صوفیانہ شاعری کی ایک شکل۔
کلیات	:	نظموں کا مجموعہ
سرِ اکبر	:	اپنشدوں کا فارسی ترجمہ
رزم نامہ	:	مہابھارت کا فارسی ترجمہ۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بابر نامہ کس زبان میں تحریر کی گئی تھی۔
2. تاج محل کا چیف آرکیٹیکٹ (اصل معمار) کون تھا۔
3. کس مغل بادشاہ کے دورِ حکومت میں دین پناہ کو تعمیر کیا گیا۔
4. ساسارام میں ہشت ضلعی مقبرہ کس نے تعمیر کروایا۔
5. آگرہ کا قلعہ کی شروعاتی تعمیر کس حکمراں نے کیا تھا۔
6. کس حکمران نے اپنے فن تعمیر میں پچی کاری (Pietra Dura) تکنیک کو متعارف کرایا۔
7. لال دید کے اقوال کو یہ کہا جاتا ہے۔
8. پدماوت کس نے لکھی۔
9. دکن کے کس حکمران کو جگت گرو کے نام سے جانا جاتا ہے۔
10. الکتا ملیادا کس نے تحریر کی۔

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل دور میں جن تصنیفات کا ترجمہ کیا گیا ان کے نام بتائیں۔
2. ادب کے فروغ کو بھکتی اور صوفی تحریک سے کیسے جوڑا جاتا ہے۔
3. اکبر کے دور کو مغل فن تعمیر کا پھلنے پھولنے کا مرحلہ کیوں سمجھا جاتا ہے۔
4. شاہ جہاں کے دور میں تعمیر ہونے والی اہم عمارتوں کو ان کی خصوصیات کے ساتھ بتائیں۔
5. 16-18 ویں صدی کے دوران مقامی ادب کی ترقی پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل فن تعمیر کی اہم خصوصیات پر بحث کریں۔
2. 16-18ویں صدی کے دوران زبان وادب کی ترقی پر بحث کریں۔
3. مغل فن تعمیر کے ہم آہنگ عناصر پر بحث کریں۔

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Catherine B. Asher and Cynthia Talbot, *India Before Europe*, Cambridge University Press, 2006.
2. Catherine B. Asher, *Architecture of Mughal India*, Cambridge University Press, 1992.
3. Herman Kulke, *History of Precolonial India: Issues and Debates*, Oxford University Press, 2018.
4. Audrey Truschke, *Culture of Encounters: Sanskrit in the Mughal Court*, Penguin Books, 2016.
5. Harbans Mukhia, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, 2004.
6. Satish Chandra, *Essays on Medieval Indian History*, Oxford University Press, 2003.
7. ____________, *Medieval India: From Sultanat to the Mughals*, *Mughal Empire* (*1526-1748*), Har-Anand Publications, 2004.
8. Meena Bhargava, *Understanding Mughal India: Sixteenth to Eighteenth Centuries*, Orient BalckSwan, 2020.
9. Sheldon Pollock eds., *Literary Cultures in History: Reconstruction from South Asia*, Berkeley: University of California Press, 2003.
10. Percy Brown, *Indian Architecture: Islamic Period*, CBS Publishers & Distributors, 2018.
11. Ebba Koch, *Mughal Architecture: An Outline of its History and Development (1526-1858)*, Primus Books, Revised Edition, 2013.

اکائی 15۔مذہب

(Religion)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 بھکتی تحریک

15.3 بھکتی فلسفہ

15.4 چند بڑے بھکتی سنت

15.5 سکھ مت

15.6 تصوف

15.7 مغل حکمران اور مذہب

15.8 اکتسابی نتائج

15.9 کلیدی الفاظ

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

مذہب اور روحانیت انسانی وجود کا لازمی حصہ رہے ہیں اور عام لوگوں کے مذہبی تجربات کا مطالعہ بہت ہی مسحور کن رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں عہد وسطیٰ کے عام لوگوں کے مذہبی عقائد اور طریقوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ جدید ہندوستان میں، جہاں مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کی تکمیل کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے، عہد وسطیٰ کے مذہبی منظر نامے کو سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے فرقہ پرستی اپنا بدصورت سر اٹھا رہی ہے، مختلف تاویلات پیش کی جانے لگی ہیں۔ جہاں کچھ لوگوں نے خود مذہب کو فرقہ واریت کا ذمہ دار قرار دیا، وہیں دوسروں نے اس کی نفی کرتے ہوئے ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ کے دور کی طرف اشارہ کیا جب لوگ بہت زیادہ مذہبی تھے لیکن فرقہ پرستی کا کوئی نشان تک نہیں تھا۔ کئی ماہرین نے بلاشبہ یہ بات ثابت کی ہے کہ جب تک مذہبی برادریوں کے درمیان تنازعات میں شدت کم تھی، لوگ مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے اچھے سلوک کرتے تھے اور مذہب کے باہمی تجربات کہیں زیادہ مضبوط تھے۔ اس اکائی میں ہم عہد وسطیٰ کے ہندوستانیوں کے مذہبی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس میں عام لوگ اور اشرافیہ دونوں کی مذہبی زندگی شامل ہے۔

سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک، ہندوستان میں مذہبی زندگی اسلام اور ہندومت کے درمیان مسلسل بقائے باہمی سے عبارت تھی۔ مغل حکمرانوں نے اس پہلو کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر جہانگیر کو اس بات پر فخر تھا کہ اس کے دور حکومت میں مختلف مذاہب کے پیروکار امن اور ہم آہنگی سے رہتے تھے۔ اس کے مطابق، ازبکوں اور صفویوں کے تحت ایسا نہیں تھا۔ دو متضاد رویوں کا واضح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ستیش چندر جیسے مورخین کہتے ہیں کہ اس عرصے کے دوران، ان دونوں ہی مذہبی عقائد نے 'ایک جانب آزاد خیال ازم کے متضاد رجحانات اور دوسری جانب سخت قدامت پسندی اور امتیاز' کا سامنا کیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مشہور مورخ تاراچند کے مطابق اسلام نے ہندو ثقافت کے ہر پہلو کو متاثر کیا چاہے وہ مذہب ہو، فن ہو، ادب ہو یا سائنس ہو۔ مسلمان بھی ہندومت سے متاثر تھے۔ چنانچہ ہم البیرونی، امیر خسرو، ابوالفضل، دارا شکوہ اور دیگر جیسے مسلمان علماء کو ہندو مذہب کو سمجھنے اور مسلمانوں میں اس کی تفہیم کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اکبر، جہانگیر اور کشمیر کے زین العابدین جیسے حکمرانوں نے شاہی سرپرستی کے ذریعے ہندومت کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح کی وسیع النظری کے نتیجے میں 18 ویں صدی کے عالم مرزا جان جہاں نے لارڈ سری رام اور لارڈ سری کرشنا دونوں کو نبی قرار دیا۔ ثقافتوں اور فلسفوں کے امتزاج و اختلاط نے ہندوستانی روحانی ماحول میں بھکتی اور صوفی تحریکوں جیسی مضبوط سماجی و روحانی تحریکوں کو جنم دیا جس سے مختلف برادریوں کے درمیان سماجی رشتے مزید مضبوط ہوئے۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں لوگوں کی مذہبی اور روحانی زندگی کو سمجھ سکیں۔
- عہد وسطیٰ کے دور میں ہندوستانیوں کی سماجی، مذہبی اور ثقافتی زندگی کو تقویت بخشنے میں بھکتی اور صوفی تحریکوں کے تعاون کا اعتراف

کر سکیں۔

- سکھ مت کے ظہور کو سمجھ سکیں۔
- مغل حکمرانوں کے مذہبی عقائد اور طریقوں کی داد دے سکیں اور ان کا تجزیہ کر سکیں جس نے ان کی سیاست کے ساتھ ساتھ وسیع طور پر معاشرے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔
- اس بات کو سمجھ سکیں کہ عہد وسطیٰ کا ہندوستانی معاشرہ کوئی فرقہ پرست معاشرہ نہیں تھا اور باہمی مذہبی وجود کا عنصر اپنے عروج پر تھا۔

15.2 بھکتی تحریک (Bhakti Movement)

بھکتی تحریک ایک اہم ترین سماجی، مذہبی اور ثقافتی تحریک تھی جس نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ بھکتی تحریک کے منظرنامے پر کئی بھکتی مصلحین ابھرے جنھوں نے اس بات کی تبلیغ کی کہ خدا ایک ہے، تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ انہوں نے بت پرستی کو رد کیا اور ذات پات کے غیر انسانی نظام اور اچھوت ہونے کے تصور کی مذمت کی۔ رفتہ رفتہ بھکتی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور میرابائی اور کرناٹک کی اکامہادیوی جیسی خواتین بھی اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔ اس تحریک نے سماجی اور روحانی جمہوریت کے لیے مہم چلائی اور اعلان کیا کہ خدا کو مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کے طبقے کے چنگل سے آزاد کر کے عام لوگوں کے قریب لایا جانا چاہیے۔ اس تحریک نے یہ بھی ثابت کیا کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی اثر و رسوخ کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

موکش یا نجات حاصل کرنے کے حتمی مقصد کے ساتھ وقف ہو کر خدا کی عبادت کو بھکتی کہا جاتا ہے۔ بھکتی کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہندوستانی مذہبی روایت جو کہ وادی سندھ کی تہذیب سے جا کر ملتی ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب میں، ہمیں پشوپتی شیو کی پوجا کے ابتدائی شواہد ملتے ہیں جو جانوروں سے گھرے مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ویدوں، اپنشدوں، رزمیہ داستانوں اور پرانوں میں بھکتی کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے۔ ویدانت یا ویدک مذہبی فلسفہ بنیادی طور پر اپنشدوں پر مبنی ہے، جو رسمی اور سطحی شکلوں سے اوپر اٹھ کر ہند آریائیوں کے مذہبی عقائد و اعمال کے فلسفیانہ پہلو سے بحث کرتا ہے۔ یہ تخلیق کے اسرار کو حل کرنے اور انسانی زندگی کے معنی اور مقصد کو مابعد الطبیعاتی اندازوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ویدانت کے فلسفے کا اصل محور خالق اور مخلوق، خدا (پرماتما) اور روح (آتما) کا تصور ہے۔ یہ دو بنیادی اصولوں کے گرد گھومتا ہے۔ ا۔ روح کی دوبارہ پیدائش یا منتقلی کا نظریہ۔ ۲۔ کرما کا نظریہ یا 'مکافات عمل کا قانون۔' روح اور خدا کے درمیان تعلق ایسا ہی ہے جیسے کامل اور جز کے درمیان تعلق؛ پانی کے قطرے اور سمندر کے درمیان تعلق۔ انسان فانی ہے لیکن روح لافانی ہے۔ خدا کا ایک حصہ اور جز ہونے کے ناطے، اس کا حتمی مقصد خدا کے ساتھ دوبارہ ملاپ کی تلاش اور خدا کے ساتھ ایک ہو جانا ہے۔ یہی نجات (جسے مکتی، موکش یا نروان بھی کہا جاتا ہے) یا پنر جنم کے چکر سے آزادی ہے۔

ویدانت، نجات کے حصول کے لیے تین طریقے بتاتا ہے۔ وہ ہیں گیان مارگ، کرما مارگ اور بھکتی مارگ۔ گیان مارگ، نجات کے حصول کے لیے حقیقی علم کی تحصیل یا عرفان پر زور دیتا ہے۔ کپل کا سانکھیہ درشن اس طریقے کی سفارش کرتا ہے۔ کرما مارگ، نجات کے حصول کے لیے خالص عمل پر زور دیتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن نے اپنے شاگردار جن کو اسی کی تعلیم دی۔ بھکتی مارگ، خدا کی دل لگا کر عبادت، بندے کی خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور پاک نیت، اچھے الفاظ اور عمل کے ساتھ خدا سے لولگانے پر زور دیتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق قائم کرتا ہے، ایک ایسا تعلق جو آقا اور غلام، شوہر اور بیوی یا عاشق و معشوق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کی عقیدت کے ذریعے مکتی حاصل کی جاسکتی ہے۔ گیان مارگ کو اپنانا سب سے مشکل ہے۔ غیر معمولی خدائی اوصاف کے حامل بہت کم سادھو اور مادی دنیا کی خواہشات سے عاری، پاک ذہن و قلب کے حامل سنیاسی، حقیقی علم یا عرفان کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بھکتی کے لغوی معنی 'لگاؤ' یا 'عقیدت' کے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ بھکتی ایک تحریک کے طور پر جنوبی ہندوستان میں ابھری۔ بھکتی کا تصور پہلے الوار جو وشنو بھگوان کو ماننے والے تھے ان کے بھجنوں میں اور بعد میں نیناروں جو شیو بھگوان کو ماننے والے تھے ان میں فروغ پایا۔ یہ تصور بنیادی طور پر برہمنوں کے مذہبی غلبے، اس وقت موجود سخت گیر سماجی اصولوں اور رسوم و رواج کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع ہوا تھا۔ بعدازاں بھکتی، بتدریج ایک اخلاقی اصول میں تبدیل ہو گئی۔ بھگوت گیتا سے لے کر 13 ویں صدی تک جب کہ اسلام ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا، بھکتی عقیدہ ویدک دانشوریت کے بنیادی عقیدے میں باقی رہا کیونکہ اس وقت بھی اس نے ہندوستانی معاشرے کی ذات پات کی تقسیم کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ تاہم، بعد میں، چند بھکتی سنتوں نے ذات پات کے نظام کو چیلنج کیا۔

15.3 بھکتی فلسفہ (Bhakti Philosophy)

شمالی ہندوستان میں ترک قوت مضبوط ہونے کے بعد ہندوستان میں اسلام نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔ اسلام کا توحید کا فلسفہ بتدریج ہندوستانی سرزمین پر پھیل گیا اور اس نے مقامی مذہبی نظریات اور فرقوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ عہد وسطیٰ کے دور میں صوفی شاعری اور ہندو فکر نے بھکتی تحریک کے نظریات اور تعلیمات کو متاثر کیا۔ دانشوران نے بھکتی روایت کو دو وسیع زمروں میں تقسیم کیا ہے: سگن اور نرگن۔ سگن کا مطلب ہے 'گن (صفات) کے ساتھ'، اور نرگن کا مطلب ہے 'گن (صفات) کے بغیر'۔ سگن بھکتی ایک ایسی روایت ہے جہاں مخصوص دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے، مثال کے طور پر، وشنو یا شیو، یا ان کے اوتار یا دیوی کی پوجا کرنا۔ نرگن بھکتی کا مطلب خدا کی ایک مابعد الطبیعیاتی شکل (یعنی بے شکل خدا) کی عبادت ہے۔ قدیم ہندوستانی تاریخ کی ماہر مشہور مورخ رومیلا تھاپر کے مطابق، دوسری صدی ء کے اوائل تک، بھکتی نے شیومت، وشنومت اور اس سے بھی اہم بات، شرمن روایات سے تعلیمات اخذ کرتے ہوئے ایک اہم نئے مذہبی اظہار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جنوبی ہند کے بھکتی سنتوں نے تیلگو، تمل اور دیگر مقامی زبانیں استعمال کیں جبکہ سنسکرت اب بھی ابلاغ کا اہم ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ تاہم، نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے اوائل میں جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں کیے جانے والے بھگوت پران کے ترجمہ کو بھکتی فلسفہ میں ایک اہم پیش رفت سمجھا جاتا ہے۔ اس پران نے اپنا مواد اور اپنا قصہ جنوبی ہند کے تامل ذرائع بالخصوص الوار بھکتی شاعری سے اخذ کیا ہے۔

اپنے تاریخی ارتقا کے دوران، مختلف مراحل میں بھکتی کے تصور کی مختلف طریقوں سے وضاحتیں اور تجزیے ہوتے رہے۔ جنوبی ہند کے ایک برہمن، آدی شنکراچاریہ (50۔700ء)، نے بھکتی کی وضاحت ادویتا کے نظریے (توحید یا غیر ثنویت) کے ذریعے کی۔ اس فلسفے کے ذریعے، شنکر نے برہما کے علم کے حصول کے ذریعے نجات کے اپنشد والے نظریے کی تبلیغ کی۔ ایک اور جنوبی ہندوستانی بھکتی سنت رامانج تھے جن کی بھکتی کی فکری تعریف مختلف تھی۔ ان کے مطابق، خدا کی شکل بھی ہے اور خوبیاں بھی، اور نجات بھکتی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ رامانج نے وِشِشٹا دویتا (پابند توحید یا مشروط توحید) کا تصور دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جیسے لوگوں کو خدا کی ضرورت ہے اسی طرح خدا کو بھی لوگوں کی ضرورت ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ کی مذہبی روایت کو بھکتی روایت نے تقویت بخشی۔ اسی دور میں یہ تحریک جنوبی ہند کے علاقوں سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ بھکتی نظریات کے اہم مبلغین میں، جنھوں نے اسے شمالی ہندوستان تک پہنچایا، نام دیو (1270-1350)، اور رامانند (70-1400) شامل ہیں۔ اول الذکر نے 14ویں صدی کے اوائل میں تبلیغ کی تھی اور مؤخر الذکر نے چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی کے اوائل میں اس کا پرچار کیا۔ ان سنت شاعروں نے اپنے ارد گرد مریدین کا ایک حلقہ تیار کیا۔ انہوں نے نچلے طبقے اور خواتین کو اپنے دائرے میں شامل کر کے ذات پات کے درجہ بندی کے موجودہ سماجی نظام پر حملہ کیا۔ ان بھکتی سنتوں نے اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے بھجن لکھے۔ یہ بھجن تین بڑے موضوعات پر پیش کیے گئے تھے: شخصی خدا کے تئیں عقیدت، سخت گیر برہمنیت کے خلاف مزاحمت، اور بدھ مت کے ماننے والوں اور جینیوں کو بدعتی (مرتد) اور بے عقیدہ کہہ کر بدنام کرنا۔

15.4 چند ایک اہم بھکتی سنت (A Few Major Bhakti Saints)

نام دیو کی پیدائش مہاراشٹر میں ایک نچلی ذات سمجھے جانے والے گھرانے میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے تخلیق کردہ مختلف ابھنگوں (بھجنوں) میں ذات پات کی پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ ورکری پنتھ (یاتریوں کا راستہ) کے بھی زبردست شارح تھے، ورکری پنتھ یعنی وہ مکتب فکر ہے جو مساوات اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ نام دیو نے اپنے نظریات اور تعلیمات کی تبلیغ کے لیے مراٹھی زبان کا استعمال کیا۔ نام دیو کی شاعری خدا کے لیے محبت اور لگن کے جذبہ کو بیدار کرتی ہے۔ انہوں نے دور دراز کے سفر کیے اور دہلی میں صوفی عارفوں کے ساتھ روحانی مباحث کرتے رہے۔ تاہم، بھکتی تحریک کو رامانند کی سرپرستی میں زبردست تقویت ملی، جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سب سے بڑے بھکتی سنتوں میں سے ایک تھے۔ وہ رامانج کے پیروکار تھے اور انہوں نے وشنو کی جگہ رام کی پوجا کی۔ رامانند نے پورے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر سفر کیا جس نے انہیں شمالی ہندوستان میں اسلام کے فروغ کا مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انہوں نے چاروں ورنوں کو وید سکھائے اور ذات پات کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق نہیں کی۔ تاہم، اپنی 'آنند بھاشیہ' میں، رامانند نے لکھا ہے کہ شودروں کو وید پڑھنے کا حق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے ہر ذات، بشمول نچلی ذات کے سمجھے جانے والے لوگوں کو اپنے پیروکاروں میں شامل کیا۔ کبیر (1440۔1518) اور روی داس (جو رائے داس کے نام سے بھی مشہور ہیں) ان کے غیر معمولی چیلے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رامانند کے 12 چیلے تھے اور ان میں سے ایک عورت تھی۔

کبیر جن کی تاریخ اسرار میں ڈوبی ہوئی ہے ہندوستان کے سب سے زیادہ بااثر بھکتی سنت تھے۔اپنے ایک دوہے میں کبیر اپنے آپ کو ایک بنکر کا بیٹا بتاتے ہیں۔ان کے مطابق، صحیفوں کے علم کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ کوئی فرد تعقل کے ذریعہ علم حاصل نہ کرلے۔ وہ مذہب کے نام پر ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے منائی جانے والی خالی خولی (بے جا) رسومات کے سخت مخالف تھے۔ان کا کہنا تھا کہ حقیقی مذہب اور روحانیت رسومات میں پوشیدہ نہیں ہوسکتی۔ کبیر کاشی میں رہتے تھے جہاں وہ اس وقت کے ہندو اور مسلم باباؤں کے ساتھ فلسفیانہ گفتگو کرتے تھے۔انہوں نے اپنی تعلیمات میں کچھ بنیادی اسلامی اصولوں کو شامل کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے اچھوت اور دیگر سماجی سختیوں جیسے ذات پات کے نظام، ورن آشرم، مذہبی یاتراؤں اور کتابی علم کی مذمت کی۔

کبیر اس قدر متاثر کن بھکتی شخصیت تھے کہ ان کے حوالہ جات صوفی ادب جیسے 'مرآۃالعصر' اور 'دبستانِ مذاہب' میں ملتے ہیں۔ تاراچند کے مطابق، 'کبیر کا مشن ایک ایسے محبت بھرے مذہب کی تبلیغ کرنا تھا جو تمام ذاتوں اور مذاہب کو متحد کر دے۔' کبیر کسی الگ مذہب کی بنیاد ڈالنا نہیں چاہتے تھے لیکن جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر ہوتا آرہا ہے ان کے بھکتوں نے شمالی اور وسطی ہندوستان میں ایک فرقہ جو 'کبیر پنتھ' کے نام سے جانا جاتا ہے اس کی بنیاد رکھی۔ کبیر خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے، قطع نظر اس کے کہ اسے کس ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبیر نے ہندوؤں میں موجود بت پرستی، ذات پات کے نظام اور اچھوت پرستی کی شدید مخالفت کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کی دقیانوسی اور بے معنی رسومات کی بھی مذمت کی۔انہوں نے پاکیزگی قلب اور خلوص خدا کے بغیر مسجد میں پانچ نمازیں ادا کرنے کو فضول قرار دیا۔ کبیر نے مذہبی رواداری پر زور دیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق سکھایا۔ وہ ان نمایاں بھکتی اصلاح کاروں میں سے ایک تھے جنہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی پوری کوشش کی۔ کبیر نے ستی اور بچپن کی شادی کے رواج کے خلاف آواز اٹھائی، یہ دو برائیاں مکمل طور پر سماجی تھیں۔ کبیر دنیا کو ترک کرنے اور حقیقی علم یا نجات کی تلاش میں جنگلوں یا پہاڑیوں پر جانے کے حق میں نہیں تھے۔اس کے بجائے، انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی کہ وہ محنت کرکے اپنی روزی کمائیں اور ایک دیانتدار، شریف اور پرخلوص زندگی گزارتے ہوئے گھر کے تمام فرائض انجام دیں۔ کبیر کی تعلیمات وقت کے سماجی اور مذہبی تقاضوں سے کامل ہم آہنگ تھیں۔انہوں نے خود کو ایک مربوط ہندوستانی سماج کے تصور سے پوری طرح ہم آہنگ کیا اور لاکھوں لوگوں کے دل جیت لیے۔ان کے دوہے اور مشہور انقلابی اقوال بڑے پیمانے پر مشہور ہیں اور عہد وسطی کے ہندوستانی ثقافتی ورثے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔آیئے کبیر کے دوہے ملاحظہ کرتے ہیں:

'جاتی نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجیے گیان
مول کرو تلوار کا پڑا رہن دو میان۔'

'پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آخر پریم کا پڑھئے سو پنڈت ہوئے۔'

'پاہن پوجے ہری ملے، تو میں پوجوں پہار

یا تے چا کی بھلی جو پیں کھائے سنسار۔'

'سائیں اتنا دیجیے، جا مے کُٹُم سمائے

میں بھی بھوکا نہ رہوں، سادھو نا بھوکا جائے۔'

15.5 سکھ مت (Sikhism)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایک انتہائی اہم پیشرفت، سکھ مت کا ارتقاوفروغ تھی۔اس مذہبی فرقے نے گرونانک (1469-1539ء) کے روحانی نظریات اور تعلیمات سے اپنے افکار و تصورات کو اخذ کیا۔ گرونانک عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی متحرک مذہبی شخصیات میں سے ایک تھے۔ان کا جنم ننکانہ (پنجاب) کے ایک کھتری گھرانے میں ہوا۔وہ ہندومت اور اسلام دونوں کے توحید کے فلسفے سے متاثر تھے۔ پچھلے بھکتی سنتوں نام دیو اور رامانند کی طرح، گرونانک نے بھی پورے ہندوستان کے وسیع دورے کیے۔انھوں نے برہمنی سماج کی سخت گیر نوعیت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی۔انھوں نے ان تمام مذہبی علوم کو مسترد کردیا جوذات پات اور نسل کی بنیاد پر سماجی تقسیم کو جائز قرار دیتے تھے۔اس طرح،انھوں نے کسی فرد کے حقیقی حیثیت کے تعین کے لیے ذات (جو کہ پیدائش سے وراثت میں ملتی ہے) کے بجائے اعمال کو بنیاد بنایا۔انھوں نے کھلے عام سماجی انصاف کی بات کی جس سے ذات پات کے بندھنوں کی بنا پر کئی لوگ محروم تھے۔ان کا فلسفہ تین بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا: 'گرو' جو ایک کرشماتی شخصیت ہوتی ہے؛ 'شبد' جس کا مطلب نظریہ ہے؛ اور 'سنگت' جس کا مطلب تنظیم ہے۔

گرونانک نے ہندوستانی سماجی تانے بانے کو انتہائی سخت اور رسوم ورواج میں ڈوبا پایا۔ان کا مقصد ایک ذات پات سے پاک اور طبقہ بندی سے آزاد سکھ پنتھ کی بنیاد رکھنا تھا۔ کئی ذاتوں اور طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے آگے بڑھ کر اس مساوات والے پنتھ کو گلے لگایا۔انھوں نے اپنے عقیدت مندوں کو سچے اخلاق اور عبادت کے اصولوں کو اپنانے کی نصیحت کی جیسے کہ 'سچ' (حق کو تھامے رکھنا)، 'حلال' (جائز طریقے سے کمانا)، 'خیر' (دوسروں کی بھلائی چاہنا) اور 'نیت' (صحیح نیت)۔ گرونانک نے سماجی امتیاز کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی اور وہ معاشرے میں خواتین کو برابری کا مقام دلانے کے لیے کوشاں رہے۔کبیر کی طرح، انھوں نے بھی یاترا (مذہبی سفر)، بت پرستی، اور معاشرے میں رائج دیگر دنیاوی رسومات کی مذمت کی۔اس کے بجائے، گرونانک نے کسی فرد کی زندگی میں 'گرو' رکھنے کی اہمیت پر بہت زور دیا جو رہنمائی کرتا ہے اور خدا تک پہنچاتا ہے۔انھوں نے لنگر متعارف کرایا، جو عہد وسطیٰ کے لحاظ سے ایک انقلابی اقدام تھا: ان دنوں، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، مختلف ذاتوں اور عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ مل کر نہیں کھاتے تھے۔انھوں نے لوگوں کو جہالت اور توہم پرستی کی زنجیروں سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہوئے سماج کی تشکیل نو پر زور دیا۔ گرونانک کا خود کسی مذہب کی بنیاد رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن بعدازاں، ان کی تعلیمات کی بنیاد پر سکھ ازم کے نام سے ایک نیا مذہب تشکیل دیا گیا جس کے پیروکار آج پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہیں سکھ کہا جاتا ہے اور ان کے مذہب کو سکھ مت کہا جاتا ہے۔

بھکتی فرقہ چودھویں صدی کے اختتام پر ایک وسیع عوامی تحریک بن گیا۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی تحریک تھی جس میں ہندوؤں کے تمام طبقات اور ذاتیں شامل تھیں۔ اس کی ابتدا یا مقبولیت اسلام کی مرہون منت نہیں تھی حالانکہ یہ کسی حد تک صوفیوں کے صوفیانہ فلسفے سے متاثر تھا۔ بھکتی تحریک نے اپنے معلنہ مقاصد کو کافی حد تک حاصل کر لیا۔ اس نے سماج میں برہمن پجاریوں کے غلبہ پر شدید ضرب لگا کر ہندومت کا احیا کیا۔ اس نے مذہبی اور سماجی ثقافتی ورثے پر عوام کا اعتماد بحال کیا اور بڑے پیمانے پر اسلام قبول کرنے پر روک لگائی۔ ذات پات کے نظام کا قلعہ تو نہیں ٹوٹ سکا تاہم ذات پات کی بنیاد پر امتیاز کے برے اثرات کو اونچی ذات اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے درمیان ہم آہنگی کے رشتوں اور آزادانہ سماجی میل جول کے ذریعے کم کیا گیا۔ ہندوؤں کو جن بے شمار سماجی برائیوں کا سامنا تھا ان کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جا سکا۔ تاہم، جب ان برائیوں کو پوری طرح سے بے نقاب کر دیا گیا اور ان کی مذمت کی گئی تب لوگوں کے اخلاقی شعور میں ان کی اہمیت کم ہونے لگی۔ بھکتی تحریک نے زندگی کی عمدہ اقدار پر زور دیا اور اس طرح مجموعی طور پر معاشرے کے عمومی اخلاقی رویہ کو بہتر بنایا۔ بھکتی مصلحین اور صوفیاء نے نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی طور پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں مدد کی۔ بھکتی تحریک نے نام نہاد ہندو اور مسلم ثقافتوں یا مقامی اور غیر ملکی ثقافتی روایات کے درمیان قومی یکجہتی اور میل ملاپ پیدا کیا۔

بھکتی تحریک کے کچھ ضمنی اثرات یا اس کے بعد پڑنے والے اثرات بھی قابل ذکر ہیں۔ تمل، تیلگو، ہندی، پنجابی، بنگالی اور مراٹھی سمیت مقامی زبانوں کے فروغ کا زیادہ تر سہرا بھکتی مصلحین کے سر جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کی مقامی بولیوں اور عام لوگوں کے درمیان بولی جانے والی زبانوں میں اپنی مہم کو آگے بڑھایا۔ بھکتی کے موضوع نے ان زبانوں کے ادبی ذخیرے کو بھی مالا مال کیا جیسا کہ اس نے ان ہندوستانی اسکالروں کو فکر اور اظہار کا ایک نیا گوشہ فراہم کیا جو مبلغین کے طور پر تحریک میں شامل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر، دو قابل ذکر پنڈت سنتوں، سورداس اور تلسی داس نے سولہویں صدی کے دوسرے نصف اور سترہویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں ہندی ادب کے فروغ میں قابل قدر تعاون دیا۔ اور سب سے بڑھ کر پنجاب میں سکھ مت کی پیدائش، بھکتی تحریک کا براہ راست نتیجہ تھی جو پنجاب میں گرو نانک نے 1594ء میں شروع کی تھی، اس طرح، بھکتی تحریک نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، معاشرہ اور ثقافت میں کثیر جہتی تعاون کیا۔

15.6 تصوف (Sufism)

تصوف دنیا کے ہر مذہب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اسلامی تصوف، جسے تصوف یا صوفی ازم کے نام سے جانا جاتا ہے، اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسلام کے بطن سے پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کچھ نیک طینت اور شرمیلے لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو بخوشی قبول کیا لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں سستی کا مظاہرہ کیا۔ ایسے آزاد منش بندگانِ خدا قرآنی تعلیمات اور حیات نبویؐ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیرپا روحانی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنے باطن کی تطہیر پر زیادہ زور دیا۔ اسلام میں قادرِ مطلق، اللہ تعالی جیسی اعلیٰ ترین ہستی کے وجود کے بارے میں شعور ہی نیک لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ خود سپردگی، مراقبہ اور خدمت خلق کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ تصوف کا اسلام کے علاوہ کوئی علاحدہ مقصد یا

عقیدہ نہیں تھا اور ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی تنظیم یا خانقاہی نظام نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نویں صدی میں اسلام کی سخت گیر رسمیت (شعائر) کے خلاف رد عمل کے طور پر ایران میں ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ بغداد کے عباسی خلفا کے زمانے میں اسے ایک نظریاتی بنیاد حاصل ہوئی اور صوفی بزرگوں نے عیسائیت، ہندومت، بدھ مذہب اور جین مذہب سمیت دیگر مذاہب اور لوگوں سے تصوف کے نظریات کو فراخ دلانہ طور پر اخذ کرنا شروع کیا۔ تاراچند کے مطابق تصوف ایک پیچیدہ رجحان ہے، جس کا موازنہ ایک دریا سے کیا جا سکتا ہے جو کئی سرزمینوں سے آنے والی معاون دریاؤں کے پانی کو اکٹھا کر کے اپنی جسامت بڑھاتا رہتا ہے۔ تصوف کو مسلم قدامت پرستوں، سنی اور شیعہ دونوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات صوفیوں کو ستایا گیا اور ان میں سے بعض کا اسلام سے ارتداد کے الزام میں درحقیقت سر قلم کر دیا گیا۔ قدامت پسندوں یا سخت گیر اسلام اور تصوف کے درمیان مفاہمت کا سہرا الغزالی (1057-1112ء) کے سر جاتا ہے، جو ایک عرب فلسفی تھے۔ انہوں نے تصوف کو اسلامی الٰہیات کے ایک اٹوٹ جز کے طور پر ایک مابعد الطبیعیاتی بنیاد فراہم کی۔

ہندوستان بھی عہد وسطیٰ کے دور میں تصوف کے ایک غیر معمولی مرکز کے طور پر ابھرا۔ 11ویں اور 12ویں صدی میں، شمالی ہندوستان کے بڑے حصوں میں صوفیوں کی آمد ہوئی اور اتفاق سے 13ویں صدی میں دہلی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ تیرہویں صدی کے ہندوستان میں دو بڑے صوفی سلسلے، چشتی سلسلہ اور سہروردی سلسلہ بالترتیب دہلی/ہانسی اور ملتان میں پھیلے۔ عہد وسطیٰ کے میں ہمیں ایسے علمائے کرام نظر آتے ہیں جو قابل قدر سرکاری عہدوں پر فائز تھے اور انہوں نے کسی بھی ایسی مذہبی تحریک کی مخالفت کی جو ان کے بقول اسلام کی قدیم پاکیزگی کو چیلنج کرتی تھی۔ مغربی ایشیا کی طرح ہندوستان میں بھی شریعت اور طریقت (تصوف) کے حامیوں کے درمیان کشمکش دیکھنے میں آئی۔ دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ریاست سے وابستہ علماء کے سخت گیر طبقے نے ہندوستان میں شریعت کے نفاذ کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ تاہم، اس وقت کے سلاطین نے اس مطالبہ کو یہ کہتے ہوئے ٹال دیا کہ ہندوستانی ماحول میں شریعت کا نفاذ ناقابل عمل ہے جہاں لوگوں کی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور مسلمانوں کے پاس نہ تعداد تھی اور نہ وسائل۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے نامور مورخ مظفر عالم کے مطابق مغلوں کو مختلف نظریاتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے متنوع گروہوں کو راضی کرنے اور ان کو سمونے کی پیچیدہ صورت حال سے نمٹنا پڑا۔ مزید برآں، مظفر عالم کے مطابق، نچلی سطح سے اوپر آکر خود کی محنت اور ہمت سے حکمران بننے والے 13ویں صدی کے سلطانوں کے برعکس، مغل تیمور کی اولاد تھے۔ تیمور، سنی مسلم سلطنتوں کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک انتہائی اہم شخصیت تھی۔ وسطی ایشیا میں مغلوں کے آباؤ اجداد اپنے خود کے مذہبی آقاؤں سے مانوس تھے یا انس رکھتے تھے اور یہ مذہبی آقا، مجازی شاہی پیروں کا کردار ادا کرتے تھے۔

16ویں اور 17ویں صدی کے ہندوستان میں، صوفی پہلے ہی مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان کے کام کرنے کے مراکز مختلف تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ صوفیاء کے مختلف گروہوں میں روحانی مسابقت اور رقابت پائی جاتی تھی۔ یہ چپقلش خاص طور پر چشتی پیروکاروں اور نقشبندیوں میں بہت زیادہ نمایاں تھی۔ ابتدا میں جب مغلوں نے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا تو اس وقت بھی چشتی ہندوستان میں برتر مقام پر فائز تھے۔ اکبر کے دور حکومت میں، چشتی سلسلے کو دوبارہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی بنیادی وجہ شیخ سلیم چشتی سے اس کی وابستگی تھی۔ اکبر وحدت الوجود کے عقیدہ سے متاثر تھا، اور اس کے زمانے کے بہت سے صوفی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

نقشبندی صوفی سلسلہ کی بنیاد خواجہ بہاؤالدین نقشبندی (1389-1317) نے ڈالی تھی۔اس سلسلے کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ (1603-1563) نے متعارف کرایا۔ خواجہ باقی باللہ ایک سرکردہ شخصیت تھے جنہوں نے اکبر کی آزاد خیال مذہبی پالیسیوں کے خلاف تحریک چلائی۔ وہ دہلی میں آباد ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کے بہت سے امرا، ان کے شاگرد بن گئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نقشبندی مکتب فکر شروع سے ہی شریعت کی پابندی پر پختہ یقین رکھتا تھا اور بدعات کی مذمت کرتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے نے وحدت الوجود کے فلسفے کو چیلنج کیا۔

شیخ احمد سرہندی (1624-1564) نے وحدت الوجود کے تصور پر کڑی تنقید کی۔ آپ خواجہ باقی باللہ کے خاص مرید تھے۔ آپ نے صوفیاء کے ان تمام اعمال پر تنقید کی جنہیں آپ غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ اس طرح کے اعمال میں، جن کی مخالفت کی گئی، سماع اور اولیاء کے مقبروں کی زیارت بھی شامل تھی۔ انہوں نے ان رسومات اور تقاریب کی مذمت کی جو ہندوؤں سے ماخوذ تھیں لیکن مسلم ثقافت کا حصہ بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی قسم کے سماجی روابط برقرار رکھنے کے خلاف تھے۔ انہوں نے ہندوؤں پر جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے اور گائے کے ذبیحہ کو دوبارہ شروع کرنے کی پرزور وکالت کی۔ ان دونوں اعمال (جزیہ اور گائے کشی) پر اکبر نے پابندی لگادی تھی۔ وحدت الوجود کے عقیدہ کو رد کرتے ہوئے شیخ احمد سرہندی نے وحدت الشہود کے عقیدہ کی وکالت کی۔ وحدت الوجود کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی معروضی تجربہ نہیں بلکہ ایک موضوعی تجربہ ہے: صوفی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا جز ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ خوشی کی یہ کیفیت ایک عارضی تجربہ ہے جس میں انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نفس مکمل طور پر فنا ہو چکا ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ چونکہ خدا اور انسان کا رشتہ آقا اور غلام کا ہے اور چونکہ وحدت الوجود خالق اور مخلوق کے درمیان فرق کو ختم کر دیتا ہے، چنانچہ یہ (عقیدہ وحدت الوجود) مظاہر پرستی کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ صرف شریعت کے ذریعے سے ہی وجود ربانی کے اسرار کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مجدد (تجدید کرنے والا) کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے تصوف کے فلسفے کو راسخ العقیدہ اسلامی عقائد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ شیخ احمد سرہندی کا عقیدہ تھا کہ وہ مجدد ہیں اور انہیں خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ سنی راسخ العقیدہ کی شکل میں حقیقی ایمان بحال کریں۔ وہ شیعوں کو کافر سے بدتر سمجھتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کی جانب سے بھیجے گئے ہیں۔ ان کے اس دعویٰ پر بہت سے سخت گیر عناصر نے تنقید کی اور کہا کہ شیخ احمد سرہندی نے پیغمبر کے برابر درجہ کا دعویٰ کیا ہے۔ اس پر جہانگیر نے انہیں قید میں ڈال دیا۔

اکبر کے دور میں موجود دیگر سلسلوں میں سے ایک قادریہ سلسلہ بھی تھا۔ اس سلسلے کو شیخ عبدالقادر (انتقال 1533) نے مشہور کیا جن کے بیٹے اکبر اور ابوالفضل کے قریبی حامی تھے۔ قادریہ سلسلہ وحدت الوجود کے عقیدہ پر یقین رکھتا تھا۔ قادریہ سلسلہ کے صوفیاء میں سے، جو سیاسی حلقوں میں کافی اثر ورسوخ رکھتے تھے، میاں میر بھی تھے۔ دارا شکوہ اور جہاں آرا دونوں ہی میاں میر سے بیعت تھے۔ دارا شکوہ، ایک روشن خیال شہزادہ، اپنی فکر میں آزاد خیال تھا اور مذہبی تنوع کا بہت بڑا مداح تھا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف 'مجمع البحرین' میں ویدوں کو آسمانی کتابیں قرار دیا گیا ہے۔ راسخ العقیدگی والے عہد وسطیٰ کے دور میں جبکہ سخت گیر عناصر کا غلبہ تھا، اس طرح کا کوئی بھی خیال ایک بہت بڑا انقلابی بیان تھا۔

اورنگ زیب کے دور میں راسخ العقیدہ مذہبی مطالعات پر زیادہ زور دیا گیا۔ فتاویٰ عالمگیری کو علمائے کرام کے ایک گروپ نے ترتیب دیا تھا جس میں ہندوستان اور بیرون ملک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جاری ہونے والے فتاویٰ شامل ہیں۔ تاہم یہ خیال غلط ہے کہ وحدت الوجود کا تصور اورنگ زیب کے دور حکومت میں زوال پذیر ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اسلام کے آزاد خیال اور قدامت پسند (راسخ العقیدہ) دونوں عناصر حرکت میں تھے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مایہ ناز مورخ ستیش چندر استدلال کرتے ہیں کہ آزاد خیال قادریہ سلسلے کے مقابلے نقشبندی سلسلے کو راسخ العقیدہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، ایسی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ اپنے قول کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے شیخ عبدالحق کی مثال پیش کی جو کہ قادریہ سلسلہ سے وابستہ تھے لیکن سوچ میں قدامت پسند تھے۔ اسی طرح نقشبندی سے تعلق رکھنے والے مرزا مظہر جان جاناں کا خیال تھا کہ وید آسمانی کتابیں ہیں اور اسی لیے ہندو بھی اہل کتاب سے تعلق رکھتے ہیں۔

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مختلف علاقائی طاقتیں جیسے مراٹھے، جاٹ اور سکھ، بکھرتے مسلم اقتدار کے لیے ایک سنگین خطرہ بن گئے۔ اب مذہبی طبقے خصوصاً علمائے کرام کی ریاستی سرپرستی ختم ہو گئی تھی اور اس بنا پر ان کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ احساس اس وقت بہت زیادہ ہوا جب نوآبادیاتی ریاست نے ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ اس پس منظر میں 18 ویں صدی میں مختلف احیائی تحریکیں ابھریں جو کہ مذہبی و سیاسی نوعیت کی تھیں۔ شاہ ولی اللہ (62-1703) اسلامی احیائی تحریکوں کی ایک اہم شخصیت کے طور پر ابھرے۔ تصوف پر ان کی گفتگو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان تصوراتی تعلق کو ہم آہنگ کرنے اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ صوفی کا بنیادی مقصد روحانی حصول ہے اور 'وہ سب خدا کے وجود میں وجود کی حقیقت کو دیکھتے ہیں' (مظفر عالم، صفحہ 13)۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس پہلو میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ تخلیق شدہ دنیا کو پرتَو (مظہر) سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ انعکاس (ظل)۔ لہٰذا، ان دو گروہوں کے درمیان یہ فرق صرف 'تشریح اور تراکیب کے معاملات میں' ہے۔ (مظفر عالم، ص 13)۔ ان کی مذہبی فکر کا 18 ویں اور 19 ویں صدی کے مختلف مذہبی مصلحین اور احیاء پسندوں پر کافی اثر پڑا۔

15.7 مغل حکمران اور مذہب (Mughal Rulers and Religion)

مغل حکمرانوں کے مذہبی عقائد اور طرز عمل بحث کا ایک بڑا موضوع رہے ہیں۔ عام لوگوں کے ذہنوں میں ایک بڑی غلط فہمی نے اپنے قدم جما لیے ہیں اور اس کی ایک بڑی وجہ چند فرقہ پرست پروپیگنڈہ کرنے والے (دروغ گو لوگ) ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مغل حکمران اسلام کے راسخ العقیدہ (سخت گیر) پیروکار تھے اور اس وجہ سے انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو خاص طور پر ان کی عبادت گاہوں کو تباہ کر کے ان پر ظلم کیا۔ مغل حکمرانوں پر دیگر عقائد کے تئیں عدم رواداری کا الزام لگایا گیا۔ متعدد مشہور مورخین کا کہنا ہے کہ اس طرح کے الزامات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد بابر نے رکھی تھی۔ بابر پر الزام ہے کہ اس نے ایودھیا میں بھگوان سری رام کے مندر کو تباہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن کئی سرکردہ مورخین اس الزام کو قبول نہیں کرتے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بابر کے رویہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہرگز مذہبی جنونی نہیں تھا۔ مثال کے طور پر، ایک بار بابر نے گوالیار قلعہ کے قریب جین کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔ اس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ 'بتوں کے ستر والے حصے کو ڈھانپے بغیر انہیں بالکل برہنہ دکھایا گیا تھا...

ویسے یہ کوئی بری جگہ نہیں ہے... بت اس جگہ کا عیب تھے۔ میں نے، اپنی جانب سے انہیں تباہ کرنے کا حکم دیا۔' کیا اس بات کی بابر کے مذہب کے تناظر میں وضاحت کی جاسکتی ہے؟ مورخ ابراہم ایرالی لکھتا ہے کہ بابر نے قریبی ہندو مندروں کا بھی دورہ کیا۔ لیکن اس نے مندروں میں موجود مورتیوں کو تباہ کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ایرالی کے مطابق، 'یہ بابر کے مذہبی جذبات نہیں بلکہ اس کی جمالیاتی حساسیت تھی جو جینی مجسموں سے مجروح ہوئی۔' اب بات بالکل واضح ہوگئی ہوگی۔ مزید برآں، ہمایوں کے نام بابر کی درج ذیل وصیت، بابر کی ہندوستانی عوام اور ان کی ثقافت کے تئیں فکر مندی اور احترام کی بہترین عکاس ہے:

> بیٹا! اس ملکِ ہندوستان کے مختلف مذاہب ہیں۔ اللہ کا شکر مناؤ کہ اس نے ہمیں یہ بادشاہت دی ہے۔ ہمیں اپنے دل سے تمام اختلافات کو نکال دینا چاہیے اور ہر برادری کے ساتھ اس کے رسم ورواج کے مطابق انصاف کرنا چاہیے۔ اس سرزمین کے لوگوں کے دل جیتنے اور انتظامیہ کے معاملات میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے گاؤکشی سے پرہیز کیا جائے۔ ہماری حکومت کی حدود میں آنے والی عبادت گاہوں اور مندروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ حکمرانی کا ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس کے تحت مملکت کے تمام لوگ بادشاہ سے خوش ہوں اور بادشاہ عوام سے خوش ہو۔ اسلام نیک اعمال سے ترقی کر سکتا ہے نہ کہ دہشت گردی سے۔ شیعہ اور سنی کے اختلافات کو نظر انداز کرو کیونکہ یہ اسلام کی کمزوری ہے۔ مختلف رسم ورواج کی پیروی کرنے والے لوگوں کو یکجا کرکے رکھو تاکہ اس مملکت کے جسم کا کوئی حصہ بیمار نہ ہو۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بابر اور اس کا بیٹا ہمایوں دونوں آزاد خیال سوچ کے حامل تھے، اپنی مختصر حکمرانی کی وجہ سے وہ ایک مضبوط مذہبی پالیسی تیار نہیں کر سکے۔ یہ بابر کا پوتا اکبر تھا جس کی قسمت میں ایسا کرنا لکھا تھا۔ اکبر اپنے دورِ حکومت کے آغاز سے ہی کھلے ذہن کا انسان تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے سیکولر خیالات 1580 کے آس پاس واضح طور پر سامنے آئے۔ اکبر کا دوسرے مذاہب اور اپنے مذہبی عقائد کے تئیں احترام اس قدر مضبوطی سے ہم آہنگ تھا کہ کٹر عبدالقادر بدایونی اور کرسچن جیسوئٹس بھی اسے مسلمان نہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے۔ اکبر چشتی صوفیاء کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ 1560 کی دہائی میں چشتیوں نے اسے ایک آزاد طریقۂ فکر سے متعارف کرایا۔ اکبر خواجہ معین الدین چشتی کا بہت احترام کرتا تھا اور وہ شیخ سلیم چشتی کے بھی بہت قریب تھا جن کے لیے اس نے سیکری میں شاندار آستانہ اور مسجد کے ساتھ ایک وسیع محل تعمیر کروایا۔ اکبر کو بعد میں چشتی صوفیاء نے فنا اور وحدت الوجود کے تصور سے متعارف کروایا۔

اکبر اپنی صلح کل مذہبی پالیسی کے لیے جانا جاتا ہے جس کا مطلب سب کے ساتھ امن وآشتی سے رہنا ہے۔ اکبر نے یہ پالیسی اپنے متنوع عوام کے درمیان رواداری اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے اختیار کی تھی۔ اس نے 1575 میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ قائم کیا۔ ابتدا میں اس نے یہاں پر صرف سنی مسلمانوں کو ہی بحث کے لیے مدعو کیا۔ لیکن 1578 سے، اس نے بین المذاہب مکالمے کی راہ ہموار کرتے ہوئے ہندومت، جین مت، عیسائیت، یہودیت، زرتشتی جیسے مختلف مذاہب کے مذہبی علما کو مدعو کیا۔ یہاں اکبر نے مختلف مذہبی نقاط نظر کا گہرا فہم حاصل کیا۔ اکبر بعض علما کے رویے سے بہت مایوس ہوگیا تھا جو ہمیشہ مذہبی مسائل پر جھگڑتے رہتے تھے۔ اکبر نے ایک 'معصوم

عن الخطا حکم نامہ' جاری کیا اور خود کو مجدد قرار دے دیا۔ اس حکم نامے نے مذہبی قانون کی تشریح اور اطلاق کے تمام اختیارات علمائے کرام کے ہاتھوں سے چھین کر بادشاہ کو منتقل کر دیے۔ پروفیسر عزیز احمد کے بقول یہ فرمان قرآن پاک کے اصول اور سنت نبوی پر مبنی تھا۔ یہ اجتہاد کے اسلامی اصول کے مطابق انفرادی استنباط پر مبنی تھا۔ اس حکم نامے میں اعلان کیا گیا کہ بادشاہ کا حکم سب پر لازم ہوگا بشرطیکہ اس سے قرآن کریم کی کسی آیت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ بعض علماء کی رائے تھی کہ اکبر کے فرمان کا مقصد علمائے کرام کی طاقت پر لگام لگانا تھا۔

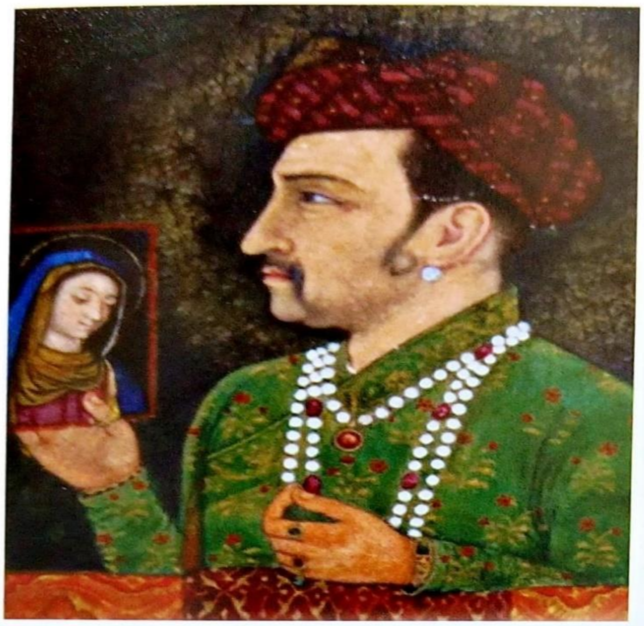

National Museum, New Delhi / Wikimedia Commons

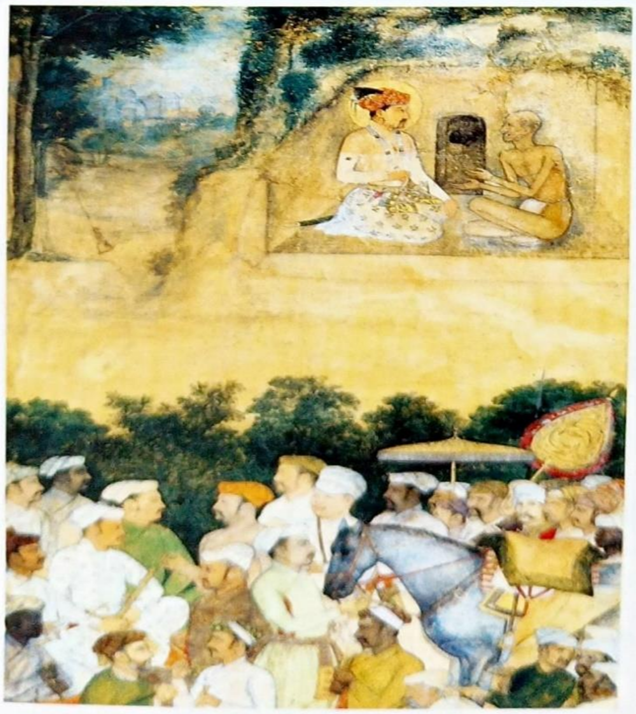

Musée Guimet, Paris / Wikimedia Commons

Top: Jahangir holding a picture of the Madonna, c. 1620. This is one of the best-known portraits of Jahangir, whose court was replete with paintings of Hindu deities and Christian iconography. European visitors, accustomed to sectarian strife back home, were amazed by Jahangir's eclecticism and the religious freedom of his empire.

Bottom: Jahangir converses with Jadrup Gosain, c. 1620. Jahangir met the Hindu ascetic Jadrup when passing through Ujjain on his way to spur Khurram's first campaign in the Deccan. He went to the ascetic's cave twice and for three hours each time. The ascetic appears many times in Jahangir's memoirs thereafter, often because the emperor had a 'great yearning' or 'another overwhelming desire' to meet him. Jahangir always returned from these conversations strangely elated. 'Without exaggeration,' he once wrote, 'it was hard for me to part from him.'

Source: Parvati Sharma, *Jahangir: An Intimate Portrait of a Great Mughal*, Juggernaut, New Delhi, 2018.

1581 میں، اکبر نے اپنے نئے دین، دینِ الٰہی کا اعلان کیا جس نے تعقل کو مذہب کے فہم کی بنیاد بنایا۔ اس کے تحت دھوکہ دہی، بہتان، ظلم، ڈرانے دھمکانے، شہوت پرستی، حرص وہوس اور غبن ممنوع تھے۔ یہ تمام احکام اسلام اور دیگر مذاہب میں مشترک تھے۔ اکبر نے اس فہرست میں جینوں کے اس عقیدہ کو بھی شامل کیا جس کے تحت وہ کسی جاندار کو ہلاک نہیں کرتے تھے اور انتہائی تجرد (celibacy) کے عیسائی تصور کو بھی شامل کیا۔ اس میں پروہتوں یا پجاریوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پروفیسر عزیز احمد استدلال کرتے ہیں کہ 'نہ تو روشنی، سورج اور آگ کے ساتھ وابستگی اور نہ ہی اس کے عبادات یا رسوم کے اصولوں میں کوئی ایسی چیز تھی جو دینِ الٰہی کو اسلام میں موجود دیگر متفرق بدعتوں سے مختلف زمرے میں رکھ سکتی تھی۔' اس مذہبی تجربے پر اکبر کو ان کے بہت سے ہم عصروں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر تھا اور وہ انہیں اپنے خاطر اختیار کرنے سے نہیں ہچکچایا۔ مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ راجپوت شہزادیوں سے شادیوں نے اکبر کی شخصیت کو بہت متاثر کیا۔ ابوالفضل کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ اکبر گھر میں اور سفر کے دوران دونوں جگہ گنگا کا پانی پیتا تھا۔ آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندو گنگا کے پانی کو مقدس مانتے ہیں۔ نسرین لکھتی ہیں کہ 'یہ پانی اس کے لیے مہربند برتنوں میں لایا جاتا تھا۔ بارش کے پانی یا جمنا یا چناب کے پانی میں کھانا پکایا جا سکتا تھا لیکن اس میں گنگا کا تھوڑا سا پانی ضرور ملایا جاتا'۔ بلاشبہ، اکبر ہندو ثقافتوں کی چکاچوند سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کو بہتر طور پر سمجھنے اور فارسی بولنے والی دنیا میں اس کی تفہیم کو مقبول بنانے کے لیے، اکبر نے 1573 میں 'مکتب خانہ' (ترجمہ بیورو) قائم کیا۔ اس کے زمانے میں بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنگھاسن بتیسی (نامہ خردافزا)، اتھرو وید (اتھربن)، مہابھارت (رزم نامہ)، رامائن، ہری ونش پران (ہری بن)، لیلاوتی (بھاسکراچاریہ کی 1150 میں لکھی گئی ریاضی کی تصنیف)، تاجک انیل کنتھی (تاجک: فلکیات پر ایک تصنیف)، راج ترنگنی (کلہن کی تصنیف کردہ کشمیر کی تاریخ)، پنچ تنتر (جانوروں کی کہانیوں کے توسط سے حکمت کے اسباق) وغیرہ ان میں سے چند تصنیفات تھیں جن کا ترجمہ کیا گیا۔ ابوالفضل کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستانی ثقافت کا مطالعہ نہیں کیا کیونکہ انہیں وراثت میں ملی روایت نے آزادی سے چھان بین کی اجازت نہیں دی۔ 'کیوں' اور 'کس طرح' یہ پوچھنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں تعقل واستدلال کے دروازے دوبارہ کھل گئے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

اکبر کے جانشینوں، جہانگیر اور شاہ جہاں نے اکبر کی مذہبی ہم آہنگی کی پالیسی کو جاری رکھا۔ جہانگیر مذہب کے معاملے میں بھی، اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اس نے اکبر کی 'صلح کل' کی پالیسی میں 'انصاف' کا عنصر شامل کیا۔ اس نے ایک زنجیرِ عدل نصب کرنے کا حکم دیا جو کہ خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے مذہبی عقائد اور عادات اس کے والد کے مشابہ تھے اور اس حقیقت کو ان کے زمانے کے عیسائی مشنریوں نے پوری طرح تسلیم کیا اور انہیں ریکارڈ کیا۔ فادر رڈولفو ایکواویوا (Ridolfo Aquawiva) جہانگیر کے ذاتی دوست تھے۔ اسلامی تہواروں اور فارسی نوروز کے ساتھ ساتھ، اس نے کئی ہندو تہوار منائے جیسے ہولی، دسہرہ، دیوالی، رکشا بندھن (راکھی) اور شیوارتری۔ شیوارتری کے موقع پر، وہ ہندو یوگیوں کے ساتھ بات چیت کرتا اور دسہرہ کے تہوار کے دوران گھوڑوں کو سجایا جاتا اور ان کی پریڈ کروائی جاتی۔ برہمن اس کی کلائیوں پر راکھی باندھتے تھے۔ وہ اس قدر وسیع النظر تھا کہ ایک بار جب راکھی اور شب برات دونوں ایک ہی دن آئے تو بے حد

خوش جہانگیر نے اس دن کو مبارک شنبہ (خوش قسمتی کا دن) قرار دیا۔ اپنے والد ہی کی طرح، جہانگیر نے سرکاری تقرریوں کے معاملے میں ہندوؤں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کیا گیا۔ مسلمان افسروں کو ہندوؤں کو زبردستی اسلام قبول کروانے سے منع کیا گیا تھا۔ جہانگیر کو ہندو یوگی، جدروپ گوسائیں سے بہت عقیدت تھی، جسے اس نے پہلے 1616 میں اجین میں اور بعد میں متھرا میں دیکھا۔ اس نے کبھی یوگی کو اپنے پاس نہیں بلایا بلکہ خود ان سے ملنے جاتا تھا، جو کہ یوگی کے تعظیم کی ایک بڑی علامت تھی۔ جہانگیر جدروپ گوسائیں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کو، اکتساب کے بہترین مواقع اور خوش نصیبی اور خالص خوشی کے مواقع سمجھتا تھا۔ غیر معمولی مذہبی طرز عمل کے ان تمام شاندار ریکارڈوں کے باوجود، جہانگیر کے دامن پر ایک انمٹ داغ پڑ ہی گیا اور یہ داغ سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن سنگھ کا قتل تھا۔ جب اس کے بیٹے خسرو نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تو گرو نے اسے آشیرواد دیا۔ اس عمل سے مشتعل ہو کر جہانگیر نے گرو کے قتل کا فرمان جاری کیا۔ فرحت نسرین بتاتی ہیں کہ 'جہانگیر کے لیے مسئلہ مذہب کا نہیں، بغاوت کا تھا۔' تاہم، افسوسناک بات یہ ہے کہ سیاسی غنڈہ گردی اور تشدد کی کارروائیوں کو اکثر مذہبی رنگ دیا جاتا ہے، اور یہ رنگ پھیکا ہی نہیں پڑ رہا ہے بلکہ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم، مذہبی وسیع النظری کے لحاظ سے، مغل دور کی سب سے نمایاں شخصیت دارا شکوہ کی تھی۔ وہ اتنا آزاد خیال مذہبی شخص تھا کہ اس پر مرتد ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس کے بھائی اورنگزیب نے اسے قتل کر دیا۔ دارا، اکبر سے کیسے الگ تھا؟ فارسی بولنے والی دنیا کو ہندو فلسفے سے واقف کروانے کے لیے، اکبر نے ہندو مذہبی متون کے مطالعہ کا کام شروع کروایا، جب کہ دارا نے خود اس کام کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجے میں متعدد فلسفیانہ تصنیفات تیار ہوئیں جو اس کے 'صوفیانہ اور سیکولر رجحانات' کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس نے 'سفینۃ الاولیا'، 'سکینۃ الاولیا'، 'رسالہ حق نما'، 'حسنات العارفین'، 'مجمع البحرین'، 'سرّ اکبر' وغیرہ کتابیں لکھیں۔ مؤخر الذکر اُپنِشد کے تقریباً پچاس ابواب کا ترجمہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ دارا کے مطابق ہندومت نے توحید کی نفی نہیں کی۔ وہ اس خیال کا حامی تھا کہ اسلام اور ہندومت دو متوازی خطوط ہیں۔ مورخ فرحت نسرین کہتی ہیں کہ 'اس کی تصنیفات کو پڑھنے سے واضح طور پر عقائد کے تمام نظاموں کے لیے اس کا احترام ظاہر ہوتا ہے۔ دارا شاید ایک ایسی سلطنت کے لیے ایک مثالی بادشاہ تھا جو مذہب، زبان اور ثقافت کے تنوع سے بھری ہوئی تھی۔' اپنے مضمون 'Socio-Cultural Interactions in India: Does Contemporary India Disrespect Its Past?' میں پروفیسر عبدالرحیم پی۔ وجاپور دارا شکوہ کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> اس کلاسیکی تصنیف [مجمع البحرین] میں دارا شکوہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندو رہبانیت اور صوفی مسلک کے دقیق عناصر کو دونوں مذاہب کے بہترین لوگوں کے ذریعے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے اسلامی صوفی نظریات کا ہندو رہبانیت کے نظریات کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ 'وہ ایک دوسرے کے مماثل ہیں'۔ مذہب سے متعلق اپنی گفتگو کے دوران دارا نے حریت پسندی کی روح کو عہد وسطی کی ہندوستانی زندگی میں سرایت کرنے کی کوشش کی اور ہندوستانی فکر کے افق کو وسیع کیا۔

تمام مغل حکمرانوں میں اورنگزیب، بالخصوص اپنے سخت گیر سمجھے جانے والے مذہبی عقائد کی بنا پر، سب سے زیادہ متنازعہ شخصیت ہے۔ آپ اس کی تفصیلات اورنگ زیب پر لکھی گئی اکائی میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں ہم مورخ فرحت نسرین کے الفاظ میں اس کی مذہبی پالیسی کا خلاصہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ انہیں کتنا کٹر مذہبی بتایا جاتا ہے یا وہ کتنے کٹر مذہبی تھے۔ انہوں نے سیکولر انداز میں اتنے فیصلے لیے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تخت پر اپنی حیثیت محفوظ ہو جانے کے بعد وہ مذہب کو سیاست کے ساتھ ملانا نہیں چاہتے تھے۔ ان سے اکثر اس بنیاد پر نفرت کی جاتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن جن لوگوں کو انہوں نے انتہائی بے رحمی سے کچلا وہ در حقیقت مسلمان تھے—بالکل ان ہی کی طرح اور ان ہی کے عقیدے کے حامل—ان کا اپنا خون۔ مذہب نے ان کی فوجوں کی راہنمائی نہیں کی۔ ان کے لیے ان گنت غیر مسلموں نے کام کیا اور ان کی فوج میں خدمات انجام دیں۔ جانشینی کی جنگ کے دوران بھی 1000 ہزاری منصب سے اوپر کے راجپوت امرا میں سے 23 اورنگ زیب کی حمایت کر رہے تھے اور 24 دارا کی حمایت میں تھے۔...اورنگ زیب نے زور دے کر کہا کہ وہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے بادشاہ ہیں، اور انہوں نے دونوں کے لیے یکساں طور پر کام کیا۔ ایک ہندو نجومی ایشور داس نے 1663 میں سنسکرت میں لکھا کہ اورنگ زیب دھرمیہ (صالح) تھے اور ان کی پالیسیاں وِود ھیوت (قانونی) تھیں۔

15.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کے لوگوں کی مذہبی اور روحانی زندگی کو سمجھ چکے ہوں گے۔ آپ عہد وسطیٰ کے ہندوستانیوں کے سماجی مذہبی اور ثقافتی ماحول کو مالا مال کرنے میں بھکتی اور صوفی تحریکات کی متعدد حصہ داریوں کو جان چکے ہونگے۔ آپ سکھ مذہب کے ابھرنے اور سکھ مذہب کے بانی گرونانک کی تعلیمات سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ آپ مغل حکمرانوں کے مذہبی افکار اور اعمال کو سمجھ چکے ہوں گے جن کے ان کی سیاست اور اسی طرح وسیع سماج پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس اکائی نے آپ کو یہ سمجھنے کے لائق بنا دیا ہوگا کہ عہد وسطیٰ کا ہندوستانی سماج ایک فرقہ وارانہ سماج نہیں تھا جیسا کہ غلط طور پر متعدد لوگ محسوس کرتے ہیں۔ آپ اس بات کا اعتراف کر پائیں گے کہ مذہبی منافرت پر مبنی ایک فرقہ وارانہ سماج ہونے کے برعکس عہد وسطیٰ کا ہندوستانی سماج مشترکہ مذہبی اطوار اور روحانی تجربات کے عناصر سے بھرپور تھا۔

15.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

سگن بھکتی	:	صفات یا شکل کے ساتھ خدا کی عبادت کرنا
نرگن بھکتی	:	بے شکل خدا کی عبادت کرنا
سماع	:	صوفی موسیقی کی محفل

سنگت : تنظیم

15.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کا بانی کون ہے؟
2. نقشبندی سلسلہ کا بانی کون ہے؟
3. شیخ احمد سرہندی کس صوفی سلسلہ سے وابستہ تھے؟
4. مجمع البحرین کس نے لکھی؟
5. ادویت فلسفہ کس نے پیش کیا؟
6. 18ویں صدی کے ہندوستان میں کس صوفی نے کہا کہ لارڈ سری رام اور لارڈ سری کرشن دونوں بھی پیغمبر ہیں؟
7. فتاویٰ عالمگیری کس کے دور میں مرتب ہوئی؟
8. سگن بھکتی اور نرگن بھکتی میں کیا فرق ہے؟
9. کبیر نے کس ذات سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کیا؟
10. جانشینی کی جنگ کے دوران 1000 ہزاری منصب سے اوپر کے کتنے راجپوتوں نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا؟

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ذات پات کے نظام کے حوالے سے بھکتی نظریہ پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. بھکتی تحریک میں نام دیو کے کردار پر ایک نوٹ لکھیں۔
3. عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں پروان چڑھنے والی جامع ثقافتی اقدار پر ایک نوٹ لکھیں۔
4. نقشبندی صوفی سلسلہ پر ایک نوٹ لکھیں۔
5. دارا شکوہ پر ایک نوٹ لکھیں۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

- ہندوستانی مغل حکمرانوں کے مذہبی نظریات اور اعمال پر ایک مضمون لکھیں۔
- عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سماجی اور روحانی زندگی کی جمہوریت سازی میں مختلف بھکتی سنتوں کے کردار کا جائزہ لیں۔
- کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ فرقہ واریت کا ذمہ دار مذہب ہی ہے؟ اگر، ہاں/نہیں، تو کیوں اور کیسے؟

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmad, Aziz, *Studies in Islamic Culture in the Indian Environment*, Oxford University Press, 2000. (Reprint)
2. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State, 1526 – 1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1998).
3. Alam, Muzafar, *The Mughals and the Sufis: Islam and Political Imagination in India 1500-1750*, Permanent Black in association with Ashoka University, Ranikhet, 2022.
4. Asher, Catherine B., and Cynthia Talbot, *India before Europe*, Cambridge University Press, 2006.
5. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity*, *Ideas*, *Society*, *and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. 2006)
6. Bhargava, Meena, *Understanding Mughal India: Sixteenth to Eighteenth Centuries*, Orient BalckSwan, New Delhi, 2020.
7. Chand, Tara, *Influence of Islam on Indian Culture*, LG Publishers, New Delhi, 2018 (First published 1963)
8. Champakalashmi, R., *Religion, Tradition and Ideology: Pre-Colonial South India*, Oxford University Press, New Delhi, 2011.
9. Chandra, Satish, *Essays on Medieval Indian History*, Oxford University Press, New Delhi, 2003.
10. ____________, Medieval India: From Sultanat to the Mughals, Mughal Empire (1526-1748), Haranand Publications, 2004.
11. Eaton, Richard M., *India in the Persianate Age* (*1000 – 1765*), Penguin Books, New Delhi, 2020.
12. Eraly, Abraham, *Emperors of the Peacock Throne*: *The Saga of the Great Mughals*, Penguin Books, New Delhi, 2000.
13. Gascoigne, Bamber, *A Brief History of the Great Mughals*, *India's Most Flamboyant Rulers*, Robinson, London, 2002.
14. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. 1997).
15. __________, *Medieval India: The Study of a Civilization*, National Book Trust, New Delhi, 2008.
16. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. II.* (*1526 – 1707*): *Mughal Empire*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1996 (first pub. 1981).
17. Mukhia, Harbans, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2005.
18. Mukhoty, Ira, *Akbar*: *The Great Mughal*, Aleph, New Delhi, 2020.
19. Nasreen, Farhat, *The Great Mughals*, Rupa, New Delhi, 2021.
20. Pande, Rekha, 'The Bhakti Movement: An Interpretation', *Proceedings of the Indian History Congress*, 1987, pp. 214-221.
21. Pollock, Sheldon ed., *Literary Cultures in History: Reconstruction from South Asia*, University of California Press, Berkeley, 2003.
22. Puniyani, Ram, *Communal Politics: Facts versus Myths*, Sage, New Delhi, 2003.
23. Sharma, Manimugdha S., *Allahu Akbar*: *Understanding the Great Mughal in Today's India*, Bllomsbury, New Delhi, 2019.
24. Thapar, Romila, *The Penguin History of Early India: From the Origins to AD 1300*, Penguin Books, New Delhi, 2002.
25. ____________, 'Imagined Religious Communities? Ancient History and the Modern Search for a Hindu Identity', *Modern Asian Studies* 23, No. 2, (Fall: 1989): 209-231.
26. Truschke, Audrey, *Culture of Encounters: Sanskrit in the Mughal Court*, Penguin Books, 2016.
27. Vijapur, Abdulrahim P., 'Socio-Cultural Interactions in India: Does Contemporary India Disrespect Its Past?', *Ars Artium*: *An International Refereed Research Journal of English Studies and Culture*, Vol.11, January 2023, pp. 122-142.

اکائی 16۔زرعی معیشت

(Agricultural Economy)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 زراعت کی وسعت
16.3 کاشت اور آبپاشی کے ذرائع
16.3.1 کاشتکاری کے ذائع اور طریقہ کار
16.3.2 آبپاشی کے ذرائع
16.4 زرعی پیداوار
16.4.1 غزائی فصلیں
16.4.2 نقد فصلیں
16.4.3 پھل،زسبزیاں اور مصالے
16.4.4 پیداواری صلاحیت اور پیداوار
16.5 پالتو مویشی
16.6 خلاصہ
16.7 کلیدی الفاظ
16.8 نمونہ امتحانی سوالات
16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان ایک وسیع و عریض زمینی علاقے میں پھیلا ہوا ہے جو نہ صرف مختلف نسل، مذاہب اور ثقافت کے لوگوں کا مسکن ہے بلکہ اس میں مختلف موسم اور حلقیں بھی ہیں۔ اس ملک کی پوری تاریخ زراعت کے اہم پیداوری سرگرمیوں سے بھری پڑی ہے۔ مغل دور میں زمین کا ایک بڑا حصہ کھیتی کے ماتحت تھا۔ اس عہد کے ہندوستانی، بیرونی مصنفین اور سیاحوں نے اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں ہندوستانی مٹی کی زرخیزی کی جابجا تعریف کیا ہے۔ اس اکائی میں، زرعی معیشت سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی جس میں کاشتکاری کی حد یعنی جتنی زمینٹیں جوتی جاتی تھیں وہ بھی شامل ہیں۔ دور وسطی کے ہندوستان میں مختلف قسم کی غذائی فصلیں، پھل، سبزیاں اور نقد فصلوں کی کھیتی کی توسیع پر بھی بات کی جائے گی۔ اس کے علاوہ، ہم کاشت کے مختلف طریقوں کے ساتھ ساتھ کاشتکاری اور کھیتوں کی آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے آلات پر بھی بحث کریں گے۔ مغل سلطنت کے زیر تسلط علاقے میں زرعی معیشت پر زور دیتے ہوئے اس کی سرحد سے باہر کے علاقوں پر گفتگو کرنا بھی اس اکائی کا حصہ ہے

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغل ہندوستان میں ہونے والی زرعی پیداوار کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغلیہ عہد میں زرعی پیداوار کی وسعت کو سمجھ سکیں گے۔
- زرعی پیداوار کے طریقہ کار اور سینچائی کے ذرائع کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اس زمانے کے اہم فصلوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مویشیوں اور مویشیوں کی افزائش کے بارے میں بھی کچھ اندازہ لگا سکیں گے۔

16.2 زراعت کی وسعت (Expansion of Agriculture)

مغل عہد میں کاشت کے ماتحت کتنا رقبہ تھا یا کتنی زمینوں پر کھیتی کی جاتی تھی، اس تعلق سے اعداد و شمار کے عدم موجودگی میں اسکا صحیح علم ہونا کافی مشکل ہے۔ پھر بھی دستیاب اعداد و شمار سے مغل دور میں قابل کاشت زمین کے رقبے کا اندازہ لگانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ابوالفضل نے پنی کتاب آئین اکبری میں بنگال، ٹھٹا اور کشمیر کے علاوہ تقریباً شمالی ہندوستان کے تمام صوبوں کے رقبے کے اعداد و شمار دیا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر صوبے جیسے دہلی، آگرہ، اودھ، لاہور، ملتان، الہ آباد اور اجمیر میں کچھ استثناء کے ساتھ تقریباً ہر صوبے کے پرگنہ کا الگ الگ اعداد و شمار دیا ہے۔ اعداد و شمار کے متعلق کچھ معلومات تو آئین اکبری کے اعداد و شمار سے ہوتا ہے، لیکن آئین اکبری میں درج اعداد و شمار کا تعلق سال 1595ء سے ہے اسی لیے پورا علم نہیں ہوتا۔ حالانکہ کے مختلف خطوں کے رقبے کے اعداد و شمار کا علم سترہویں صدی کے رقبے کے اعداد و شمار سے ہوتا ہے جو 1686ء کے دفتر اندراجات میں دستیاب ہے۔ اسی اعداد و شمار کو چندر بھان کی تاریخی کتاب، چہار گلشن (1739-40)

میں دوبارہ پیش کیا گیا ہے۔اس دستور العمل سے ہر صوبے کے مساحت کردہ رقبہ کے اعداد و شمار علم ہوتا ہے۔ ہر صوبے کے دیہاتوں (گاؤں) کے کل تعداد کے ساتھ ساتھ مساحت شدہ اور غیر مساحت شدہ دیہاتوں کا بھی ذکر ہے۔پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آئیں اکبری میں زیادہ تر پرگنہ کے رقبے کا اعداد و شمار دیا گیا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن پرگنوں کی کس حد تک صحیح مساحت کی گئی تھی۔ حالانکہ بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے کا دستیاب اعداد و شمار کا مجموعہ اس بارے میں ایک بہتر تصویر پیش کرتا ہے۔اس اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1686ء تک تقریباً پچاس فیصد گاؤں کی پیائش نہیں کی گئی تھی۔اورنگزیب کے دور حکومت کے اعداد و شمار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آئین اکبری میں دیے گئے رقبے کے مقابلہ سترہویں صدی کی پیائش کردہ رقبے میں اضافہ ہوا۔لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ پیائش کردہ رقبے میں اضافہ کی وجہ کاشت میں توسیع تھی۔یہ اضافہ پیائش کردہ رقبے میں پہلے کے کچھ غیر پیائش علاقے کو شامل کرنے کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔مورخین کے درمیان ایک بحث یہ ہے کہ اس دور کے اعداد و شمار دراصل کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے۔کیا یہ اعداد و شمار اصل میں زیر فصل رقبے کے ہیں، یا پیائش کردہ رقبے کے۔ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ (W. H. Moreland) کا خیال ہے کہ یہ اعداد و شمار کل فصلی رقبہ یعنی جس زمین پر فصل اگائی جاتی تھی کی نمائندگی کرتا ہے۔

عرفان حبیب کا خیال ہے کہ اس اعداد و شمار میں قابل کاشت رقبہ جس میں کوئی فصل بوئی نہیں جاتی تھی کے علاوہ رہائشی علاقے، جھیل، حوض اور جنگلات وغیرہ بھی شامل تھے۔ شیرین موسوی عرفان حبیب سے اتفاق کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ قابل کاشت بیکار زمین بھی پیائش کردہ رقبے کا دس فیصد شامل تھی۔ لیکن وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اس دس فیصد کو کم کرنے کے بعد بھی باقی رقبہ کو خالص فصل شدہ رقبہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کاشت شدہ رقبہ کے بڑے حصے کی پیائش نہیں کی گئی تھی۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کئی مرتبہ خریف اور ربیع کی فصلوں کے ماتحت زمینوں کی الگ الگ پیائش کی گئی اور دونوں کو شامل کرنے کے بعد اسے پیائش شدہ رقبے کے طور پر درج کر دیا گیا۔ایسی صورت میں صرف مغلیہ دور کے پیائشی اعداد و شمار ہی کاشت کی حد یا وسعت کو معلوم کرنے میں زیادہ مددگار نہیں ہیں۔اس عہد میں زراعت کی وسعت کی علم کے لیے عرفان حبیب اور شیرین موسوی نے دیگر دستیاب شدہ اعداد و شمار کی بھی مدد لی ہے، مثلاً کچھ ریوینیو دستاویز جس میں کچھ علاقوں کے تفصیلی اعداد و شمار، جمع کے اعداد و شمار اور دستور کے نرخ وغیرہ دیے گئے ہیں۔ان کا موازنہ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اصل کاشت شدہ رقبے کے اعداد و شمار سے کیا ہے۔انکا یہ خیال ہے کہ سولہویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان کاشت شدہ رقبہ تقریباً دوگنا ہو گیا تھا۔ بہار، اودھ اور بنگال کے کچھ حصوں میں کاشت شدہ رقبے میں اضافہ کا بڑا سبب جنگلات کی صفائی تھی۔ جبکہ پنجاب اور سندھ جیسے علاقوں میں نہروں کے پھیلاؤ کاشت کی توسیع کی اہم وجہ تھی۔

16.3 کاشت اور آبپاشی کے ذرائع (Agriculture, and the Means of Irrigation)

زراعت کے تعلق سے ہندوستانی زراعت کی کچھ اہم خصوصیات ہیں۔ مغل عہد میں ہندوستانی کسان مٹی کی نوعیت اور فصلوں کی ضرورت کے لحاظ سے کھیتی کے لیے مختلف قسم کے آلات اور طریقہ کار کا استعمال کرتے تھے۔اسی طرح مختلف علاقوں میں آبپاشی کے لیے

مختلف ذرائع رائج تھے۔

16.3.1 کاشتکاری کے ذرائع اور طریقہ کار (Means and Methods of Cultivation)

اس عہد میں ہل اور بیل کا زراعتی معاملات میں ایک اہم کردار تھا۔ ہل اور بیلوں کے جوڑے کو استعمال کر کے کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ لوہے کی پھالی لکڑی کے ہل کے ساتھ جوڑ کر مکمل ہل بنایا جاتا تھا۔ یوروپ میں استعمال ہونے والے طریقہ کار کے برعکس ہندوستان میں نہ تو گھوڑا اور نہ ہی بیل کے ذریعہ کھینچے جانے والے پہیوں والا ہل اور نہ ہی مڑا ہوا بورڈ کا استعمال ہوتا تھا۔ علاقائی تغیرات کے ساتھ ساتھ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں ہلکے ہل سے لیکر جسے بآسانی کسان اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتا تھا سخت مٹی کو توڑنے کے لیے وزنی لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ نرم مٹی کے لیے لوہے کے ہل یا ہل کی پھالی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ حالانکہ کسانوں کے لیے لوہے والا ہل زیادہ مہنگا پڑتا تھا۔ کچھ ہمعصر یوروپی سیاحوں نے حیرت انگیز انداز میں ہندوستانی ہل کی خاصیت کا ذکر کیا ہے۔ انکے بیان کے مطابق ہندوستانی ہل نے صرف مٹی کا رخ کیا اور یہ کہ یہاں گہری کھدائی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا عمل یا طریقہ کار ہندوستانی ماحولیات کے مطابق تھا کیونکہ گہری کھدائی کی وجہ سے مٹی کی نمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صرف مٹی کا اوپری حصہ ہی زرخیز ہوتا تھا۔ جبکہ کھیت میں مٹی کی گانٹھوں اور ڈھیروں کو توڑنے کے لیے آلائی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں میں لکڑی کے تختوں کی مدد سے کیا جاتا تھا، جسے ٹیپلا کہا جاتا تھا۔ ٹیپلا کو بیلوں کے ذریعہ اس لکڑی کے پٹیلے کو میں کھینچا جاتا تھا۔ عام طور سے بیجوں کو ہاتھ سے بکھیر کر بویا جاتا تھا۔ حالانکہ سولہویں صدی میں باربوسا نے دھان کی بوائی کے لیے بیج بونے والا ایک آلے کا ذکر کیا ہے، جسکا استعمال ساحلی علاقوں میں کیا جاتا تھا۔

زمین کی زرخیزی بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لیے مختلف مصنوعی طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ کھاد کے طور پر جنوبی ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ استعمال ہوتے تھے۔ عام طور سے ان مویشیوں کے ریوڑ کو کھیتوں میں چند راتیں باندھے جاتے تھے تاکہ ملبہ جمع ہو سکے، اس کے گودے کو بہترین کھاد سمجھا جاتا تھا۔ ایسا بھی مانا جاتا تھا کہ اگر ایک ایک ہزار مویشیوں کا ریوڑ ایک کنی زمیں (1-132 یکڑ) میں پانچ یا چھ راتیں باندھ دیا جائے تو یہ عمل اس زمین کو چھ سے سات سالوں تک زرخیز رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر شمالی ہندوستان میں رائج تھا۔ حالانکہ ساحلی علاقوں میں مچھلی کا کھاد بھی استعمال ہوتا تھا۔ کھیت کی زرخیزی بڑھانے کے لیے اس کے علاوہ فصلوآ کی گردش کا طریقہ بھی زمین پر پورے سال کھیتی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ مٹی کی پیداوری صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی کسانوں نے اپنے اجداد سے نسل در نسل اچھی کھیتی کے لیے فصلوں کی گردش کے طریقہ سے متعلق معلومات حاصل کر لیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کی زمین کی بہتر پیداوار کے لیے کس خاص فصل کو دوسری فصل سے بدلنا ہے۔

فصل کاٹنے کے لیے نیم دائرہ نما آلہ جسے درانتی کہا جاتا تھا، کا استعمال ہوتا تھا۔ بھوسا الگ کرنے کے لیے کٹی ہوئی فصلوں کو زمین پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ اس عہد کے ہمعصر ماخذ میں بھوسا الگ کرنے کے لیے دو طریقوں کے حوالے ملتے ہیں۔ پہلے طریقے میں فصل کو لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا، تاکہ اناج الگ ہو جائے جبکہ دوسرے طریقے میں پھیلی ہوئی فصل پر جانوروں کو چلایا جاتا تھا جس میں جانوروں کے وزن اور نقل و

حرکت سے اناج الگ ہو جاتا تھا۔ دوبارہ اناج کو ٹوکریوں میں رکھ کر آہستہ آہستہ پھینکا جاتا تھا اس عمل میں ہوا کی وجہ سے بھوسا اڑ جاتا تھا اور خالص اناج زمین پر گر جاتا تھا۔

16.3.2 آبپاشی کے ذرائع (Sources of Irrigation)

ہندوستانی زراعت آبپاشی کے لیے زیادہ تر بارش پر منحصر تھی۔ کچھ خاص فصلیں تو ایسے تھیں جنکی بوائی کے انتخاب کی بڑی وجہ کسی خاص علاقہ میں بارش کا پانی کی دستیابی تھی، یعنی جس علاقہ میں بارش کا پانی زیادہ دستیاب تھا انھیں علاقوں میں کچھ خاص فصلیں لاگئی جاتی تھی۔ بارش کے پانی جیسی قدرتی ذریعہ کے علاوہ، مصنوعی آبپاشی کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ حالانکہ کنوؤں سے آبپاشی کا طریقہ پورے ملک میں عام تھا۔ اس زمانے کے دستیاب ٹکنالوجی کے اعتبار سے کنوؤں سے پانی اٹھانے کے لیے مختلف طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں معیاری (اینٹ یا پتھر کے) پکے کنویں اور غیر معیاری (کچے) کنویں دونوں کھودے جاتے تھے۔ کچے کنویں پائدار نہیں ہوتے تھے اور ہر سال کچھ کدائی کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جبکہ پکے کنویں پائدار اور پانی اٹھانے کے بہتر آلات کو مستحکم کرنے کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ پکے کنوؤں میں دیواریں یا چبوترے بنائے جاتے تھے۔ کنویں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور پتھر دونوں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کنوؤں کے اندر سے عام طور سے ٹیراکوٹا کے چھلّے لگائے جاتے تھے جسے انگوٹھی نما کنواں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کنوؤں سے پانی اٹھانے کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ پانی اٹھانے کے مندرجہ ذیل پانچ طریقہ کار عام تھے۔

1. بغیر کسی مشینی مدد کے ہاتھ سے رسّی اور بالٹی کے ذریعہ پانی کھینچنے کا طریقہ سب سے آسان تھا۔ لیکن اپنی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ آلہ بڑے کھیتوں کی سینچائی کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔
2. اس طریقہ میں کنوؤں کے اوپر گھرنی لگا کر رسی اور بالٹی سے پانی اوپر کھینچا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں گھرنی کی مدد سے کم محنت کے ساتھ بڑی مقدار میں کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مذکورہ بالا دونوں طریقہ کار اور آلات گھریلو استعمال میں پانی فراہمی یا چھوٹے کھیتوں کی سینچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔
3. اس طریقہ کار میں بیلوں کے جوڑے اور رسی گھرنی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ میں کار میں جانوروں کی طاقت کے استعمال سے بڑے کھیتوں کی سینچائی میں مدد ملتی تھی۔
4. یہ آلہ بیرمی اصول پر کام کرتا تھا۔ اس طریقہ کار میں ایک لمبی رسی کو ایک سیدھی شہتیر یا درخت کے تنے ایک سرے میں جھولنے کی حالت میں باندھ دیا جاتا تھا۔ بالٹی کو اسی رسّی میں باندھ دیا جاتا تھا، اور کمبھے کے دوسرے سرے پار بالٹی سے زیادہ وزنی چیز جیسے پتھر وغیرہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں آلہ کو چلانے کے لیے ایک شخص کا ہونا ضروری تھا۔
5. اس طریقہ میں پہیے کے استعمال کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طریقہ کار کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ برتنوں کو پہیوں کے کناروں سے جوڑا جاتا تھا۔ اس پہیے کو گھمانے کے لیے حیوانی طاقت کی مدد لی جاتی تھی۔ اس آلے کو اوپری سطح سے پانی اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کنوؤں کے لیے یہ بالکل بے معنی تھا۔ حالانکہ کنویں سے پانی اٹھانے کے لیے پہیے کا بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن تب طریقہ کار اور آلے میں تھوڑی

تبدیلی کی جاتی تھی۔ جسمیں برتنوں کی لڑی سے تین پہیوں، ایک گیئر مکانزم اور جانوروں کی طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔اس آلے اور طریقہ کار کی مدد سے بڑے کھیتوں کی سینچائی کی جاتی تھی کیوں کہ اس میں ایک بڑی مقدار میں پانی فراہم کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ گہرے کنوؤں سے پانی اٹھانے کے لیے مناسب تھا۔ لیکن یہ طریقہ کار کی اپنی پیچیدگی اور جانوروں کی طاقت کے استعمال نے آلہ کو مہنگا بنا دیا تھالٰہٰذا اس کی رسائی کسانوں تک مشکل سے ہی ہو پاتی تھی۔

مندرجہ بالا تمام طریقہ کار اور آلات کے علاوہ ہندوستان کے تمام حصوں میں جھیل، تالاب اور پانی کے ذخائر بھی سینچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ خاص طور سے جنوبی ہندوستان میں، آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والا سب سے زیادہ مروجہ طریقہ تھا۔ یہاں ندیوں پر باندھ (dam) بنائے گئے۔ ایسی آبی ذخائر کی تعمیر انفرادی طور سے کافی مشکل تھی۔ ایسی سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری خاص طور پر مقامی سربراہ، اور مندروں کے انتظامیہ کی تھی۔ اس ضمن میں ایک وسیع و عریض، مڈگ جھیل اس وقت کی فن تعمیر کی اہم مثال ہے جیسا کہ وجے نگر کے حکمرانوں نے تعمیر کی تھی۔ یہ تین زمینی پشتوں کے ساتھ سنگھ راندی پر بنایا گیا تھا۔ تاکہ پہاڑیوں کے خلا کو پر کی جا سکے۔ جب بھر گیا تو یہ جھیل دس سے پندرہ میل لمبی تھی۔ تینوں پشتوں میں سے ہر ایک پر تراشے ہوئے پتھروں کے بڑے بڑے سلیبوں سے بنے ہوئے سلائس تھے۔ راجستھان ہندوستان کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں پانی کو جمع کرنے کے لیے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ سولہویں صدی کے مؤرخ ابوالفضل کے مطابق میواڑ کے ڈھیبر جھیل کا احاطہ تقریباً چھتّیس میل ہے۔ اُدیا گر جھیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا احاطہ بارہ میل ہے۔ اس خطہ میں راجسمند اور جیسمند وغیرہ دوسری اہم جھیلیں تھیں جسے سترہویں صدی میں بنائی گئی تھی۔ اسی طرح کے ذخائر جیسے مارواڑ میں اور بالسن آمبیرم کے علاقوں میں باندھ کی مدد سے بنائے گئے تھے۔

اسی طرح گاؤں کے تقریباً ہر جھرمٹ میں چھوٹے چھوٹے آبی ذخائر اور جھیلیں تھیں جہاں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ ہمعصر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1650 کے دہائی میں مغل سلطنت کے انتظامیہ نے کھیتوں کی سینچائی کے لیے خاندیش اور بیرار کے علاقوں میں باندھ بنانے کے لیے کاشتکاروں کو چالیس سے پچاس ہزار روپیہ دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ بھی کافی دلچسپ ہے کہ خاندیش میں اس طرح کے چھوٹے باندھوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جو اب بھی استعمال میں ہے، اور وہ تمام اس علاقے کے پانچ بڑی ندیوں جیسے موسم، گرنا، کین پنجبرا اور شیبون کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں نہریں سینچائی کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔ دور وسطی میں نہروں کی تعمیر کا سلسلہ تغلق خاندان کے دور حکومت نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ یہی سلسلہ مغل عہد میں بھی جاری رہا۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور حکومت میں نہر فیض کی تعمیر ہوئی تھی جسکی لمبائی تقریباً ایک سَو پچاس میل تھی یہ جمنا ندی سے پانی کو ایک بڑے علاقے تک لے جاتا تھا۔ ایک اور نہر تقریباً سَو میل لمبی تھی جو لاہور کے قریب راوی ندی سے کاٹی گئی تھی۔ اسی طرح پورے سندھ کے ڈیلٹائی علاقے میں متعدد نہروں کے باقیات ملتے ہیں۔ مؤرخ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ مغل نہروں کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ زیادہ تر ادر گرد کے میدانوں سے اوپر نہیں بہتی تھیں۔ اس لیے ان نہروں سے جو پانی ملتا تھا وہ ان سے اٹھانے تک محدود تھا۔ ان علاقوں میں نہروں کے جال کا سلسلہ جاری رہا۔ جبکہ جنوبی ہندوستان میں نہروں کی تعمیر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے، کیوں کہ ان کا غلبہ صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود تھا۔

16.4 زرعی پیداوار (Agricultural Production)

ہندوستان ایک وسیع و عریض زمینی رقبہ ہے جہاں نہ صرف مختلف قسم کی نسلوں، مذاہب کے ماننے والوں کا گھر ہے بلکہ اس بڑے رقبہ میں مختلف قسم کی مٹی اور موسم بھی ہیں جہاں کئی اقسام کی پھلوں، سبزیاں اور فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں زرعی پیداوار پر ہندوستان کو فخر بھی ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے زرعی پیداوار کے تین اہم عنوانات جس میں غذائی فصلیں، نقدی فصلیں اور پھل، سبزیاں اور مصالحہ شامل ہیں، پر گفتگو کریں گے۔

16.4.1 غذائی فصلیں (Food Crops)

شمالی ہندوستان میں زیادہ تر موسمی فصلیں دو بڑے فصلی موسم خریف (خزاں) اور ربیع (بہار) میں اگائی جاتی تھیں۔ حالانکہ کچھ علاقوں میں ہندوستانی کسان خریف اور ربیع کے درمیان قلیل مدت والی فصل پیدا کر کے تین فصلیں اگانے کا رجحان بھی رکھتے تھے۔ چاول خریف کی سب سے اہم فصل تھی جبکہ ربیع کی اہم فصل گندم تھی۔ جنوبی ہندوستان میں مختلف فصلوں کے لیے فصلوں کے بھی الگ الگ موسم نہیں تھے۔ کیوں کہ یہاں گیلی زمینوں پر دو بار دھان (چاول) کی فصل پیدا کی جاتی تھی۔ پہلی دھان کی فصل جون یا جولائی سے دسمبر یا جنوری کے دوران اور دوسری جنوری یا فروری سے اپریل یا مئی تک کھیتوں میں اگائی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں خشک فصلیں جیسے (کمبو، سرخ چنا، ارنڈ) مئی سے ستمبر یا اکتوبر تک بوئی جاتی تھیں اور اگست سے دسمبر۔ جنوری تک گیلی زمینوں پر اگست۔ ستمبر میں راگی اور چولم اور فروری ۔مارچ مین دھان کی فصل کاٹی جاتی تھیں۔ چاول اور گندم دو بڑی غذائی فصلیں تھیں جنکی پیداوری پورے ہندوستان میں ہوتی تھیں۔ چاول کی پیداوار کا بڑا حصہ وہ علاقے تھے جہاں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ پورا شمال مشرق اور مشرقی ہندوستان (بہار، بنگال، اُڑیسہ، مشرقی اُترپردیش کا کچھ حصے)، گجرات کا جنوبی ساحل ور جنوبی ہندوستان چاول پیدا کرنے والے علاقے تھے۔ اوپر اوراق میں پہلے ہی یہ بتایا جاچکا ہے کہ جنوبی ہندوستان میں چاول کی کاشت کے دو اہم موسم تھے۔ ایک کدپاہ کار اور دوسرا سامب پشنم جنکا نام گرمیوں اور سردیوں کے موسم میں کاشت کی جانے والی چاول کے اقسام پر رکھے گئے تھے۔

پنجاب اور دکن کے سیرابی علاقوں سے بھی چاول کی کاشت کے حوالے ملتے ہیں۔ ہر علاقے میں موٹے سے لے کر عام اور وعمدہ قسم کے چاول کے اپنے اقسام تھے۔ بنگال اور بہر کے علاقوں میں بہترین قسم کے چاول پیدا ہوتے تھے۔ چاول کی طرح گیہوں کے بھی کچھ مخصوص علاقے تھے۔ پنجاب، سندھ، مغربی اُترپردیش اور وہ تمام خطے جہاں بارش کم ہوتی تھی وہاں گیہوں کی پیداوار ہوتی تھی۔ حالانکہ ہمعصر مآخذ میں گیہوں کی پیداوار کچھ حوالے ان علاقوں کے بھی ملتے ہیں جہاں چاول زیادہ اگایا جاتا تھا، مثلاً بہار، بنگال، گجرات اور دکن کے کچھ حصوں میں اِسکی پیداوار کے حوالے ملتے ہیں۔ اِن دو بڑی فصلوں گیہوں اور چاول کے علاوہ جو بھی بڑے پیمانے پر میدانی علاقوں میں اگائے جاتے تھے۔ ابوالفضل کے آئین اکبری کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد، اودھ، آگرہ، اجمیر، دہلی، لاہور اور ملتان وغیرہ میں جو کی کھیتی کی جاتی تھی۔ مختلف علاقوں میں دالوں کی کھیتی کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ دالوں کی اہم فصلوں میں ارہر، چنے، مونگ، موٹھ، اُرد اور کھساری شامل

تھے۔ کھِساری کی بہار اور موجودہ مدھیہ پردیش کے علاقوں مین بڑے پیمانے پر اگائی جاتی تھی۔ کھِساری کے حوالے سے ابوالفضل کا ایک دلچسپ بیان بھی ہے۔اس کے مطابق کھِساری کا استعمال صحت کے لیے نقصاندہ ہے۔اس بات کی تصدیق جدید محققین بھی کرتے ہیں۔جوار کی پیداور کے حوالے کچھ استثناء کے ساتھ بنیادی طور پر ان علاقوں سے ملتے ہیں جہاں گیہوں اگائی جاتی تھی۔ان میں جوار اور باجرہ دو اہم فصلیں تھیں۔ جہاں تک مکئی یا مکاّ کی پیداوار کا سوال ہے۔اس ضمن میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سترہویں صدی ہندوستان میں ایک طویل عرصے تک یہ فصل ناپید رہی۔حالانکہ موجودہ کچھ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ راجستھان اور مہاراشٹرا اور ممکنہ طور پر دوسرے خطّوں میں بھی سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں مکئی کی کاشت یقینی طور پر ہوئی تھی۔

16.4.2 نقد فصلیں (Cash Crops)

بنیادی طور پر جن فصلوں کی اگائی منڈی کے لیے جاتی ہیں انھیں نقد فصل کہا جاتا ہے۔ان فصلوں کو فارسی کے دستاویزوں میں جِنس کامل یا جِنس اعلی (یعنی اعلی درجے کی فصلیں) کہا جاتا تھا۔ موسمی غذائی فصلوں کے برعکس، یہ تقریباً پورا سال کھیتوں پر قابض رہتی تھیں۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں اہم نقدی فصلوں میں گنّا، کپاس، نیل اور افیوم تھے۔ یہ تمام فصلیں ہندوستان میں زمانہ قدیم سے ہی اگائی جاتی تھی۔ سترہویں صدی میں اس کی مانگ میں صنعتکاری اور تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ چونکہ اس صدی میں ان تمام اشیاء کی تجارت کے لیے بڑے بڑے غیر ملکی بازار بھی کھل گئے تھے۔ بازار میں ان اشیاء کے کثیر مطالبے پر ہندوستانی کسان نے اس پر فوری عمل کرتے ہوئے ان فصلوں کی کاشت میں اضافہ کیا۔

گنّا اس عہد میں سب سے زیادہ اگائی جانے والی نقد فصل تھی۔ابوالفضل نے اپنے آئین اکبری میں اکو آگرہ،اودھ،لاہور، ملتان اور الہ آباد کے دستور حلقوں میں درج کیا ہے۔ حالانکہ بنگال کی چینی سب سے اچھی قسموں میں بہترین سمجھی جاتی تھی۔اس کے علاوہ ملتان، مالوا، سندھ، خاندیش، بیرار اور جنوبی ہندوستان کے تقریباً علاقے میں اسکی اگائی جانے کے حوالے ملتے ہیں۔ گنّے کے علاوہ کپاس دوسری نقد فصل تھی جسکی بڑے پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ موجودہ مہاراشٹر، گجرات اور بنگال کے حصے میں اسکی کھیتی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔اس عہد کے تاریخی ماخذ میں ذکر کیا گیا ہے کہ کپاس کی کھیتی اجمیر، الہ آباد، اودھ، بہار، ملتان، ٹھٹّا (سندھ) لاہور اور دہلی میں اسی کھیتی کی جاتی تھی۔ نیل ایک تیسری فصل تھی جسکی کھیتی مغل عہد میں برٹے پیمانے پر کی جاتی تھی۔اس کے پودے سے نیلا رنگ نکلتا تھا جسکی ہندوستان اور یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔اس کی موجودگی کے حوالے اودھ، الہ آباد، اجمیر، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان اور سندھ کے دستور حلقوں میں بیان کیے گئے ہیں۔اسکی کاشت گجرات، بہار، بنگال، مالوا اور جنوبی ہندوستان، دکن اور کورومنڈل میں کی جاتی تھی۔ بَیانہ اور سرکھیج نیل کی وہ اقسام تھے جن کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ بیانہ جو آگرہ کے قریب ایک جگہ ہے جسے نیل کی بہترین قسم کی پیداوار کے لیے جانا جاتا تھا۔اسی وجہ سے یہاں کی نیل کی قیمت بھی تھی۔اسی طرح احمد آباد کے قریب مقام سرکھیج کو معیار میں دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا تھا۔اور اسکی قیمت بھی زیادہ تھی۔اچھے قسم کے نیل کے دیگر مقامات اُترپردیش کے خُورجہ، علی گڑھ کے قریبی علاقے، سندھ کے سیھوان اور دکن کے تلنگانہ تھے۔

نقد فصل میں اَفیم یاافیون کا بھی شمار ہوتا تھا۔ہندوستان میں اسکی کھیتی کی اطلاع کئی مقامات سے ملتے ہیں۔ مغل عہد میں بہار اور مالوہ کے صوبوں میں سب سے اچھی قسم کے افیون پیدا ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کی کاشت ہندوستان کے مختلف علاقے جیسے ،اودھ ، بہار، دہلی، آگرہ، ملتان، لاہور، بنگال، گجرات اور راجستھان کے مارواڑ اور میواڑ میں بھی کی جاتی تھی۔ جہاں تک تمباکو کی کاشت کا سوال ہے اسکی کھیتی ہندوستان میں کچھ ہی عرصے پہلے پھیلی تھی۔ کیوں کی آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کا ذکر پر دستور حلقوں یا دوسرے خطوں میں فصل کے طور پر نہیں کیا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کی تمباکو کو ہندوستان میں پرتگالیوں نے سولہویں صدی کے دوران متعارف کرایا تھا۔اسکی کاشت ملک کے تقریباً تمام حصوں میں اور خاص طور پر سورت اور بہار میں دیکھی گئی۔ جہاں تک کافی کی کھیتی کا سوال ہے مورخین کا یہ خیال ہے کہ اس کی کاشت ہندوستان میں سترہویں کے دوسرے نصف میں ابتداء ہوئی تھی جبکہ مغل دور میں چائے کو ایک عام مشروبات مین شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اور سَن کی کھیتی مغل سلطنت کے تمام بنیادی صوبوں جیسے اودھ، الہ آباد، آگرہ، لاہور، اجمیر وغیرہ۔ میں کی جاتی تھی۔ حالانکہ شہتوت کے پودوں پر ریشم کے کی پرورش کے ذریعہ ریشم کی زراعت آسام، کشمیر، مغربی ساحل میں اور خاص طور سے بنگال میں کی جاتی تھی۔ دراصل بنگال ریشم کی پیداوار کا ایک اہم خطہ تھا۔ جن پودوں کے بیج تیل نکالنے کے لیے استعمال ہوتے تھے وہ خوراک کے ساتھ نقد فصلوں کے زمرے میں آتے تھے۔ تیل پیدا کرنے والی اہم فصلیں تِل، ارنڈی اور اَلسی (تیسی) تھیں۔ الہ آباد، ملتان اور بنگال میں بھی تِل کی کاشت کی اطلاع ملتی ہے۔ حالانکہ تل کے مقابلہ دیگر تیل کے بیجوں کے پودوں کی کاشت کم وسیع تھی۔

16.4.3 پھل، سبزیاں اور مصالحہ (Fruits, Vegetables, and Spices)

مغل عہد میں باغبانی کا عروج تھا۔ مغل بادشاہوں اور امراء نے بڑے تعداد میں باغات لگائے تھے۔ تقریباً ہر امیر کے باغات اُن شہروں کے مضافات میں تھے جہاں وہ رہتے تھے۔ باغات پورے منصوبہ بندی کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ موجودہ ہندوستان میں دستیاب مختلف پھل سولہویں اور سترہویں صدی میں متعارف کرائے گئے۔ اناناس ایک ایسا پھل ہے جو ہندوستان میں لاطینی امریکہ سے لایا گیا تھا جسکو بعد میں پرتگالیوں نے ہندوستان میں متعارف کرایا۔ تھوڑے ہی مدت میں یہ پھل اتنا مشہور ہوا کہ پورے ہندوستان میں اسکی کشت بڑے پیمانے ہونے لگی۔ پپیتا اور کاجو بھی اسی ذرائع سے ہندوستان میں متعارف کرایا گیا تھا، لیکن اسکی توسیع تھوڑی سست رہی۔ چیری کو کابل سے لاکر پیوند کاری (grafting) کے ذریعہ کشمیر میں اگایا گیا تھا۔ پیوند کاری کی مشق بہت سے پھلوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کی جاتی تھی۔ سنترے اور کھٹی پھلوں کے دیگر اقسام، خوبانی، آم اور دیگر پھلوں کی ایک بڑی تعداد کو پیوند کاری کے ذریعہ بہت بہتر بنایا گیا۔ ناریل نہ صرف ساحلی علاقے بلکہ اندرون ملک میں بھی اگایا جاتا تھا۔ خربوزہ اور انگور کے مختلف اقسام کے بیج کابل سے لیے گئے شاہی باغات اور مغل امراء کے باغات میں بڑے سلیقے سے لگائے گئے۔ آم خربوزے کو توکسان ندیوں کے کنارے ہر جگہ اگاتے تھے۔ جہاں تک سبزیوں کی کاشت کا سوال ہے تو پورے ملک میں مختلف قسم کی سبزیاں اگائی جاتی تھی۔ آئین اکبری میں اس عہد میں کھائے جانے والی سبزیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ آلو اور ٹماٹر سترہویں صدی اور اسکے بعد ہندوستان میں متعارف کرائے گے تھے۔ ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی اپنے مصالوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں نے ایشیاء اور یوروپ کے مختلف خطوں میں ایک بڑے پیمانے پر مسالوں

کی برآمد کی گواہی دیتا ہے۔کالی مرچ،لونگ،الائچی کی فراوانی تھی۔ادرک اور ہلدی بڑے پیمانے پر اگائی جاتی تھی۔ڈچ اور انگریز برآمد کے لیے بڑی مقدار میں سامان خریدا کرتے تھے۔ کشمیر میں کاشت کی جانے والی زعفران اپنے رنگ اور ذائقے کے لیے جانا جاتا تھا۔ پان بہت سے علاقوں میں اگائے جاتے تھے۔ بہار کا مگھی پان اور بنگال کے دیگر مختلف قسم کے پان مشہور تھے۔ ساحلی علاقوں میں بھی سپاری پیدا کی جاتی تھی۔ حالانکہ بڑے جنگلی علاقے تجارتی لحاظ سے اہم مصنوعات فراہم کرتے تھے۔طبّی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا لگنم اور لٹھ بڑی مقدار میں برآمد کی جاتی تھی۔

16.4.4 پیداواری صلاحیت اور پیداوار (Productivity and Production)

مغل ہندوستان میں فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پر بیگھا کی پیداوار پر شیرین موسوی نے کام کیا ہے۔اس لیے اس موضوع سے متعلق معلومات کے لیے ان کی تحقیق پر انحصار ہے۔اس سے متعلق آئین اکبری نے ضبطی صوبے جیسے لاہور، ملتان، آگرہ، الہ آباد، اودھ اور دہلی کے فصلوں کی پیداوار اور محصولات کی شرح کا نظام الاوقات دیا گیا ہے۔ ہر فصل کی پیداوار کی شرح اعلی، درمیانی، اور کم زمرے والی زمین کے مطابق دی گئی ہے۔اسی بنیاد پر پیداوار کی اوسط تیار کی گئی ہے۔ حالانکہ ابوالفضل ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ ان تین اقسام کی بنیاد کیا تھی۔ایسا لگتا ہے کہ کم پیداوار ان زمینوں کی تھی جو غیر آبپاشی تھیں جبکہ باقی دو ان کھیتوں کی ہیں جنکی سینچائی کی جاتی تھی۔ شیرین موسوی نے سولہویں صدی کے دستاویز سے دستیاب مختلف اعداد و شمار کی بنیاد پر زرعی پیداواری صلاحیت پر کام کیا ہے۔ اس کے اندازوں کے مطابق کچھ بڑی فصلوں کی پیداوار اوسط، درمیانی، اور کم پیداوار والی فصل مندرجہ ذیل کے مطابق تھی۔ شیرین موسوی نے آئین اکبری میں درج فصل کی پیداوار کا موازنہ انیسویں صدی کے آخر میں ہونے والی پیداوار سے بھی کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر دو ادوار کے درمیان خوراک کی فصلوں کی پیداواری صلاحیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ پھر بھی نقد فصلوں کی صورت میں انیسویں صدی میں پیداواری کی صلاحیت میں ایک یقینی اضافہ دیکھا جاسکتا ہے۔

فصل کی اوسط پیداوار۔(96-1595)(مَن اکبری فی بگھا الٰہی)

گیہوں	13.49	جو	12.93	چنا	9.71
باجرا	5.02	جوار	7.57	کپاس	5.75
گنّا	11.75	سرسوں	5.13	تل	4.00

یہ اعداد شمار شرین موسوی کی کتاب، اکونامی آف دی مغل اَمپائر کے صفحہ نمبر 82 سے لی گئی ہے۔

16.5 پالتو مویشی (Domestic Animals)

مویشیوں خاص طور سے پالتو جانوروں کا مغل عہد کے زرعی پیداوار میں اہم کردار رہا ہے۔ان مویشیوں سے ہل چلانے اور آبپاشی جیسے اہم زرعی کاموں میں کام لیا جاتا تھا۔ ان کے گوبر کو کھاد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ ڈیری مصنوعات زراعت سے متعلقہ

پیداوار میں خاطر خواہ تعاون لیا کرتا تھا۔ عام طور سے ہندوستان کے کسان کچھ مخصوص ذاتوں کے ساتھ مویشیوں کی پرورش میں شامل تھے۔ اس طرح کے زرعی کاموں میں مویشیوں کے بڑے پیمانے پر شمولیت ان کی بڑی آبادی کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چرنے والے کھیت وافر مقدار میں زمین اور آدمی کے اعلیٰ تناسب سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس عہد میں سیاحت کرنے والے یوروپ کے سیاحوں نے ہندوستانی کھیتوں میں مویشیوں کی بڑی تعداد میں موجودگی کا حوالہ دیتے ہیں۔ عرفان حبیب کا یہ تجویز ہے کہ مغل ہندوستان میں فی کس مویشیوں کی آبادی کا جدید اعداد و شمار کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے۔ مکھّن اور گھی کی کثرت استعمال کو عام لوگوں کی غذا کہا جاتا تھا۔ یہ بات بھی اس عہد میں مویشیوں کی ایک بڑی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بیلوں کو سامان کے نقل و حمل کے لیے یا بیل گاڑیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بنجارے (جو ایک ہجرت کرنے والی تجارتی برادری تھی) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سیکڑے سے ہزار جانوروں کے ریوڑ پالتے تھے۔ ہزاروں بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ بھی پالے جاتے تھے۔

16.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس دور میں ہندوستان کی سیاحت کرنے والے غیر ملکی مبصرین نے زرعی آلات کی قدیمیت اور سادگی کے بارے میں تبصرہ کیا ہے، لیکن وہ تمام آلات ہندوستانی زراعت کی ضروریات کے مطابق تھے۔ اگرچہ زراعتی پیداوار کا انحصار بنیادی طور سے بارش کے پانی پر تھا، لیکن اس عہد میں مصنوعی آبپاشی کے ذرائع اور طریقہ کار بھی استعمال میں لائے جاتے تھے۔ پانی اٹھانے کے لیے مصنوعی آلات میں مختلف آلات جیسے ڈھینکلی، چرس، اور ساقیہ تھے جن کا استعمال کنویں سے پانی اٹھانے اور آبپاشی کے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ حالانکہ ٹینکوں کے ذخائر اور ایک محدود حد تک نہریں سینچائی کے بنیادی ذرائع تھے۔ اس عہد کی زراعتکاری کے خصوصیات یہ بھی تھے کہ فصلوں کی گردش اور بازار کی ضروریات کے مطابق نقد فصلوں کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ اس عہد میں مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے پھلوں کی پیداوار ایک نئی بلندی تک پہنچ گئی تھی۔ اسی طرح فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پیداوار انیسویں صدی کے آخر کی جدید پیداواری صلاحیت اند پیداوار کے ساتھ اچھی طرح موازنہ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل دور میں مویشیوں کی فی کس آبادی زیادہ تھی۔

16.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

بیگھہ الٰہی : ساٹھ مربع گزِ الٰہی کا رقبہ، گزِ الٰہی کی لمبائی تقریباً بتّیس انچ تھی اور ایک بیگھہ الٰہی تقریباً ساٹھ ایکڑ تھی۔

حلقہ دستور : (Dastur Circle) اس علاقے کو کہا جاتا تھا جس کے اندر مختلف فصلوں کے لیے کچھ نقد محصول کی شرحیں نافذ کی گئی تھیں۔ پورا صوبہ بہت سے دستور حلقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جس میں ہر ایک حلقے کے لیے الگ الگ محصولات کی شرحیں ہوتی تھیں۔

شرح دستور : (Dastur Rate): مختلف فصلوں کے لیے نقد آمدنی کی شرح فی اکائی رقبہ۔

16.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کھیتوں کی سینچائی کے لیے کنویں سے پانی اٹھانے کے تین طریقوں کو بیان کیجیے۔
2. کھیتی کی زرخیزی کو بڑھانے کیے شمالی ہندوستان مین کون سے طریقہ کار استعمال کیے جاتے تھے؟
3. مغل دور میں کھیتوں کی سینچائی کے بنائے گئے دو نہروں کا نام بتائے۔
4. دو بڑے جھیل یا باندھ کا نام بتائے۔
5. کھیتی کی زرخیزی کو بڑھانے کے لیے ساحلی علاقوں میں کیا استعمال کیا جاتا تھا؟
6. ربیع اور خریف فصلی موسم میں پیدا ہونے والے چار فصلوں کا نام بتائے۔

16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دس اہم خوراک والے فصلوں کا نام بتائیں
2. مغل عہد میں خوراک والی، نقد اور تیل والی فصلیں کون کون سی تھیں۔
3. چار اہم نقد فصلوں کا نام بتائیں۔
4. چار ایسے پھلوں کے نام بتائیں جو ہندوستان میں غیر ملکیوں نے متعارف کیا۔
5. سینچائی کے مختلف ذرائع کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل دور میں زراعت کی وسعت سے متعلق اعداد و شمار کے بارے میں مؤرخین کے درمیان کیا بحث ہے، بیان کیجیے۔
2. ربیع اور خریف کے فصلی موسم میں پیداوار پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. مغل عہد میں نقد فصلوں کے پیداوار پر ایک مضمون لکھیے۔

16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Irfan, Habib, and Raychaudhuri, Tapan, (eds.,), *The Cambridge Economic History of India*, Vol. 1, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
2. Irfan Habib, *Agrarian System of Mughal Empire*, *1526-1707*, Oxford University Press, New Delhi, 2013.
3. Shireen Moosvi, *The Economic History of the Mughal Empire*, c. 1595, Oxford University Press, New Delhi, 2015.

اکائی 17۔ غیر زرعی معیشت

(Non-Agricultural Economy)

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید
17.1 مقاصد
17.2 زراعت پر مبنی صنعت
17.2.1 ملبوسات
17.2.2 سوتی ملبوس
17.2.3 ریشمی ملبوس
17.2.4 اُونی ملبوس
17.2.5 نیل
17.2.6 چینی، تیل، تمباکو وغیرہ
17.3 معدنیات، کان کنی اور دھاتیں
17.3.1 معدنی پیداوار
17.3.2 دھات
17.3.3 ہیرے
17.4 لکڑی پر مبنی دستکاری
17.5 متفرقات
17.6 پیداوار کی تنظیمیں
17.6.1 گاؤں کے کاریگر اور رزق پر مبنی پیداواری نظام
17.6.2 بازار کے لیے پیداوار
17.6.3 دادنی

17.6.4 فیکٹری
17.6.5 کارخانے
17.7 خلاصہ
17.8 کلیدی الفاظ
17.9 نمونہ امتحانی سوالات
17.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
17.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
17.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
17.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید (Introduction)

دور وسطی کے ہندوستان میں اعلی قسم کی دستکاریاں موجود تھیں جو براہ راست تجارت و حرفت سے منسلک تھیں۔ ہمعصر آماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں دستکاری سرگرمیاں کچھ اہم تجارتی مراکز اور اس کے نزدیکی علاقوں میں کافی تیز تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دستکاری اور اس کو تیار کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں فارسی آماخذ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی۔ ہمیں اس کے بارے تفصیلی معلومات یوروپی سیاحوں کے دستاویزات اور مختلف غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے خط و کتابت سے ہوتی ہیں۔ حقیقت میں یہ کمپنیاں ہندوستانی دستکاروں کی پیداوار کے عمل اور معیار پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ حالانکہ دستکاری کی پیداوار مکمل طور سے گھریلو بازار میں اس کی مانگ اور کھپت پر منحصر تھی۔ دستکاری سرگرمیاں اس وقت کافی تیز ہوجاتی ہیں، جب ہندوستانی دستکاروں کی مانگ ستر ہویں صدی کے بیرون ملکوں میں زیادہ تیز ہوجاتی ہے۔ ہندوستانی دستکاروں کی مانگ کے اس اضافہ نے پیداوری سرگرمیوں کو کافی حد تک متأثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس اکائی میں، ہم بڑے بڑے دستکاریوں، انکے اہم مراکز اس کو تیار کرنے میں استعمال ہونے والے کچّے مال اور طریقہ کار پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس کے علاوہ، ہم معدنیات کی دستیابی اور ان کی پیداوار کے ساتھ ساتھ کچھ منتخب دستکاریوں کی پیداواری تنظیموں پر بھی گفتگو کریں گے۔

17.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- دور وسطی کے ہندوستان میں تیار کردہ مختلف قسم کی چیزوں، دستکاروں اور صنعتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- کچھ اہم اور مخصوص دستکاریوں اور دستکاری کے اہم مراکز کے بارے میں جان سکیں گے۔

- ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جانے والی معدنیات کے بارے میں اندازہ لگا پائیں گے۔
- اس زمانے کے چند اشیاء کو تیار کرنے کے لیے استعمال ہونے والی تکنیک کے بارے میں جانیں گے۔
- دستکاروں کی تنظیموں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کریں گے۔

17.2 زراعت پر مبنی صنعت (Agro-Industry)

یہ واضح رہے کہ غیر زرعی معیشت میں وہ تمام صنعت بھی شامل ہیں جن میں زرعی پیداوار کو سامان تیار کرنے کے لیے کچّے مال کے طور پر استعمال ہوا ہو، حالانکہ موجودہ دور میں زرعی صنعتوں کی اصطلاح مختلف قسم کی صنعتوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ دور وسطی کے ہندوستان میں صنعت کی وسیع پیمانے پر پیداوار ایک ایسے شعبے میں تھی جہاں بنادی خام مال زرعی پیداوار سے حاصل کیا جاتا تھا۔اکائی 16 میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس عہد میں نقدی فصلیں جیسے کپاس، گنے، نیل، تمباکو، وغیرہ کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔اس لیے یہ فطری بات ہے تھی کہ ان تمام نقدی فصلوں کی دستکاریوں کو بھی خوب فروغ ہوا ہوگا۔اس نہج سے ہم سب سے پہلے ان تمام دستکاریوں اور صنعتوں پر گفتگو کریں گے جنکا انحصار زرعی پیداوار پر تھی، مثلاً ملبوسات کے متعلق صنعت جن میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت اور دستکاریاں شامل تھیں۔اس کے علاوہ نیل، شکر اور مختلف قسم کے تیل کی صنعت پر بھی گفتگوں کریں گیں۔

17.2.1 ملبوسات (Clothing)

ملبوسات کے تعلق سے جس صنعت نے اس عہد میں سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا ان میں کپاس سے تیار کردہ سوتی ملبوسات کی صنعت تھی، جبکہ ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت کو بامقابل سوتی ملبوتات کے کم فروغ ملا۔

17.2.2 سوتی ملبوس (Cotton Clothes)

جہاں تک سوتی ملبوسات کا تعلق ہے تو دور وسطی کے ہندوستان میں یہ مشہور و معروف صنعت تھی جسے ممکنہ طور پر ملک کے تقریباً ہر حصے میں مقامی استعمال اور دور دراز کی منڈیوں کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ مشہور معاشی مورخ، تپن رائے چودھوری کے مطابق، سوتی ملبوسات عملی طور پر پورے ملک میں تیار کیے جاتے تھے کیونکہ کے ہمالیہ کے ذیلی علاقوں کو چھوڑ کر کپاس کی کاشت تقریباً ہر جگہ ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ ہمعصر مأخذ میں ذکر کیے گے سوتی ملبوسات کے مراکز کی فہرست سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً صولہویں صدی کے مشہور مورخ، ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں سوتی ملبوسات کے اہم مراکز کی فہرست شامل کیا ہے۔اس فہرست یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات سوتی ملبوسات کا ملک میں سب سے اہم علاقہ تھا۔احمد آباد، بروچ، بڑودہ، کھمبات اور سورت وغیرہ بھی کو سوتی ملبوسات کے اہم مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ راجستھان کے شہروں میں اجمیر، سرونج، اور بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے کا ذکر سوتی کپڑوں کے مراکز کے طور پر کیا گیا ہے۔ جدید اتر پردیش کے علاقوں میں لکھنؤ، اور اسکے ارد گرد کے چھوٹے شہر، بنارس، آگرہ، الہ آباد وغیرہ اسکے اہم اور نمایاں مراکز تھے۔ جبکہ شمال

کے دیگر علاقوں میں دہلی، سرہند، سَمانا، لاہور، سیالکوٹ، ملتان اور ٹھٹّا جیسے شہر سوتی ملبوسات کے بہترین قسم کے اہم مراکز تھے۔ اسکے کچھ مراکز ہندوستان کے مشرقی حصوں میں بھی تھے۔ جن میں بنگال، بہار، اڑیسہ، سونار گاؤں، ڈھاکہ، راج محل، قاسم بازار اور اسکے ارد گرد کے کئی قصبوں کے علاوہ، بالاسور، پٹنہ اور اس سے ملحق علاقے شامل تھے۔ حالانکہ دکن، بُرہان پور، اور اورنگ آباد میں ایک عمدہ قسم کے سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ مہاراشٹرا کے علاقے بھی مستثنیٰ نہیں تھے یہاں کے مغربی ساحل پر چول اور بھیونڈی میں بنائی گئی صنعت کو کافی فروغ ملا۔ اسی طرح قطب شاہی سلطنت اپنے کپڑوں کے لیے مشہور تھی۔ جنوبی علاقوں کے مسولی پٹنم اور کورومنڈل میں بھی سوتی کپڑے تیار کیے جاتے تھے۔ حالانکہ جنوبی علاقوں میں کوئمبٹور اور مالابار اچھے معیار کی کپاس کی کاشت کے لیے بھی مشہور تھے۔

ان تمام سوتی ملبوسات کے اہم مراکز کے علاوہ بہت سے علاقے ایسے بھی تھے جو صرف دھاگے تیار کرنے کے لیے مشہور تھے۔ اِن تمام مراکز سے دھاگوں کو ان مقامات یا مراکز میں لے جایا جاتا تھا جہاں کپڑوں کی بنائی ہوتی تھی یہ وہی مراکز ہیں جنکا کا نام ہم پچھلے اقتباس میں ذکر چکے ہیں۔ تیار کردہ دھاگیں بیرونی ملکوں کو برآمد بھی کیا جاتا تھا۔ دھاگوں کی صنعت کے فروغ سے اس عہد میں سوت کاتنے کا کام باقاعدہ طور پر ایک خاص پیشہ بن گیا تھا جسے بڑے مراکز کے اندرونی اور آس پاس کے علاقے کے کسانوں اور عورتوں نے اپنی کمائی کا ایک اضافی ذریعہ کے طور پر اپنا لیا تھا۔ جنکا اہم کردار بنکروں کو سوت فراہم کرنا تھا۔ میسور کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے خواتین ایک بڑی تعداد میں سوت کاتی تھیں۔ حالانکہ وشاکھاپٹم، گنجام، بروچ، قاسم بازار اور بالاسور جیسے علاقوں میں سوت کی فروخت کے لیے مشہور بازار موجود تھے۔ جبکہ سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں گجرات بنگال کو سوت فراہم کرتا تھا۔ ڈھاکہ کے ململ کے لیے درکار ہونے والی باریک سوت کو وہاں کی نوجوان خواتین تکلی یا تکلے نامی اوزار کی مدد سے کاتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی طرح کپڑوں کے مختلف معیار بھی تھے۔ جدید تحقیق میں مغلیہ سلطنت کے پانچ بڑے پیداواری مراکز میں تیار کیے جانے والے کپڑوں کی انتالیس اقسام کا ذکر کیا ہے؛ حالانکہ یوروپی سیاحوں کے دستاویزوں میں کپڑوں کا ایک سو بیس سے زیادہ اقسام کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کی سوتی ملبوسات کے مختلف اقسام تھے اور علاقائی اعتبار سے ان کی خصوصیات بھی مختلف تھیں۔ جن میں بافتہ، سفید سوتی کپڑا (calico)، تفتہ، زرتری، چھینٹ، کھاسہ وغیرہ ایسے اقسام تھے جنکا یہاں ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ بافتہ کو ابوالفضل کی کتاب آئینِ اکبری میں سوتی کپڑے کی سب سے اعلی قسم کے طور پر ذکر ہوا ہے یہ کپڑے کی ایک قسم تھی جو عام طور پر سفید یا ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے۔ حالانکہ کیلکو (calico) کا لفظ یوروپین سیاحوں نے عام طور پر ہر قسم کے سوتی کپڑے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جبکہ کیلکو کا مطلب ایک موٹے قسم کا سفید کپڑا بھی ہوتا تھا۔ تافتہ ریشمی کپڑے کا ایک قسم تھا جسے کبھی کبھی سوتی دھاگے کے ساتھ بنا جاتا تھا۔ زَرتَری ایک ایسا کپڑا تھا جسے سونے اور چاندی کے دھاگے سے ملا کر بنا جاتا تھا۔ چھینٹ بھی ایک قسم کا سوتی کپڑا تھا جسے پھولوں یا دیگر طریقے سے رنگا جاتا تھا۔ کھاسہ ململ کی ایک قسم تھی جو کافی قیمتی اور اچھے قسم کا کپڑا تھا۔

اس عہد میں کچھ کپڑوں کے نام انکے تیار کردہ مقام کے نام پر ہی رکھ دیا گیا تھا، جن میں دریابادی (جدید اترپردیش کا ایک ضلع جو بارہ بنکی ضلع کے نزدیک ہے)، خیرآبادی (جدید اترپردیش کا ضلع سیتاپور میں ایک قصبہ)، سَمیان (سَمانا)، لکھواڑیا (موجودہ پٹنہ ضلع کا ایک مقام) وغیرہ شامل تھے۔ حالانکہ کچھ علاقے تو ایسے تھے جسے خاص قسم کے لیے جانا جاتا تھا، مثلاً گجرات بافتہ کے لیے، سونار گاؤں کا ململ اور بنگال کے

ڈھاکہ سے ان کی تخصیص کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ لیکن سترہویں صدی میں یوروپین کمپنیوں کی تیز رفتار تجارتی سرگمیوں کی وجہ سے اس میں کچھ اہم تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جسکی تعداد میں انگریزی، ڈچ اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا جیسی کمپنیوں کی آمد کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جبکہ ان تمام کپڑوں میں سب سے زیادہ عام سوتی کپڑے کی مانگ تھی۔اعلی قسم کا سفید کپڑا(calico) کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا، مثلاً بہار اور بنگال میں اسے اَمبرٹیز کہا جاتا تھا، تو گجرات میں بافتہ وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ حالانکہ سوتی کپڑوں کے دیگر مشہور اقسام میں بنگال کی باریک ململ تھی جسے کھاسہ کہا جاتا تھا۔ جبکہ چھینٹ ایک چھاپ شدہ کپڑا تھا جسے ریشم کے دھاگے کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ گجرات کا شہر احمد آباد نے چھاپ شدہ کپڑے کی وجہ سے شہرت حاصل کر لیا تھا جسے چھینٹ کہا جاتا تھا۔

جہاں تک سوتی ملبوسات کو تیار کرنے کے طریقہ کا سوال ہے تو اسے تیار کرنے میں کئی مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، جیسے سوت کاتنا، لوم کے ذریعہ کپڑے تیار کرنا، رنگنا، رانگکاری اور پرنٹنگ وغیرہ کے مراحل شامل تھے۔ سب سے پہلے مرحلے میں زراعت پر مبنی نقدی فصل، کپاس سے بیج کو الگ کرکے سوت تیار کیا جاتا تھا۔ جس میں سب سے پہلے دُھنیا (روئی کو صاف کرنے والا پیشہ ور) اپنے کمان سے کپاس سے بیج نکال کر روئی کی صفائی کرتا تھا، اسکے بعد صاف روئی کو چرخی کے ذریعہ سوت تیار کیا جاتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں سوت یا دھاگے سے لوم پر کپڑا تیار ہوتا تھا، اس مرحلے میں ابھی تک کپڑا پوری طرح تیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ تیسرے مرحلے میں کپڑے کو استعمال کرنے سے پہلے اس کی بلیچ یا رنگا جاتا تھا، اس فعل کو لوگوں کے ایک الگ ہی گروہ کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ جنکے لیے عہد وسطی میں کچھ خاص مقامات تھے۔ گجرات کے بروچ کو وہاں کے پانی کی خاص معیار کی وجہ سے بلیچنگ کے لیے سب سے اچھا مقام میں شمار کیا جاتا تھا۔ ہمعصر ماٗخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی آگرہ اور لاہور میں خریدے گئے کپڑوں کو بیرونی ملکوں کو برآمد کرنے سے پہلے بروچ اور گجرات کا ایک خاص جگہ، نوساری میں بلیچنگ کے لیے بھیجتا تھا۔ گجرات کے ان دو مقامات کے علاوہ، احمد آباد، سورت، پٹنہ، سونار گاؤں، ڈھاکہ، مسولی پٹم وغیرہ دوسرے شہر بھی تھے جہاں بڑی مقدار میں کپڑوں کی بلیچنگ کی جاتی تھی۔ بلیچنگ کے وقت کپڑوں کو بھگونے (جیسا کہ باریک کپڑوں میں کیا جاتا تھا) یا اسے کسی خاص محلول میں ابالنے کا عمل بھی شامل تھا، اس کے بعد اسے اچھی طرح دھو کر خشک کر لیا جاتا تھا۔ حالانکہ نیل کو بلیچنگ میں کپڑوں کو سفید کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے آخر مرحلے میں کپڑوں پر رنگکاری اور پرنٹنگ کی جاتی تھی جو اس عہد میں ایک خاص پیشہ بن گیا تھا جسے رنگریز (کپڑوں کے رنگنے والا ایک طبقہ) کہا جاتا تھا۔ اس طبقے نے اس پیشہ میں اتنا مہارت حاصل کر لیا تھا کہ اسے ایک الگ ذات سمجھا جانے لگا۔ رنگکاری کے لیے عام طور سے سبزیوں سے نکلنے والے رنگ کا استعمال ہوتا تھا۔ سرخ رنگ چھالئے یا لاکھ سے تیار کیا جاتا تھا، جبکہ نیلے رنگ کے لیے نیل کا استعمال کیا جاتا تھا۔

17.2.3 ریشمی ملبوس (Silk Clothes)

ملبوسات کو تیار کرنے کے لیے ریشم بھی ایک اہم چیز تھی۔ سولہویں صدی کے مشہور موٗرخ ابوالفضل نے کشمیر کا ذکر کیا ہے جہاں ریشمی کپڑے زیادہ تیار کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پٹنہ، احمد آباد، اور بنارس جیسے شہر بھی ریشمی کپڑوں کے لیے کافی مشہور تھے۔ معاشی موٗرخین کا معقول طور سے یقینی خیال یہ ہے کہ سترہویں صدی میں بنگال میں خاص طور سے ریشم کی پیداوار اور اس کی بیرون ملکوں کو برآمدگی میں کافی

اضافہ ہوا۔ کیونکہ اس سے قبل، اگرچہ گجرات کے علاوہ جو تیار شدہ ریشم پیدا کرنے والا ایک اہم علاقہ تھا، کشمیر اور بنگال (بشمول مشرقی ضلع بکلا کے) میں بہت تھوڑی مقدار میں ریشم کی بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ یوروپین سیاحوں مینرق اور منوچی کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ کشمیر، گجرات اور بنگال ریشم کے اہم مراکز تھے لیکن آگرہ، لاہور، فتح پور اور غالباً پٹنہ اور ٹھٹّا جیسے شہر بھی اسکے دوسرے مراکز میں شامل تھے۔

جہاں تک ریشمی ملبوسات کی صنعت کا سوال ہے تو اس کے فروغ کا اندازہ ابوالفضل کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں اسنے ریشم کی پیداوار میں بادشاہ اکبر کی دلچسپی اور ریشم کی بنائی کی بہتری کے لیے غیر ملکی کاریگروں کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ گجرات ابتدأ میں چینی خام مال پر بہت زیادہ منحصر تھا، کیونکہ اس علاقے میں ریشم کی پیداوار کا کبھی بھی فروغ نہیں ہو پایا۔ جبکہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں بنگال نے ریشم کی فراہمی کے ذریعہ چین کو مکمل طور پر ہندوستان سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ بنگال میں ریشم کی پیداوار میں ہونے والے اضافے سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بنگال کے صرف قاسم بازار نے تقریباً دو ملیَن پاؤنڈ سے زیادہ خام ریشم تیار کیا تھا، جس کی دو تہائی گجرات کو برآمد کی گئی اور باقی کے ایک تہائی ملک کے عوام کے پاس رہا۔ اس کے علاوہ، سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈچوں کو جاپان میں ہندوستانی ریشم کی ایک منڈی مل گئی تھی، اور اسی عہد میں انگریزوں نے بنگال کا خام ریشم یوروپ کو برآمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ریشم سے تیار شدہ مصنوعات میں قالین، مخمل کے خیمے، سونے اور چاندی سے بنے ساٹن اور ریشمی چمکدار کپڑے، مختلف رنگوں سے سجے پٹولے وغیرہ شامل تھے۔ ہندوستانی ریشمی کپڑوں میں مشہور جڑی بوٹیوں کا کپڑا بھی شامل تھا، جسے آج کے زمانے میں تسَر اور آسام کا جنگلی ریشم (مونگا) کہا جاتا تھا، جسکا ذکر یقینی طور پر یوروپین سیاح ٹاورنیر (Tavernier) نے کیا ہے۔

17.2.4 اونی ملبوس (Woolen Clothes)

دور وسطی میں اون بھی ایک اہم مواد تھا جسکا استعمال ملبوسات بنانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن ہمعصر مأخذ سوت اور ریشم سے بنے ملبوسات کے مقابلے اون سے تیار ملبوسات کے بارے میں خاموش ہیں۔ اگرچہ ابوالفضل نے اونی کمبل کا ذکر تو کیا ہے، لیکن باقی تمام دستیاب حوالے سے شال اور قالین کے بارے میں ہی علم ہوتا ہے۔ اونی مصنوعات میں سب سے مشہور کشمیر کی شال تھی جو پوری دنیا میں کو برآمد کی جاتی تھی۔ فرانسیسی سیاح، بَرنیر نے شال کا ذکر کشمیر کی سب سے اہم صنعت کے طور پر کیا ہے۔ حالانکہ کشمیری شال میں استعمال ہونے والی باریک اُون تبت سے درآمد کی جاتی تھی۔ اگرچہ بادشاہ اکبر نے لاہور میں اس صنعت کو فروغ دیا لیکن وہاں تیار کیے گئے شال کشمیری شالوں کے معیار سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ کشمیری شالوں کو تیار کرنے کی کوشش شمالی ہندوستان کے کئی شہروں، جیسے پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں کی گئی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس عہد میں اعلی طبقے کے لیے عمدہ قسم کے اونی لبوسات عام طور سے یوروپین تاجروں کے ذریعہ فراہم کیے جاتے تھے۔ جبکہ کمبل تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں اون سے تیار کیے جاتے تھے۔ دوسرے ملبوساتی اشیاء میں کپاس کی دری، ریشم اور اون کی قالین، خیمے اور لحاف وغیرہ شامل تھا۔ ان تمام اشیاء میں قالین کی بنائی ملبوسی پیداوار کی ایک اہم شاخ تھی۔ شمالی ہندوستان کے کچھ علاقے قالین کے اہم مراکز تھے ان میں بہار کا داؤد نگر، اوررا، دہلی، آگرہ، لاہور اور مرزاپور شامل تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں وارنگل قالین کے لیے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ قالین کی بنائی کا کام کورومنڈل کے ساحلی علاقوں کے ساتھ ساتھ مسولیپٹم میں بھی کیا جاتا تھا۔ دوسری صنعت کے مقابلے

قالین کی بنائی کی پیداوار بہت زیادہ نہیں تھی اور اس عہد میں ایرانی قالین کا استعمال جاری تھا۔ بادشاہ اکبر نے شاہی کارخانوں میں ایرانی قسم کی قالین کے بعد ریشم کی قالین کی صنعت میں خاص دلچسپی لی۔ ایک معاشیاتی مؤرخ کا خیال ہے کہ 'اپنے کارخانوں مین فارسی قسم کی قالین بنانے کی اکبر کی کوششیں، زیادہ کامیاب تھیں۔' قالین کی صنعت کے علاوہ اس عہد میں خیمہ تیار کرنے کی صنعت بھی تھی، جسکا استعمال زیادہ تر شاہی اداروں میں ہوتا تھا۔ ابوالفضل نے گیارہ قسم کے خیموں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ، سوتی، ریشم یا چاندی سونے کے دھاگے سے ہر قسم کے ملبوسات پر کڑھائی بھی ایک مربوط دستکاری تھی، جسمیں بڑی تعداد میں کاریگر شامل تھے۔

17.2.5 نیل (Indigo)

نیل کی مانگ نہ صرف ہندوستان میں تھی بلکہ اسے بیرونی ملکوں کو بھی بڑے پیمانے پر برآمد کیا جاتا تھا۔ دور وسطی میں نہ صرف اس کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھا بلکہ اما نگ کے مطابق زیادہ وسیع پیمانے پر بنایا جاتا تھا۔ اس کی پیداوار اور صنعت کے اہم مراکز آگرہ کے علاقے میں واقع تھے، خاص طور سے بیانا کا علاقہ۔ اس کے علاوہ گجرات مین سرکھیج نامی مقام اور شمالی اور جنوبی کورومنڈل میں کئی مقامات تھے جو نیل بنانے کے اہم مراکز تھے۔ ان مقامات کے علاوہ، دیگر مقامات مین راجستھان کے جیپور ریاست میں ہنڈوان، بلند شہر اور مشرق میں خاندیش اور برہان پور تھے۔ بیانا کی نیل کو سب سے بہترین سمجھا جاتا تھا حالانکہ کی سرکھیج کی نیل کی قسم کی قیمت زیادہ تھی۔ عام طور سے رنگنے والی چیزیں کسان خود ہی بناتے تھے۔ لیکن گجرات میں کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں نیل کے پتے ان لوگوں کو فروخت کر دیا جاتا تھا جو اس صنعت میں مہارت رکھتے تھے۔ جہاں تک اس کی کھپت کا سوال ہے تو تیار شدہ نیل کا ایک بڑا حصہ مقامی طور پر استعمال ہوتا تھا، لیکن جب یوروپ میں اس کی برآمد میں کافی اضافہ ہوا تو انگریزوں نے بیرون ملکوں کے برآمد کے لیے گجرات اور آگرہ پر اپنی توجہ مرکوز کیا۔ حالانکہ ڈچوں نے اس کی تجارت کے لیے کورومنڈل کی طرف توجہ کیا۔ دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ نیل کی صنعت کی تاریخ ہندوستان کی زرعی پیداوار کی قیمت کے جوابی کردار کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کردار کو کئی مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً 1630ء کے قحط کے بعد، اس کی پیداوار میں کمی آئی کیونکہ غذائی اجناس کی قیمتیں زیادہ ہو گئیں جس کی وجہ سے غیر غزائی فصلیں پیدا کرنے والے پہلے ہلاک ہوئے۔ کورومنڈل کے علاقے کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب بی نیل کی مانگ میں کمی آئی، تو اسے صنعت سے ملحق لوگ تیزی سے زرعی کاشت کی طرف منتقل ہوئے۔ نیل کے پودوں سے نیل نکالنے کا عمل کافی آسان تھا۔ اس عمل میں سب سے پہلے پودوں کی ڈنڈیاں پانی ڈال دیا جاتا تھا، جب رنگ پانی میں مل جاتا تھا تو اس پانی کو دوسرے حوض میں لے جایا جاتا تھا جہان نیل کو حوض کے نچلے حصے میں رہنے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسے چھان کر کیک کی شکل میں خشک کیا جاتا تھا۔ یہ عمل زیادہ تر گاؤں کے کسان کیا کرتے تھے۔

17.2.6 شکر، تیل، تمباکو، وغیرہ (Sugar, Oil, Tobacco, etc.)

آج کی طرح دور وسطی کے ہندوستان میں بھی گنے کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، جس سے پورے ملک لیے شکر تیار کی جاتی تھی۔ عام طور سے گنے سے تیار کردہ چینی تین قسم کی ہوتی تھی۔ گڑ، باریک دانے والی سفید شکر اور مہنگی کینڈی یا بڑے کرسٹل جو ملک کے کئی

حصوں میں تیار کیے جاتے تھے۔ گڑ ان تمام علاقوں میں بنایا جاتا تھا جہاں گنے کی کاشت ہوتی تھی، اور اسے مقامی طور پر کھایا جاتا تھا۔ حالانکہ چینی کی بہترین اور سستی قسمیں بنگال سے آتی تھیں۔ آگرہ اور اسکے پڑوس کے علاقے، ملتان اور اڑیسہ چینی پیدا کرنے والے دیگر علاقوں میں سے تھے۔ سترہویں صدی میں دکن کے بارے میں لکھتے ہوئے، تھیونوٹ نے ذکر کیا ہے کہ ہر کسان جو گنا اگاتا ہے اس کی اپنی بھٹی ہوتی تھی۔ ابوالفضل نے ایک آدمی کی لیے باریک قسم کی چینی کی قیمت 128 دام بتایا ہے، جبکہ مہنگی کنڈی کی قیمات 220 دام لکھا ہے۔ بنگال کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس صوبے نے یوروپین کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کے ذریعے یوروپ اور ایران میں اپنا منڈیان تلاش کر لیا تھا، یہ بات چینی کی پیداوار میں ایک اضافے کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ مثلاً 1640 کی دہائی میں ڈچوں نے جو چینی ایران کو برآمد کیا تھا اس کی سالانہ کی اوسط 40000 سے 45000 تھی۔ گنے کا رس نکالنے کے طریقوں میں کولہو کا استعمال کیا جاتا تھا جسے ہاتھ کی مدد سے یا جانوروں کی طاقت کی مدد سے جلایا جاتا تھا۔ گڑ یا باریک قسم کی چینی کو کڑھاہی یا کھلی بھٹی میں ابال کر حاصل کیا جاتا تھا۔ گنے کے رس کو ابالنے کے دوران ہی مختلف قسم کی چینی تیار کی جاتی تھی۔

دیگر زرعی پیداوار پر مبنی غیر زرعی معیشت میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو گھریلو استعمال کے لیے خاص تھیں اور جسکی کبھی کبھی مقامی طور پر تجارت ہوتی تھیں۔ ان چیزوں میں تیل، تمباکو، افیون، زعفران اور نشیلی مشروبات شامل تھیں۔ اڑیسہ کے ساحلی علاقوں نے تو اپنا نام تیل کی بیجوں سے حاصل کیا تھا جو وہاں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ جبکہ بنگال کا مدناپور کا علاقہ پھولوں اور دیگر خوشبودار مادوں سے قیمتی بدبودار تیل تیار کرتا تھا، جو ملک کے تمام دوسرے حصوں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ جبکہ گوالیر اپنی چنبیلی تیل کے لیے مشہور تھا۔ تیل نکالنے کی صنعت میں بھی زیادہ تر گاؤں کے لوگ شامل تھے۔ تیل نکالنے کے عمل میں بھی گنے کی طرح دستی طور پر یا جانوروں کی طاقت سے چلنے والے بیج کو دبانے والے آلہ رکھا جاتا تھا۔ اس پیشہ میں شامل ایک خاص ذات تھی جسے تیلی کہا جاتا تھا۔ تیل نکالنے کے بعد بقیہ مصنوعات جانوروں کے کھانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ تمباکو، ایک نئی تجارتی فصل تھی جو سترہویں صدی میں ہندوستان میں قائم ہوئی۔ سب سے پہلے اسے اکبر کے دور میں پرتگالیوں نے لایا تھا۔ منوچی کے مطابق، اس وقت جب وہ ہندوستان میں تھا دہلی میں مشترکات پر روزانہ کی سیر ٹیکس 5000 تک پہنچ گئی تھی، جب کہ یہ گجرات، بنگال اور کورومنڈل مین پہلے سے ہی ایک برآمد ہونے والی مصنوعات تھی۔ اس کے علاوہ مسولی پٹنم کے بوری کے قریب تین سے چار سال کے بچے بھی تمباکو پیتے ہوئے پائے گئے۔ حالانکہ مالوا اور بہار میں افیون ایک قائم شدہ صنعت تھی۔ جہاں تک نشیلی مشروبات کا سوال ہے تو ہندوستان کے بہت سے حصوں مین تاڑی، مہوا اور گڑ کے تیار شدہ نشیلی مشروبات تھے۔

17.3 معدنیات، کان کنی اور دھاتیں (Minerals, Mining, and Metals)

ہندوستان میں سولہویں اور سترہویں صدیوں کے درمیان بہت گہری کان کنی نہیں کی جاتی تھی، لیکن معدنیات اور دھات کی ایک بڑی تعداد کے لیے سطح کی کان کنی کا رواج تھا۔ مؤرخین کے مطابق ہندوستان کی معیشت کے شعبوں میں سے ایک کمزور شعبہ معدانیات کی پیداوار تھی۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ اس کی کمزوری کی وجہ یہ تجویز کی ہے کہ بڑی حد تک معدنیات اور ایندھن کے وسائل کے ناکافی جوڑ کا نتیجہ

تھا۔اس کے علاوہ گہری کان کنی کی تکنیکیوں سے ناواقفیت بھی ایک وجہ رہی ہوگی۔

17.3.1 معدنی پیداوار (Mineral Production)

معدنی پیداوار مین نمک ایک ضروری شے تھی جس میں ہندوستان خود کفیل نظر آتا ہے۔نمک حاصل کرنے کے مختلف ذرائع تھے جیسے راجپوتانا کی سمبھر جھیل، پنجاب میں موجود سیندھا نمک کی چٹّانوں کی کانیں، اور سمندری پانی سے حاصل ہونے والے ذرائع۔ سمندری نمک بنیادی طور پر سندھ، رن آف کچھ، گجرات کے دیگر ساحلوں، مالابار، میسور اور بنگال وغیرہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ چونکہ نمک ہندوستان کے کچھ مخصوص علاقوں دستیاب تھا،اس لیے یہ علاقائی اور تجارتی لحاظ سے تجارت کی اہم چیزوں میں سے ایک تھا۔شورہ ،معدنیات میں سے ایک اہم صنعت تھی جسکی یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ اس کا استعمال بارود کے اجزاء کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ابتدائی طور پر شورا احمد آباد کے برودم وغیرہ سے نکالا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی کھپت کی مانگ پورا نہیں کر سکتی تھی،اس لیے اس کو دہلی، آگرہ کے علاقے میں بھی بنایا جانے لگا۔ حالانکہ سترہویں صدی کے دوسرے نصف تک، بہار کا ضلع پٹنہ شورا کی خرید و فروخت کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ پٹنہ کے قریبی مقامات سے جمع کیے گئے شورا کو پھر کشتیوں کے ذریعہ گنگا کے نیچے ہگلی بھیجا جاتا تھا۔اور وہاں سے یوروپ میں برآمد کیا جاتا تھا۔ ٹیورنیر کا بیان ہے کہ ہالینڈ سے درآمد شدہ برتن میں پانی ابالتے تھے۔ ایک مٰاخذ کے مطابق تو سال 1688 میں تقریباً دو لاکھ من کچے شورے کی پیداوار صرف بہار سے ہوی تھی۔جب کہ دیگر معدنیات جیسے پھٹکری،اور ابرک چھوٹے پیمانے پر تیار کیا جاتا تھا۔

17.3.2 دھات (Metal)

در حقیقت ہندوستان میں سونے اور چاندی کے کانیں نہیں تھیں۔ سونے اور چاندی کی مقدار بہت کم تھی، کیوں کہ ان کی اقتصادی اہمیت بہت کم تھی۔ ابھی تک کولار کی مشہور سونے کی کانیں تھیں۔ندیوں کی بستروں سے تھوڑے مقدار میں سونے کی ضرورت پوری کی جاتی تھی، لیکن یہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ یوروپی سیاح فچ نے بہار کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہاں ندیوں کی ریت کو دھو کر سونے کی دھول تلاش کیا جاتا تھا۔اسی طرح ہندوستان کے کچھ دوسرے علاقوں میں بھی ندیوں کے بستروں میں سونا پایا جاتا تھا۔ چاندی کی زیادہ تر ضروریات باہر کے ملکوں سے درآمد کے ذریعہ پوری کی جاتی تھی۔ سونا اور چاندی سکوں کے ٹکسال کے لیے استعمال ہوتے تھے۔اس کی ایک بڑی مقدار زیورات بنانے اور قیمتی دھات کے طور پر ذخیرہ اندوزی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جہاں تک تانبے کی بات ہے تو راجستھان تانبے کی پیداوار کا مرکزی علاقہ تھا، جہاں کھیتری نامی مقام میں تانبے کی کانیں موجود تھیں۔اس دھات کا ایک بڑا مقدار تانبے کے سکوں کی ٹکسال کی لیے استعمال ہوتا تھا۔اس کے علاوہ گھر کی چھوٹی بڑی چیزیں بھی اسی دھات سے بنائی جاتی تھیں۔

تمام دھاتوں میں لوہا سب سے زیادہ مقدار میں پائی جانے والی دھات تھی۔اس کی کانیں ہندوستان کے شمالی، مشرقی، مغربی، وسطی اور جنوبی حصوں میں وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ دھات کی کانیں مغل سلطنت کے مختلف صوبوں جیسے، بنگال، بہار، الہ آباد، آگرہ، بیرار، گجرات، دہلی اور کشمیر میں پائی جاتی تھیں۔ اسکے علاوہ یہ دھات بہار میں چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ کے ملحقہ علاقوں مین بھی بڑے مقدار میں پایا جاتا

تھا۔ حالانکہ جنوب میں پایا جانے والا لوہا فولاد میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے استعمال ہل، کلہاڑی، کیل، پیچ، تلوار، خنجر بنانے میں ہوتا تھا۔ جنوب میں خاص طور پر گولکنڈہ میں تیار کردہ اسٹیل کو دمشق کی تلواریں بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، جسکی دنیا بھر میں تعریف کی جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہتھیاروں کے بہت زیادہ مانگ کو دیکھتے ہوئے، ہندوستان لوہے میں خود کفیل تھا۔ ہندوستان می لوہے کی فراوانی اور اس کی بیرون ملکوں میں برآمدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1660 کی دہائی میں ڈچوں نے کورومنڈل سے بتاویہ تک لوہے کی مصنوعات کو برآمد کرنا شروع کیا تھا۔ پیداوار کی مقدار اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1667 میں ہندوستان سے 105000 پاؤنڈ کیل، 188000 پاؤنڈ توپ کے گولے، 189000 پاؤنڈ لوہے کی سلاخیں اور 10000 پاؤنڈ لوہے کی بستر برآمد کیے گئے تھے۔ ان تمام دھاتوں کے علاوہ کچھ دوسرے دھاتیں، اگرچہ ان کی مقدار تھوڑی تھی، بھی بنایا جاتا تھا، جیسے سیسہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔

17.3.3 ہیرے (Diamonds)

ہندوستان کی ایک اور چیز جو تمام غیر ملکی مبصرین کے تصور سے باہر تھی وہ ہیرا تھا، حالانکہ ملکی معیشت میں اس کی اہمیت شاید زیادہ نہ تھی، لیکن یہ ایک ایسی صنعت تھی جس نے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف راغب رکھتا تھا۔ ہیروں کی کانوں میں سب سے اہم گولکونڈہ اور بیجاپور کی کانیں تھیں۔ حالانکہ چھوٹاناگپور میں ہیرے کی ایک چھوٹی مقدار بھی ندیوں کے کنارے سے جمع کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات میں برار کے بیڑاگڑھ، مدھیہ پردیش کے پنّا میں بھی ہیرے کی کان کنی کی جاتی تھی۔

17.4 لکڑی پر مبنی دستکاری (Wooden Crafts)

لکڑی پر مبنی دستکاری نے ایک بڑی تعداد میں مختلف قسم کی دستکاری کی بنیاد رکھی۔ اس سے بنے والے سامان میں پالکیوں اور بیل گاڑیوں کے سطح شامل تھیں۔ یہ دونوں سامان مختلف انداز سے بنائے جاتے تھے جسے امیر طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ انہیں تراش کر سجایا جاتا تھا۔ لکڑی ایک بڑی تعداد میں کشتی اور سمندری جہازوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ اس کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ ہندوستان ایک طویل ساحلی علاقے گھرا ہے اور شمالی ہندوستان بھی بڑی تعداد مین ندیوں سے گزرتا ہے۔

کشتیاں مختلف قسم کی بنائی جاتی تھیں۔ تفریحی سفر کے لیے چھوٹی کشتیوں سے لے کر بڑے سمندری جہاز جو ہزاروں کلو گرام سامان لے کر ایک طویل سفر پر جاتا تھا۔ بحرے عرب کے ساتھ ساتھ خلیج بنگال کی بدرگاہیں جیسے ٹھٹّا، سورت، بیسین، گوا، کرانور، کوچن، مسولی پٹنم اس کے پڑوس میں نورس پور، ہریپور، ستگاؤں اور چٹاگاؤں جہاز سازی کے اہم مراکز تھے۔ جب یوروپین تاجروں کی تجارتی سرگرمیاں تیز ہوئیں وہ لوگ انہیں مقامات پر اپنے جہاز کی مرمت کراتے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستانی بحری جہازوں کو مشرقی سمندری علاقوں کے لیے بہتر بنایا۔ اسی لیے وہ لوگ ہندوستان میں تیار کردہ جہاز خریدتے تھے۔ اس لیے سترہویں وار اٹھارویں صدی کے اوائل میں اس صنعت کو کافی فروغ ملا۔ لکڑی کے دیگر استعمال، دروازے، کھڑکیاں، اور گھریلو فرنیچر کی ایک بڑی تعداد جیسے بکس وغیرہ کو بنانے میں ہوتا تھا۔

17.5 متفرقات (Miscellaneous)

عہد وسطی کے ہندوستان میں دستکاریوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان تمام کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ ہر علاقے کی اپنی کچھ مخصوص دستکاری تھیں۔ یہاں صرف چند اہم دستکاریوں کا ذکر کیا جائے گا۔ان میں سے پتھر کاٹنے، کاغذ بنانے، برتن بنانے، شیشے وغیرہ سے سامان تیار کرنے کی دستکاریاں اہم تھیں۔ پتھر کاٹنے کی دستکاری کو ایک اہم ہنر سمجھا جاتا تھا کیونکہ پتھر کا استعمال گھروں شاہی محلیں، قلعے، مندروں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر میں بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی معمار جن کا پیشہ پتھر کاٹنا یا تراشنا تھا،اپنی کاریگری میں مہارت کے لیے پورے دنیا میں مشہور تھے۔اس کے علاوہ غیر زرعی پیداوار کی دیگر اشیاء میں چمڑے سے بنے سامان جیسے جوتے، چپل، کتاب کی جلد بندی وغیرہ ملک بھر میں بنائی جاتی تھی۔کاغذ کی دستکاری بھی اس عہد میں ایک اہم صنعت تھی۔ ہندوستان کے مختلف علاقے اور شہر کاغذ بنانے کے اہم مراکز تھے،ان شہروں میں احمد آباد، دولت آباد، لاہور، سیال لکوٹ، بہار شریف شامل تھے۔ جبکہ احمد آباد میں کئی اقسام کے کاغذ تیار کیے جاتے تھے جسکو عرب، ترکی اور ایران کو برآمد کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ کشمیر کا کاغذ بھی کافی مشہور تھا۔ شمالی ہندوستان میں بھی کئی جگہوں پر کاغذ بنایا جاتا تھا جسکا مقامی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ جنوبی ہندوستان میں کاغذ بنانے کی صنعت بہت ہی محدود تھی۔کاغذ زیادہ تر حصہ ہاتھ سے بنا ہوا اور موٹے قسم کا ہوتا تھا۔ ہمعصر مأخذ میں مٹی کے برتن بنانے کے حوالے ملتے ہیں، جسے لوگ کھانا پکانے، پانی اور اناج وغیرہ کو ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان کے ہر گاؤں میں کمہار ہوتے تھے۔ مٹی کے موٹے برتنوں کے علاوہ اچھے قسم کے ظروف بھی بنائے جاتے تھے۔منوچی نے مٹی کے ایسے ظروف کا ذکر کیا ہے جو شیشے سے زیادہ باریک اور کاغذ سے ہلکے ہوتے تھے۔مارشل نے بھی ہندوستان میں عمدہ قسم کے ظروف دیکھے تھے۔ مٹی سے بنے ٹائل (کھپریل) کا استعمال گھر کی چھتوں میں کیا جاتا تھا۔ان تمام دستکاریوں کے علاوہ،ہندوستان کے کئی حصوں میں شیشے سے بنائے جانے والے سامان کی صنعت کا آغاز ہوا۔ان تمام مصنوعات کے علاوہ،ہندوستانی کاریگر دیگر متفرق اشیاء جیسے صابن، ہاتھی دانت، خول اور سینگ سے بنے سامان بھی شامل تھے۔ کئی دستکاریوں کا انحصار جنگلات پر تھیں مثلاً چوڑیوں اور کھلونے لک سے بنائے جاتے تھے

17.6 پیداوار کی تنظیمیں (Production Organisations)

دور وسطی کے ہندوستان میں ایک عام اور آزاد کاریگر سے کارخانوں میں کام کرنے والے تمام دستکار کے کاریگر موجود تھے۔ حلانکہ دستکاریوں اور صنعتوں میں اس کی ضروریات کے مطابق مختلف ہوتی تھیں۔

17.6.1 گاؤں کے کاریگر اور رزق پر مبنی پیداواری نظام
(Village Artisans and Subsistence-based Production System)

کاریگروں کی ایک قسم وہ تھی جو دیہی علاقوں مین روزمرہ استعمال ہونے والے سامان تیار کرتے تھے۔ یہ کریگر گاؤں کے جممانی نظام کا باقاعدہ حصہ ہوتے تھے۔ گاؤں میں سب سے اہم خدمات لوہار، بڑھئی، کمہار اور جوتے بنانے والوں کی ہوتی تھی۔ عام طور سے ان تمام

کریگروں کو بنیادی اوزار، زرعی آلات اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ادائگی کی جاتی تھی۔ یہی نظام دکن اور مہاراشٹر میں زیادہ منظم تھی جہاں گاؤں کے کاریگروں اور نوکروں کو بالوتیدار کہا جاتا تھا، دکن کے کچھ علاقوں میں محنت کشوں کا ایک اور گروہ تھا جسے آلوتیدار کہتے تھے۔ دیہی علاقوں میں کرنسی کی معیشت اور دستکاریوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے رزق پر مبنی اس نظام میں بھی تبدیلی شروع ہوگئی۔ تپن رائے چودھری کا خیال ہے کہ غالباً اٹھارویں صدی کے وسط تک طویل اور درمیانی دور کی تجارت کے لیے پوری پیداوار کا انحصار ان کاریگروں پر تھا جو پہلے تو ججمانی نظام سے ملحق تھے، لیکن اب وہ یہ لوگ پوری طرح سے آزاد تھے۔ ہندوستانی دستکاریوں کی مانگ میں اس طرح اضافہ ہوا کے دیہی کاریگر شہری بازاروں کی ضروریات کو بھی پورا کرنے لگے تھے۔ مؤرخین کا یہ بھی خیال ہے کہ گاؤں کے کاریگر اتنے متحرّک تھے کہ صرف پہلی کی طرح ایک ہی گاؤں میں نہیں رہتے تھی بلکہ ایک سے دوسرے گاؤں بھی جایا کرتے تھے۔

17.6.2 بازار کے لیے پیداوار (Production for Marketing)

جو سامان بازار کے لیے تیار کیا جاتا تھا اس کا انحصار بنیادی طور پر منحصر کاریگر پر تھا۔ تقریباً ہر ایک دستکاری میں کوئی خاص کریگر فروخت کے لیے سامان تیار کرتے تھے۔ ایک ڈچ سیاح، پیلسارٹ کا ذکر ہے کہ کاریگروں کی تقریباً سو خصوصی قسمیں مختلف دستکاریوں میں کام کرتی تھیں۔ اس طرح کی اعلی سطح کی خصوصیت ملبوسات کی صنعت میں زیادہ واضح دکھتا ہے۔ ہر عمل مختلف کاریگروں کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا۔ مثلاً کارڈ بندی (اون یا ریشہ صاف کرنے کا عمل) سوت کاتنا، ریشم کے دھاگے کو سمیٹنا، کپڑے کی بنائی، بلیچنگ، رنگ کاری، کپڑے کی پرنٹنگ اور تصویر سازی وغیرہ کچھ ایسے کام تھے جسکے لیے اس کام لیے خاص کاریگر ہی کام کو انجام دیتے تھے۔ اس معاملے میں دیہات کے کسان مختلف پیداواری سرگرمیوں کے ذریعہ اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ تقریباً زراعت پر مبنی تمام دستکار جیسے، نیل، چینی، سوتی دھاگے کی کتائی، بشمول نمک اور شورا کی پیداوار کے لیے گاؤں اہم مرکز تھے۔ دراصل دستکار تیار کرنے کی محل پزیری اس عہد کی معیشت کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ پہلے یہ ذکر ہوا ہے کہ مختلف علاقے کچھ دستکاریاں تیار کرنے کی لیے خاص تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یوروپین تاجروں کو مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا تھا۔ مسولی پٹنم اور بنارس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں 7000 بُنکر تھے۔ اسی طرح قاسم بازار مین 2500 کے قریب ریشم کے بُنکر رہتے تھے۔ جب کاریگر انفرادی سطح پر سامان تیار کرتا تھا تو، انھیں خود ہی خام مال اور اوزار خریدتے، سامان تیار کرتے اور اسے فروخت کرتے تھے۔ ایسے معاملے میں دسترکاری تیار کرنے کی جگہ خود کاریگار کا گھر ہوتا تھا۔ چونکہ انفرادی کاریگروں کے پاس سامان تیار کرنے کے لیے بہت ہی کم سرمایہ ہوتا تھا، اس لیے انفرادی پیداوار کم تھی، جسکی وجہ سے تاجروں کو تیار شدہ سامان حاصل کرنے لیے کافی مشقت کرنی پڑتی تھی، اور سامان کا معیار بھی مختلف تھا۔

17.6.3 دادنی (Dadani)

فارسی میں لفظ 'دادن' کا مطلب دینا ہوتا ہے، اسی سے دادنی کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ مغل عہد میں اس کا مطلب رقم کی ادائگی تھی جسے تاجر کریگروں کو تیار شدہ دستکار سے پہلے سامان خریدنے لیے دیتا تھا۔ اور بدلے میں کاریگر تاجروں کو ایک مقررہ قت پر تیار شدہ سامان

دینے کا وعدہ کرتا تھا۔ مؤرخین نے اسے انگریزی میں پُٹنگ آؤٹ سسٹم (putting-out-system) کی اصطلاح دیا ہے۔

دراصل یہ ایک معاشی نظم تھا جو جمانی نظم کے پیداواری مسائل کی وجہ سے وجود میں آیا۔ دادنی نظام میں تاجر اپنی تصریحات کا حکم دینے کی حالت میں نہیں ہوتا تھا۔ ملبوسات کے شعبے میں یہ نظام اس قدر پھیل گیا تھا کہ دستکاروں کو بغیر پیشگی رقم کی ادائگی کے کپڑا حاصل کرنا مشکل تھا۔ حالانکہ سترہویں صدی کے دکن میں بنائی کی صنعت پر تاجروں کا غلبہ تھا۔ الائیو کے مطابق، دستکاروں کے تجارتی سرمایہ کے تابع کرنے کا رواج کافی وسیع تھا۔ جبکہ عملی طور سے کورومنڈل کے ساحل پر بسی کاریگروں کی تمام بستیاں کسی نہ کسی تاجر کے قبضے میں تھیں۔ سترہویں صدی میں ایسے بڑے تاجروں میں سے کاسی وِرنّا نامی ایک تاجر تھا، جس کے قبضے میں پُلکٹ کو سوا مدراس سے آرمگاؤں تک کا ساحلی علاقے تھے۔ اس علاقے کے بُنکروں کی بستیوں کو وِرنّا گاؤں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن دادنی کے نظام نے ایک طرف تو خریدار یا تاجروں کو سامان کا معیار اور مقدار تعین کرنے کا اختیار دے دیا تھا، تو دوسری طرف کاریگروں کو تیار کردہ سامان کی فروخت کی ضمانت کے ساتھ خام مال خریدنے کے لیے ضروری قم مل گیا تھا۔ لیکن اسی وجہ سے کریگروں کا سامان کے فروخت پر اپنا اختیار ختم ہو گیا تھا۔

17.6.4 فیکٹری (Factory)

جدید اصطلاح میں فیکٹری ایک ایسے خاص مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگ گروہ میں ایک جگہ جمع ہو کر بازار کے لیے سامان تیار کرتے ہیں۔ اس طرح کی کچھ مثالیں عہد وسطی کے ہندوستان میں بھی ملتیں ہیں۔ جو اس وقت کی ہندوستانی معیشت کی اہم خصوصیت تھی۔ فیکٹری کے قیام کی پہلی مثال 21-1620 میں انگریزوں کے ذریعہ بہار کے پٹنہ میں قائم کردہ فیکٹری سے دی جاتی ہے، جب انگریزوں نے ریشم کے دھاگے کو لپیٹنے کے لیے پٹنہ میں تقریباً سو مزدوروں کو ملازمت دی تھی۔ اس طرح کی دوسری فیکٹری ڈچوں نے بھی قاسم بازار میں قائم کیا تھا جہاں ریشم کے کارخانے میں 800-700 بُنکروں کو ملازمت دی تھی۔ حالانکہ ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ان دو فیکٹری کے علاوہ جہاز سازی اور تعمیری کام ایسے شعبے تھے جہاں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو ایک جگہ پر کام کرنے کے لیے جمع کیا جاتا تھا۔ دکن اور جنوبی ہندوستان میں کاریگروں کی ایک بڑی تعداد تقریباً جہاز سازی کے تمام مراکز میں ہر جہاز پر ایک کی شخص کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ اسی طرح تعمیراتی کام میں بھی جہاز سازی جیسی کام کرنے کے لیے کاریگروں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ اسی طرح کان کنی اور شورہ تیار کرنے کی صنعت بھی دو ایسے شعبے تھے جہاں مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کام کرتی تھی۔ گولکونڈا اور دکن کی ہیروں کی کانیں مثال کے حوالے ہمعصر مأخز میں ملتے ہیں، مثلاً گولکونڈا اور دکن کی کانوں میں کان کنی موسم میں تقریباً تیس سے ساٹھ ہزار لوگ کرتے تھے۔ ہیروں کے متلاشی اس زمین کے حصے کو حکمرانوں سے کرائے پر لے لیتے تھے، جو اس زمین کے حصوں پر کام کرنے کے لیے دو سے تین سَو کان کنوں کو ملازمت دیتا تھا۔ کان کنوں کو یومیہ مزدوری دی جاتی تھی۔ اسی طرح بہار میں دسمبر سے جنوری جو کان کنی کا موسم تھا تقریباً آٹھ ہزار لوگ ہیروں کی کانوں میں کام کرنے آتے تھے۔ یہ کان کن عموماً کسان اور مزدور ہوتے تھے جو اپنے کھیت بونے کے بعد ان کانوں میں کام کرنے آتے تھے۔ شورہ کی صنعت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے گروپ میں ایک ایک شخص کی نگرانی میں کام کرتے تھے، جسے بہار میں نونا س کہا جاتا تھا۔ شورہ کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے ڈچوں اور انگریزوں نے شورہ کی صفائی کے لیے اپنی اپنی اکائیاں قائم کر لیا تھا۔ ان

اکائیوں میں مزدوروں کو کمپنیوں کے فراہم کردہ سامان کے ساتھ کام کرنا ہوتا تھا۔

17.6.5 کارخانہ (Karkhana)

کارخانہ دور وسطی کی پیداوار کی ایک منفرد خصوصیت تھی، جس کا سلسلہ چودھویں اور پندرہویں صدی سے چلا آرہا تھا۔ یہ کارخانے کا نظام، طبقہ امراء کا اہم حصہ ہوا کرتا تھا۔ان کارخانوں میں شاہی گھرانے اور دربار میں استعمال ہونے والی چیزیں تیار کی جاتی تھی۔ حالانکہ بہت سے اعلی امراء کے ذاتی کارخانے بھی تھے۔ان کارخانوں میں عام طور سے قیمتی اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔ کافی ماہر کاریگروں کو ضروریات کی چیزیں بنانے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ان کی نگرانی ریاستی آفسر کرتے تھے۔ان کارخانوں کے بارے میں یہ علم ہونا بھی ضروری ہے کہ ان کی ضرورت کیوں تھی۔ان کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ کریگر خود اس حالت میں نہیں تھے کہ وہ شاہی ضرورتوں کے لیے درکار موٹی رقم لگا سکے۔اس کے علاوہ قیمتی خام مال کی وجہ سے ریاست بھی انہیں کاریگروں کو ان کی اپنی جگہ پر کام کرنے لے لیے نہیں دینا چاہتی تھی۔ان شاہی کارخانوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کے ان میں تیار کیے جانے والے سامان بازار میں خرید وفروخت کے بجاے بادشاہوں اور امراء کے ذاتی استعمال کیے جاتے تھے۔

17.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دور وسطی میں زرعی معیشت کی طرح ہی غیر زرعی معیشت بھی کافی اہمیت کی حامل تھی۔اس اکائی میں ہم نے ہندوستان کی غیر زرعی معیشت کے ضمن میں مختلف خام مال پر مبنی دستکاروں اور صنعتوں کے مراکز انہیں تیار کرنے والے سماجی طبقات اور بنانے کے طریقہ کار کے ساتھ ساتھ ان دستکاروں سے ملحق تنظیموں پر گفتگو کیا ہے۔تاکہ قاری ان تمام دستکاروں کی اپنی خصوصیات اور کو اہمیت اور انکے غیر ملکوں برآمدات کے بارے میں علم ہو سکے۔ مندرجہ بالا کے صفحات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں ملبوسات کی دستکاری اور صنعت کو خاص طور پر سوتی ملبوسات کو کافی وسیع پیمانے پر فروغ ملا تھا۔دیگر صنعت کو جسے سوتی ملبوسات کے بعد فروغ ملا ان میں زراعت پر مبنی صنعتیں جیسے نیل اور چینی یا شکر شامل تھیں۔ گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان صنعتوں کا اس عہد کی ہندوستانی معیشت میں کافی اہم کرادر تھا۔غیر زرعی پیداوار میں نمک کی پیداوار گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی، جبکہ شورہ ایک اور اہم صنعت تھی جسے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں تیار کیا جاتا تھا۔اس نظریہ سے ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام چیزیں نتیجتاً برآمدات کے لیے کافی مقدار میں موجود تھی۔لوہے اور تانبے سے تیار کردہ سامان بھی کافی مقدار میں تیار کیے جاتے تھے۔، جبکہ انکے بالمقابل برار چاندی کی پیداور غائب تھی۔

اس عہد کی صنعتی معیشت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان میں جہاز سازی کی صنعت کی بھی بہت ترقی ہوئی۔چیزوں کو تیار کرنے کے ذرائع سے متعلق مندرجہ بالا گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غیر زرعی شعبے میں دستکاریوں کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ انفرادی کاریگر کے ذریعے کی جاتی تھی۔حالانکہ کچھ شعبوں جیسے شورہ اور ہیرے کی کان کنی میں، ہیرے کی تلاش انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ کانوں میں کاریگروں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد نے مشترکہ نگرانی میں مشترکہ طور پر کام کرتے تھے۔اسی طرح موجودہ دور کی فیکٹری نظام کی

بھی دور وسطی میں کچھ جھلکیاں ملتی ہیں، جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ریشم کو سمیٹنے کے لیے کارخانے قائم کرنے کی چند تجربات تو کیے گئے۔ لیکن انہیں بہت کم کامیابی ملی۔ سامان تیار کرنے اور کاریگروں اور مزدوروں کو انکے کام کے بدلے رقم فراہم کرنے کا نظام اچھا تھا۔ اس کے علاوہ شاہی کارخانے بھی تھے جہاں عیش و آرام کی قیمتی اشیاء بجاے بازار میں فروخت کے شاہی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔

17.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

دادنی : تاجروں کے ذریعہ کاریگروں کو سامان تیار کرنے کے لیے دی نانے والی پیشگی رقم جسے انگریزی میں Putting-Out-System کہتے ہیں۔

کارخانہ: بازار یا شاہی ضروریات کے استعمال کے لیے سامان تیار کرنے والی جگہ۔

17.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

17.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سوتی ملبوس تیار کرنے والے چند اہم مراکز کا نام بتایۓ۔
2. عہد وسطی میں کن مقامات کی نیل اچھی معیار کی ہوتی تھی؟
3. شورہ بنانے کا طریقہ کار کیا تھے؟
4. دادنی نظام پر پانچ جملے لکھیے۔
5. سوتی ملبوسات کی کچھ اقسام کے نام بتایۓ۔
6. عہد وسطی میں کریگروں کن جگھوں پر ایک شخص کی نگرانی میں کام کرتے تھے؟
7. کون کی معدنیات ہندوستان میں سب سے زیادہ پایا جاتا تھا؟
8. عموماً گھروں میں مٹی کی کون کی دستکار کا استعمال ہوتا تھا۔
9. ہیرے کی کان کنی پر دس جملے لکھیے۔
10. کاغذ کی صنعت پر دس جملے لکھیے۔

17.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تامبا پاۓ جانے والے مقامات اور اس سے تیار کردہ سامان پر کچھ جملے لکھیے۔
2. اونی دستکار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

3. دھاگا تیار کرنے کی صنعت پر کچھ جملے لکھیے۔

4. شورہ کی صنعت پر ایک نوٹ لکھیے۔

5. شاہی کارخانے اور فیکٹری کے درمیان بنیادی فرق کیا تھا؟

17.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سوتی ملبوس کی صنعت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. ہندوستان میں پائی جانے والی کچھ دھاتوں پر بحث کیجیے۔

3. سترہویں صدی میں دستکاریوں میں کس طرح کی تبدیلیاں آئیں تھیں، بیان کیجیے۔

17.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Irfan Habib and Tapan Raychaudhuri, (eds.), *The Cambridge Economic History of India*, Vol. 1, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
2. Irfan Habib, *Agrarian System of Mughal Empire*, 1526-1707, Oxford University Press, New Delhi, 2013.
3. John F. Richard, *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, New Delhi, 2016.
4. Satish Chandra, *Medieval India: From Sultanate to the Mughal Empire (1526-1748)*, Part 2, Har-Anand Publication, New Delhi, 2004.
5. Shireen Moosvi, *The Economic History of the Mughal Empire, c. 1595*, Oxford University Press, New Delhi, 2015.

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
Estd. 1998

اکائی 18۔ مراٹھااقتدار کا عروج

(Emergence of Maratha Power)

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید
18.1 مقاصد
18.2 پس منظر
18.3 مراٹھا سلطنت کے قیام کے اسباب
18.3.1 شیواجی اور ان کی ابتدائی فتوحات
18.3.2 سلطنت کا استحکام اور تاجپوشی
18.3.3 شیواجی کے جانشین اور ان کے اختلافات
18.4 پیشواؤں کا عروج
18.4.1 عروج کے اسباب
18.4.2 بالاجی وشوناتھ
18.4.3 باجی راؤ اوّل
18.4.4 بالاجی باجی راؤ
18.5 اکتسابی نتائج
18.6 کلیدی الفاظ
18.7 نمونہ امتحانی سوالات
18.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
18.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
18.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
18.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی تاریخ میں مراٹھا سلطنت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مغلوں کے زوال نے جو سیاسی خلا پیدا کیا تھا اس کو پُر کرنے کی ان میں صلاحیت بھی تھی اور حالات بھی موافق تھے۔ مراٹھا ریاست کا بانی شیواجی ایک فاتح مدبر اور عمدہ منتظم تھا۔ پیشواؤں کے دور میں مراٹھوں کو عروج حاصل ہوا اور شمالی ہند تک گھوڑے دوڑاتے رہے۔ جنوب میں میسور، حیدرآباد اور ان کے حکمرانوں کے ساتھ ان کے ٹکراؤں نے صورتِ حال پیچیدہ بنادی تھی۔ بالآخر 1761 میں افغان حکمران احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں ان کی طاقت توڑ دی۔ حالانکہ اس کے بعد یہ پھر اُٹھ کھڑے ہوئے مگر پورے ملک پہ حکومت کرنے کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔

18.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مراٹھا سلطنت کے قیام کے اسباب اور حالات کو سمجھ سکیں گے۔
- شیواجی کی زندگی اور ان کی فتوحات سے واقف ہو جائیں گے۔
- دیگر ہمعصر طاقتوں کے ساتھ مراٹھوں کی جدوجہد کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مراٹھا طاقت کے زوال میں کارفرما عناصر کی نشان دہی کر سکیں گے۔

18.2 پس منظر (Background)

مغلوں کی مرکزی حکومت میں پیدا مختلف کمزوریوں نے علاقائی ریاستوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ مراٹھوں کے عروج میں بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ جن میں دکن کی جغرافیائی کیفیت، وہاں کے باشندوں کی جفاکشی، جنوب کا سماجی تانا بانا جہاں ذات پات کا نظام شمالی ہند کی طرف سخت نہیں تھا اور دیگر ریاستوں میں امرا اور حکمرانوں کی گروہ بندیاں اہم ہیں۔ ان حالات میں شیواجی اور بعد میں پیشواؤں کی باصلاحیت قیادت نے ایک مضبوط اور منظم ریاست قائم کی۔

18.3 مراٹھا ریاست کے قیام کے اسباب

(Causes for the Establishment of the Maratha State)

مراٹھا طاقت کا عروج نہ تو کسی ایک شخص کی کوششوں کا مرہون منت تھا اور نہ ہی کسی خاص موقع پر پیدا کسی عارضی صورت حال کی دین تھا۔ درحقیقت ان کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے میں کوئی ایسے عوامل و عناصر تھے جو اپنی ذات میں مستقل تھے۔ ہم ایک ایک کرکے ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

1. مہاراشٹر کی جغرافیائی صورت حال: مہاراشٹر کا بڑا حصہ پٹھاری ہے۔ یہاں محفوظ اور بہتر طریقہ سے زندگی گذارنے کے لیے قدرت سے

سخت جدوجہد کرنا پڑتی ہے جس کے سبب یہاں کے رہنے والے محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں باہر سے حملہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ایک بڑی حملہ آور فوج کو یہاں بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔یہی نہیں دفاع کے نقطہ نظر سے یہاں بہت سی آسانیاں موجود تھیں ۔اس علاقہ میں آسانی سے پہاڑی قلعے بنائے جاسکتے تھے جس کو فتح کرنا مشکل ہوتا اور ان کی حفاظت آسان ہوتی۔پھر یہ علاقہ ملک کے وسط میں تھا یعنی شمال و جنوب کے درمیان واقع تھا۔اس سبب سے یہاں کے رہنے والے دونوں طرف پھیل سکتے تھے۔

2. آریہ جنوبی ہند میں کبھی مکمل تسلط حاصل نہیں کرسکے۔نتیجتاً یہاں دراوڑ اور آریوں کی نسلی آمیزش میں بڑی موافقت پائی جاتی ہے۔ یہاں کے باشندوں میں دونوں کی خوبیاں موجود ہیں۔یہاں لگان کا نظام رعیت واری رہا جس کے سبب معمولی کسان بھی زمین پر مالکانہ حق رکھتا تھا اور اس سے محبت کرتا تھا۔یہاں معاشی غیر برابری بھی ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں کم تھی۔تجارت پیشہ افراد کے علاوہ یہاں مالدار قوتوں کی تعداد بہت کم تھی۔چنانچہ معاشی استحصال بھی یہاں کم تھا۔مراٹھوں کے دور انتظام میں بھی مختلف علوم وفنون میں بہت ترقی نہیں ہوئی جس کا ایک سبب غربت بھی تھی۔عوام سادہ زندگی گذارتے تھے۔خود پیشواؤں کے رہائشی محل معمولی اور بے ڈھنگے پن سے بنے ہوتے۔ان کے سادہ طرز زندگی نے انہیں اس عیش و آرام سے بچائے رکھا جس کے سبب شمالی ہند میں کھوکھلا پن پیدا ہوچکا تھا۔اس علاقہ کے لوگ ذات و برادری کے اس دقیانوسی و پیچیدہ نظام میں اتنی سختی سے بندھے ہوئے نہیں تھی جو شمالی ہندوستان کا خاصہ تھا۔یہاں برہمن اور شودر بھی ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے جس کی مثال کسی دوسرے علاقہ میں آسانی سے نہیں ملے گی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے سماجی و مذہبی مصلحین نے ایکتا کے اس ڈور کو اور مضبوط کردیا تھا۔یہ تحریکیں کسی ایک طبقہ و مذہب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں بلکہ عوامی تھیں۔ایکناتھ، تکارام، رام داس جیسے مصلحین کے ذریعہ چلائی گئیں تحریکیں، ذات پات اور اونچ نیچ کے زبردست مخالف تھے جس کے سبب سماج میں ایکتا کے جذبات پیدا ہوئے۔

3. زبان کی اہمیت: مراٹھی زبان بول چال کے اعتبار سے سادہ اور سہل تھی، لیکن مراٹھی ادب کی ترقی اٹھارویں صدی سے پہلے نہیں ہوسکی۔زبان کی سادگی نے ہی یہاں کے باشندوں کو قریب لانے کا کام کیا۔

4. جنوب میں ہندو اور مسلم طاقتوں میں توازن قائم تھا۔دونوں میں سماجی اور معاشرتی ہم آہنگی قائم تھی۔شمالی ہند کے مقابلہ میں یہاں یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔

18.3.1 شیواجی اور ان کی ابتدائی فتوحات (Shivaji and His Early Conquests)

مراٹھا ریاست کے بانی شیواجی کا تعلق بھونسلہ نسل سے تھا۔ان کے اجداد احمد نگر کے نظام شاہی سلطان کے ماتحت گاؤں کے مکھیارہ چکے تھے۔20اپریل1627 کو شونیر کے قلعہ میں شیواجی کی پیدائش ہوئی۔اس وقت ان کے باپ شاہ جی بھونسلے بیجاپور کے دربار سے منسلک اہم جاگیر دار تھے۔شاہ جی بھونسلے نے دوسری عورت سے شادی کرلی جس کے سبب شیواجی کی ماں جیجا بائی اپنے شوہر سے الگ رہنے لگیں اور شیواجی کی پرورش کی ذمہ داری شاہ جی کے وفادار ملازم داداجی کونڈ دیو نے اُٹھائی۔شیواجی کے کردار پر ان کی ماں جیجا بائی اور داداجی

کونڈدیو نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ شیواجی لکھ پڑھ نہیں سکے مگر فوجی تربیت بہت اچھی طرح حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے اپنے باپ شاہ جی سے پونا کی جاگیر حاصل کی۔

شیواجی مضبوط قوتِ ارادی اور بلند حوصلہ کا مالک تھا۔ اس کی ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز دکن کا ماول علاقہ رہا۔ یہاں کے کولی اور مراٹھا نسل کے جفاکش و محنتی نوجوان شیواجی کے گرد اکھٹا ہوگئے اور آس پاس کے علاقوں پر حملے شروع کردیے۔ 1646 میں بیجاپور کے تورن کے قلعہ پر انہوں نے فتح حاصل کرلی اور اپنی جاگیر کو وسیع کرنے کا کام شروع کردیا۔1648 میں عیاری سے کام لے کر 'پورندر' کے مضبوط قلعہ پر قبضہ کرلیا اور 1656 میں جاؤلی کا قلعہ بھی شیواجی کی دسترس میں آگیا۔ اسی سال رائے گڑھ کے اہم قلعہ پر بھی ان کا پرچم لہرانے لگا۔ رائے گڑھ کو شیواجی نے اپنی راجدھانی بنایا۔ یہ فتوحات جو شیواجی نے دکن کے ہندو جاگیرداروں اور قلعہ داروں پر حاصل کیں ان کی مختلف النوع صلاحیتوں کی عکاس ہیں۔ ساتھ ہی ان میں اس بلند حوصلہ شخص کے ارادوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا تمام قلعے جو شیواجی نے حاصل کیے ریاست بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ صورتِ حال بیجاپور کے سلطان کے لیے تشویشناک تھی اور اس نے اس کے سدِّباب کے لیے اپنے ایک باصلاحیت اور اہم افسر افضل خاں کو مقرر کیا۔ ستمبر 1659 میں افضل خاں پندھارپور پہنچا۔ اس وقت شیواجی جاؤلی کے جنگلوں میں اپنا ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ افضل خاں نے براہِ راست مقابلہ کے بجائے شیواجی کو عیاری سے زیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لیے گفتگو شروع ہوئی اور پرتاپ گڑھ کے جنوب میں واقع گاؤں پار میں دونوں کی ملاقات طے ہوئی۔ 2 نومبر 1659 کو اس ملاقات میں شیواجی، افضل خاں کے اندازہ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا اور اس نے دھوکہ سے افضل خاں کو ماردیا۔ جس کے بعد بیجاپور کی فوجوں کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ شیواجی نے نہ صرف بہت سی دولت حاصل کی بلکہ کونکن اور کولہاپور سمیت بہت سے قلعوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ شیواجی کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے بیجاپور کے سلطان نے اس سے سمجھوتہ کرلیا اور اسے ایک خودمختار حکمران کی حیثیت سے قبول کرلیا۔

18.3.2 سلطنت کا استحکام اور تاجپوشی (Consolidation of the Empire, and Coronation)

شیواجی جی کے سیاسی مقاصد نے مغلوں سے ان کا ٹکراؤ لازمی کردیا۔ اپنی صوبیداری کے دور میں بھی اورنگ زیب مراٹھوں کو بالمقابل دیکھ چکا تھا۔ حکمران بننے کے بعد اس نے اپنے ماموں شائستہ خاں کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا۔ شائستہ خاں نے بیجاپور کے سلطان کی مدد سے پنہالا اور چاکن کے قلعوں کو چھین لیا۔ 1660 میں اس نے شیواجی کی راجدھانی پونا پر بھی قبضہ کرلیا۔ شائستہ خاں کی طاقت کے سامنے شیواجی نے اپنے کو بے بس پاکر اس سے چھٹکارہ پانے کے لیے 15 اپریل 1663 کو پونا میں واقع شائستہ خاں کے کیمپ پر شبخون ماردیا۔ اس اچانک حملہ سے مغل کیمپ میں افراتفری مچ گئی اور شائستہ خاں کو بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑی۔ اس حملہ نے شیواجی کی حیثیت اور مضبوط کردی۔ اس نے 1664 میں سورت کی بندرگاہ پر حملہ کرکے اسے لوٹ لیا۔ شیواجی کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر اورنگ زیب نے اپنے مشہور سپہ سالار آمیر کے راجہ جے سنگھ کو جنوبی ہندوستان میں اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ راجہ جے سنگھ نے بیجاپور کے سلطان سے سمجھوتہ کیا۔ 24 اپریل 1765 کو مراٹھوں سے وزیرگڈھ کا قلعہ چھین لیا۔ اپنی شکست اور کمزور حیثیت کو قبول کرکے شیواجی نے 22 جون 1665 کو مغلوں سے پورندر کی صلح کرلی۔ جس کی شرائط حسب ذیل۔

1. شیواجی نے 4 لاکھ ہن سالانہ آمدنی والے 23 قلعے اوران سے متعلقہ علاقے مغلوں کو سونپ دیے۔
2. ایک لاکھ ہن سالانہ آمدنی والے رائے گڈھ اور قرب وجوار کے 12 قلعے اوران کی زمین شیواجی کی ملکیت رہی۔
3. شیواجی نے اپنے بیٹے شمبھاجی کو مغل دربار میں بھیجنا قبول کیا۔ بادشاہ نے 500 کا منصب اور جاگیر شیواجی کو عطا کی۔
4. شیواجی نے مغل افواج کو دکن میں اپنی پوری اعانت کا وعدہ کیا۔
5. ان شرائط میں بعد میں یہ اضافہ کیا گیا کہ کونکن کی ترائی والی اور بیجاپور اور بالا گھاٹ کی بالائی زمین والی جاگیر اور فرمان شیواجی کو عطا کیا گیا اوراس نے اس کے بدلہ میں 40 لاکھ ہن 13 قسطوں میں مغلوں کو ادا کرنا منظور کیا۔

صلح نامہ کے تحت خود شیواجی اپنے بیٹے اور چندہ ساتھوں کے ساتھ مغل دربار میں حاضر ہوا۔ اورنگ زیب کا اپنے ساتھ شایانِ شان سلوک نہ ہونے پر شیواجی نے دربار میں بادشاہ کو ناراض کر دیا جس کے بعد انہیں قید کر دیا گیا۔ لیکن وہ وہاں سے اپنے بیٹے کے ساتھ دو ٹوکریوں میں چھپ کر فرار ہو گئے۔ لیکن کچھ وقت کے بعد اس نے پھر اورنگ زیب سے معافی مانگ کر صلح کر لی اور راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ لیکن مغلوں سے یہ کشا کش تھمی نہیں۔ 13 اکتوبر 1670 میں شیواجی نے سورت کو دوبارہ لوٹا۔ اور دکن کے مغل علاقوں سے چوتھ اور سردیش مکھی لینا شروع کر دیا۔ 1672 میں شیواجی نے اورنگ زیب کے سپہ سالار دلیر خاں اور بہادر خاں کو ملیہر کی جنگ میں شکست دی۔ اب وہ اپنی طاقت کے عروج پر تھے۔ چنانچہ 16 جون 1674 کو رائے گڈھ کے قلعہ میں بنارس کے وشویشر جی گاگھٹ کے ہاتھوں ان کی رسمِ تاج پوشی ہوئی اوران چھتر پتی کا خطاب اختیار کیا۔ جشن تاجپوشی کے بعد انہوں نے دوبارہ مغلوں پر حملہ شروع کر دیے۔ اس نے بگلانہ اور خاندیش پر حملہ کرکے مغل صوبہ دار قطب الدین خان کو شکست دی اور شہروں کو لوٹا۔ فروری 1675ء میں اس نے کولہاپور پر حملہ کیا۔ شیواجی نے بہادر خان سے معاہدہ کی جو بات چیت مارچ 1975 میں شروع کی تھی وہ ناکام ہوگئی۔ بہادر خان نے اسی سال بیجاپور سے سمجھوتہ کرکے شیواجی پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کو اورنگ زیب کی منظوری بھی مل گئی۔ اس کی زندگی کی آخری بڑی مہم کرناٹک کا حملہ تھی۔ جنجی، ویلور کے قلعہ حاصل کیے اور تنگ بھدرا سے کاویری تک اپنی فتوحات کو وسعت دے دی۔ دوسری طرف بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلوں کے حملے جاری تھے چنانچہ مغلوں کے خوف سے وہ اپنی راجدھانی لوٹ آیا۔ جہاں 13 اپریل 1680 کو 53 سال کی عمر میں اس کی جدوجہد بھری زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ شیواجی ایک جری، حوصلہ مند، جفاکش، اٹل ارادوں اور مضبوط قوتِ ارادی والا مہم جو شخص تھا جس نے مسلسل اور انتھک کوششوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا اور ایک طاقتور ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

18.3.3 شیواجی کے جانشین اوران کے اختلافات (Successors of Shivaji and Their Conflicts)

شیواجی کی موت کے بعد اس کی بیوی سوئیرا بائی نے راجہ رام کو گدی پر بٹھایا مگر وہ دونوں شمبھاجی کے ہاتھوں قید ہوئے اور تخت شمبھاجی کے حصہ میں آیا۔ وہ ایک تیز مزاج، مغرور اور عیش پسند آدمی تھا۔ اورنگ زیب کا بیٹا اکبر جب بغاوت کرکے جنوبی ہند آیا تو شمبھاجی نے اسے پناہ دی لیکن کوئی مدد نہیں کی۔ اورنگ زیب نے 1686 میں بیجاپور اور 1687 میں گولکندہ کی فتح کے بعد شمبھاجی پر دھیان دیا۔ 1688 میں شمبھاجی نے شکست کھائی اورنگ زیب کے سپہ سالار مقرب خاں نے فروری 1688 میں سنگمیشور کے قلعہ سے شمبھاجی کو

ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا جنہیں مارچ 1789 میں قتل کردیا گیا۔اس کے ساتھ ہی دکن اورنگ زیب کے زیر نگیں آگیا۔

شمبھاجی کے بعد 19 فروری 1789 کو راجہ رام گدی پر بٹھایا مگر اس نے خود کو شمبھاجی کے بیٹے شاہو کا نمائندہ کہا کیونکہ اس وقت شاہو مغلوں کی قید میں تھا۔1700 میں اپنی موت تک راجہ رام کا پورا وقت مراٹھوں کو متحد کرنے اور مغلوں سے جنگ کرنے میں گزرا۔ مراٹھا سردار کبھی کرناٹک میں ہوتے تو کبھی مہاراشٹر اور کبھی مالوہ اور گجرات تک پہنچ جاتے۔یہ دوران کا مغلوں کے ساتھ گوریلا جنگ کرنے میں گزرا۔اورنگ زیب کی عظیم فوج پر وہ چھاپے مارتے اور نقصان پہنچاتے رہے۔اورنگ زیب ان کی طاقت کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔اس دور میں راجہ رام کے گرد بہت سے باصلاحیت مراٹھا سردار اکٹھا ہو گئے تھے جنہوں نے اس جدوجہد کو جاری رکھا۔ بالآخر اس تگ ودو میں 12 مارچ 1700 کو 30 سال کی عمر میں راجہ رام کی موت ہو گئی۔راجہ رام کی موت کے بعد اس کی بیوی تارابائی نے اپنے 6 سالہ بیٹے کو شیواجی دوم کے نام سے تخت نشین کیا اور مغلوں سے جدوجہد جاری رکھی۔ وہ ایک باصلاحیت عورت تھی اور بخوبی مراٹھا سرداروں کی مدد سے لڑتی رہی۔1707 میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اول گدی پانے میں کامیاب ہوا۔اس نے شمبھا جی کے بیٹے شاہو کو آزاد کرکے مراٹھاواڑ واپس بھیج دیا۔اس کا خیال تھا کہ اس طرح کچھ لوگ شاہو کے طرف دار ہو جائیں گے اور مراٹھا سرداروں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ہوا بھی یہی کئی نامی سردار جن میں بالاجی وشوناتھ جو بعد میں پیشوا بنا اور منہیاجی سندھیا نے شاہو کا ساتھ دیا۔ تارابائی جو اپنے بیٹے شیواجی دوم کی تاجپوشی کرا چکی تھی،اس نے شاہو کو جائز حق دار ماننے سے انکار کر دیا اور ایک فوج اپنے باصلاحیت افسر دھنا جی جادو کی سرکردگی میں شاہو کو مہاراشٹر سے ہٹانے کے لیے بھیج دی۔ مگر شاہو نے دھنا جی کو اپنی طرف ملا لیا اور کھید کے مقام پر تارابائی کو شکست دی۔اس طرح 22 جنوری 1708 میں ستارہ میں شاہو کا جشن تاج پوشی ہوا۔دوسری طرف راجہ رام کی دوسری بیوی یشو بائی نے سازش کرکے تارابائی اور شیواجی دوم کو قید کرا دیا اور اپنے بیٹے شمبھاجی دوم کے ساتھ کولہاپور میں مراٹھا سیاست کا دوسرا مرکز بنا دیا۔ لیکن 1731 میں واریا کے مقام پر شاہو نے شمبھاجی دوم کو بھی شکست دی اور کل مراٹھا طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔1749 میں شاہو کی موت واقع ہوئی۔

شاہو آخری مراٹھا حکمراں تھا جس نے چھترپتی (راجا) کی حیثیت سے اپنے حقوق استعمال کیے۔اس کے جانشین برائے نام راجا تھے۔ اصلی اقتدار پیشواؤں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔سردیسائی کے مطابق شاہو مراٹھوں کا سب سے اہم حکمراں تھا۔وہ وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔اس وقت ایک ایسے حکمراں کی ضرورت تھی جو مغلوں سے اچھے تعلق رکھ سکے،آزاد خیال اور معتدل مزاج ہو،وزیروں اور افسروں پر اعتماد کر سکے اور دو مراٹھا خاندانوں کو ایک کر سکے اور یہ سب خوبیاں شاہو میں موجود تھیں۔وہ رحم دل تھا،اچھے لوگوں کو تلاش کرکے ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لینا جانتا تھا۔اولین تین پیشوا، بالاجی وشوناتھ، باجی راؤ اول اور بالاجی باجی راؤ کا تقرر اسی نے کیا تھا اور اقتدار وطاقت اُن کے ہاتھوں میں دے کر مطمئن رہا۔اس طرح پیشواؤں کو مکمل اقتدار سونپنے کے باوجود حکمراں اپنے اختیارات استعمال کرنے کے لائق بنا رہا اور پیشواؤں کے ساتھ اعتماد کی فضا بھی بحال رہی۔پیشوا بھی اسے عزت کا مقام دیتے رہے۔شاہو نہ تو ایک لائق سپہ سالار تھا اور نہ ہی باصلاحیت حکمراں ،اور یہ بات وہ بخوبی جانتا تھا۔اسی لیے نہ تو اس نے ملکی انتظام میں کوئی دلچسپی دکھائی اور نہ ہی کسی جنگ میں حصہ لیا۔وہ

پیشواؤں کی صلاحیت سے اچھی طرح واقف تھا اور اسی لیے ان کا حمایتی بنا رہا۔ یہاں تک کہ اقتدار کی طاقت ان کے ہاتھوں میں دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچایا۔ مغلوں کے تئیں بھی اس کا رخ نرم ہی تھا۔ وہ دلی اور ستارہ کے بیچ کوئی ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا۔ اس میں مذہبی رواداری تھی اور وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ جب تک شاہو زندہ رہا، پیشوا اس کی عزت کرتے رہے اور احکامات بجالاتے رہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد مراٹھا راجا کی برائے نام اہمیت بھی ختم ہوگئی۔ شاہو بلاواسطہ پیشواؤں کے عروج کے ساتھ ساتھ مراٹھوں کے زوال کا سبب بھی بنا۔ پیشوا سردار تھے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے سرداروں میں بھی طاقت کے حصول کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی جس نے بالآخر مراٹھا طاقت کو کمزور کردیا۔

18.4 پیشواؤں کا عروج (Rise of Peshwas)

18.4.1 عروج کے اسباب (Causes for the Rise of Peshwas)

جب شاہو نے اقتدار سنبھالا تو مراٹھا سیاست پیچیدہ صورتحال سے دوچار تھی۔ خانہ جنگی کو ختم کرنا، نظم و نسق قائم کرنا، ریاست میں امن بحال کرنا اور علاقے میں سیاسی بالادستی کے لیے مختلف طاقتوں میں ہونے والی جدوجہد میں اپنی جگہ مضبوط کرنا وغیرہ ایسے چیلنج تھے جن سے نبرد آزما ہونا نہ تو امن پسند شاہو کے بس کی بات تھی اور نہ ہی سخت مزاج و کمزور قوت ارادی والی تارا بائی یہ کام انجام دے سکتی تھی۔ شیواجی نے انتظام و انصرام کے نقطہ نظر سے جو وزیروں کی کونسل اشٹ پردھان قایم کی تھی وہ کمزور ساخت پر مبنی تھی اور اورنگزیب کے حملوں کے دوران اس کا وجود تقریباً مٹ چکا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ مراٹھا سردار آپس میں متصادم تھے، حکمراں کمزور اور انتظامی صلاحیتوں سے عاری تھا، سیاسی اور فوجی دونوں اعتبار سے انتشار کی سی کیفیت تھی ایسے میں برہمن خاندان کا باصلاحیت، حوصلہ مند اور دوراندیش فرد بالاجی وشوناتھ، شاہو کا وزیر اعظم یعنی پیشوا بنا۔ اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن کی مراٹھا ریاست کو سخت ضرورت تھی۔ شاہو کے دیگر تمام سرداروں کے مقابلے میں اولین تینوں پیشوا ہر اعتبار سے زیادہ لائق اور باصلاحیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مکمل اقتدار اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرنے میں انہیں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ ایسے وقت میں جب مراٹھا علاقوں میں لالچ، مفاد پرستی، خود غرضی اور دھوکا دہی عام بات بن گئی تھی، انہوں نے عوام کے سامنے سوراجیہ کی شکل میں اعلیٰ مقصد کا حصول رکھا جس کے ذریعے امن و امان اور نظم و نسق قائم کیا جاسکتا تھا۔ جب حکمران اور اس کے وزرا کی کونسل، مسائل حل نہیں کرسکی تو پیشوا کی شکل میں وہ قیادت ابھری جس کے پاس ان تمام پریشانیوں کا حل تھا اور جن کے ہاتھوں مراٹھا طاقت کو عروج حاصل ہونا تھا۔

18.4.2 بالاجی وشوناتھ (Balaji Vishwanath)

1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد پیدا ہوئی سیاسی صورت حال نے مراٹھوں میں نئی جان ڈال دی۔ اٹھارویں صدی میں شمال و جنوب دونوں سمتوں میں مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور وسیع ہوتی ہوئی ریاست کو تسلیم کیا گیا۔ مراٹھوں کو ایک عظیم سیاسی قوت بنانے کا سہرا ان پیشواؤں کو جاتا تھا جو عہدے کے اعتبار سے وزیر اعظم تھے لیکن بہت جلد کل اختیارات کے مالک بن گئے۔ پیشوا کے عہدہ کو

سب سے پہلے جس نے مضبوط اور بااختیار بنانے میں کامیابی حاصل کی وہ بالاجی وشوناتھ تھا۔

بالاجی وشوناتھ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ وہ کونکن کے ایک برہمن خاندان سے تھا جو اپنی دیانت اور صلاحیتوں کے لیے معروف تھا۔ان کے اجداد جنجیرا میں لگان وصول کرنے کے پشتینی عہدہ سے متعلق تھے۔ لیکن جنجیرا کے سدِیوں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے بالاجی وشوناتھ اپنا علاقہ چھوڑ کر سارواڑ میں بس گیا۔ مراٹھوں کے زیرِ انتظام اس نے ٹیکس وصول کرنے کا کام کیا۔ 1699 سے 1703 تک وہ پونا کا صوبیدار اور پھر 1704 سے 1707 تک دولت آباد کا سر صوبیدار رہا۔ اورنگ زیب 1699 سے 1704 تک پونا میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت بالاجی وشوناتھ نے اورنگ زیب کے لیے رسد مہیا کرنے کا کام کیا جس کی وجہ سے اورنگ زیب نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اورنگ زیب جب تک دکن میں رہا، شاہو اس کی قید میں رہا۔ شاید اسی زمانہ میں بالاجی وشوناتھ اور شاہو کے درمیان کسی قسم کا رابطہ قائم ہوا۔ 1705 میں وشوناتھ نے شاہو کو آزاد کرانے کی کوشش بھی کی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شاہو اور تارابائی کے اختلاف میں بالاجی نے شاہو کا ساتھ دیا تھا اور یہ ساتھ ہر حال میں برقرار رہا۔ یہاں تک کہ جب شاہو کے کئی بڑے افسر اور سپہ سالار تارابائی سے مل گئے تھے، یہ بالاجی ہی تھا جس نے نہ صرف شاہو کا ساتھ دیا بلکہ اپنی حکمت عملی اور ذہانت سے اس کی حیثیت کو بھی مضبوط بھی کیا۔ شاہو نے 27 نومبر 1713 کو بالاجی وشوناتھ کو پیشوا کا عہدہ دیا۔ اس نے مختلف مراٹھا سرداروں کو شاہو کے زیرِ نگیں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر بالاجی کی اصل کامیابی وہ سمجھوتہ ہے جو 1719 میں مغلوں اور مراٹھوں کے درمیان ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عظیم الشان مغلیہ سلطنت بہت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ حکمرانوں کی نااہلی اور امرا کی مفاد پرستی نے عجب صورت حال پیدا کردی۔ ہر طرف سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے۔ شہنشاہ بے دست و پا تھے اور امرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ اس وقت مغل سلطنت کی باگ ڈور فرخ سیر کے ہاتھوں میں تھی، جب کہ حقیقی اقتدار، تاریخ میں بادشاہ گر کے خطاب سے مشہور، دو سید بھائیوں حسین اور عبداللہ کے ہاتھوں میں تھا۔ فرخ سیر نے جب سید برادران سے چھٹکارا پانے کی کوشش شروع کی، اس وقت حسین علی جنوب میں تھا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے اس کو فوراً دلی بلایا۔ اس وقت حسین علی نے بھی اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لیے مراٹھوں سے مدد مانگی اور ان سے ایک سمجھوتہ کیا جسے دونوں بھائیوں کی کامیابی کے بعد مغل بادشاہ نے منظوری عطا کردی۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل اہم نکات طے پائے گئے۔

1. مغل بادشاہ شاہو کو وہ سبھی قلعے اور علاقے دے دے گا جو کبھی شیواجی کے سوراجیہ میں ہوا کرتے تھے۔
2. شاہو کو خاندیش برار، گونڈوانہ، حیدرآباد اور کرناٹک کے وہ علاقے بھی ملیں گے جو اس نے ماضی قریب میں جیتے تھے۔
3. شاہو کو جنوب کے کچھ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق بھی ملے گا۔
4. جنوبی ہند کے مذکورہ صوبوں میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری بھی شاہو پر ہوگی۔
5. شاہو، کولہاپور میں شمبھاجی دوم کو پریشان نہیں کرے گا۔
6. شاہو مغل بادشاہ کو 10 لاکھ روپیہ سالانہ ٹیکس دے گا

7. بادشاہ شاہو کے خاندان اور متعلقہ لوگوں کو جو ابھی تک مغل قید میں تھے، آزاد کر دے گا۔
8. ضرورت پڑنے پر شاہو مغلوں کو 15000 گھوڑ سوار فوج مہیا کرائے گا۔

اس عہد نامہ نے شاہو اور مراٹھوں کی قوت اور اقتدار میں زبردست اضافہ کیا۔ اور پہلی بار 15000 مراٹھا فوج، بالا جی اور کھانڈے راؤ کی قیادت میں دہلی گئی جس کی مدد سے سید برادران نے فرخ سیر کو تخت سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بالا جی وشوناتھ نے شاہو کی طاقت میں اضافہ کیا۔ مراٹھا اقتدار کو وسعت دی اور ساتھ ہی پیشوا کی حیثیت سے اپنے عہدے کو اتنا بااختیار بنا دیا کہ بالآخر مراٹھا حکمراں بھی اس کے زیر دست ہونے لگے۔

بالاجی وشوناتھ کی شخصیت: بالاجی نے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی تھی۔ کامیابی کی پہلی سیڑھی سے لیکر پیشوا بننے اور مراٹھا اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے تک کے سارے مراحل اس نے خود ہی طے کیے تھے۔ بہادری کے ساتھ ساتھ سیاسی دور اندیشی بھی اس میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔ وہ مراٹھوں کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تارابائی یا شیوبائی کو چھوڑ کر شاہو کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسی کی سیاسی سوجھ بوجھ اور مدبرانہ صلاحیتیں تھیں جس کے سبب دھناجی جادو، کھانڈے راؤ دبھاڑے، پرشوجی اور کانہوجی آنگڑے جیسے سرکردہ مراٹھا سردار شاہو کی حمایت میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے مراٹھا ریاست کو خانہ جنگی سے بچایا اور مادھاجی کرشن جوشی جیسے ساہوکاروں کی مدد سے ریاست کے مالی مسائل حل کیے۔ یہ بالاجی وشوناتھ ہی تھا جس کے سبب سید برادران سے سمجھوتہ ہوا اور ریاست کو 30 لاکھ روپیہ ملا اور باقاعدگی سے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں 35 فیصد سالانہ ٹیکس ملنے لگا۔

18.4.3 باجی راؤ اول (Baji Rao-I)

1720 میں اپنے باپ کی موت کے بعد باجی راؤ اول (1720 تا 1740) پیشوا بنا۔ کئی تجربہ کار سرداروں کی موجودگی میں 20 سال سے بھی کم عمر کے اس نوجوان کو شاہو نے فوقیت دی اور اس کا انتخاب وقت نے صحیح ثابت کیا۔ وہ ایک باہمت فوجی باصلاحیت سپہ سالار اور دور اندیش سیاست داں تھا۔ باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو داخلی طور پر مضبوط بنانے کے لیے جاگیروں کو سرداروں میں اس طرح تقسیم کیا کہ کوئی بھی سردار کسی جاگیر پر خود مختار نہ ہو سکے۔ اور وہ ایک دوسرے پر منحصر رہیں۔ خارجی طور پر اس نے مغلیہ سلطنت کے کھوکھلے ہوتے ہوئے درخت پر دار کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ اس کے دورِ اقتدار کے مختلف پہلوؤں کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

نظام سے تعلقات: نظام الملک آصف جاہ دکن کا وائسرائے رہ چکا تھا۔ وہ پھر واپس آیا۔ اس کا ارادہ اپنے لیے ایک آزاد خود مختار ریاست قائم کرنے کا تھا۔ اس لیے مراٹھوں سے ٹکراؤ لازمی تھا۔ 1726 میں اس نے کولہاپور میں سمبھاجی دوم کی مدد کی اور شاہو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ باجی راؤ اول کی غیر موجودگی میں شاہو کی حیثیت خراب ہو گئی لیکن باجی راؤ اول نے کرناٹک سے واپس لوٹ کر فروری 1728 میں پالکھیڑا کے مقام پر نظام کو اس طرح گھیر لیا کہ اسے مجبوراً 16 مارچ 1728 کو منگی شوگاواں کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس سمجھوتے کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

1. نظام نے شاہو کو مہاراشٹر کا بلا شرکت غیرے حکمراں تسلیم کر لیا۔

2. اسے باقی رہ گئی چوتھ اور سر دیس مکھی کی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔
3. اس نے منگی شوگاواں کے مراٹھا سرداروں کو اپنی حدود میں رہنے دینا قبول کر لیا۔

نظام اور مراٹھوں کا یہ ٹکراؤ یہیں ختم نہیں ہوا۔ 1737 میں دلی کی ہدایت پر نظام نے ایک بڑی فوج بھوپال کے قریب جمع کر لی۔ مگر اس کی ذرا سی غلطی کے سبب اس کی فوج میں رسد کی کمی اور بھکمری پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے بنا جنگ کیے ہی جنوری 1738 میں ذدئی سرائے کا معاہدہ قبول پڑا۔ معاہدہ کے مطابق مالوہ اور نرمدا اور چنبل ندیوں کے درمیان کا پورا علاقہ باجی راؤ اول کو حاصل ہو گیا۔ علاوہ ازیں 50 لاکھ روپیہ کا تاوان جنگ بھی نظام نے دینا قبول کر لیا۔

دلی پر حملہ: مراٹھوں کے دوآب، راجستھان اور دہلی کے آس پاس کے مغل علاقوں پر لگاتار حملے اور لوٹ مار جاری تھی جس کے سبب مغل بادشاہ نے مراٹھوں کو چمبل ندی کے جنوبی علاقے کے لیے 13 لاکھ روپیہ، راجستھان کے لیے 13 لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ اور جنوبی ہندوستان کی آمدنی کا 5 فیصد حصہ سردیش مکھی کی شکل میں دینا قبول کر لیا۔ اس سے حوصلہ پاکر باجی راؤ نے اودھ اور بنگال جیسے صوبوں اور الہ آباد، گیا، بنارس جیسے شہروں کی مانگ کی جسے قبول کرنے سے مغل بادشاہ نے انکار کر دیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر باجی راؤ نے اپنے ایک سپہ سالار ملہار راؤ ہولکر کے ذریعے اودھ پر حملہ کر دیا لیکن اودھ کے صوبے دار سعادت علی خان کی گھڑ سوار فوج نے مراٹھوں کو مار بھگایا۔ سعادت علی خان نے اپنی اس فتح کے بعد مغل بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ اس نے باجی راؤ کو چنبل ندی کے جنوب میں بھگا دیا ہے۔ اس خط کی خبر پاکر باجی راؤ نے دہلی کا رخ کیا۔ وہ بہت تیزی سے سفر کرتا رہا اور 29 مارچ 1737ء کو دہلی پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے کی خبر سن کر مغل بادشاہ نے دہلی چھوڑنے کی تیاری کر دی۔ مگر باجی راؤ کا مقصد دہلی پر حملہ اور لوٹ مار نہیں تھا، وہ تو صرف سعادت خان کو جھوٹا ثابت کرنا اور مغل بادشاہ کو دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا۔ تین دن دہلی رکنے کے بعد جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے واپس لوٹ گیا، کیونکہ سعادت خان، وزیر فخر الدین اور شمس الدولہ کی افواج دلی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچنا اس کے لیے ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے راجستھان کا راستہ اپنایا اور تھار کے ریگستان میں داخل ہو گیا جہاں اس کا تعاقب آسان نہیں تھا۔ اس طرح باجی راؤ دو بڑی مغل افواج سے بنا تصادم کے بچ کر نکل گیا۔

کونکن کی فتح: کونکن میں سدّیوں کو طاقت حاصل تھی اور وہ مراٹھوں کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ 1733 تک ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1733 میں باجی راؤ خود وہاں گیا اور ایک سال تک وہیں رکا رہا۔ آخر میں ایک سمجھوتہ کر کے واپس ہوا۔ اس سمجھوتے سے مراٹھوں کو کچھ علاقہ تو مل گیا مگر سدیوں کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ جنگ دوبارہ چھڑ گئی۔ بالآخر 1736 میں باجی راؤ کے بھائی چیما جی اپا نے سدی سردار کو ایک جنگ میں مار دیا جس کے نتیجے میں ان کی کمر ٹوٹ گئی اور انہوں نے معاہدہ کر کے کونکن پر پیشوا کی برتری قبول کر لی۔

پرتگالیوں سے تصادم: پرتگالیوں سے مراٹھوں کے ٹکراؤ کی شروعات 1731ء سے ہوئی۔ انہوں نے سدیوں کی مدد کی تھی۔ 1732ء میں انہوں نے مراٹھوں سے سمجھوتہ کر لیا لیکن 1737ء میں انہوں نے پھر جنگ چھیڑ دی جس کا اختتام 1739ء میں بسین (Bassein) پر مراٹھوں کے قبضے کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد پرتگالیوں سے مراٹھوں کا سمجھوتہ ہو گیا اور انہوں نے کونکن علاقے میں مراٹھوں کی بالادستی کو

تسلیم کر لیا۔28اپریل 1741ء کو اپنی مرنے سے پہلے باجی راؤاول نے مراٹھا ریاست کی شکل وصورت ہی بدل دی۔ مغربی ساحل کی ایک چھوٹی سی ریاست سے اسے شمال تک پھیلی ہوئی وسیع سلطنت بنادیا۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ نئے علاقے جیتے گئے مگران کے انتظام و انصرام پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

باجی راؤاول کی شخصیت: باجی راؤ کو پیشواؤں میں بلند مقام حاصل ہے۔ اسے عظیم پیشواؤں میں گنا جاتا ہے۔ یہ باجی راؤ ہی تھا جس نے مراٹھوں کو ہندوستان کی اہم ترین طاقت بنادیا۔ مورخین کے مطابق اس نے مراٹھوں میں ایک نئی امید جگادی۔ اس کی فوجی لیاقت اور قیادت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نظام جو ایک باصلاحیت سپہ سالار تھا اور جس نے سو سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا تھا، وہ باجی راؤ کے سامنے دوبار آیا اور دونوں ہی بار بنا جنگ کیے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سیاسی تدبر میں بھی نظام جیسے زیرک حکمراں کی اس کے سامنے کچھ نہیں چلی۔ مغلوں کے زوال سے ہندوستان میں جو سیاسی خلا پیدا ہو رہا تھا، باجی راؤ نے اسے مراٹھا طاقت سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے زیر قیادت مراٹھا شہ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں پورے ہندوستان میں گونج رہی تھیں۔

18.4.4 بالاجی باجی راؤ (Balaji Baji Rao)

باجی راؤ کی موت کے بعد شاہو نے اس کے 19 سالہ بیٹے بالاجی باجی راؤ(1740تا1761ء) کو پیشوا بنادیا۔ یہاں تک آتے آتے پیشوا کا عہدہ نہ صرف موروثی بن گیا تھا بلکہ اصل طاقت واختیار کا مرکز بھی وہی تھا۔ بالاجی باجی راؤ اپنے باپ کی طرح عظیم سپہ سالار تو نہیں تھا لیکن وہ میدان عمل کا آدمی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ باجی راؤاول نے دشمن زیادہ بنائے، دوست کم، اور بالاجی باجی راؤ نے دوست زیادہ بنائے، دشمن کم۔ بالاجی نے بھی آغاز سے ہی مراٹھا ریاست کی توسیع کی پالیسی کو جاری رکھا۔ بالاجی کے عہد میں 1749 میں چھترپتی شاہو کی موت واقع ہوئی۔ اس کے آخری دن پریشانی اور مشکل میں گزرے۔ تارابائی حکومت حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر سرگرم عمل ہوگئی۔ مختلف مراٹھا سردار ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ کچھ وقت کو پیشوا نے بھی اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔ شاہو کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ جیل میں بند تارابائی نے ایک لڑکے کے بارے اعلان کیا کہ یہ اس کے بیٹے شیواجی دوم کا بیٹا ہے۔ اس نے شاہو سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکے کو گود لے لے۔ دوسری طرف کولہاپور کا شمبھاجی دوم بھی شاہو کا جانشین بننے کے لیے بے چین تھا۔ ان حالات میں 25 دسمبر 1749 کو اپنی موت سے قبل شاہو نے تارابائی کے پیش کردہ لڑکے راجہ رام دوم کو اپنا وارث بنانے کا اعلان کیا۔ جنوری 1750 میں راجہ رام دوم چھترپتی بنا۔ تارابائی اس کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھتی۔ جب اس نے تارابائی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو تارابائی نے یہ راز کھولا کہ راجہ رام دوم شیواجی کے نسب سے نہیں ہے۔ یہ صورت حال جان کر پیشوا بالاجی باجی راؤ نے راجہ رام دوم کو پونا بلایا جسے وہ اپنی راجدھانی بنا چکا تھا۔ یہاں اس نے راجہ رام دوم سے سنگھولا کا سمجھوتہ کیا جس کے مطابق چھترپتی نے اپنے سبھی اختیار پیشوا کو سونپ دیے جس کے بعد پیشوا اصل حکمراں بن گیا اور مراٹھا چھترپتی ستارا میں نام کا حکمراں اور حقیقت میں ایک قیدی بن گیا اس سمجھوتے کے بعد بھی تارابائی نے اقتدار حاصل کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھی۔ جب پیشوا نظام پر حملے کی غرض سے ریاست سے باہر تھا۔ تو اس نے دماجی گائکواڑ اور کچھ دوسرے سرداروں کی مدد سے پونا پر حملہ کر دیا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ راجہ رام قید میں ڈال دیا گیا۔

پیشوا کی طاقت کو للکارنے کرنے والے شکست کھا گئے۔

بالاجی باجی راؤ کی فتوحات: سب سے پہلے بالاجی نے 1740 میں مالوہ پر حملہ کی تیاری کی لیکن درمیان میں جے پور کے حکمراں راجہ جے سنگھ نے مغل بادشاہ اور پیشوا کے درمیان صلح و معاہدہ کرادیا۔ جس کی رو سے مالوہ، پیشوا کو مل گیا۔ اس کے بدلے پیشوا نے 500 مستقل فوجی اور ضرورت پڑنے پر 400 فوجی مہیا کرانے کا وعدہ کیا۔ معاہدہ کے مطابق شہزادا احمد مالوہ کا صوبیدار اور پیشوا نائب صوبیدار مقرر ہوئے اور مالوہ پر پیشوا کو قانونی حق حاصل ہو گیا۔ کرناٹک پر پہلا حملہ 1739ء میں راگھوجی بھونسلے نے کیا تھا 1741ء میں وہاں کے نواب دوست علی کو قتل کر دیا اور اس کے داماد چندا صاحب کو قید کر لیا لیکن 1743ء میں نظام نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ 1745ء میں بابوجی کرناٹک کو بھیج کر پیشوا نے کرناٹک کو مکمل طور سے اپنے قبضے میں لے لیا۔ پیشوا کی طرف سے رگھوجی بھونسلے نے اڑیسہ پر حملہ کر دیا اور بنگال کے نواب علی وردی خاں کو 1751ء میں 12 لاکھ روپیہ سالانہ چوتھ کی شکل میں دینے پر مجبور کر دیا۔ نظام حیدرآباد اور پیشوا بالاجی میں دوستی دشمنی کے مختلف موڑ آتے جاتے رہے۔ نظام نے اپنے باغی بیٹے ناصر جنگ کے خلاف مراٹھوں کی مدد کے بدلے انہیں 15 لاکھ روپیہ دیا۔ 1743 میں نظام نے کرناٹک جیت لیا لیکن 1757 کی سندکھڑ جنگ میں شکست کھا کر 25 لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی والے علاقے پیشوا کو دینے پڑے۔ 1760 میں ادے گیر کی جنگ میں پیشوا نے پھر نظام کو شکست دی اور بدلہ میں ایک بڑا علاقہ حاصل کیا۔ پیشوا نے راجپوتوں اور جاٹوں سے بھی اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔

پانی پت کی تیسری جنگ

اسباب: مغل اور بالاجی راؤ مغل بادشاہ کے نواب وزیر صفدر جنگ سے 1752 میں ہوئے معاہدے کے مطابق انہوں نے پورے ہندوستان سے چھوتھ وصول کرنے کا اختیار حاصل کر لیا تھا اور اس کے بدلے ضرورت پڑنے پر مغل بادشاہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ نے مراٹھوں کو شمالی ہندوستان کی سیاست میں ملوث کر دیا۔ دراصل مراٹھوں نے 1752 میں عمادالدولہ کو وزیر بننے میں مدد کی جس کے بدلے وہ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس سے شمالی ہند میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ دلی کے بعد پنجاب میں بھی مراٹھوں نے احمد شاہ ابدالی کے نمائندے کو نکال کر اپنا قبضہ کر لیا۔ شمالی ہند میں قبضہ و اقتدار کی اس کشکش نے صورتِ حال میں بڑی تبدیلیاں کیں۔ مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ امراء کی خود غرضی اور مفاد پرستی نے انہیں دو حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ ایک ہندوستانی مسلمانوں کا گروپ اور دوسرا باہر سے آئے مسلمانوں کا گروپ۔ باہر سے آئے مسلمانوں کا گروہ مراٹھوں کے خلاف کسی قسم کی روک تھام نہ ہونے اور مغل بادشاہ کے ان کے ماتحت چلے جانے سے ناراض ہو گیا۔ انہوں نے ملک سے باہر سے مدد کی کوشش شروع کر دی۔ سلطنت کا مضبوط ستون کہے جانے والے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور روہیل کھنڈ کے نجیب الدولہ نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچانے کے لیے بلایا۔ چنانچہ افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی اپنی فوج لے کر ہندوستان کی طرف چل پڑا اور اسے پانی پت کے میدان میں مراٹھوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مراٹھوں نے بھی مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر مراٹھوں کو ان کی پچھلی کارگزاریوں، بے جا مداخلت اور ظلم و بربریت کے سبب کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کے غیر مسلم راجپوتوں، سکھوں اور جاٹوں کو بھی ان پر بھروسہ نہیں تھا۔

جنگ: چنانچہ 16 جون 1761 کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں اور مراٹھوں کے درمیان جو خونریز جنگ ہوئی اس میں مراٹھوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ کوئی مراٹھا گھر ایسا نہیں تھا جہاں سوگ نہ منایا گیا ہو۔ اس جنگ نے مراٹھا قوت کو ختم تو نہیں کیا مگر مغلوں کی جگہ لینے کا خواب ہمیشہ کے لیے چور چور کر دیا۔

مراٹھوں کی شکست کے اسباب: ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی اس شکست فاش کے کچھ بنیادی اسباب تھے۔

- مراٹھوں میں جاگیر دارانہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ جو ایک قیادت، ایک عمومی تربیت اور ایک جنگی پالیسی کے خلاف تھا۔
- مراٹھوں کی لوٹ مار کی سرشت نے ہندو راجاؤں کو بھی ان کے مخالف بنا دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں راجستھان میں بھی انہیں کوئی مدد نہیں ملی۔ سورج مل جاٹ نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔
- وقت کے ساتھ مراٹھوں میں سادگی، جفاکشی اور ڈسپلن کم ہوتا جا رہا تھا۔
- فوج کے ساتھ عورتیں بھی چلنے لگی تھیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے فوج پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اس جنگ میں عورتوں اور نوکروں کی کثیر تعداد نے پریشانیاں پیدا کر دیں۔
- پیشواؤں کے عروج نے دیگر سرداروں میں حدور قابت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان میں آپسی اختلاف بڑھ گئے تھے۔
- شکست کا ایک فوری سبب بھی تھا اور وہ تھا ابدالی کے مقابلہ میں سداشو راؤ بھاؤ کی کمزور قیادت۔ مراٹھا سپہ سالار تدبر اور جنگ دونوں میں اپنے حریف سے کمزور پڑا۔ بھاؤ نے گوریلا جنگ کا طریقہ استعمال نہیں کیا۔ توپ خانے پر بھروسہ کر کے مدافعانہ جنگ لڑی، جو غلط فیصلہ ثابت ہوی۔ اس کے علاوہ ابدالی کے پاس آتشی اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اس کی گھڑ سوار اور شتر سوار فوج بھی مراٹھوں سے بہتر تھی۔

جنگ کے نتائج: اس جنگ کے نتائج کے موضوع پر مورخین میں بہت اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے میں اس جنگ نے مراٹھوں کو جانی ومالی نقصان تو بہت پہنچایا لیکن اس شکست سے نہ تو ان کی طاقت ختم ہوئی اور نہ ہی ان کے مقاصد تبدیل ہوئے۔ وہیں کچھ دوسرے مورخین کے مطابق یہ جنگ مراٹھوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ان کے بڑے بڑے لائق و باصلاحیت سرداروں کے مارے جانے سے کمزور اور سازشی سرداروں کو آگے آنے کا موقع ملا۔ مراٹھا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ شمالی ہند میں ان کی پیش رفت تھم گئی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ بلاشبہ اس جنگ نے مراٹھا قوت واقتدار اور ان کے وقار کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مراٹھا فوج کی ناقابل شکست حیثیت ختم ہو گئی اور انہیں دوبارہ اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں وسائل اور قوت خرچ کرنی پڑی۔ لیکن پھر بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکے کہ انگریزوں کو شکست دے سکیں۔

بالاجی باجی راؤ کی شخصیت: پیشوا بالاجی باجی راؤ، وجیہ اور خوش گفتار تھا۔ اپنے پیش روؤں کے برعکس وہ فنون کا رسیا اور سست کاہل مزاج کا تھا لیکن ساتھ ہی ایک لائق فوجی اور قابل منتظم بھی تھا۔ اس کے عہد میں مراٹھا سلطنت وسیع ہوئی۔ اس کے دور حکومت میں مراٹھا گھوڑوں نے کنیا کماری سے لیکر ہمالیہ کی جھرنوں تک اپنی پیاس بجھائی۔ مختلف صلاحیتوں کا حامل ہوتے ہوئے بھی بالاجی باجی راؤ میں کچھ کمیاں تھیں۔ عصری

تقاضوں کے مطابق نہ تو اس میں فوجی قیادت کی اہلیت تھی، نہ ہی وہ اعلیٰ درجہ کا منتظم تھا۔ بحیثیت مدبر بھی وہ وقت اور حالات کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترا۔ مراٹھا سرداروں کے آپسی اختلافات اور مخالفین کی سرگرمیوں پر بھی وہ کوئی قدغن نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو اس کا دور حکومت کامیابیوں کی کہانیاں سناتا ہے تو دوسری طرف ناکامی اور زوال کا راستہ بھی وہیں سے شروع ہوتا ہے۔

18.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں مراٹھا، جنوبی ہندوستان میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ شیواجی نے ایک کامیاب قائد اور لائق منتظم کی حیثیت سے اپنی سلطنت قائم کی جس نے نہ صرف ہمعصر علاقائی طاقتوں بلکہ عظیم مغلوں سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ شیواجی کے جانشینوں کے اختلافات اور کمزوری نے پیشواؤں کو جو وزیر کی حیثیت رکھتے تھے، اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع دیا۔ شیواجی کے بعد اولین تین پیشواؤں کا دور مراٹھا اقتدار کا عہد زریں ثابت ہوا۔ اسی تناظر میں پہلے تین عظیم پیشواؤں بالا جی وشوناتھ، باجی راؤ اول اور بالا جی باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو عظیم بلندیوں تک پہنچایا۔ انہوں نے اس عہد میں جنوب کے علاوہ شمالی ہند میں بھی اپنے بازوں پھیلائے۔ جنوب میں حیدر آباد، میسور اور انگریزوں کے علاوہ دیگر چھوٹی ریاستوں کے ساتھ علاقائی سیاست میں کامیاب کردار ادا کیا اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مراٹھوں نے کمزور مغل بادشاہ اور آپسی رسہ کشی میں مصروف امرا پر مسلسل اپنی بالادستی ثابت کی۔ شمالی اور جنوبی ہند کے مختلف علاقوں سے انہوں نے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں ٹیکس وصول کیا۔ ان کی فوجی کامیابیوں نے ایسی صورت پیدا کر دی جسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ مغلوں کے زوال کے بعد ہندوستان کی قسمت انہیں کے ہاتھوں لکھی جائے گی۔ لیکن ملک کی پیچیدہ سیاسی صورتحال میں ان کی راہ آسان نہیں تھی۔ مغل بادشاہ، اس کے امراء اور مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کی آپسی کھینچ تان نے افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی کو یہ موقع فراہم کیا کہ ہندوستان میں حملہ آور ہو۔ ابدالی کی باصلاحیت قیادت اور مراٹھوں کی کمزور جنگی حکمت عملی نے پانی پت کے میدان میں جنگ کا نتیجہ طے کر دیا۔ پانی پت کی اس شکست نے ان کا ملک گیر سلطنت قائم کرنے کا خواب چکنا چور کر دیا۔

18.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

چوتھ	:	چوتھ، مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے مراٹھوں کے ذریعے وصول کیا جانے والا ایک حفاظتی محصول تھا اور کل مقررہ محصول کا چوتھائی حصے پر مشتمل تھا۔
سردیش مکھی	:	سردیش مکھی محصول کا 10 فیصد اضافی محصول تھا جس کا دعویٰ شیواجی نے سردیش مکھ (سردار) ہونے کے طور پر کیا تھا۔
پیشوا	:	مراٹھا وزیر اعظم
اشٹ پردھان	:	آٹھ وزیروں کی کونسل
سوراجیہ	:	شواجی کی قائم کردہ سلطنت

18.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

18.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مراٹھا ریاست کا بانی کون تھا؟
2. شیواجی کا تعلق کس نسل سے تھا؟
3. شیواجی کی پرورش کی ذمہ داری کس نے اُٹھائی؟
4. شواجی کی تخت نشینی کہاں ہوئی؟
5. چوتھ کسے کہتے ہیں؟
6. سردیش مکھی کسے کہتے ہیں؟
7. پیشوا کون تھا؟
8. چھترپتی کون تھا؟
9. اشٹ پردھان سے کیا مراد ہے؟
10. سوراجیہ سے کیا مراد ہے؟

18.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مراٹھا ریاست کے قیام کے کوئی تین اسباب بیان کیجیے۔
2. پورندر کی صلح کی کیا شرائط تھیں؟ بیان کیجیے۔
3. شیواجی کی ریاست کے استحکام اور تاجپوشی پر نوٹ لکھیے۔
4. باجی راؤ اول کے دہلی پر حملے اور پرتگالیوں سے تصادم پر نوٹ لکھیے۔
5. پیشواؤں کے عروج کے اسباب بیان کیجیے۔

18.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. شواجی ایک سلطنت کے بانی اور عظیم فاتح تھے اس کی تشریح کیجیے۔
2. پیشواؤں کے دور میں مراٹھا سلطنت کی وسعت پر اظہارِ خیال کیجیے۔
3. پانی پت کی تیسری جنگ کے اسباب و نتائج کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

18.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Gordon, Stewart, *The Marathas*, *1600–1818*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005 (first published in 1998).
2. Gordon, Stewart, *Marathas, Marauders and State Formation in Eighteenth-Century India*, OUP, New Delhi, 1994.
3. Hardas, Balshastri, *Chatrapati Shivaji*, Vols. 1–4, Kale Prakashan, Pune, 1984.
4. Kadam, V.S., *Maratha Confederacy (A Study in its Origin and Development)* , Munshiram Manoharlal, Delhi, 1993.
5. Karandikar, S.L., *Rise and Fall of the Maratha Power*, S.S. Karandikar, Pune, 1969.
6. Majumdar, R.C., and V.G. Dighe (eds.), *Maratha Supremacy*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1977.
7. Nadkarni, R.V., *Rise and Fall of the Maratha Empire*, Popular Prakashan, Bombay, 1966.
8. Ranade, M.G., *Rise of the Maratha Power*, Bombay University, Bombay, 1963 (first published in 1900).
9. Sen, Surendranath, *Administrative System of the Marathas*, K.P. Bagchi, Calcutta, 1976.

اکائی 19۔ مراٹھا سیاست اور انتظامیہ

(Marathas: Polity and Administration)

اکائی کے اجزا

19.0 تمہید
19.1 مقاصد
19.2 مراٹھا سیاسی نظام کی نوعیت
19.3 کچھ وضاحتیں
19.4 مراٹھا سیاسی نظام
19.4.1 حکمراں اور وزیر اعظم
19.4.2 اہم سردار خانوادے
19.4.3 انتظامی ساخت
19.4.4 طویل مدتی رجحانات
19.5 سماج اور معیشت
19.5.1 زرعی سماج
19.5.2 نظام زر کی ترقی
19.6 مراٹھا خارجہ پالیسی
19.6.1 بنگال
19.6.2 حیدرآباد
19.6.3 میسور
19.6.4 راجپوتانہ
19.6.5 مغل حکمران
19.6.6 ایسٹ انڈیا کمپنی

19.7 اکتسابی نتائج

19.8 کلیدی الفاظ

19.9 نمونہ امتحانی سوالات

19.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

19.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

19.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

19.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید (Introduction)

سترھویں صدی کے دوران مغربی دکن میں ایک چھوٹی سی مراٹھا ریاست قائم ہوئی۔ بعد میں یہ وسیع ہو کر ایک عظیم کل ہند مراٹھا سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ اٹھارویں صدی میں مراٹھا سلطنت (سوراجیہ) کی سرحدیں شمال، مشرق اور جنوب میں پھیل گئی۔ دکن سے مغلوں کی واپسی کے بعد، مراٹھوں نے اپنے فوجی رہنماؤں یا سرداروں کی قیادت میں ایک عظیم حکمراں وفاق قائم کیا۔ ابتدا میں مراٹھوں نے چوتھ اور سردیش مکھی کے حاصل کرنے پر زور دیا، لیکن جب ان کے قدم جم گئے تو انہوں نے مفتوحہ علاقے کو اپنی وراثتی ملکیت میں تبدیل کر دیا۔ اس اکائی میں ہم مراٹھا سلطنت کے سیاسی نظام، سماج، معیشت اور نظم ونسق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

19.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مراٹھا سیاسی نظام کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مراٹھوں کے سیاسی نظام اور انتظامی ساخت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مراٹھا علاقے کی سماجی اور معاشی حالت سے واقف ہو سکیں گے۔
- مراٹھوں کے خارجی تعلقات سے واقف ہو سکیں گے۔

19.2 مراٹھا سیاسی نظام کی نوعیت (Nature of the Maratha Political System)

سامراجی مورخین (Imperialist Historians) اٹھارویں صدی کی مراٹھا ریاست کو بد نظمی اور انتشار کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف، قوم پرست تاریخ نگاری کے تحت، متعدد مراٹھی مورخین، مراٹھا ریاست کو ہندو سلطنت کی بحالی کی آخری کوشش

سمجھتے ہیں۔ عرفان حبیب(Irfan Habib)کا خیال ہے کہ مراٹھوں کا عروج در حقیقت مغلیہ سلطنت کے حکمران طبقے (منصبداروں اور جاگیرداروں) کے خلاف زمینداروں کی بغاوت کا نتیجہ تھا۔وہ مراٹھا ریاست کی تشکیل میں زمینداری نظام پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ ستیش چندر(Satish Chandra)کا خیال ہے کہ مغلوں کا زمینداری نظام، آمدنی اور اخراجات کا توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہا اور اس مالی بحران کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مراٹھوں نے علاقائی آزادی قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

کرسٹوفر ایلن بیلی(C.A. Bayly)نے تین جنگجو اقوام یعنی مراٹھوں، سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہندوستانی مسلم اشرافیہ کے خلاف عوامی یا کسان بغاوتیں تھی۔ان کے مطابق، مراٹھوں نے اپنی طاقت سادہ کسانوں اور چرواہوں کی ذات سے حاصل کی، لیکن انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر مراٹھا برہمنوں کے غلبے کی وجہ سے، مراٹھا ریاست کو 'برہمن' ریاست کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔اس کی قابل ذکر ذمہ داری تیرتھ مقامات اور مقدس جانوروں کی حفاظت تھی۔

آندرے ونک(Andre Wink)'فتنہ'(Fitna)کے عمل کو مراٹھا ریاستی نظام کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ مانتے ہیں۔اس عمل کے تحت سیاسی ناراضگی اور اختلاف کا فائدہ اٹھایا گیا اور براہ راست فوجی کارروائی کے بجائے دباؤ اور سمجھوتے کا سہارا لیا گیا۔اس طرح سے، فتنہ ایک سیاسی طریقہ کار تھا، جسے علاقائی توسیع، استحکام اور آخر میں مراٹھا قوت کو ادارہ جاتی بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔فتنے کی درست سیاسی موافقت کے لیے عوام کا تعاون اور ان کے قبول کرنے کو بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔یہ علاقائی فتح کے ساتھ ساتھ زرعی وسائل پر تسلط جمانے کے لیے بھی ضروری تھا۔17ویں صدی کے نصف آخر میں، فتنہ کے ذریعے ہی مراٹھوں نے مغلیہ سلطنت کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا۔انہوں نے مغلوں کے خلاف مختلف دکنی ریاستوں کے ساتھ اتحاد کیا۔آخر میں وِنک کا خیال ہے کہ مراٹھا اقتدار کے عروج کو مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کے طور پر دیکھنے کے بجائے اس کی اصل، خود مغلیہ سلطنت کی توسیع میں تلاش کرنی چاہیے۔مراٹھا سوراجیہ (مراٹھا ریاست)ایک قسم کی زمینداری تھی اور مراٹھوں نے کبھی بھی خود کو زمینداروں کے کردار سے الگ نہیں کیا۔

فرینک پرلن(Frank Perlin)ریاست اور ریاست کی تعمیر کے تصور کو بڑے اور لمبی مدت کے، بین سیاسی، برصغیر اور بین الاقوامی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ریاست کی ترقی ایک طویل عرصے میں ہوئی، جس میں پہلی صدی سے 19ویں صدی تک مختلف عہد حکومت اور صدیاں شامل ہیں۔اس کے علاوہ صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ اور ہندوستان کی حالت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بھی تقابلی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔اس سے اس روایتی نظریہ کو مسترد کیا جاسکتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے سے پہلے ہندوستانی سماج بدلاؤ چاہتا ہی نہیں تھا۔

19.3 کچھ وضاحتیں (Some Explanations)

اس اکائی میں آگے بڑھنے سے پہلے ہم کچھ اہم باتوں کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔مملکت کی ساری زمین چار حصوں میں منقسم تھی۔

- ریاستی زمین جو کہ 'بھنڈاروڈا' یا 'معاملہ' کے نام سے جانی جاتی تھی۔
- سپہ سالاروں کو فوجیوں کی بھرتی اور تیاری کے لیے دی جانے والی زمین کو 'اسرا' یا 'موکاسا' اور تنخواہ کے طور پر دی جانے والی زمین کو 'جاگیر' یا 'سرانجام' کہتے تھے۔
- غیر محصولی زمینی عطیے کو 'مانیہ' یا انعام کہتے تھے۔
- کسانوں کے قبضے والی زمین کو 'میراث' اور اس زمین پر اختیار کو 'میراثی اختیارات' کہتے تھے۔

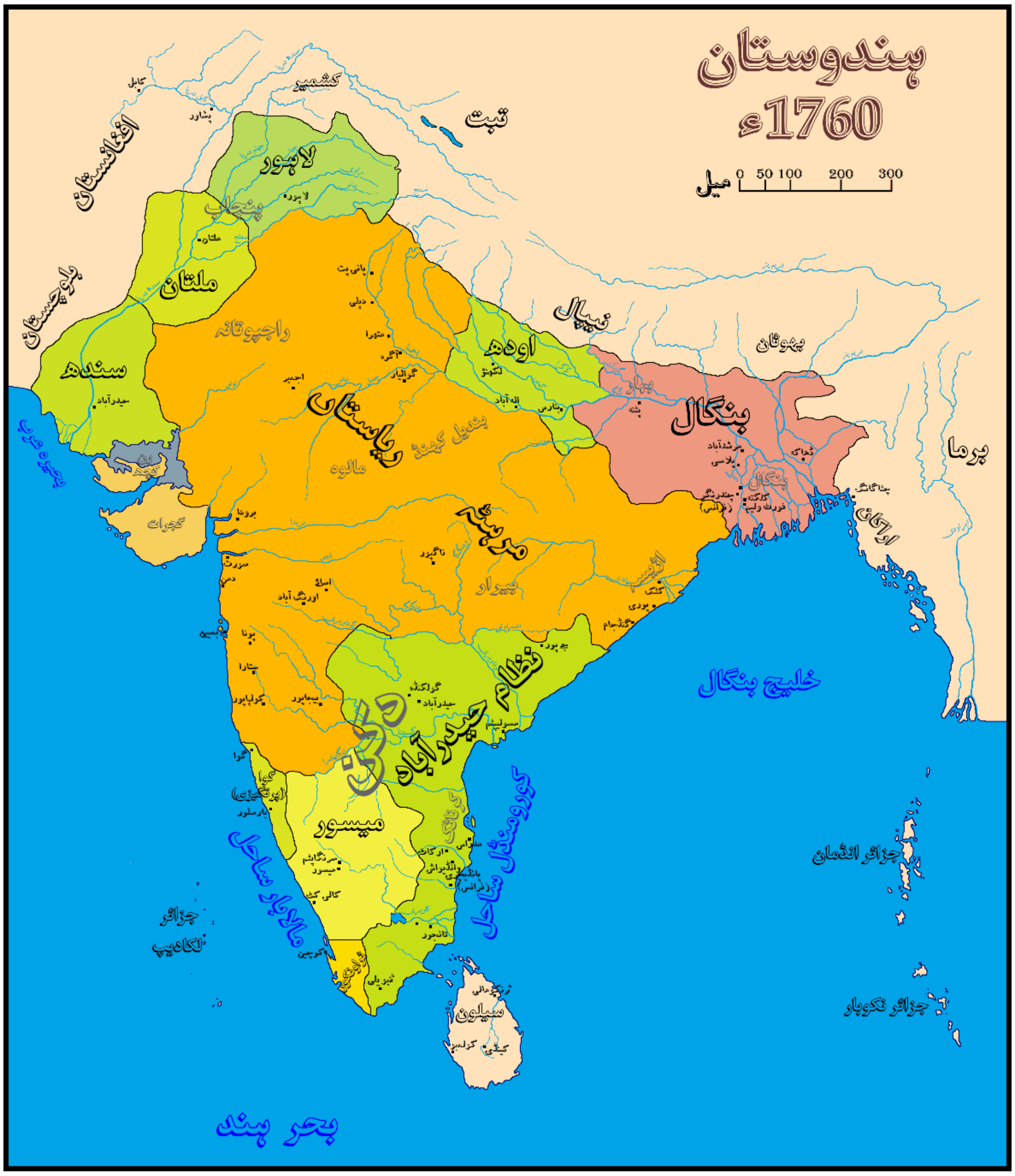

تصویر 19.1۔ ہندوستان تقریباً 1760 میں۔ مراٹھا سلطنت

(Source: https://upload.wikimedia.org/wikipedia/commons/0/01/%DB%81%D9%86%D8%AF%D9%88%D8%B3%D8%AA%D8%A7%D9%861760.png)

ریاست کے براہ راست انتظام والی زمین کی دیکھ بھال کی ذمہ داری 'موکاسادارو ں' پر رہتی تھی جنہیں حکمراں اپنی مرضی سے منتقل کر سکتا تھا، لیکن عام طور پر یہ لمبے وقت تک ایک ہی مقام پر بنے رہتے تھے اور کبھی کبھی ان کے بیٹے ان کی جگہ حاصل کر لیتے تھے۔ کسانوں کو

زمین پر ملکیت کا حق حاصل تھا۔ اجتماعی ملکیت کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ کچھ زمینیں (زیادہ تر بنجر) پورے گاؤں کی ملکیت ہوتی تھیں اور پنچایت کے ذریعے ان کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ 'موضع' مالگزاری کی تشخیص اور تعین کی سب سے چھوٹی اکائی تھی۔ کئی گاؤں مل کر ایک مالگزاری اکائی 'محال' یا 'پرگنہ' بنتا تھا۔ کئی محال کو ملا کر 'طرف'، 'ٹپہ'، 'قریات' یا 'سمت' بنتے تھے۔ کئی پرگنوں کو ملا 'صوبہ' بنتا تھا۔ شواجی کی سلطنت تین صوبوں میں منقسم تھی جس کے گورنر 'سرصوبیدار' ہوتے تھے۔

19.4 مراٹھا سیاسی نظام (Maratha Political System)

اٹھارویں صدی کی دوسری دہائی میں دکن اور وسطی ہندوستان میں مراٹھا پیشوا (وزیراعظم) باجی راؤ اول کی قیادت میں مراٹھوں نے مغلوں کی بالادستی کا تقریباً خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مغلوں اور مراٹھوں کے درمیان 1780 کی دہائی کے معاہدوں میں مغل بادشاہ کی برتری کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ گجرات، مالوہ اور برار جیسے مقامات سے چوتھ جمع کرنے کے لیے باضابطہ طور پر مغل بادشاہ کی سفارش لی جاتی رہی۔ درحقیقت یہ مراٹھا اقتدار کے قیام کا پیش خیمہ تھا۔

19.4.1 حکمراں اور وزیراعظم (The Ruler and the Prime Minister)

1719 میں بالاجی وشوناتھ نے کو دہلی میں مغل شہنشاہ فرخ سیر سے دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا فرمان حاصل کیا۔ چھترپتی (مراٹھا بادشاہ) کو سارے دکن یعنی اورنگ آباد، برار، بیدر اور کرناٹک کا سردیش مکھ بنایا گیا۔ 1719 میں، بالاجی وشوناتھ نے چوتھ اور سردیش مکھ کی وصولی کو چھترپتی شاہو اور اس کے سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اس وصولی کا ایک مخصوص حصہ یعنی سردیش مکھی جو کہ چوتھ کا 34 فیصد ہوتا تھا، چھترپتی کے خزانے میں جمع کرایا گیا۔ اس طرح چھترپتی اپنے مالیاتی اداروں کے لیے زیادہ تر سرداروں پر منحصر ہوتا چلا گیا۔

ابتدائی دور میں پیشوا صرف اہم ترین سردار یا وزیراعظم ہوتا تھا اور یہ عہدہ وراثتی نہیں تھا۔ یہ عہدہ احمد نگر ریاست میں پہلے سے چلتا چلا آرہا تھا۔ ملک عنبر خود اپنے آپ کو مرتضیٰ نظام شاہ دوم کا پیشوا کہلاتا تھا۔ درحقیقت مراٹھا انتظامیہ کی ترقی دکنی ریاستوں کے ریاستی نظام سے ہی ہوئی تھی۔ 1720ء میں بالاجی وشوناتھ کا بیٹا باجی راؤ اول پیشوا بنا۔ اسی وقت سے یہ عہدہ موروثی ہو گیا۔ 1740 میں بالاجی باجی راؤ (نانا صاحب) پیشوا بنا۔ وہ 1749 میں چھترپتی شاہو کی موت تک دارالسلطنت ستارہ کی ماتحت رہا۔ اس کے بعد اس نے عملی طور پر شاہی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پیشوا اور اس کے سردار ایک عرصے سے مراٹھا سلطنت کی توسیع میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ 1740 کی دہائی میں، مراٹھوں نے مالوہ، گجرات، بندیل کھنڈ، شمال میں آہیک، راجپوتانہ، دوآب، اودھ، بہار اور اڑیسہ پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کیا۔ آندرے ونک کا خیال ہے کہ یہ تمام فتوحات، فتنہ (دعوت پر حملہ) کے تحت حاصل کی گئیں۔ واضح رہے کہ 1740 کی دہائی کے دوران مراٹھا اقتدار، شمال میں مضبوطی سے قائم نہیں ہو سکا تھا اور جنوب میں بھی اس کی حیثیت عارضی اور محدود تھی۔

19.4.2 اہم سردار خانوادے (Important Noble Houses)

ناگپور کے بھونسلے

پرسوجی بھونسلے پونہ ضلع کے ایک گاؤں کے مکھیا خاندان سے تھا۔اس نے پیشوا سے آزاد ہو کر شمال مشرق میں پہلی بار چوتھ جمع کرنا شروع کیا۔ 1707 میں جب چھترپتی شاہو مغل دربار سے واپس آیا تو وہ سب سے پہلے حاضر ہونے والے سرداروں میں سے ایک تھا۔ شاہو نے اس کی برار مہم کو تسلیم کیا اور بالاجی وشواناتھ نے بھی برار، گونڈوانہ اور کٹک پر اس کی آزادانہ اقتدار کو منظوری دی۔ 1743 میں، شاہو نے بہار، اڑیسہ، برار اور اودھ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصولی کی ذمہ داری رگھوجی بھونسلے کو سونپ دی۔ 1755 میں رگھوجی کی موت کے بعد، پیشوا نے بھونسلے خاندان کی طاقت کو کم کر دیا اور سرانجامی (فوجی خدمات کے بدلے بڑے سرداروں کو زمینی مالگزاری عطیہ) کو تین حصوں میں تقسیم کرکے انہیں کافی حد تک کمزور کر دیا۔

بڑودہ کے گائیکواڑ

18ویں صدی کے دوران گجرات پر مغل حملے کی قیادت کرنے والے مراٹھا سرداروں میں باندے، پوار اور داماڈے اہم ترین تھے۔ داماڈے گائکواڑ سپہ سالار تھے جنہوں نے 1730 کے آس پاس اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔ 1727 میں، گجرات کے مغل صوبے دار نے شاہو کو پورے گجرات کی مالگزاری کا 10 فیصد بطور سردیش مکھی اور جنوبی گجرات سے چوتھ وصول کرنے کا حق دیا۔ بدلے میں شاہو کو اس صوبے کو پرتگالی ڈاکوؤں کے حملوں سے بچانا تھا۔ شاہو کی موت کے بعد، 1749 میں پیشوا نے گجرات کے چوتھ اور سردیش مکھی کو اپنے اور اپنے داماڈے کے درمیان تقسیم کر دیا۔ 1751 میں، گائیکواڑوں نے داماڈے کی جگہ سنبھالی اور 1752 میں بڑودہ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ناگپور کے بھونسلے کی طرح گائیکواڑ حکمران سرانجام دار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ حکمراں نہ ہو کر صرف منتظم تھے۔

اندور کے ہولکر

مدھیہ پردیش ہندوستان اور دکن کا سیاسی اور تجارتی مقام اتصال تھا۔ اس علاقے پر 1699 سے مراٹھوں نے حملے شروع کر دیے تھے۔ 1716 میں پہلی بار نرمدا کے قریب ایک مراٹھا چوکی قائم کی گئی اور اس کے فوراً بعد چوتھ کا دعویٰ کیا گیا۔ 1738 میں درو ہاسرائے کی فتح کے بعد، پیشوا کو مالوہ کا نائب صوبے دار بنایا گیا۔ 1730 کی دہائی تک پیشوا نے چوتھ اور سردیش مکھی کی وصولی کو اپنے اور سندھیا، ہولکر اور پوار خاندان کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ مالوہ کے مشرقی حصے پر پیشوا کا قبضہ تھا جب کہ مغربی حصے پر موروثی سرانجام دار کی حیثیت سے ہولکر، سندھیا اور پوار خاندان کی حکومت تھی۔ سندھیا اور گائیکواڑ کی طرح ہولکر بھی دیہی وطن داروں (دیہی زمیندار) کے اخلاف تھے۔ 1733 میں انہیں اندور کا منتظم بنایا گیا، جسے انہوں نے اپنی ریاست (دولت) کے طور ترقی دی۔ حالانکہ تکنیکی طور پر وہ سرانجام ہی رہے۔ ہولکر اپنے عروج کے دور میں بھی پیشوا کے اقتدار کو تسلیم کرتے رہے اور خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا۔ 1788 اور 1793 کے درمیان، ہولکر اور سندھیا خاندان کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ریاست کی توسیع کے معاملے میں ہولکر سندھیا سے بہت پیچھے تھے۔

گوالیار کے سندھیا

18ویں صدی کی آخری دو دہائیوں تک گوالیار سندھیا خاندان کے قبضے میں نہیں تھا۔اس خاندان نے مالوہ میں اقتدار حاصل کیا جس کا صدر مقام اجین تھا۔سندھیا بھی پیشوا کے ماتحت سرانجام دار تھے۔1761 میں پانی پت کی جنگ میں اپنے والد کی فوج کی مکمل تباہی کے بعد مہاد جی سندھیا میدان جنگ سے فرار ہوگیا۔اس نے مالوہ پہنچ کر سکون حاصل کیا اور مالوہ پر اپنے اقتدار کو مضبوط کیا۔ملہار راؤ ہولکر کی موت کے بعد،سندھیا خاندان نے فتوحات کے ذریعے ہندوستان کے بڑے حصے پر حکومت قائم کی۔انہوں نے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو بھی روہیلوں اور سکھوں کے ظلم سے نجات دلائی۔بدلے میں شہنشاہ نے بھی مراٹھا اقتدار کو تسلیم کیا۔

19.4.3 انتظامی ساخت (Administrative Structure)

مغل کبھی بھی مہاراشٹر پر صحیح طریقے سے اپنا اقتدار قائم نہیں کر سکے۔مہاراشٹر کی روایتی انتظامی ساخت اور ملکیت کا نظام 18ویں صدی تک بنا کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔مراٹھا سلطنت کو موٹے طور پر غیر منظم (uncontrolled) اور منظم (controlled) علاقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔غیر منظم علاقوں میں ریاست کا وہ حصہ شامل تھا جو زمینداروں،خود مختار اور نیم خود مختار سرداروں کے ماتحت تھا۔یہ سردار اندرونی نظم ونسق کے معاملے میں خود مختار تھے۔حکمراں اس علاقے سے نذرانہ وصول کرتا تھا لیکن منظم علاقوں کی طرح یہاں زمینی محصول کی شرح مقرر نہیں تھی۔نذرانہ کی رقم کا فیصلہ سردار کی طاقت سے ہوتا تھا۔مضبوط سرداروں کو کم نذرانہ ادا کرنا پڑتا تھا جبکہ کمزور سرداروں کو زیادہ دینا پڑتا تھا۔

منظم علاقوں یا براہ راست مراٹھا انتظامیہ کے تحت علاقوں میں محصولات کی تشخیص، تنظیم اور حساب کتاب کا مناسب نظام موجود تھا۔یہ علاقے وطن داروں کے حوالے کر دیے گئے۔دیشمکھ اور دیش پانڈے کے تحت 10 سے 100 گاؤں تک ہوتے تھے۔وطن دار نظام کے تحت حقوق کسی فرد کو نہیں بلکہ قبیلے یا خاندان کو تفویض کیے گئے تھے۔وطن داروں کا زمین کی پیداوار میں اجتماعی حصہ ہوتا تھا،اس کے علاوہ ان کے مزید کچھ حقوق ہوتے تھے، جیسے کسانوں سے اجرت کے طور پر سرکاری بقایہ لگان کی وصولی اور حکومت کی غیر محصولی زمین میں حصہ۔وطن کے حصوں کی تقسیم،زمین کی تقسیم نہیں تھی بلکہ پیداوار کی تقسیم تھی۔اصولاً کسی بھی موروثی جائیداد کو بیچنے کا حق مسلم تھا۔زرعی،مالی یا انتظامی بحران کے وقت،اس ریاستی کنٹرول کو ڈھیلا کیا جاسکتا تھا اور زمینداروں کو آمدنی کی وصولی میں مختصر مدت کے لیے آزادی دی جاسکتی ہے۔

جوت دار دو قسم کے ہوتے تھے۔

1. پہلی قسم کے جوت دار کو 'میراث دار' کہا جاتا تھا۔یہ مستقل جوت دار تھے، جنہیں موروثی ملکیت حاصل تھی۔
2. جوت داروں کی دوسری قسم کو 'اپرس' کہتے تھے۔یہ عارضی جوت دار تھے۔

مزید برآں جنوبی مہاراشٹر اور گجرات کا جوت داری نظام اور بھی پیچیدہ تھا۔18ویں صدی میں،زیادہ تر منظم علاقوں میں مالگزاری متعین

کرنے یا تشخیص کے روایتی معیار قائم رہے۔ پیشواؤں کے تحت، تنخہ('tankha') یعنی ہر گاؤں کے لیے ایک مستقل معیاری تشخیص ،مالگزاری بندوبست کا خط آغاز تھا۔

1750 کی دہائی کے آخر اور 1760 کی دہائی کے اوائل میں 'کمال بندوبست' نافذ کیا گیا تھا۔ اس نے تنخہ بندوبست کو مکمل کرنے کا کام کیا اور اس کے تحت نئ کاشت شدہ زمین بھی شامل کرلی گئی۔ یہ زمین کی زرخیزی کے تعین اور درجہ بندی پر مبنی تھا اور پیداوار میں بادشاہ کا حصہ $\frac{1}{6}$ فیصد تھا۔ ایک بار دیہی مالگزاری مطالبے ("تنخہ یا کمال) کی اندرونی تقسیم طے ہو جانے پر باقی امور پاٹل (گاؤں کے سربراہ) یا پورے گاؤں پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔ باضابطہ زمینی مالگزاری کے علاوہ، حکومت بہت سے دوسرے محصول (دیہی اخراجات کے عنوان کے تحت) عائد کرتی تھی جن کا حساب کتاب، دیہی اور ضلعی عہدیدار تفصیل کے ساتھ رکھتے تھے۔ مالگزاری جمع کرنے والے افسران کو عام طور پر کام وشدار یا معاملت دار کہا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی کے دوران، دکن، جنوبی مراٹھا دیش، گجرات، وسطی ہندوستان اور ناگپور میں ہر جگہ دیہی بندوبست سالانہ طور پر کیے جاتے تھے۔ 1790 اور 1810 کی دہائیوں میں، چونکہ پیشواؤں کو فوجی اخراجات کو پورا کرنے اور انگریزوں کو ادا کرنے کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی، اجارے داری (revenue farming) کی توسیع ہوئی اور حکومت کے مطالبے میں اضافہ ہوا۔ مہاراشٹر میں مالگزاری کا ایک چوتھائی سے ذرا کم، نقد ادا کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر اس مالگزاری کو ہنڈی (bill of exchange) کے ذریعے گاؤں سے ضلع اور ضلع سے دارالحکومت پونا بھیجا جاتا تھا۔ اصولی طور پر سرانجامداری والی شمالی ریاستوں (ہولکر، سندھیا، گوالیار اور بھونسلے) کا نظم ونسق پیشواؤں کی انتظامی ساخت کا عکس تھا، سوائے اس بات کہ کہ ان ریاستوں کی انتظامیہ میں پونہ سے مقرر کردہ ایک اضافی دیوان اور نگران افسر تھا۔

19.4.4 طویل مدتی رجحانات (Long-term Trends)

14 ویں اور 15 ویں صدی سے پورے شمالی اور مغربی دکن، وسطی ہندوستانی صوبجات، گجرات اور راجپوتانہ میں کچھ گھرانے عہدوں اور اختیارات پر قبضہ کرکے اور ریاستی تعمیر اور اپنے اثر ورسوخ کے بنیادی ڈھانچے قائم کرکے طاقتور مقام حاصل کر رہے تھے۔ 17 ویں صدی کے مہاراشٹر میں ان بڑے گھرانوں (جیسے بھونسلے) نے جو انتظامی ساختیں اپنائیں، اس میں انہوں نے مالی اور عسکری شعبوں میں اہم تبدیلیاں کیں۔ زمین کا نئے سرے سے سروے کیا گیا۔ نقد مالگزاری کی وصولی شروع ہونے لگی اور حساب کتاب کا نیا طریقہ وضع کیا گیا۔

ریاست کی مرکزی طاقتوں اور مقامی کسانوں کی نسبتاً مساوات پر مبنی روایات کے درمیان تناؤ غالب رہا۔ ریاست کے مالگزاری مطالبے پر احتجاج کے لیے وطن دار مجلسوں (گوتا) کو اکثر بلایا جاتا تھا۔ حالانکہ شاید یہ معاشرے 17 ویں صدی کے مقبول عام عوامی مزاحمت کا مرکز تھے، ایسا لگتا ہے کہ 18 ویں صدی میں ان علاقائی اور دیہی مکھیاؤں کے اختیارات اور طاقت میں نئے انتظامی طریقوں کے ذریعے کمی آئی۔ مذکورہ بالا بڑے گھرانے، زمین، محنت اور سرمائے کے کنٹرول پر مبنی اپنی معاشی طاقت کے ذریعہ شاہی دربار اور مقامی کسان میں تعلق قائم کرتے تھے۔

19.5 سماج اور معیشت (Society and Economy)

19.5.1 زرعی سماج (Agrarian Society)

18ویں صدی تک آتے آتے مراٹھا دیہی سیاسی نظام مکمل طور پر قائم ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زرعی بستیوں اور آبادی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پونا کے آس پاس کا علاقہ غیر سیر اب شدہ تھا اور یہاں کی آبادی بھی نسبتاً بکھری ہوئی تھی۔ اس وقت کی تکنیکی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے، یہ علاقہ 16ویں صدی کے وسط میں اپنی ترقی کے کنارے پر تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں مراٹھے مستقل زرعی علاقوں جیسے جنوب میں تنجور، مغرب میں گجرات اور شمال میں گنگا کی وادی پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑھتے ہوئے ٹیکسوں اور دیگر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے پیداوار بڑھانے پر بھی زور دیا گیا۔

مراٹھا حکمرانوں نے اس علاقے میں دو اقدامات کیے۔ سب سے پہلے، اس نے رعایتی تشخیص (استوا)، ٹیکسوں کی معافی اور قرضوں کو از سر تنظیم کا اہتمام کیا۔ اس سے نئی زمینوں پر کاشت ممکن ہوئی۔ دوسرے اقدام کے تحت، لوگوں کو زرعی وسائل کی ترقی کی ترغیب دی گئی۔ مثلاً شیواجی کے دور حکومت میں، گاؤں کے مکھیا کو پرانے بند کی مرمت اور نیا بند نانے کے لیے زمین انعام کے طور پر دی گئی۔

مورخ فوکوزاوا (Fukuzawa) نے بتایا ہے کہ مراٹھا حکمرانوں کے ان اقدامات کی وجہ سے کسانوں میں ایک قسم کی معاشی اونچ نیچ نے جنم لیا۔ انہوں نے بتایا کہ لوگوں کے پاس 18 ایکڑ سے 108 ایکڑ تک کی زمین تھی۔ ان کے مطابق، 1790 اور 1803 کے درمیان، چھوٹے جوت مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ دوسری طرف بڑے زمینداروں کی تعداد بڑھ گئی۔ 18ویں صدی تک آبادی، محصول اور غلے کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے کسانوں کا استحصال بڑھ گیا۔ اس حقیقت کے بہت سے شواہد دستیاب ہیں کہ غیر پیداواری طبقے جیسے وزیروں، دیش مکھوں اور سرانجام دار فوجی افسران، سوداگروں اور ساہوکاروں کا زراعت پر غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں سے کئی، ایک ہی وقت میں متعدد کردار ادا کرتے تھے۔ اس طرح دیہی علاقوں میں دھیرے دھیرے سماجی عدم مساوات میں اضافہ ہوتا گیا۔ دیہی وسائل کو کنٹرول کرنے کے تین طریقے تھے محصول، انعام زمین اور موروثی عہدہ۔

19.5.2 نظام زر کی ترقی (Development of Monetary System)

جس دور کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، اس دور میں جنوبی دکن، بنگال، بہار اور گجرات کے طرز پر دور دراز کی منڈیوں کے لیے مہاراشٹر کی معیشت میں نقد فصلوں کی پیداوار اور تیاری میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ 17ویں اور 18ویں صدی میں، قرض دینے والے ادارے شہری اور دیہی علاقوں میں کام کر رہے تھے۔ یہ ادارے قرضوں میں ڈوبے اعلیٰ طبقے اور کسانوں کو قرض فراہم کرنے کے علاوہ روزمرہ کی معاشی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ 18ویں صدی کے دوران مغربی دکن میں تانبے اور کوڑیوں کی درآمد، متحرک اور ترقی یافتہ نقد مقامی منڈیوں کی موجودگی کا اشارہ کرتا ہے۔ مغربی دکن کے دیہی بازاروں میں ہی نقد رقم کا لین دین نہیں ہوتا تھا، بلکہ زرعی مزدوروں کی یومیہ اور ماہانہ اجرت اور دستکارانہ پیداوار اور گھریلو کام کاج کے لیے بھی نقد ادائیگی کی جاتی تھی۔ چھوٹے بازاری قصبوں، اہم سرداروں کے رہائشی

مکانات اور بڑے شہروں میں بھی چھوٹے بڑے ٹکسال دیکھنے کو ملتے تھے۔ در حقیقت، 18ویں صدی کے نصف آخر میں، مروجہ دیہی نقدی کے نظام کے بارے میں معلومات بڑے پیمانے پر ملتی ہیں۔ مہاراشٹر میں کسانوں، زرعی مزدوروں، کاریگروں اور فوجیوں کے ذریعے نقد اور جنس میں قرض لیے جانے کے کافی ثبوت موجود ہیں۔ قرض لینے اور اسے واپس کرنے سے متعلق تحریری دستاویزات بھی ملی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام آدمی بھی اس نظام سے پوری طرح واقف تھا۔

19.6 مراٹھا خارجہ پالیسی (Foreign Policy of the Marathas)

19.6.1 بنگال (Bengal)

1740 میں نادر شاہ کے حملے اور علی وردی خان کی موت کے بعد، عظیم تر صوبہ بنگال جس میں بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھے، کے مغل نواب نے اپنے مخالفین کے خلاف مراٹھا پیشوا سے مدد طلب کی۔ مخالف فریق کو رگھوجی بھونسلے کا تعاون حاصل تھا۔ اس مدد کے بدلے 1743 میں اس علاقے کا چوتھ پیشوا کے حوالے کر دیا گیا۔ تاہم، بعد میں رگھوجی بھونسلے کی اپیل پر، شاہو نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کے چوتھ اور سردیش مکھی کو رگھوجی بھونسلے کو سونپ دیا۔ 1751 کے معاہدے کے تحت، نواب نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کے چوتھ کے طور پر ناگپور کے بھونسلوں کو 12 لاکھ روپے دینا قبول کیا۔

19.6.2 حیدرآباد (Hyderabad)

1715 سے 1717 تک دکن کے وائسرائے کے طور پر، نظام نے دکن میں مراٹھوں کے چوتھ اور سردیش مکھی محصول وصولی کی مسلسل مخالفت کی اور دونوں کے درمیان برابر جدوجہد ہوتی رہی۔ 1720 کے آس پاس نظام نے زرعی اور مالگزاری افسران کو مراٹھوں کے ذریعہ وصولی روکنے کی ترغیب دی۔ 1724 میں، اس نے پیشوا کو چوتھ اور سردیش مکھی دینا اس شرط پر قبول کیا کہ بدلے میں، پیشوا دشمنوں سے نظام کی حفاظت کرے۔ یہ معاہدہ اس وقت ٹوٹ گیا جب مراٹھوں نے 1725 میں کرناٹک پر حملہ کیا۔ اس لیے نظام نے دکن صوبے کے محصولات کی وصولی کی ذمہ داری کولہاپور کے سنبھاجی کو سونپ دی۔ 1728 میں پیشوا نے نظام کو پالکھیڈ میں شکست دی۔ اس کے بعد ہی نظام کولہاپور سے تعلقات ختم کرنے کے لیے تیار ہوا۔ پونا اور حیدرآباد کے درمیان تنازع 1752 میں اپنے عروج پر پہنچا۔ اس وقت مراٹھوں نے گوداوری اور تاپتی کے درمیان برار کے مغربی حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔

19.6.3 میسور (Mysore)

مراٹھوں نے اپنے علاقے کو تنگ بھدرا تک پھیلا دیا تھا اور میسور کے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ساتھ ان کی مسلسل جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے 1726ء میں میسور سے نذرانہ بھی وصول کیا۔ 65-1764ء اور 72-1769ء میں پیشوا نے حیدر علی کے خلاف کامیاب مہمات چلائیں، اور 1772 کے معاہدے کے مطابق، تنگ بھدرا کے جنوب کا علاقہ حیدر علی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ 1776 کے بعد، حیدر علی نے مراٹھا سلطنت کے کرشنا- تنگ بھدرا دوآب علاقے پر حملہ کیا۔ 1780 میں جا کر ہی میسور اور مراٹھوں کے درمیان

انگریزوں کے خلاف ایک مختصر مدت کا معاہدہ ہوا۔

19.6.4 راجپوتانہ (Rajputana)

مراٹھوں نے اس علاقے میں باقاعدہ براہ راست حکومت نہیں قائم کی۔ تاہم، 18ویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں کے دوران، مراٹھوں نے راجپوت ریاستوں، خاص طور پر بوندی، جے پور اور مارواڑ کے اندرونی جھگڑوں میں کبھی کبھی مداخلت کی۔ 1735 میں باجی راؤ کے راجستھان جانے سے پہلے، صرف چھوٹی ریاستیں ہی مراٹھوں کو چوتھ دیتی تھیں، لیکن اس کے وہاں جانے کے بعد ادے پور اور میواڑ نے بھی چوتھ دینا قبول کر لیا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مراٹھوں کی بگڑی ہوئی حالت کی وجہ سے چوتھ وصولی کچھ دنوں ملتوی رہی، لیکن پھر ہولکر اور اس کی موت کے بعد سندھیا خاندان نے پیشوا اور شہنشاہ کے نمائندے کے طور پر چوتھ کی وصولی جاری رکھی۔

19.6.5 مغل حکمران (Mughal Rulers)

جب احمد شاہ ابدالی نے 1752ء میں لاہور اور ملتان پر قبضہ کیا، تب مغل بادشاہ نے شمال مغرب کے دفاع کے لیے مراٹھوں سے مدد مانگی۔ 1752 میں ایک معاہدہ کے تحت شہنشاہ احمد شاہ نے ملہار راؤ ہولکر اور جیاپا سندھیا کو پنجاب اور سندھ اور دوآب کے چوتھ کے ساتھ ساتھ اجمیر اور آگرہ کی صوبیداری دینے کا وعدہ کیا۔ بدلے میں، ہولکر اور سندھیا کو مغل بادشاہ کو بیرونی دشمنوں اور سازشیوں سے بچانا تھا۔ لیکن 1761 میں پانی پت کی جنگ میں مرہٹے احمد شاہ ابدالی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور انہیں شکست ہوئی۔ پنجاب اور راجستھان ان کے قبضے سے نکل گئے۔ 1784 میں شاہ عالم نے دہلی اور آگرہ کی انتظامی ساخت کو تبدیل کیا اور ماہانہ وظیفہ لے کر دہلی اور آگرہ کا انتظام سندھیا کے حوالے کر دیا۔ پیشوا کو وکیل کا خطاب دیا گیا اور سندھیا کو نائب وکیل کا خطاب دیا گیا۔ دریں اثنا، روہیلا سردار غلام قادر خان نے سکھوں کی مدد سے شاہ عالم کو معزول کر کے اسے اندھا کر دیا۔ اس نے حرم کی خواتین اور شہزادیوں کی بے حرمتی کی۔ اپنی ذلت و رسوائی سے تنگ آکر شہزادیوں نے دریائے جمنا میں ڈوب کر جان دے دی۔ یہ سب دیکھ کر مہادجی سندھیا نے مداخلت کی۔ اس نے غلام قادر کو قتل کر کے مغل خاندان کو اس کے ظلم سے نجات دلائی اور شہنشاہ کو اس کا تخت واپس دلایا۔ شاہ عالم نے سندھیا کو وکیل مطلق اور امیر الامراء کا خطاب دیا۔ اس کامیابی نے سندھیا کو رسمی طور پر عزت بخشی مگر اس کی سیاسی قوت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، کیونکہ زیادہ تر مغل سردار شہنشاہ سے آزاد ہو چکے تھے۔ اس لیے سندھیا نے راجپوتوں پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔

19.6.6 ایسٹ انڈیا کمپنی (The East India Company)

1739 میں مراٹھوں نے پرتگالیوں سے بسین (Basein) چھین لیا۔ اس کے خوفزدہ ہو کر انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی بمبئی کاؤنسل نے بمبئی کو قلعہ بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شاہو کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس کے تحت انگریزوں کو مراٹھا ریاست میں آزاد تجارت کرنے کی اجازت دی گئی۔ کمپنی نے مراٹھا ریاستی وفاق کے مختلف دھڑوں اور پیشوا خاندان کے درمیان لڑائی کا فائدہ اٹھایا اور مراٹھا ریاست کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ کمپنی نے سازشوں اور بعد میں باقاعدہ جنگوں کے ذریعے مراٹھوں کے زیادہ تر علاقے چھین

لیے اور انہیں ماتحت امدادی معاہدہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

19.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے مراٹھا سیاست پر جدید نظریات کا تجزیہ کیا۔ مختلف مورخین نے مراٹھا ریاست کے ابھرنے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس میں فرینک پرلن، آندرے ونک وغیرہ شامل ہیں۔ مغل سلطنت کے ڈھانچے پر مراٹھا وفاق نے اپنی سلطنت قائم کی اور اس کے اداروں کو مغل طرز پر منظم کیا۔ مغل مالگزاری انتظامیہ کے بہت سے عناصر مراٹھا مالگزاری انتظامیہ میں موجود تھے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ مراٹھا ریاست پر تحقیق کرنے والے مورخین 15 ویں صدی سے شروع ہونے والے جائیداد اور انتظامی عمل کے ارتقا کو بڑے پیمانے پر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس ترقی کو مراٹھا بادشاہی کے دور تک محدود نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے زرعی معاشرے کی نوعیت اور نقدی کے چلن کے بارے میں بھی اس اکائی میں جانا کہ کس طرح نقد فصلوں اور ان کی دور دراز تجارت نے نقدی کے چلن کو بڑھاوا دیا۔ اس کے ساتھ ہی علاقائی طاقتوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مراٹھوں کے تعلقات پر اس اکائی میں روشنی ڈالی گئی۔

19.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

تیرتھ مقامات	:	ہندوؤں کے مقدس زیارتی مقامات
پیشوا	:	مراٹھا سردار اعلیٰ یا وزیر اعظم
سرانجام	:	مراٹھا سلطنت میں 17 ویں اور 18 ویں صدی کے دوران سرانجام کا نظام رائج تھا۔ یہ ایک محاصل کا نظام تھا جس میں زمین کی آمدنی بڑے افسروں اور فوجی کمانڈروں کو ان کی تنخواہوں کے بدلے تفویض کی جاتی تھی۔
میراث دار	:	زمین پر ملکیتی حقوق رکھنے والا کسان
موضع	:	مراٹھا مالگزاری نظام کی سب سے چھوٹی اکائی
موکاسادار	:	ریاستی زمین کے منتظم افسر
معاملہ	:	سرکاری زمین
سرصوبے دار	:	مراٹھا انتظامیہ میں صوبے کا گورنر
چوتھ	:	مالگزاری کا ایک چوتھائی
سردیش مکھی	:	مالگزاری کا دس فیصد

19.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

19.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تیرتھ مقامات کسے کہتے ہیں؟
2. پیشوا کون ہوتا تھا؟
3. مراٹھا انتظامیہ میں بادشاہ کو کیا کہا جاتا تھا؟
4. سرانجام سے کیا مراد ہے؟
5. میراث دار کون ہوتا تھا؟
6. موضع کسے کہتے ہیں؟
7. موکاسادار کون ہوتا تھا؟
8. معاملہ سے آپ کون سی زمین مراد لیتے ہیں؟
9. سرصوبے دار کسے کہا جاتا تھا؟
10. چوتھ کیا تھا

19.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مراٹھا سیاسی نظام کی نوعیت پر نوٹ لکھیے۔
2. اہم سردار خانوادوں پر نوٹ لکھیے۔
3. طویل مدتی رجحانات پر نوٹ لکھیے۔
4. زرعی سماج پر نوٹ لکھیے۔
5. مراٹھا مغل تعلقات پر نوٹ لکھیے۔

19.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مراٹھا سیاسی نظام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
2. مراٹھا سماج اور معیشت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. مراٹھا خارجہ پالیسی کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

19.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bayly, Christopher Alan, *Indian Society and the Making of the British Empire*, Cambridge University Press, 1987.
2. Chandra, Satish. *Parties and Politics at the Mughal Court, 1707-1740*. India, Oxford University Press, 2002.
3. Gordon, Stewart, *The Marathas, 1600–1818*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005 (first published in 1998).
4. Gordon, Stewart, *Marathas, Marauders and State Formation in Eighteenth-Century India*, OUP, New Delhi, 1994.
5. Hardas, Balshastri, *Chatrapati Shivaji*, Vols. 1–4, Kale Prakashan, Pune, 1984.
6. Kadam, V.S., *Maratha Confederacy (A Study in its Origin and Development)* , Munshiram Manoharlal, Delhi, 1993.
7. Karandikar, S.L., *Rise and Fall of the Maratha Power*, S.S. Karandikar, Pune, 1969.
8. Majumdar, R.C., and V.G. Dighe (eds.), *Maratha Supremacy*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1977.
9. Nadkarni, R.V., *Rise and Fall of the Maratha Empire*, Popular Prakashan, Bombay, 1966.
10. Ranade, M.G., *Rise of the Maratha Power*, Bombay University, Bombay, 1963 (first published in 1900).
11. Sen, Surendranath, *Administrative System of the Marathas*, K.P. Bagchi, Calcutta, 1976.
12. Wink, André, *Land and Sovereignty in India: Agrarian Society and Politics Under the Eighteenth-Century Maratha Svarājya*. Cambridge University Press, 2008.

اکائی 20۔ بنگال

(Bengal)

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید

20.1 مقاصد

20.2 پس منظر

20.3 بنگال کی خود مختاری اور مرشد قلی خاں

20.4 شجاع الدین

20.5 سرفراز خاں

20.6 علی وردی خاں

20.6.1 مراٹھوں سے تصادم

20.7 سراج الدولہ

20.7.1 پلاسی کی جنگ

20.7.2 پلاسی کی جنگ کے نتائج

20.8 میر جعفر

20.9 میر قاسم

20.10 بنگال کی معاشی صورت حال

20.11 کلیدی الفاظ

20.12 اکتسابی نتائج

20.13 نمونہ امتحانی سوالات

20.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

20.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

20.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

20.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید (Introduction)

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جب مغل بادشاہوں کی گرفت سلطنت کے مختلف حصوں میں کمزور ہونے لگی تو امراء کی جاہ طلبی نے اپنے راستے الگ کر لیے۔ مغل صوبہ داروں نے مرکز سے تعلق قطع کر کے اپنی ریاستوں پر آزادنہ حکمرانی شروع کر دی۔ بنگال بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ اس میں بنگال کے علاوہ بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ اس اکائی میں ہم پڑھیں گے کہ کس طرح بنگال کے صوبہ دارنے مغل حکمرانوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اپنا تسلط جما لیا اور خود مختاری حاصل کر لی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ریاستوں کی فلاح و بہبود اور معاشی ترقی پر پورا دھیان دیا اور عوام کے مفادات کو مدنظر رکھا۔

20.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آزاد ریاست کے طور پر بنگال کی تاریخ سے واقف ہو سکیں گے۔
- سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شمال مشرق میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کو جان جائیں گے۔
- پلاسی کی جنگ کے اسباب اور نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان پر انگریزوں کے بتدریج تسلط کے آغاز کو سمجھ سکیں گے۔
- کمپنی کی حکومت کے دوران بنگال کی معاشی بدحالی کا تجزیہ کر سکیں گے۔

20.2 پس منظر (Background)

ہندوستان کے شمال مشرق میں ایک خوشحال خطہ بنگال واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہ مگدھ کے حکمرانوں، موریہ اور گپت خاندان کے زیر حکومت رہا۔ چھٹی صدی ء میں بنگال، شمالی ہند کے عظیم حکمراں ہرش کے کٹر مخالف ششانک کا دارالحکومت تھا اور اس وقت یہ گوڑ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ابتدائی عہد وسطیٰ میں یہ پال اور سین خاندان کے ماتحت رہا جنہوں نے اسے بڑے پیمانے پر ترقی دی۔ جنگلات صاف کرائے اور بدھ خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ ان خانقاہوں کی زیارت کے لیے بدھ راہب بڑی دور دراز سے آیا کرتے تھے۔ 1204 میں بنگال بختیار خلجی کے ہاتھوں دہلی سلطنت میں شامل ہوا لیکن 1338 کے بعد یہ کافی عرصہ تک خود مختار حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ بنگال پر کسی بھی مرکزی ریاست کے لیے اقتدار قائم رکھنا آسان نہیں تھا۔ یہ ایک مالدار صوبہ اور تجارت اور زراعت کا مرکز تھا۔ خلیج بنگال میں اس کی متعدد بندرگاہیں تھیں۔ بنگال کا ہر گورنر وسیع ذرائع کا مالک ہونے کی وجہ سے خود مختاری کی کوششیں شروع کر دیتا تھا۔ 1565 میں اکبر کے عہد میں

یہ عظیم مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔فرخ سیر نے 1717 میں مرشد قلی خاں کو صوبہ بنگال کا گورنر مقرر کیا جس میں بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھا۔یہیں سے آزاد ریاست کے طور پر جدید ہندوستان میں بنگال کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔جس نے یورپینوں کی آمد کے بعد نئی صورت اختیار کرلی۔

20.3 بنگال کی خود مختاری اور مرشد قلی خاں

(Independence of Bengal and Murshid Qali Khan)

مغلیہ سلطنت کے زوال نے باحوصلہ اور قسمت آزماؤں کے لیے ایسے راستے کھول دیے جن پر چل کر انہوں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں انہیں میں ایک مرشد قلی خاں ہے جس نے ہندوستان کے مشرق میں بنگال کی آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی جو بنگال کے علاوہ بہار اور اڑیسہ پر مشتمل تھی۔بنگال وہ پہلا صوبہ بنا جس نے مغلوں سے خود مختاری کا فیصلہ کیا۔اس کے بانی مرشد قلی خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جنوبی ہندوستان کا نو مسلم برہمن تھا۔اس نے ایران میں بھی تعلیم پائی اور دکن میں رہ کر فوجی وانتظامی تجربات حاصل کیے تھے۔اپنی محنت،ایمانداری اور صلاحیتوں سے مرشد قلی خاں نے اورنگ زیب کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔1700 میں اورنگ زیب نے اسے صوبہ بنگال کا دیوان مقرر کیا۔اس کی اہلیت دیکھ کر بادشاہ نے 1701 میں اڑیسہ اور 1704 میں بہار کی ذمہ داریاں بھی اسے دے دیں۔ اورنگ زیب ایک لمبے عرصے تک دکن میں الجھا رہا۔جہاں اسے اپنی جنگوں کو جاری رکھنے کے لیے بڑی رقم درکار تھی۔مرشد قلی خاں باقاعدگی سے بادشاہ کو ایک خطیر رقم بھیجتا رہا۔اس وقت بنگال کا صوبیدار اورنگ زیب کا پوتا عظیم الشان تھا۔اس سے کچھ اختلافات کے باعث مرشد قلی خاں نے اپنا دیوانی کا دفتر ڈھاکہ سے مقصود آباد منتقل کردیا جو بعد میں اسی کے نام سے مرشد آباد کہلایا۔

1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد اسے ہاتھ پیر پھیلانے کے اچھے مواقع حاصل ہوئے۔فرخ سیر نے اُسے بنگال اور اڑیسہ کی صوبیداری بھی عطا کردی،اور چونکہ اس وقت بہار،بنگال کی صوبیداری میں شامل تھا،اس لیے مرشد قلی خاں بنگال،بہار اور اڑیسہ تینوں کا صوبیدار بن گیا۔اب وہ صرف رسمی طور پر مغل بادشاہ کے ماتحت تھا ورنہ عملی طور پر ان علاقوں کا بلاشرکت غیرے مالک اور خود مختار حکمراں تھا۔فرخ سیر نے اسے 'معتمد الملک علاء الدین ظفر خاں بہادر ناصر جنگ' کے خطاب سے نواز کر اس کی حیثیت کو مضبوط کردیا تھا۔

مرشد قلی خاں عمدہ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔اس نے ریاست کی معاشی حالت کو مضبوط کرنے کے لیے بہت سے اقدام کیے۔اس نے جاگیرداروں کی سبھی زمین کو خالصہ میں تبدیل کردیا اور 'اجارہ' کے تحت لگان وصول کرنے کے لیے ٹھیکے کا طریقہ اپنایا۔بعد میں یہی ٹھیکیدار،زمیندار کہلائے اور لارڈ کارنوالس کے عہد میں دوامی بندوبست کے تحت زمین کے مالک بن گئے اور ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔مرشد قلی خاں کی ان تبدیلیوں سے ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔علاوہ ازیں اس نے انتظامی امور پر ہونے والے خرچوں پر بھی لگام کسی جس نے معیشت کو بہتر بنانے میں مدد کی۔مرشد قلی خاں کے بہتر انتظام کے سبب امن وسکون قائم رہا۔اس نے ریاست کو اندرونی وبیرونی خطروں سے محفوظ رکھا۔اس کے عہد میں صرف تین بغاوتیں ہوئیں۔پہلی بغاوت بھوسنہ پرگنہ کے سیتارام،ادے نارائن اور غلام محمد نے

کی۔دوسری شجاعت خاں اور تیسری نجابت خاں نے کی۔ان تینوں بغاوتوں کو کامیابی سے کچلنے کے بعد یہ جاگیریں اپنے قریبی لوگوں کو بخش دی گئیں۔مرشد قلی خاں ایک اچھا منتظم تھا۔اس نے تجارت کو فروغ دیا اور تاجروں کی ہر ممکن مدد کی۔ان کوششوں سے ریاست کی مالی حالت کافی بہتر ہوئی۔وہ ذاتی طور پر ایک بلند کردار کا مالک تھا اور ہر طرح کے تعیش سے دور تھا۔اپنی ذمہ داریوں کو پوری یکسوئی کے ساتھ نبھانے والا،مذہبی امور کی سختی سے پابندی کرنے والا مرشد قلی خاں جادو ناتھ سرکار کے الفاظ میں برف جیسا ٹھنڈا دل رکھتا تھا۔1727 میں اس کی موت ہوگئی لیکن اپنی موت سے قبل اس نے بنگال کے صوبہ کو مکمل طور پر اپنے زیر نگیں کر لیا تھا۔

20.4 شجاع الدین (Shujauddin)

مرشد قلی خاں کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔اس لیے اس کی موت کے بعد اس کا داماد شجاع الدین محمد خاں مسند نشین ہوا۔اس سے پہلے وہ اڑیسہ کا ڈپٹی گورنر رہ چکا تھا۔اسے انتظامی امور کا تجربہ تھا۔اس نے اپنے رشتہ داروں اور دوست واقربا کو اہم منصب دیے،اس کے خاص صلاح کاروں میں علی وردی خاں ،اس کا بھائی حاجی احمد،ایک وفادار افسر عالم چند اور مرشد آباد کا مشہور ساہوکار جگت سیٹھ فتح چند شامل تھے۔تمام امور انہیں لوگوں کی رائے سے طے پاتے۔اپنے شروعاتی دور میں شجاع الدین نے صوبہ کے نظم ونسق پر خصوصی دھیان دیا،عوام کی فلاح وبہبود ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتی۔لوگوں کو انعام واکرام سے نوازتا اور رحم دلی کا سلوک کرتا تھا۔لیکن جو یوروپی کمپنیاں اس کے علاقہ میں سرگرم تجارت تھیں ان پر کڑی نظر رکھتا اور سختی سے پیش آتا۔انگریز اس کی کھلی مخالفت کی جرأت کبھی نہیں کر سکے بلکہ وہ اسے خوش کرنے اور چاپلوسی میں بڑی بڑی رقمیں بھی دیتے۔شجاع الدین کا یہ عہد حکمرانی بنگال کے لیے خوش آئند تھا مگر آخری دور میں حالات بدل گئے۔اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور سارے اختیارات اس کے صلاح کاروں حاجی احمد،عالم چند اور جگت سیٹھ فتح چند کے ہاتھوں میں آ گئے۔1739 میں شجاع الدین کی موت ہوگئی۔

20.5 سرفراز خاں (Sarfaraz Khan)

شجاع الدین کی موت کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں تخت نشین ہوا۔وہ ایک آرام پسند اور نااہل شخص ثابت ہوا۔حکمراں بننے کے بعد اس نے اپنے باپ کے پرانے امراء حاجی احمد اور عالم چند وغیرہ کو ان کے عہدوں پر قائم رہنے دیا۔مگر اس کی حد سے زیادہ کاہلی اور انتظامی امور میں عدم دلچسپی کی وجہ سے حالات اس کے مخالف ہوگئے،حقیقتاً اس میں حکمرانوں والی کوئی خوبی تھی ہی نہیں۔نتیجتاً حاجی احمد جیسے لوگوں کی بن آئی۔جس کے جوڑ توڑ سرفراز خاں کو کمزور کرتے چلے گئے۔یہاں تک کہ 1740 میں بہار کا ڈپٹی گورنر علی وردی خاں پٹنہ سے چل کر مرشد آباد پہنچا اور اپریل 1740 میں گھیریا کی لڑائی میں سرفراز خاں کو شکست دے دی۔سرفراز خاں لڑائی میں مارا گیا اور بنگال کی گدّی پر علی وردی خاں قابض ہوگیا۔

20.6 علی وردی خاں (Alivardi Khan)

علی وردی خاں ایک لائق اور چالاک شخص تھا۔اس میں سیاسی سوجھ بوجھ کے علاوہ انتظامی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔1728 میں شجاع الدین نے اسے چکلہ اکبر پور کا فوجدار مقرر کیا تھا۔ جس کا اس نے عمدہ طریقے سے انتظام چلایا۔ نظم و نسق قائم کیا۔لوگوں کو امن میسر آیا اور خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ علی وردی خاں کا بڑا بیٹا محمد رضا،شجاع الدین کی فوج میں محکمۂ تنخواہ کا افسر اور مرشد آباد میں کسٹم سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر تعینات تھا۔اس کا دوسرا بیٹا آغا محمد سعید رنگ پور کا فوجدار تھا۔جب کہ بھائی حاجی احمد خاں ایک طویل عرصہ سے بنگال میں اہم جگہ رکھتا تھا اور شجاع الدین کا صلاح کار تھا۔1733 میں علی وردی خاں کو بہار کا ڈپٹی گورنر بنایا گیا۔بہار کے زمیندار بڑے سرکش تھے اور بنجارے فساد مچاتے رہتے تھے۔ علی وردی خاں نے ذمہ داری قبول کرنے کے بعد زمینداروں کے خلاف سخت قدم اٹھائے اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔بنجاروں پر لگام کسی اور پوری طرح سے اُن پر قابو پایا۔سخت کاروائیوں کے علاوہ اس نے باہمی تعاون کا راستہ بھی اپنایا اور بہار کے حالات پر مکمل قابو کرکے وہاں امن وچین قائم کیا۔اس کے بلند حوصلوں نے اُسے آگے بڑھایا اور حالات کا فائدہ اٹھا کر 1740 میں سرفراز خاں کو شکست دے کر بنگال کے تخت پر قبضہ کرلیا۔

بنگال کی مسند علی وردی خاں کے لیے آسان راستہ ثابت نہیں ہوئی۔مگر اس جفاکش اور مضبوط قوت ارادی کے مالک شخص نے تمام مشکلوں پر قابو پایا۔سب سے پہلے 1740 میں اس نے فوجی کاروائی کے ذریعہ اڑیسہ پر قبضہ کیا۔1742 میں اودھ کے نواب نے بہار میں گھس کر علی وردی خاں کے لیے دقتیں پیدا کردیں۔ لیکن اس سے زیادہ پریشانی بہار کے افغانوں کی بغاوتوں کی وجہ سے ہوئی۔ان افغانوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے جری پٹھانوں کی مدد سے 1745 اور 1748 میں دو بغاوتیں کیں جن پر قابو پانے میں علی وردی خاں کو کافی مشقت کرنی پڑی۔

20.6.1 مراٹھوں سے تصادم (Clash with the Marathas)

یہ وہ دور تھا جب مراٹھا اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے تھے۔اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے لیے درد سر بنے ہوئے تھے۔انہوں نے بنگال پر 1742،1743،1744،1745 اور 1748 میں پانچ بار حملے کیے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال معاشی اعتبار سے ایک خوشحال علاقہ تھا اور یہاں لوٹ مار کرنے یا حملہ کرنے میں زیادہ فائدہ کے مواقع تھے۔ناگپور کے رگھوجی بھونسلے کو اپنے سیاسی مفاد کے لیے یہ علاقہ زیادہ سود مند نظر آیا۔سب سے پہلے 1742 میں اس کے ایک سپہ سالار بھاسکر رام نے بنگال پر حملہ کیا۔اس کی فوجوں نے بنگال کے مغربی اضلاع اور بہار واڑیسہ کے کچھ علاقوں میں لوٹ پاٹ کی۔1743 میں خود رگھوجی بھونسلے ایک بڑی فوج کے ساتھ بنگال پر حملہ آور ہوا۔بہانہ تھا چوتھ کی وصولی۔اسی دوران پیشوا بالاجی باجی راؤ نے بھی ایک بڑی مراٹھا فوج کے ساتھ بنگال پر چڑھائی کردی۔ایسے مشکل وقت میں علی وردی خاں نے سمجھ داری سے کام لے کر بالاجی باجی راؤ سے چوتھ دینے کا وعدہ کرکے اور 22 لاکھ روپیہ ادا کرکے صلح کرلی۔ان دونوں کی مشترکہ افواج نے رگھوجی بھونسلے کو بڑی آسانی سے بنگال سے باہر کردیا۔ جس کے بعد بالاجی باجی راؤ بھی بنگال سے چلا گیا۔1744 میں

بھاسکر رام پھر ایک مراٹھا فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا مگر اس بار علی وردی خاں نے چالاکی سے بھاسکر رام کو مروادیا جس کے بعد اس کی فوج کو فرار ہونا پڑا۔1745 میں رگھوجی بھونسلے نے دوبارہ حملہ کر دیا۔اس بار علی وردی خاں کی فوجوں نے اسے شکست دی اور بنگال سے باہر کھدیڑ دیا۔مراٹھوں کا پانچواں حملہ 1748 میں ہوا۔اس بار ناگ پور کی مراٹھا فوج جنوّجی بھونسلے کی قیادت میں بنگال میں داخل ہوئی۔1751 میں علی وردی خاں نے تین سال تک جدّ وجہد کے بعد مراٹھوں سے صلح کرلی۔75 سالہ علی وردی خاں کو اسی میں بہتری نظر آئی۔اڑیسہ بھونسلے حکمراں کو دے دیا گیا۔اکتوبر 1751 سے بنگال کی آمدنی سے دو قسطوں میں 12 لاکھ روپیہ سالانہ مراٹھوں کو دینا طے ہوا جس کے بعد مراٹھوں نے بنگال پر کبھی حملہ نہ کرنے کا عہد کیا۔

مراٹھوں کے حملوں سے نجات تو مل گئی مگر ان مسلسل فوجی کاروائیوں نے بنگال کو بہت نقصان پہنچایا۔اہم علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔مالی تاوان نے معاشی بربادی کی۔علاوہ ازیں زراعت، صنعت و حرفت اور کاروبار کو بہت دھکا پہنچا۔ان حملوں نے سماجی ڈھانچے پر بھی ضرب لگائی۔لوٹ مار کے سبب بہت سے لوگ مغربی اضلاع سے مشرقی و شمالی حصوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔انگریزوں کو بھی فائدہ ہوا۔انہوں نے مراٹھوں کے ممکنہ حملوں سے تحفظ کے لیے قدم اٹھائے اور ہندوستانیوں کو پناہ دی جس سے عوام میں ان کا اعتماد بڑھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تمام سرگرمیوں پر علی وردی خاں کی گہری نظر تھی۔وہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے واقف بھی تھا اور فکر مند بھی۔10،اپریل 1756 کو علی وردی خاں کی موت ہوگئی۔اس کا پورا دورِ حکمرانی اس کی ہمت، دور اندیشی اور اہلیت کا عکاس ہے۔ نظم و نسق پر اس کی مضبوط گرفت اور باحوصلہ فوجی کاروائیاں تاریخ میں اس کے مقام کو بلند کرتی ہیں۔وہ ایک چالاک سیاستداں تھا،حالات کے تحت سمجھوتہ اور کاروائی کرنے کا قائل تھا۔اپنی آخری عمر تک حالات اور انتظامیہ دونوں پر اس کی گرفت مضبوطی سے بنی رہی۔

20.7 سراج الدولہ (Siraj-ud Daula)

علی وردی خاں کے بعد اس کا پوتا سراج الدولہ جسے وہ خود نامزد کر گیا تھا گدّی پر بیٹھا۔ مگر اس کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ ایک سال کے اندر ہی پلاسی جیسی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ اس صوبہ کا مقدر بن گئی۔سراج الدولہ کو تخت پر بیٹھتے ہی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔اس وقت حکمرانی کے کئی دعوے دار تھے جو سراج الدولہ کی جگہ لینا چاہتے تھے۔اس کی سب سے بڑی خالہ گھسیٹی بیگم جس نے بہت دولت جمع کر رکھی تھی وہ اپنے گود لیے بیٹے مراء الدولہ کو جو سراج الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا نواب بنانا چاہتی تھی۔تخت کا دوسرا دعویدار سراج الدولہ کی دوسری خالہ کا بیٹا شوکت جنگ تھا جو پورنیا کا صوبیدار تھا۔اس کے علاوہ اس کا سپہ سالار میر جعفر جو علی وردی خاں کا بہنوئی تھا، خود سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔سراج الدولہ نے ان سب کے خلاف کاروائی کی۔اس نے گھسیٹی بیگم کی سب دولت ضبط کرلی۔میر جعفر کو ہٹا کر فوج کی باگ دوڑ میر مدن کے ہاتھ میں دی۔اکتوبر 1756 میں شوکت جنگ کو شکست دی اور ہلاک کر دیا۔

سراج الدولہ کے سب سے طاقتور دشمن انگریز تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب کے درمیان کئی طرح کے تنازعات تھے۔وہ شروع سے ہی انگریزوں کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ علی وردی خاں نے مرتے وقت سراج الدولہ کو انگریزوں سے ہوشیار رہنے کو کہا

تھااور یوروپی طاقتوں کو دبانے اور قلعے بنانے سے روکنے کے لیے وصیت کی تھی۔دوسری طرف انگریز نہ صرف سراج الدولہ کی کھلی حکم عدولی کرتے بلکہ اس کے دشمنوں کو پناہ دیتے اور اکساتے۔دوسرا مسئلہ 'دستک' کا تھا۔یہ ایک پرمٹ تھا جس سے انگریزوں کو تجارت میں ٹیکس کی چھوٹ تھی۔انہوں نے اس کا غلط استعمال کیااور ہندوستانیوں کو یہ پرمٹ بیچنے لگے۔جس سے ریاست کی آمدنی کو نقصان ہو رہا تھا۔اس کے علاوہ انگریزوں نے کلکتہ میں ریاست کے مجرمین کو پناہ دے رکھی تھی۔جس کی سب سے بڑی مثال کرشن بلّبھ تھا۔یہ گھسیٹی بیگم کے دیوان راج بلّبھ کا بیٹا تھااوراس کی ساری دولت لے کر انگریزوں کے پاس چلا گیا تھا۔انگریزوں نے نہ صرف اس کو واپس دینے سے انکار کیا بلکہ سراج الدولہ کے سفیر نارائن سنگھ کی بے عزتی بھی کی۔یہ وہ دور تھاجب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں رسّہ کشی چل رہی تھی۔دونوں نے اپنی اپنی بستیوں کی قلعہ بندی شروع کردی۔انگریزوں نے تو قلعہ کے چاروں طرف خندق بھی کھود دی۔نواب نے دونوں کو اس سے روکنے کا حکم دیا۔فرانسیسی تومان گئے مگر انگریزوں نے اپنا عمل جاری رکھا،اس پر نواب نے انگریزوں کے خلاف کاروائی کا آغاز کیا۔6،جون 1756 کو سراج الدولہ نے انگریزوں کی قاسم بازار کی کوٹھی پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔وہاں سے چل کر 16،جون کو کلکتہ پر حملہ کر دیا۔جس کے بعد گورنر ڈریک اور بیشتر انگریز جہاز کے ذریعہ فلتا ٹاپو پر چلے گئے اور 20جون کو قلعہ پر سراج الدولہ کا قبضہ ہوگیا۔اس کا نام بدل کر علی نگر رکھا۔یہاں بلیک ہول ٹریجڈی کا ذکر غیر ضروری ہے جس کے مطابق ایک چھوٹے سے کمرے میں 146 انگریزوں کو نواب نے بند کردیا تھا۔اور دم گھٹنے سے 123 مر گئے تھے۔یہ واقعہ کبھی ہوا ہی نہیں صرف انگریزوں نے نواب کو بدنام کرنے کی غرض سے اس کہانی کو جنم دیا تھا۔

کلکتہ ہاتھ سے نکلنے پر مدراس سے ایک فوج ایڈمرل واٹسن اور دوسری زمینی راستہ سے کلائیو کی سرکردگی میں 14،دسمبر 1756 کو بنگال پہنچیں۔نواب کے افسر مانک چند کو انگریزوں نے رشوت دے کر اپنی طرف ملا لیا نتیجتاً 2 جنوری 1757 کو معمولی سی لڑائی کے بعد کلکتہ پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔انہوں نے آس پاس کے علاقوں کو لوٹا۔9،فروری 1757 کو سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان علی نگر کا معاہدہ ہوا۔جس کے مطابق طے ہوا۔

1. نواب نے انگریزوں کو مغل بادشاہوں کے ذریعہ دی گئی تمام مراعات مان لیں۔
2. دستک کے ذریعہ آئے ہوئے انگریزوں کے مال کو بنگال،بہار اور اڑیسہ میں ٹیکس سے آزاد کر دیا گیا۔
3. انگریزوں اور کمپنی سے چھینی گئیں تمام اشیاء نواب واپس کرنے اور تاوان کی شکل میں روپیہ ادا کرنے پر بھی راضی ہو گیا۔
4. مرضی کے مطابق کلکتہ کی قلعہ بندی کرنے کا انگریزوں کو اختیار مل گیا۔
5. انگریزوں کو اپنے سکے چلانے کا حق بھی دے دیا گیا۔

20.7.1 پلاسی کی جنگ (The Battle of Plassey)

یہ معاہدہ دراصل عارضی تھا جو فریقین نے اپنی اپنی مجبوری کے سبب کیا تھا۔دونوں میں سے کوئی بھی اس پر دل سے تیار نہیں تھا۔ نواب خود بھی ان شرطوں کو پورا کرنا نہیں چاہتا تھا۔انگریزوں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ تاوان کی رقم ادا نہیں کر رہا ہے۔دوسری طرف

انگریزوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ سراج الدولہ ان کے دشمن فرانسیسیوں کی مدد کر رہا ہے۔خاص طور پر جب انگریزوں نے چندر نگر پر حملہ کیا تو نواب نے اس کی مخالفت کی اور فرانسیسی افواج کی مدد کی۔ سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان فیصلہ کن معرکہ کی زمین ہموار ہو رہی تھی۔ مخاصمت کی دیوار جو اول دن سے دونوں کے بیچ کھڑی ہو گئی تھی وہ وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی جارہی تھی۔انگریز اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اپنانے کو تیار تھے۔وہ نواب کو کٹھ پتلی بنانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف سراج الدولہ کسی بھی صورت اپنے حقوق محفوظ رکھنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ مفاد کے اس ٹکراؤ نے دونوں کو پلاسی کے میدان میں پہنچا دیا۔لیکن اس آخری معرکہ کے کچھ فوری اسباب بھی تھے جنہوں نے اس جنگ کو ناگزیر بنادیا۔یہ مندرجہ ذیل تھے۔

1. علی نگر معاہدہ کی شرائط پر عمل درآمد نہ ہونا: جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ علی نگر کا معاہدہ دراصل مجبوری کا سودا تھا۔اسی وجہ سے فریقین میں سے کوئی بھی اس کو عملی شکل دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔سراج الدولہ نے تاوان کی شکل میں جو روپیہ انگریزوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا،اسے پورا نہیں کیا۔مسے میورنے لکھا ہے"نواب معاہدہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے راضی نہیں تھا اس لیے جنگ لازمی ہو گئی۔' اس لیے انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ سراج الدولہ کو تیاری کا موقع دیئے بغیر جنگ شروع کرنا بہتر ہوگا۔بلاشبہ نواب بنگال۔علی نگر معاہدہ کو عملی شکل دینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر یہی بات انگریزوں پر بھی صادق آتی تھی۔وہ یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ جب تک سراج الدولہ محفوظ ہے خود ان کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔انہیں یقین تھا کہ انگریزی مفاد سراج الدولہ کے کانٹے کو ہٹائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔
2. نواب پر الزام: انگریزوں کا نواب پر کا الزام تھا کہ نواب نے اپنی طرف سے انہیں جو یقین دہانی کرائی تھی اور جو وعدے کیے تھے وہ اس پر پورے نہیں اترے۔سراج الدولہ نے کچھ نجی خطوط میں انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے یعنی انگریزوں کے دشمنوں سے دوستی نہیں رکھے گا۔یہ بات معاہدہ کی شرائط میں شامل نہیں تھی مگر انگریز اس کو بھی سمجھوتہ کی ایک شق قرار دیتے تھے۔یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ انگریزوں کی خواہش کے باوجود نواب نے اسے معاہدہ کی شرائط میں شامل نہیں کیا۔چنانچہ چندر نگر میں فرانسیسیوں کی مدد کرنے کو انگریزوں نے اپنی دشمنی اور مخالفت قرار دیا،اور نواب پر الزام لگایا کہ اس نے ایسا کر کے معاہدہ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔سراج الدولہ نے اس الزام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سراج الدولہ فرانسیسیوں کو انگریزوں کا دشمن نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ اس وقت تک بنگال میں فرانسیسیوں نے انگریزوں کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا۔
3. سراج الدولہ کے خلاف اندرونی سازشیں: صرف انگریز ہی ایک محاذ نہیں تھے۔جہاں سراج الدولہ جدوجہد کر رہا تھا اس کے خلاف اندرونی سازشوں کا جال بھی بڑی مضبوطی سے بُنا جارہا تھا۔اس کا روح رواں تھا میر جعفر جو اس وقت میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھا۔اس کے علاوہ بااثر اور دولت مند مہاراجہ کرشن چندر اور جگت سیٹھ بھی اس سازش کے سرخیل تھے۔بہت جلد اس میں انگریزوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔اور امین چند نے درمیان میں پہنچ کر 10 جون 1757 کو سازشیوں اور انگریزوں کے درمیان خفیہ معاہدہ کرادیا۔جس میں طے کیا گیا۔

- میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا جائے گا۔
- تاوان کے طور پر میر جعفر کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ، یورپی شہریوں کو 50 لاکھ روپیہ اور ہندو تاجروں کو 20 لاکھ روپیہ دے گا۔
- جنگ کا خرچ بھی میر جعفر کو ادا کرنا ہوگا۔
- کلکتہ کی تمام آراضی کے مالک انگریز ہوں گے۔
- ہگلی کے قریب کوئی قلعہ بندی نہیں ہوگی۔

امین چند جو فریقین میں معاہدہ کرا رہا تھا اس نے تیس لاکھ روپیہ اور نواب کے خزانے کا نصف حصہ خود لینے کی مانگ کی۔ اور نہ ماننے پر یہ دھمکی دی کہ وہ اس سازش کی اطلاع سراج الدولہ کو کردے گا۔ اس پر کلائیو نے اسے دھوکہ دیا۔ دو معاہدہ نامے تیار کرائے گئے۔ اصلی پر واٹسن کے دستخط ہوئے۔ دوسرا، جس میں امین چند کی مانگ کو مان لیا تھا اس پر خود کلائیو نے واٹسن کے جعلی دستخط کیے۔ خفیہ معاہدہ کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ پر علی نگر معاہدہ کی شرائط کو پورا نہ کرنے کا الزام لگایا اور فوج کے ساتھ پلاسی کے میدان میں پہنچ گیا۔ پلاسی مرشد آباد کے جنوب میں 22 میل کی دوری پر واقع گاؤں تھا۔ سراج الدولہ بھی اپنی پچاس ہزار فوج کے ساتھ پلاسی پہنچا۔ فرانسیسی بھی اس کی مدد کے لیے فوج میں تھے۔ کلائیو کی فوج میں 2100 ہندوستانی اور تقریباً 1000 یوروپین تھے جن میں 100 توپچی تھے۔ 23 جون 1757 کو جنگ کا آغاز ہوا۔ سازش کے مطابق نواب کی فوج کا بڑا حصہ جو درلبھ رائے اور میر جعفر کے ماتحت تھا، جنگ سے الگ رہا۔ صرف ہراول دستہ نے جو میر مدن اور موہن لال کی قیادت میں تھا اور جس کے ساتھ فرانسیسی بھی تھے جنگ میں حصہ لیا۔ انگریزوں نے انہیں شکست دی۔ سراج الدولہ کو حالات کا اندازہ ہو گیا تھا مگر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ فرار ہونے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا اور مارا گیا۔ پلاسی کی جنگ نے ہندوستان کی قسمت کا بہت حد تک فیصلہ کر دیا۔ جس کے بعد پورا ہندوستان بتدریج انگریزوں کی دسترس میں آگیا۔

20.7.2 پلاسی کی جنگ کے نتائج (Results of the Battle of Plassey)

جنگ کے نتائج کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی بساط پر بہت کچھ تبدیل کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ فوجی نقطہ نظر سے اس کی بہت اہمیت نہیں ہے۔ نواب کی فوج انگریزی فوج سے تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن سراج الدولہ کی طرف فوج کے ایک بڑا حصہ جنگ میں شامل ہی نہیں ہوا۔ 65 انگریز اور 500 ہندوستانی فوجی مارے گئے۔ جن کی اس فیصلہ کن جنگ میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ میر جعفر اور درلبھ رائے نے میدان جنگ میں نواب کو دھوکہ دیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب نواب کے پاس بچاؤ کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست اس کی فوج کی کمزوری نہیں تھی بلکہ حقیقتاً کلائیو کی سازش کا جال تھا جس نے سراج الدولہ کو جکڑ لیا۔ کے۔ ایم۔ ٹیکر نے لکھا ہے 'پلاسی ایک ایسی تجارت تھی جس میں بنگال کے مالدار سیٹھوں اور میر جعفر نے نواب کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔'

پلاسی کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہ جنگ کتنی اہم تھی۔ مالی اعتبار سے یہ انگریزوں کے لیے بڑی منفعت

بخش ثابت ہوئی۔ امین چند کو کچھ نہیں ملا اور ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی رقم انگریزوں کے حصہ میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کو روپیہ دینے کے لیے میر جعفر کو اپنے محل کے برتن اور دیگر سامان تک فروخت کردینا پڑا۔ 24 پرگنہ کی جاگیر بھی انگریزوں کو مل گئی۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں انگریزوں کو تجارت کی مکمل آزادی حاصل ہوگئی اور انہوں نے مختلف علاقوں میں اپنی فیکٹریاں قائم کرلیں۔ 1757 میں انہوں نے سب سے پہلے کلکتہ ٹکسال قائم کی اور اپنے سکے جاری کیے۔ کلائیو سمیت کمپنی کے تمام بڑے عہدیداران و تاجروں کو میر جعفر نے قیمتی تحائف پیش کیے۔ بنگال جیسے خوش حال صوبہ کے وسائل سے انگریزوں نے خود کو مضبوط کیا اور کرناٹک کی جنگوں میں کامیابی حاصل کی۔ بنگال میں ڈچ اور فرانسیسی دونوں ناکام رہے۔ اس طرح پلاسی کی فتح انگریزوں کے لیے ہندستان کی کامیابی کی کلید بن گئی۔ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جنگ کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ میر جعفر انگریزوں کی مدد سے نواب بنا تھا اور پوری طرح انہی کا دست نگر تھا۔ صحیح معنوں میں اس کا اقتدار انگریزوں کا مرہون منت تھا یا یوں کہیے کہ بلا واسطہ انگریز ہی حکمراں تھے۔ نواب کی حفاظت کے لیے 16 ہزار سپاہیوں پر مشتمل انگریزی فوج تعینات تھی۔ میر جعفر اتنا بے بس تھا کہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دیوان درلبھ رائے اور بہار کے نائب دیوان کو سزا نہیں دے سکا کیوں کہ یہ انگریز نہیں چاہتے تھے۔ ریاست بنگال میں انگریزوں کی مدد سے کوئی بھی شخص کسی بھی مقام تک پہنچ سکتا تھا۔ انگریزوں کی سیاسی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میر جعفر کو گدی سے ہٹانے کے لیے انہیں ایک قطرہ خون بھی بہانا نہیں پڑا۔ جی. وی ملسن نے لکھا ہے 'کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس کے نتائج اتنے گہرے، اور مستقل ثابت ہوئے۔ پلاسی کی جنگ نے نفسیاتی اور اخلاقی اثرات بھی مرتب کیے۔ تاجروں کی ایک کمپنی کے حکمراں کو ایسی شکست دی جس کے بعد اختیار کی حقیقی مالک وہ خود بن گئی۔ اس سے انگریزوں کے وقار میں اضافہ ہوا اور ہندستانیوں کی کمزوری کھل کر سامنے آگئی۔ اس جنگ کے بعد انگریزوں کے لیے تجارت اور مملکت دونوں میدانوں میں وسعت کا دروازہ کھل گیا۔

20.8 میر جعفر (Mir Jafar)

میر جعفر نواب تو بن گیا مگر اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ سارے اختیارات کمپنی کے پاس تھے اور کلائیو کی مرضی ہی میر جعفر کی بھی مرضی تھی۔ وہ نہ تو اس حالت میں تھا کہ نظم و نسق سنبھالتا، نہ ہی ایسی حیثیت رکھتا تھا جو خود اس کے وقار کا تحفظ کرسکے۔ وہ تو اس لائق بھی نہیں بچا تھا کہ روز بروز بڑھتی ہوئی انگریزوں کی حرص و ہوس کی بھوک کو مٹا سکتا۔ وہ چاروں طرف سے جکڑا ہوا تین سال تک بنگال کا حکمراں بنا رہا۔ بنگال کی بدلتی ہوئی صورت حال کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ شہزادہ علی گوہر نے جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے خطاب کے ساتھ مغل بادشاہ بنا، بنگال کے ان حالات کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے 1759 میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ مل کر بہار پر حملہ کردیا۔ اس کے مقابلہ کے لیے ایک فوج کلائیو کی قیادت میں اور دوسری میر جعفر کے بیٹے میرن کے ہمراہ بہار پہنچی۔ جس کے نتیجہ میں شہزادہ کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ اس نے بعد میں 1760 اور 1761 میں بنگال کے حصول کے لیے کوششیں کیں مگر کامیابی ہاتھ نہیں لگی۔ 2/جولائی 1760 کو میرن کا قتل کردیا گیا۔ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ اس قتل میں انگریزوں کا ہاتھ تھا کیوں کہ وہ میرن کو اپنے راستہ کا کانٹا سمجھتے تھے۔ 1759 میں ہی ڈچ بنگال پر حملہ آور ہوئے۔ بال ویل کے مطابق، حملہ بنگال کے نواب کی سازش کا نتیجہ تھا مگر اس سے اتفاق کرنا مشکل

ہے کیوں کہ ڈچ اپنے تجارتی مفاد میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرہ سمجھتے تھے اور اسے روکنا چاہتے تھے۔ بیدرا کی جنگ میں ڈچ فوج کو شکست ہوئی اور انہوں نے انگریزوں کو تاوان جنگ دینا قبول کر لیا۔ اسی اثنا میں میرن نے ایک دوسری ڈچ فوج کو شکست دی اور انہیں معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ بیدرا کے اس معاہدہ میں مندرجہ ذیل باتیں طے کی گئیں۔

1. نواب ڈچوں کو تجارتی مراعات دے گا۔
2. ڈچ کبھی بھی نواب سے جنگ کرنے، اس کی مدد میں قلعہ بندی کرنے اور فوجیں اکھٹی کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔
3. وہ (ڈچ) پٹنہ، چن سرا، اور قاسم بازار میں واقع اپنی فیکٹریوں کی حفاظت کے لیے 125 یورپین سے زیادہ نہیں رکھیں گے۔
4. وہ اپنے جہازوں اور فوجیوں کو نواب کی حدود سے باہر لے جائیں گے۔
5. مندرجہ بالا شرائط میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کی صورت میں نواب انہیں اپنی حدود سے بے دخل کر دے گا۔

بیدرا کے اس معاہدہ نے ڈچ توسیع کے سبھی دروازہ بند کر دیے۔ اور وہ بنگال میں مکمل طور سے انگریزوں کے دست نگر ہو گئے۔ مورخین کے مطابق بیدرا کی جنگ میں بنگال میں انگریزی اقتدار کے قیام کے لیے پلاسی کے بعد دوسرا قدم ثابت ہوئی۔ فروری 1760 میں کلائیو انگلینڈ واپس چلا گیا جس کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بھی تخت سے اترنے کے لیے مجبور کر دیا۔ میر جعفر انگریزوں کی مدد سے بنگال کا نواب بنا تھا۔ اس کے اقتدار کا انحصار انگریزوں پر ہی تھا۔ اپنے دور میں اس نے انگریزی احکامات کی بجاآوری میں پوری مستعدی دکھائی لیکن پھر بھی انگریزوں نے اسے حکمرانی کے عہدے سے ہٹانا کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

- **میر جعفر کی نااہلی:** جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ میر جعفر پوری طرح سے انگریز پر منحصر تھا۔ وہ اسے کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتے۔ اس نے بے تحاشہ خزانہ انگریزوں پر خالی کر دیا لیکن پھر بھی ان کا لالچ کم نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ میر جعفر کا وقار اور سیاسی حیثیت بالکل ہی صفر ہو گئی۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ان مخالف حالات میں اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنا یا انگریزوں کے پنجے سے نکل پاتا۔ یہ اس کی نااہلی ہی تھی کہ اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کر سکا۔ یہی نہیں نواب کی حیثیت سے ریاست کے نظم نسق میں بھی وہ کوئی سدھار نہیں کر سکا اور نہ ہی ریاست کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکا۔ بلاشبہ یہ بات بالکل درست ہے کہ انگریزوں کی مضبوط گرفت میں رہ کر، اپنی مرضی سے کچھ کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ یہ کوشش تو ضرور کر سکتا تھا کہ انگریزوں کا عمل دخل کم کرے۔ منتظم کی حیثیت سے ریاست میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام کرنا اور اپنے عوام کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرتا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اُس میں انگریزوں کی کسی بھی درجہ میں مخالفت کا حوصلہ ہی نہیں تھا بلکہ اس نے تو اس کا ارادہ بھی ظاہر نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جب ضرورت سمجھی اسے بہ آسانی اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔
- **معاہدہ کے مطابق انگریزوں کو رقم فراہم نہ کرنا:** پلاسی کی جنگ سے قبل ہوئے معاہدہ کے مطابق میر جعفر کو ہر مہینہ ایک لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کرنا تھا۔ نواب نے کمپنی کو بردوان اور نادیہ (1758-60) کے لیے دے دیے اور رقم دینے کے لیے محل کا سامان تک

فروخت کر دیا مگر پھر بھی وہ انگریزوں کا قرضدار ہی رہا۔ صورت حال یہ تھی کہ نواب کا دیوالیہ نکل چکا تھا، فوج تنخواہ نہ ملنے کے سبب بغاوت پر آمادہ تھی، مگر انگریز اپنی بقایا رقم کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق فروری 1760 تک یہ رقم بڑھتے بڑھتے 25 لاکھ ہو گئی تھی۔ لیکن میر جعفر کے سامنے ان مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔ نواب کی اس معاشی تنگی کا سبب یہ تھا کہ ریاست کی باگ ڈور سنبھالتے وقت اسے اتنا خزانہ نہیں ملا جس کی اسے توقع تھی۔ خود میر جعفر نے نواب بننے کے بعد کمپنی کے ملازمین کو جو بیش بہا تحفے تحائف دیے تھے اس نے بھی مالی حالت خستہ کر دی تھی۔ ان حالات میں خود کو بے بس پا کر میر جعفر نے انگریزوں سے درخواست کی کہ اسے معاہدہ کی مالی شرطوں کی تکمیل سے بری الذمہ قرار دے۔ مگر انگریز اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس معاشی بدحالی کا ذمہ دار بھی میر جعفر کو قرار دیا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام عائد کر دیا۔

- **بال ویل کے تیئں نواب کا رخ:** کلائیو کے انگلینڈ جانے کے بعد بنگال کی انگریز کمپنی کا گورنر عارضی طور پر بال ویل کو مقرر کیا گیا۔ میر جعفر کلائیو کو بہت عزت دیتا تھا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ کلائیو کی بدولت ہی اسے حکمرانی ملی ہے۔ لیکن وہ بال ویل کو وہ مقام نہیں دے سکا۔ جس کے سبب بال ویل ناراض ہو گیا اور اس نے نواب پر الزامات عائد کرنا شروع کر دیے۔ اس کے مطابق نواب انگریزوں کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ یہی نہیں بال ویل نے نواب کو ظلم و جبر اور انتظامی معاملات میں تساہل کا قصوروار بھی ٹھہرایا۔
- **نواب کی ڈچ افسران سے خط و کتابت:** بالویل کے مطابق میر جعفر چن سرا کے ڈچ اہل کاروں سے خفیہ طور پر مل گیا ہے۔ نواب نے اس کی تردید کی اور نہ ہی یہ الزام ثابت ہو سکا لیکن پھر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ شاید اس نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طرح کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔
- **انگریزوں کی بڑھتی ہوئی ہوسِ زر:** میر جعفر کو نواب بنا کر انگریزوں نے اس لیے خوب دولت حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل دیوالیہ ہو گیا۔ اب اگر انگریز کسی دوسرے کو نواب بناتے تو اس مدد کے عوض اس سے بھی دولت اور قیمتی تحائف ملتے۔

ان حالات میں انگریزوں نے میر جعفر کی قسمت پر مہر لگانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے 27/ ستمبر 1760 کو میر جعفر کے داماد اور فوج کے سپہ سالار میر قاسم سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کے مطابق نواب بننے پر میر قاسم:

1. انگریز کمپنی کو ہردوان، مدناپور، اور چٹاگانگ کے اضلاع سونپ دے گا۔
2. میر جعفر کے قرض کو فوراً کمپنی ادا کر دے گا۔
3. اپنی فوج میں تخفیف کرے گا۔
4. کمپنی کو کرناٹک کی جنگوں میں مدد کے طور پر 5 لاکھ روپیہ دے گا۔
5. کمپنی کے حلیفوں کو اپنا دوست اور کمپنی کے مخالفین کو اپنا دشمن سمجھے گا۔
6. والیسٹوارٹ کو 50 ہزار پونڈ، بال ویل کو 27 ہزار پونڈ اور کمپنی کونسل کے دو دیگر ممبران کو 25۔25 ہزار پونڈ دے گا۔
7. ان سب کے عوض کمپنی نواب کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی اور فوجی مدد دستور دیتی رہے گی۔

اس معاہدہ کے بعد 1760 میں کلکتہ کی انگریز کونسل نے میر جعفر کو ہٹانے کی پیش قدمی شروع کردی۔اس پر ظلم و جبر، خوں ریزی، عیاشی اور سستی کے الزام عائد کردیے۔اور معاہدوں کو لاگو کرنے کے لیے والیسٹوارٹ اور کیلارڈ 14/اکتوبر 1760 کو مرشد آباد پہنچے۔میر جعفر نے ان کے حکم کی بجاآوری سے انکار کردیا۔اس پر انگریز کمانڈر کیلارڈ کی قیادت میں نواب کے محل کا محاصرہ کرلیا گیا۔اب نواب کے پاس گھٹنے ٹیکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔اس نے گدی چھوڑدی اور میر قاسم کے نواب بننے کا علان کردیا گیا۔بغیر خون بہائے اقتدار کی باگ ڈور تبدیل ہوگئی۔میر جعفر 15000 روپیہ پنشن پر کلکتہ روانہ کردیا گیا۔

20.8 میر قاسم (Mir Qasim)

1760 سے 1763 تک میر جعفر کے داماد میر قاسم نے ریاست بنگال کی نوابی کے فرائض انجام دیے۔اس کا شمار بنگال کے باصلاحیت حکمرانوں میں ہوتا ہے۔اسی نے معاہدہ کے مطابق بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ انگریزوں کو سونپ دیئے۔کرناٹک کی جنگوں کے لیے 5 لاکھ روپیہ دیا اور میر جعفر کے قرض کی جلد ادائیگی کا یقین بھی دلایا۔اس کے علاوہ اس نے تقریباً 17 لاکھ روپیہ کمپنی کے افسران کو دیئے۔انگریزوں سے کیے وعدے پورے کرنے کے بعد بھی اس نے ریاست کی طرف نظر ڈالی۔وہ جانتا تھا نظم ونسق بہتر کرنا اور خزانہ کو بھرنا ضروری ہے۔اس نے دیکھا کہ فوجوں کو باقاعدگی سے تنخواہ نہیں مل رہی ہے وہ کبھی بھی بغاوت پر آمادہ ہوسکتی ہیں،مال گذاری صحیح سے وصول نہیں کی جارہی۔ریاست کے ملازمین بے ایمان اور رشوت خور ہوگئے ہیں۔ان سب مسائل سے نمٹنے کے لیے اس نے اقدامات کرنا شروع کردیئے۔

سب سے پہلے اس نے معاشی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔اس نے ایک نیا شعبہ قائم کرکے حسابات میں گڑبڑی کی جانچ کرائی۔جن ملازمین نے غبن کیا تھا ان پر بڑے بڑے جرمانے عائد کیے۔بے ایمانی کے ذریعہ سرکاری رقم ہڑپنے والے اہل کاروں کو مجبور کیا کہ وہ یہ پیشہ سرکاری خزانہ میں جمع کریں۔میر قاسم نے کچھ نئے ٹیکس عائد کیے اور پرانے چلے آرہے محصولات میں 3/32 حصہ کا اضافہ کیا۔مالی حالت بہتر کرنے کی سمت میں یہ اقدامات مستحکم ثابت ہوئے۔یہی نہیں اس نے مقامی زمینداروں، امراء اور جگت سیٹھ جیسے مالدار تاجروں سے قرض لیے۔آمدنی میں اضافہ کی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ اس نے خرچوں پر بھی روک لگائی۔فضول خرچی بند کردی گئی۔میر قاسم نے فوجی معاملات کی بہتری کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔اس نے فوج کو یورپین طرز پر منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔اس نے مرشد آباد کی جگہ مونگیر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور یہاں گولہ بارود تیار کرتا اور فوجیوں کو یورپی طرز پر جنگ لڑنے کی تربیت دینا شروع کیا۔اس کام کے دوران گورگن خان اور ایک مسلم تقی خان نے اس کی بھرپور مدد کی۔

میر قاسم کی ان کوششوں سے انتظامیہ اور دربار کے اخراجات میں کمی آئی۔فوجیوں کو تنخواہیں ملنے لگیں اور کمپنی کا قرض بھی ادا ہوگیا۔عام میں اپنی ساکھ بہتر کرنے کے لیے اس نے غیر مطمئن سرداروں اور افسروں کو تدبر سے کام لیکر اپنی حمایت اور تعاون کے لیے راضی کرلیا۔باصلاحیت افراد کو ریاست میں عہدے تفویض کیے۔اس کے علاوہ میر قاسم نے کچھ سخت قدم اٹھائے مثلاً بہار کا نائب صوبیدار رام

نرائن کو جو میر قاسم کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا، انگریز گورنر کی مرضی لیکر پہلے برطرف کیا اور بعد میں مروا دیا۔

میر قاسم کے ذریعہ کیے گئے یہ تمام کام اس کی صلاحیت اور حوصلہ کے مظہر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ لیکن جس طرح میر جعفر کی نااہلی اس کے لیے اقتدار کی محرومی کا باعث بنی، اسی طرح میر قاسم کی اہلیت اس کے اور انگریزوں کے درمیان مخاصمت کا سبب بن گئی۔ میر قاسم نے بنگال میں نظم و نسق بہتر کیا، مالی حالت درست کی اور اپنی گرفت انتظامیہ پر مضبوط کی۔ یہ سب باتیں انگریزوں کی پسند کے خلاف تھیں۔ وہ تو ایسا خواب دیکھنا چاہتے تھے جو پوری طرح سے ان پر منحصر ہو اور ان کے اشاروں پر کام کرے۔ ظاہر ہے میر قاسم اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر اسباب بھی تھے جو نواب اور انگریزوں کے درمیان مخاصمت کا سبب بنے۔

1760 میں مغل بادشاہ عالم گیر ثانی کی موت ہوگئی۔ اس وقت شہزادہ علی گوہر بہار میں تھا، اس نے شاہ عالم ثانی کے خطاب کے ساتھ اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں نے میر قاسم سے کہا کہ وہ شاہ عالم ثانی کو مغل بادشاہ تسلیم کرلے۔ میر قاسم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اس کے بعد انگریز مغل بادشاہ سے بہار، بنگال، اڑیسہ کی صوبیداری نہ لے لیں۔ ایسا ہونے پر میر قاسم مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے سوچا جب بادشاہ دلی چلا جائے گا تو وہ تسلیم کرلے گا۔ لیکن انگریزوں نے اسے دھمکایا تو مجبور ہو کر اس نے شاہ عالم ثانی کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور شاہ عالم ثانی سے ملنے پٹنہ گیا۔ بعد میں مغل بادشاہ مراٹھوں کی مدد سے دلی چلا گیا۔ لیکن اس واقعہ نے انگریزوں اور میر قاسم کے درمیان رنجش پیدا کردی۔ علاوہ ازیں دونوں فریقوں کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ تجارت کو لیکر تھا۔ انگریز بہار، بنگال اور اڑیسہ میں بغیر محصول دیئے تجارت کرتے تھے۔ اس کے لیے انہیں ایک پاس جاری کیا جاتا جو 'دستک' کہلاتا تھا۔ میر قاسم نے دیکھا کہ انگریزی گماشتے دستک کا غلط اور ناجائز استعمال کررہے ہیں۔ وہ یہ اجازت نامہ ہندوستانی تاجروں کو بیچ دیتے۔ جس سے ہندوستانی تاجر بھی بنا چنگی کے خرید و فروخت کر لیتے۔ اس طرح ریاست کی آمدنی کم ہورہی تھی۔ چنگی کی شکل میں جو رقم حاصل ہوتی اس کے نہ ملنے سے انتظامی امور بھی متاثر ہوتے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے نواب نے کمپنی سے رابطہ کیا۔ دونوں کے درمیان طے ہوا کہ کمپنی کے ملازمین بھی اندرونی خرید و فروخت پر 9 فیصد ٹیکس دیں گے اور دستک جاری کرنے کا اختیار نواب کے پاس ہی رہے گا۔ لیکن کلکتہ کی انگریز کونسل نے اس سمجھوتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس صورت حال میں نواب نے 1762 میں سبھی محصول بنالیے اور اندرونی تجارت میں ہندوستانیوں کے لیے بھی بنا چنگی دیئے کرنا ممکن ہوگیا۔ اس فیصلہ سے انگریزوں کو جو خصوصی مراعات حاصل تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ چنانچہ کلکتہ کونسل نے نواب سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستانیوں پر دوبارہ چنگی لگائے جسے نواب نے مسترد کر دیا۔ اسی طرح نواب اور انگریزوں کے درمیان خلیج بڑھ گئی اور بالآخر اس رنجش کا اختتام بکسر کی جنگ کے ساتھ ہوا۔

انگریزوں نے اب نواب کے خلاف سازشیں کرنا شروع کردیں۔ وہ میر جعفر کو دوبارہ تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔ اس کی اطلاع پاکر میر قاسم نے خود ہی پہل کرنا مناسب سمجھا۔ ابتدائی معمولی تصادم کے بعد 4/ستمبر 1763 کو ادوانالا مقام میں نواب اور میجر ایڈمس کی افواج میں مقابلہ ہوا۔ قریب دہی کے سبب نواب کو شکست ہوئی اور وہ مونگیر ہوتا ہوا پٹنہ چلا گیا۔ انگریز فوج پٹنہ کی جانب بڑھی۔ ان حالات

میں نواب نے پٹنہ میں میجر الس اور کچھ ہندوستانی باغیوں کو جرمن افسر سمروں کے ذریعہ قتل کرادیا۔ یہ واقعہ ہندوستانی تاریخ میں 'پٹنہ قتل عام' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی پٹنہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ میر قاسم اپنی کچھ فوج، توپ خانہ اور خزانہ کے ساتھ اودھ بھاگ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے مدد مانگی۔ نواب اودھ نے بنگال میں اپنی طاقت میں اضافہ کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ میر قاسم کو گدی واپس دلانے کے لیے اس کی مدد کو تیار ہو گیا۔ میر قاسم اودھ کی فوج کے خرچ کے لیے 11 لاکھ روپیہ ماہانہ دینا قبول کر لیا۔ اس وقت مغل بادشاہ شاہ عالم بھی اودھ میں موجود تھا اس اتحاد میں وہ بھی شامل ہو گیا۔ اس طرح بنگال، اودھ اور مغلوں کی متحدہ افواج بہار کی سرحدوں میں داخل ہو گئیں۔ انگریز کمانڈر میجر ہیکٹر منرو کی فوج سے 23/ اکتوبر 1764 کو ان ہندوستانی حکمرانوں کے بیچ بکسر کی جنگ لڑی گئی۔ انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ 3۔ مئی 1765 کو کڑا کے مقام پر ایک مقابلہ ہوا، ہندوستانیوں کی شکست کے ساتھ یہ کشاکش ختم ہو گئی۔ میر قاسم وہاں سے بھاگ نکلا اور 1777 میں دلی کے نزدیک پریشانی کی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ بکسر میں فتح کے بعد کلائیو (جو دوبارہ گورنر بن کر ہندوستان پہنچا تھا) الہ آباد گیا اور 16/ اگست 1765 کو مغل بادشاہ شاہ عالم اور نواب بنگال کو بھی شامل کیا گیا۔ دراصل انگریزوں نے میر قاسم کے ساتھ تصادم کے آغاز میں ہی جولائی 1763 میں میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا نواب بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے تحت بنگال کے نواب کی حیثیت سے میر جعفر سے مندرجہ ذیل شرائط طے کی گئیں۔

- بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی نواب سے لیکر انگریزوں کو دی گئی۔
- 2 کمپنی نے 53 لاکھ روپیہ سالانہ پنشن نواب کو دینا منظور کر لیا۔

اس طرح میر جعفر دوبارہ نواب بن گیا اس نے انگریزوں کے مطالبہ پر ہندوستانیوں پر دوبارہ سے چنگی عائد کر دی۔ انگریزوں کو کثیر رقم دی۔ میر جعفر کے نواب بننے کے بعد بنگال میں دوبارہ سے حالات خراب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ 5/ فروری 1765 کو میر جعفر کی موت ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد انگریزوں نے اس کے کمسن بیٹے نجم الدولہ کو نواب بنا دیا۔ نئے نواب نے ایک معاہدہ کے تحت اپنی فوج کو ہٹا دیا اور ریاست میں عہدیداروں کے تقرر کا حق بھی انگریزوں کو دے دیا۔ اس طرح سے انگریز بنگال بہار اور اڑیسہ کے مالک بن گئے اور وارن ہیسٹنگز کے عہد تک نوابی ختم ہو گئی۔

20.9 بنگال کی معاشی صورت حال (Economic Conditions of Bengal)

بنگال کا صوبہ معاشی طور پر ایک خوشحال اور مغل بادشاہوں کے لیے اچھی آمدنی والا علاقہ تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ چاول، کالی مرچ، چینی، تیل، شورا، ریشم، سوتی کپڑا اور کڑھائی بنائی کے سامان کی پیداوار کے لیے اپنی پہچان رکھتا تھا۔ زراعت اور صنعت و حرفت کے میدان میں بھی اس کی حالت قابل ذکر حد تک بہتر تھی۔ یہاں کے صوبیداروں اور بعد میں نوابین نے اسے بہتر بنانے کے لیے بہت سے اقدام کیے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے آغاز سے سیاسی چپقلش اور مسلسل بیرونی حملوں نے اس کی معیشت کو ہر طرف سے متاثر کیا۔ خاص طور سے مراٹھا حملوں نے کاروبار اور زراعت دونوں پر منفی اثرات مرتب کیے۔ بنگال کی منفعت بخش کاروباری صورت حال نے

انگریزوں کو یہاں کے معاملات میں خاص دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔اٹھارھویں صدی کے آغاز تک برطانیہ کو ایشیا سے ہونے والی برآمدات کا 60% حصہ بنگال کی اشیاء کا ہی ہوتا تھا۔ جس میں خام مال کے علاوہ سوتی کپڑا اور چاول، چینی بہت اہم تھے۔

20.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقوں پر پھیلا ہوا بنگال کا صوبہ اپنے صوبہ دار مرشد قلی خان کے دور میں خود مختار ہوا۔ وہ ایک کامیاب منتظم اور لائق حکمراں تھا۔اس کے دور میں بنگال نے صنعت و حرفت اور کاروبار میں ترقی کی۔ 1727 میں اس کی موت کے بعد اس کا داماد شجاع الدین گدّی پر بیٹھا۔ شروع میں اس نے دلچسپی کے ساتھ کاروبار حکومت سنبھالا مگر بعد میں اس کی عدم الچسپی اور نااہلی سے اختیارات افسران کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ 1738 میں شجاع الدین کی موت کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں تخت نشین ہوا مگر وہ آرام پسند اور نااہل تھا۔اس کو بہار کے ڈپٹی گورنر علی وردی خاں نے شکست دی اور مار کر خود تخت پر قابض ہو گیا۔ وہ اچھی سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک اور منتظم تھا۔اس نے علاقہ میں امن واماں قائم کیا۔ مگر اسے مسلسل بیرونی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً 5 بار مراٹھا حملہ آوروں نے اس کے علاقہ کو تاراج کیا اور معیشت کو نقصان پہنچایا۔ 1756 کو اس کی موت کے بعد اسکا پوتا سراج الدولہ بنگال کا حکمراں بنا۔ تخت کے کئی دعویداروں سے وہ نمٹنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر انگریزوں نے بنگال کے افسران کے ساتھ مل کر سازش کے ذریعہ اس کی حکمرانی کو ختم کر دیا۔ 23 جون 1757 کو کلائیو نے پلاسی کی جنگ میں اسے شکست دی اور ہلاک کر دیا۔ جس کے بعد علاقہ پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوئی اور ان کا تسلط قائم ہونے لگا۔

20.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

امراء	:	امیر کی جمع، سردار و افسران
تسلط	:	قبضہ
تصادم	:	ٹکراؤ
خالصہ زمین	:	براہ راست حکمراں کی ملکیت
چوتھ / سردیس مکھی	:	دو مختلف طرح کے ٹیکس
تاوان	:	بدلہ (عموماً مال و دولت یا رقم کی صورت میں)
مراعات	:	سہولیات، آسانیاں
قلعہ بندی	:	چہار دیواری سے گھراؤ کرنا
ہراول دستہ	:	فوج کا سب سے اگلا حصہ
خود مختار	:	تمام اختیارات کا مالک ہونا

20.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

20.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بنگال کب دہلی سلطنت میں شامل ہوا؟
2. کس مغل حکمراں کے عہد میں یہ مغل سلطنت کا حصہ بنا؟
3. 1717 میں فرخ سیر نے کس کو بنگال کا صوبیدار متعین کیا؟
4. اٹھارہویں صدی میں بنگال میں دو دوسرے کون سے صوبے شامل تھے؟
5. مرشدآباد کا پرانا نام کیا تھا؟
6. علی نگر کا معاہدہ کس کس کے درمیان ہوا؟
7. سراج الدولہ کے خلاف ہونے والی سازشوں کا سرغنہ کون تھا؟
8. مرشد قلی خان کے بعد کون بنگال کا نواب بنا؟
9. مراٹھوں نے بنگال پر کتنے حملے کیے؟
10. پلاسی کی جنگ کب ہوئی؟

20.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مرشد قلی خاں کے بارے میں آپ کیا جانئے ہیں؟ لکھیے۔
2. شجاع الدین کے دور حکمرانی پر روشنی ڈالیے۔
3. سراج الدولہ اور انگریزوں کے تعلقات پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
4. علی نگر معاہدہ کے شرائط بیان کیجیے۔
5. علی وردی خاں اور مراٹھا تصادم پر روشنی ڈالیے۔

20.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پلاسی کی جنگ کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. میر جعفر ایک ایسا غدار تھا جس نے ہندوستان کے دروازے انگریزوں کے لیے کھول دیے، تبصرہ کیجیے۔
3. میر قاسم ایک لائق منتظم تھا مگر وہ بگڑ چکے حالات کو نہیں سنبھال پایا، وضاحت کیجیے۔

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

20.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Lyall, Sir Alfred. *The Rise and Expansion of the British Dominion in India*. New Book Corner, 2018.
2. Malleson, Colonel George Bruce. *The Decisive Battles of India from 1746 to 1849*, Lucknow Books, 2014.
3. Roberts, P. E. *History of British India*, OUP, New Delhi, 1978.
4. Thompson, Edward and G. T. Garratt. *Rise and Fulfilment of British Rule in India*. 2d ed. Central Book Depot, 1973.
5. Wilson, John, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon & Schuster, London/ New Delhi, 2016.

اکائی 21۔اودھ

(Awadh)

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید
21.1 مقاصد
21.2 پس منظر
21.3 بانی سلطنت سعادت خاں
21.3.1 ریاست اودھ
21.3.2 نادر شاہ کا حملہ اور سعادت خاں
21.4 صفدر جنگ
21.5 شجاع الدولہ
21.5.1 ماتحت امدادی معاہدہ
21.5.2 روہیل کھنڈ پر قبضہ
21.6 آصف الدولہ
21.7 سعادت علی
21.8 نصیر الدین حیدر
21.9 ناصر الدولہ اور واجد علی شاہ
21.9.1 اودھ کا الحاق
21.10 اکتسابی نتائج
21.11 کلیدی الفاظ
21.12 نمونہ امتحانی سوالات
21.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

21.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
21.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
21.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید (Introduction)

مغل سلطنت کی عظمت قائم رکھنے میں اس کے لائق حکمراں اور بھروسہ مند امرا کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ 1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد حالات بہت تیزی سے بدلے۔ نہ تو اس کے جانشینوں میں اتنی اہلیت تھی اور نہ ہی امرا کے طبقہ میں وفاداری کا پہلے جیسا مادّہ۔ نتیجتاً ایک کے بعد ایک بہت سے علاقے خود مختار ہوتے گئے، جہاں طاقت ور امیروں نے اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ ان میں اودھ بہت اہم ہے کیونکہ یہ نہ صرف تہذیب کا بڑا مرکز بنی بلکہ شمالی ہند کی سیاست میں اس کے حکمراں بہت فعال نظر آتے ہیں۔ انہوں نے انگریزوں اور مغل بادشاہ کے ساتھ ایک ایسا مثلث تشکیل دیا جس کے گرد ایک لمبے عرصہ تک شمالی ہند کی سیاست گھومتی رہی۔ اودھ بڑھتی ہوئی انگریزی طاقت کا بھی گواہ رہا اور مغلوں کے زوال کو بھی اس نے بخوبی دیکھا۔ اور بالآخر یہ ریاست خود بھی انگریزی سلطنت میں ضم ہو گئی۔

21.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- جن حالات میں ریاست اودھ خود مختار ہوئی انہیں سمجھ سکیں گے۔
- سعادت خاں برہان الملک کی سیاسی سرگرمیوں کو جان لیں گے۔
- شمالی ہند کی سیاست میں نوابینِ اودھ کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔
- اودھ کی بدحالی میں انگریزوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اودھ پر بڑھتے ہوئے انگریزی تسلط اور بالآخر اس کے الحاق سے واقف ہو سکیں گے۔

21.2 پس منظر (Background)

ریاست اودھ ہندوستانی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔ عظیم مغلوں کے بعد یہاں کے نوابین نے اس علاقہ کو سیاسی و سماجی طور پر مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ سعادت خاں جسے مغل بادشاہوں سے منصب اور عہدے حاصل ہوئے اس کا بانی تھا۔ شمالی ہند میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں، بیرونی حملوں اور مغلوں کی کمزوریوں نے اسے مغل سلطنت کی ماتحتی سے نکال کر خود مختار ریاست کا درجہ دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغلوں کی مرکزی حکومت سے اس کا تعلق ہمیشہ بہت گہرا اور مضبوط رہا۔ دلّی کی سیاسی اتھل پتھل نے اودھ کی ریاست کو نہ

صرف متاثر کیا بلکہ یہ دلی کے امراء، رؤسا اور فن کاروں کی بہترین پناہ گاہ بھی ثابت ہوئی۔

21.3 بانیٔ سلطنت سعادت خاں (Saadat Khan, the Founder)

ریاست اودھ میں اودھ کی حدود کے علاوہ مشرق میں کانپور، الہ آباد اور بنارس اور مغرب میں موجودہ مغربی اترپردیش کے کچھ اضلاع شامل تھے۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں سعادت خاں برہان الملک نے اودھ کی خود مختار ریاست قائم کی۔ سعادت خاں کی تاریخ پیدائش اور شروعاتی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ کچھ مورخین کے مطابق سعادت خاں کا نام میر محمد امین تھا اور وہ 1680 میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ میر محمد ناصر خراسان کا تاجر تھا جس کے اجداد کا تعلق نیشاپور سے تھا۔ ایران میں صفوی سلطنت کے زوال کے بعد یہ خاندان بھی ہجرت کر کے ہندوستان آ گیا۔

سعادت خاں نے عامل (گاؤں کا مکھیا) کے چھوٹے عہدہ سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ جلد ہی سربلند خاں نے جو کڑا اور مانک پور کا فوجدار تھا اسے اپنا 'میر منزل' مقرر کیا۔ جہاندار شاہ نے مسند نشین ہونے کے بعد سربلند کو احمد آباد بھیج دیا۔ سعادت بھی اس کے ساتھ گیا مگر بعد میں دونوں میں اختلاف ہوا اور وہ الگ ہو گئے۔ جس کے بعد فرخ سیر کے دور حکومت میں سعادت خاں دہلی دربار میں یک ہزاری منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مشہور سید برادران کا بڑا بھائی حسن علی، مہاراجہ جے سنگھ دوم کے خلاف ایک مہم کے دوران سعادت خاں سے بہت متاثر ہوا اور 1719 میں اسے راجستھان میں ہندون اور بیانہ کا فوجدار مقرر کر دیا۔ سعادت نے وہاں کے سرکش و باغی زمینداروں کو قابو میں کر لیا جس کے بعد اسے 1500 ذات کے منصب پر سرفراز کر دیا گیا۔ سید برادران کو ختم کرنے میں جو لوگ خفیہ طریقہ سے شامل تھے ان میں سعادت خاں بھی تھا۔ دونوں بھائیوں سے چھٹکارہ پانے کے بعد محمد شاہ نے تمام سازشیوں کو انعام سے نوازا۔ یہ موقع تھا جب انہیں سعادت خاں بہادر کا خطاب اور 5000 ذات اور 3000 سوار کا منصب ملا۔ 1720 میں اسے اکبر آباد یعنی آگرہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ وہاں کا انتظام اس نے اپنے نائب نیل کنٹھ کے ذریعہ چلایا جسے جاٹوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، اسے دبا تو دیا گیا مگر 1721 میں نیل کنٹھ اُن کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ جلد ہی سعادت خاں سے یہ منصب واپس لے لیا گیا اور 1722 میں اُسے اودھ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔

21.3.1 ریاست اودھ (Awadh State)

اودھ جانے سے قبل سعادت خاں نے مزید فوجوں کو بھرتی کیا۔ راہ میں فرخ آباد کے مقام پر وہاں کے افغان سردار محمد خاں بنگش نے لکھنؤ کی شیخ زادہ قوم کی طاقت اور سرکشی سے آگاہ کیا۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ کاکوری کے شیخ زادوں سے دوستانہ سلوک کیا جائے تو اسے فائدہ ہوگا۔ سعادت خاں نے یہی کیا۔ کاکوری کے شیخ زادوں نے لکھنؤ کے شیخ زادوں کی کمزوریوں اور طاقت سے آگاہ کیا۔ اسی کے مطابق وہ خاموشی سے رات میں شہر میں داخل ہوا اور شیخ زادوں پر حملہ کر کے انہیں اپنے قابو میں کر لیا۔ آغاز میں اسے اودھ کے جاگیرداروں کے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مغل سلطنت کے زمینوں اور لگان سے متعلق قوانین پر عمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سعادت خاں نے ذہانت سے کام لے کر بہت جلد اس مسئلہ کو سلجھایا اور جاگیرداروں کے نظم و نسق سے متعلق اختیارات ختم کر دیے۔ سعادت خاں نے اودھ میں بنارس

،جونپور، غازی پور اور چنار تک کا علاقہ شامل کر لیا۔ اپنی طاقت اور اختیارات میں اضافہ کیا۔ وہ عملی طور پر اودھ کے تمام معاملات میں خود مختار تھا۔ حقیقتاً صوبہ اودھ ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہو چکا تھا۔

21.3.2 نادر شاہ کا حملہ اور سعادت خاں (Nadir Shah's Attack and Saadat Khan)

1739 کے اوائل میں ایرانی حکمراں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ نے سعادت خاں کو مدد کے لیے دہلی بلایا۔ وہ فوراً 30000 فوجیوں کے ساتھ اودھ سے چل پڑا۔ اور 12 فروری 1739 کو کرنال پہنچ گیا جہاں محمد شاہ کی فوج پہلے سے موجود تھی۔ 22 فروری کو نادر شاہ اور سعادت خاں کی فوجوں میں ٹکراؤ ہوا جس میں سعادت خاں کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوا۔ کہتے ہیں جب وہ نادر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا کہ ہم قوم ہوتے ہوئے بھی وہ نادر شاہ کے خلاف کیوں آیا۔ تب سعادت خاں نے مغل بادشاہ سے اپنی وفاداری کا تذکرہ کیا جسے نادر شاہ نے سراہا۔ نادر شاہ نے اس سے دریافت کیا کہ کس طریقہ کار کو اپنا کر محمد شاہ سے زیادہ سے زیادہ پیسہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ سعادت خاں نے اسے مشورہ دیا کہ نظام الملک سے بات کی جائے وہ مغل سلطنت کی بہت اہم کڑی ہے۔ نادر شاہ نے اس کی بات مان لی۔ دونوں نے نظام الملک کو اس سلسلہ میں خط لکھا۔ نظام الملک کی کوششوں سے طے پایا گیا کہ مغل بادشاہ نادر شاہ کو 50 لاکھ روپیہ دے گا۔ مگر اسی دوران حالات نے کروٹ بدلی۔ 25 فروری 1739 کو محمد شاہ نے نظام الملک کے بڑے بیٹے غازی الدین فیروز جنگ دوم کو میر بخشی بنا دیا۔ دراصل سعادت خاں خود اس عہدہ کا طلبگار اور متوقع تھا۔ وہ اس عمل سے بہت ناراض ہوا۔ اس نے فوراً نادر شاہ کو بھڑکایا کہ مغل اُسے بہت کم رقم دے رہے ہیں۔ وہ اگر دہلی پر حملہ کر دے تو ایک بہت بڑا خزانہ اس کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ یہ اس اخلاقی گراوٹ کی مثال تھی جو اس وقت مغل امرا کا وطیرہ تھا۔ نادر شاہ نے یہ مشورہ بھی قبول کر لیا۔ معاہدہ کے مطابق جب محمد شاہ، ایرانی لشکر میں پہنچا تو اسے مع اس کے حرم کے گرفتار کر لیا گیا۔ نادر شاہ نے سعادت خاں کو مغل فوج کا وکیل مطلق مقرر کیا اور مغل بادشاہ سے جبراً اس کی توثیق کروائی۔ چنانچہ اس کے بعد دہلی پر نادر شاہ نے قبضہ کیا اور پھر مشہور قتل عام کا واقعہ ہوا۔

مورخین کے مطابق اسی دوران 20,19 مارچ 1739 کی درمیانی شب میں سعادت خاں کی موت واقع ہو گئی۔ اس بات پر اختلاف ہے کہ وہ کیسے مرا۔ اس ضمن میں کئی رائے ہیں، مثلاً یہ کہ اسے کینسر تھا جس سے موت ہوئی۔ لیکن غالب خیال یہ ہے کہ وہ مطلوبہ کثیر رقم جس کا اس نے بادشاہ سے وعدہ کیا تھا جب دہلی سے نہیں ملی تو اس نے ایرانی حکمراں کے خوف سے خودکشی کر لی۔ سعادت خاں نے ایک لمبے عرصے تک اودھ پر اپنا قبضہ رکھا۔ وہ حقیقتاً وہاں کی عوام کا اصلی حکمراں تھا یا کم از کم عوام ایسا ہی سمجھتے تھے۔

21.4 صفدر جنگ (Safdar Jung)

سعادت خاں کی موت کے بعد اودھ کی گدّی کے دو دعویدار تھے۔ ایک اس کا بھتیجہ شیر جنگ اور دوسرا ابوالمنصور محمد مقیم خاں۔ مقیم خاں سعادت خاں کا بھانجہ بھی تھا اور داماد بھی۔ سعادت خاں کے کہنے پر وہ ایران سے دہلی آیا تھا۔ مقیم خاں نے نادر شاہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اُسے دو کروڑ روپیہ نذرانہ دیا۔ جس کے بعد نادر شاہ نے اسے گورنر بنا دیا اور مغل بادشاہ محمد شاہ نے اس کی توثیق کر دی اور

صفدر جنگ کا خطاب عطا کیا۔ صفدر جنگ کے سامنے بھی وہی مسائل تھے جو اس کے پیش رو سعادت خاں کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے۔ یعنی مغل دربار کا انتشار، امراء کی مفاد پرستی اور آپسی رنجشیں، باغی و سرکش جاگیردار و سردار۔ صفدر جنگ نے بڑی استقامت سے ان سب کا سامنا کیا۔ اس نے جاگیرداروں کی سرکوبی کرکے اودھ میں امن قائم کیا۔ محمد شاہ کا اعتماد حاصل کیا جس کے نتیجہ میں بادشاہ نے اُسے 'میر آتش' کا خطاب دیا اور کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ محمد شاہ کا اس پر بھروسے کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کا سارا نظام اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

1748 میں احمد شاہ دہلی کا بادشاہ بنا۔ اس نے صفدر جنگ کو اپنا وزیر اعظم وزیر الممالک ہندوستان مقرر کیا۔ جس کے بعد اودھ کے حکمراں نواب وزیر کہلانے لگے۔ احمد شاہ نے اسے شاہی حرم کا نگراں، اجمیر کا گورنر اور نارنول کا فوجدار بھی مقرر کیا۔ اس کے علاوہ صفدر جنگ کے بیٹے جلال الدین حیدر کو شجاع الدولہ کے خطاب سے ساتھ شاہی فوج میں سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا۔ حقیقتاً اس وقت مغل سلطنت کے کل اختیارات صفدر جنگ کے ہاتھوں میں تھے۔ لیکن یہ راستہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ نظام الملک کے بیٹے اور پوتے کے علاوہ آنجہانی وزیر قمرالدین کے بیٹوں کی بھی مخالفت کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ پرانے امراء اسے ناپسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ان کے اختیارات ہڑپنے والا شخص تھا۔

1748 سے 1752 کے درمیان صفدر جنگ کا بنگش اور روہیلہ افغانوں کے ساتھ کئی بار تصادم ہوا۔ 1750 میں رام جتونی کے مقام پر افغانوں نے اسے شکست دی۔ اپریل 1752 میں اس نے احمد شاہ کی ہدایت کی پر بنگش اور روہیلہ افغانوں کے ساتھ صلح کرلی۔ مغل دربار اور سلطنت پر اس کی مضبوط گرفت اور امرا کی ریشہ دوانیوں نے بادشاہ احمد شاہ اور صفدر جنگ کے درمیان اختلاف پیدا کردیا۔ نتیجتاً مارچ سے نومبر 1753 تک خانہ جنگی کی سی کیفیت رہی۔ جس کے بعد وہ اودھ واپس آگیا اور یہیں اکتوبر 1754 میں 66 سال کی عمر میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ صفدر جنگ ایک انتہائی باصلاحیت منتظم تھا جس نے نہ صرف اودھ میں امن وامان قائم کیا بلکہ کمزور مغل بادشاہ کی پشت پناہی بھی کی۔ اپنی رعایا کے لیے وہ مہربان حکمراں اور مخالفین کے لیے سخت اقدام کرنے والا شخص تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنا خاص طور پر شاعر و مصور اور دیگر فن کار اس کے مرہونِ منت رہتے۔

21.5 شجاع الدولہ (Shuja-ud Daula)

1754 میں صفدر جنگ کی موت کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ تخت نشین ہوا۔ شخصیت اور کردار کے اعتبار سے نہ تو وہ ایک اچھا حکمراں تھا اور نہ ہی بہترین سپاہی۔ وہ کھیل اور شکار کا شوقین، جوڑ توڑ میں ماہر، عہد شکن اور لالچی طبیعت کا مالک تھا۔ شجاع الدولہ کے تعلقات مغل وزیر عماد الملک کے ساتھ تلخ تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ سازشوں میں مبتلا رہے۔ مغل شہزادہ علی گوہر، شجاع الدولہ کا دوست تھا۔ اسی نے شہزادہ کو بہار پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ مراٹھوں اور افغانوں میں جب 1761 میں پانی پت کی جنگ ہوئی تو شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کی حمایت میں لڑا۔ 1762 میں مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کیا جس سے اس کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی۔ جب 1763 میں میر قاسم کو بنگال چھوڑنا پڑا تو شجاع الدولہ نے اسے پناہ دی اور ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا گیا۔ بندیل کھنڈ کے

باغیوں کی سرکوبی میں میر قاسم نے اس کی مدد کی۔اس کے علاوہ میر قاسم نے مغل بادشاہ کو دس لاکھ اور شجاع الدولہ کو 17 لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ بھی کیا۔انگریزوں نے شجاع الدولہ، میر قاسم اور مغل بادشاہ شاہ عالم کے متحدہ محاذ کو 22 اکتوبر 1764 کو بکسر کی جنگ میں شکست دی جس نے ہندوستان کی قسمت پر مہر لگادی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج تقریباً 7000 سپاہیوں پر مشتمل تھی، دوسری طرف تینوں ہندوستانی حکمرانوں کے فوجیوں کی تعداد چالیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ مگر آپسی تال میل اور تجربہ کی کمی اور دیگر وجوہات کی بنا پر شجاع الدولہ اور اس کے ساتھیوں کو ہار کا منھ دیکھنا پڑا۔ بکسر میں شکست کھا کر شجاع الدولہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا رہا۔آخر کار مئی 1765 میں کٹرہ کی لڑائی میں فیصلہ کن فتح کے بعد اودھ مکمل طور سے انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کی پناہ میں چلا گیا۔16 اگست 1765 کو فریقین کے درمیان الہ آباد کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے کڑہ اور الہ آباد مغل بادشاہ کو ملے۔ان کے علاوہ شجاع الدولہ کا سارا علاقہ اُسے واپس مل گیا۔50 لاکھ روپیہ جنگ کے تاوان کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دینا پڑا۔ریاست کے دفاع کے لیے باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا اور اس طرح اودھ پوری طرح سے انگریزوں کی ماتحت ریاست بن گیا۔

21.5.1 ماتحت امدادی معاہدہ (Subsidiary Alliance)

جولائی 1765ء میں کلائیو نے بہار کے چھپرا میں ایک میٹنگ بلائی جس میں شجاع الدولہ بھی شامل ہوا۔اس میں کلائیو کے دباؤ میں شجاع الدولہ سمیت سب لوگوں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے مطابق مراٹھوں کے حملوں سے بچنے اور خود حفاظتی کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنا طے پایا گیا۔ مغل بادشاہ نے شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کیا۔ 1768ء میں انگریزوں نے ایک اور معاہدہ کیا جس نے اودھ کے نواب کی طاقت مزید کم کردی۔یہ معاہدہ 1773 میں شجاع الدولہ کی مخالفت کی وجہ سے رد کردیا گیا۔1765ء سے 1768ء تک کا زمانہ مغل بادشاہ اور شجاع الدولہ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات پر مبنی رہا۔دراصل اس وقت مغل دربار میں منیر الدولہ بہت باثر تھا۔شجاع الدولہ اسے کمزور کرکے خود مغل دربار کا حقیقی وزیر بننا چاہتا تھا۔انگریزوں کی کوششوں سے شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ میں صلح ہوگئی جس کے نتیجے میں 1769ء سے 1771ء تک دونوں کے درمیان بہتر تعلقات قائم رہے۔لیکن جب 1771ء میں مراٹھوں کی مدد سے مغل بادشاہ دہلی واپس آیا تو انگریزوں نے کڑا اور الٰہ آباد بادشاہ سے واپس لے کر شجاع الدولہ کو سونپ دیے۔اس کے بدلے میں شجاع الدولہ نے 5050 لاکھ روپیے نقد اور اپنی حفاظت کے لیے انگریز فوجی دستوں کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی۔7 ستمبر 1773 کو شجاع الدولہ اور وارن ہیسٹنگز کے درمیان معاہدے نے اس فیصلے کی توثیق کردی۔علاوہ ازیں انگریز گورنر جنرل نے نے روہیل کھنڈ کی فتح کے لیے شجاع الدولہ کی مدد کا وعدہ بھی کیا۔اس طرح شجاع الدولہ اودھ میں انگریز ریزیڈنٹ کی تعیناتی کے لیے راضی ہوگیا۔

21.5.2 روہیل کھنڈ پر قبضہ (Capture of Rohilkhand)

اودھ کے نواب کی نظر روہلکھنڈ پر تھی۔اس سے قبل روہیلوں اور اودھ کے نواب کے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ اگر شجاع الدولہ اللہ مراٹھوں کو روہیلا ریاست سے نکال دے گا تو وہ نواب کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کریں گے۔ چنانچہ جب 1773 میں مراٹھوں نے نے وہ

روہیل کھنڈ پر حملہ کیا تو انگریز کمپنی اور اودھ کی مشترکہ افواج نے مراٹھوں کو شکست دی جس کے بعد شجاع الدولہ نے طے شدہ معاہدے کے مطابق روہیلا سردار حافظ رحمت خان سے 40 لاکھ روپیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ حافظ رحمت خان اس مطالبہ کو ٹالتا رہا۔ اس صورتحال میں شجاع الدولہ نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ چنانچہ فروری 1774 میں کرنل چیمپئن کی قیادت میں ایک انگریز فوج، اودھ کے نواب کی مدد کے لیے بھیج دیں گی۔ شجاع الدولہ اور کمپنی کی مشترکہ افواج نے میں اپریل سترہ سو چوہتر میں روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیایا۔ کٹرا میر پور کی جنگ میں روہیلوں کو شکست فاش ہوئی۔ حافظ رحمت خان مارا گیا۔ 20 ہزار سے زیادہ روہیلوں کو وادی گنگا کے باہر کھدیڑ دیا گیا۔ روہیل کھنڈ پر شجاع الدولہ کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ حصہ رام پور ریاست کی شکل میں روہیلوں کو مل گیا۔ جنوری 1778 کو شجاع الدولہ کی موت ہو گئی جس کے بعد اس کا بیٹا آصف الدولہ اودھ کا نواب بنا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں ہی اودھ پر انگریزوں کا اثر بڑھ گیا تھا۔ یہاں کے نواب انگریزوں کی من مانی کہنے پر قادر نہیں تھے اور انہیں انگریزوں کے احکامات کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ مختلف معاہدوں کے دائرے میں قید اپنا الگ درجہ رکھتے ہوئے بھی خصوصاً سیاسی و فوجی معاملات میں انگریزوں کے دست نگر بن گئے تھے۔

21.6 آصف الدولہ (Asif-ud Daula)

شجاع الدولہ کے بعد اس کا بیٹا آصف الدولہ تخت نشین ہوا۔ اس نے انگریزوں کی مدد سے سابق نواب کی بیگمات کا خزانہ حاصل کر لیا۔ ریاست میں انگریز فوج کا سارا خرچہ بھی نواب کی ہی ذمہ داری تھا۔ جب کارنوالس ہندوستان میں آیا تو اودھ کی حالت خستہ تھی۔ نظم و نسق کا برا حال تھا۔ مالی حالت انگریزی خرچہ کا بار اٹھا کر مسلسل گر رہی تھی۔ خود کارنوالس نے ان حالات پر شدید تنقید کی۔ لیکن انگریز چاہتے تھے کہ اودھ کی ریاست بنی رہے۔ دراصل وہ اس علاقہ کو اپنے اور مراٹھوں کے درمیان حد فاصل کے طور پر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی نظر میں یہ اہم ریاست تھی۔ اسی لیے کمزور اودھ کو وہ اپنے لیے نقصاندہ سمجھتے تھے۔ مراٹھوں کے حملوں سے بچنے کے لیے اودھ ان کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ کانوالس نے (1787-1793) ہندوستان آکر اودھ کے قابل وزیر حیدر بیگ سے ملاقات کی۔ حیدر بیگ۔ نے انگریزوں سے استدعا کی کہ وہ ریاست سے انگریزی فوج واپس بلا لے کیوں کہ اس کا خرچہ ریاست کے لیے ایک بڑا بوجھ ہے۔ فوج ہٹانے کی درخواست تو انگریز گورنر جنرل نے مسترد کر دی لیکن نواب سے سالانہ لی جانے والی رقم 74 لاکھ روپئے سے کم کر کے 50 لاکھ روپیہ سالانہ کر دی۔ جو آصف الدولہ تاحیات دیتا رہا۔

21.7 سعادت علی (Saadat Ali)

1797 میں آصف الدولہ کی موت کے بعد اس کے بھائی سعادت علی اور بیٹے وزیر علی میں جانشینی کا جھگڑا ہو گیا۔ انگریزوں نے پھر دخل اندازی کی۔ گورنر جنرل سر جان شور کی مدد سے سعادت علی 1798 میں اودھ کا نواب بن گیا۔ اس موقع پر انگریزوں نے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں مندرجہ ذیل امور طے کیے گئے۔

- انگریزوں کو سالانہ دی جانے 50 لاکھ سے بڑھا کر 76 لاکھ کر دی گئی۔

- الہ آباد کا قلعہ انگریزوں کو دے دیا گیا۔
- تخت کے حصول میں انگریزوں کی مدد کے عوض سعادت علی نے 12 لاکھ روپیہ انگریزوں کو دیے۔
- نواب سے وعدہ کیا کہ وہ انگریزوں کی اجازت کے بغیر کسی دیگر ریاست سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا، نہ کسی یورپین شخص کو نوکری دے گا اور نہ اپنی ریاست میں رہنے دے گا۔
- سعادت علی اودھ کے سابق مرحوم نواب آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی جس کے خلاف انگریزوں نے اس کی مدد کی تھی، اس کو 50 لاکھ روپیہ سالانہ پنشن دے گا اور اس کے دیگر بھائیوں کو بھی مناسب رقم پنشن کی شکل میں دے گا۔

اس معاہدہ نے اودھ کو اور کمزور کر دیا۔ اس کا مالی بوجھ بھی بڑھ گیا، انگریزوں کی گرفت ریاست اور نواب دونوں دونوں میں مضبوط ہوگئی۔ دوسری طرف اس انتناعی بوجھ نے نظم و نسق میں مزید خرابیاں پیدا کردیں ۔اور اودھ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ لارڈ ویلزلی (1798-1805) نے ہندستان آتے ہی اودھ کی جانب توجہ کی۔ وہ اودھ کو انگریزی مملکت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نواب سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوج ختم کردے کیوں کہ اس کی حفاظت کے لیے انگریز فوج کافی ہے۔ اس نے کہا کہ نواب صرف اسی قدر فوجی رکھے جتنے ٹیکس وصول کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس صورت حال میں نواب سعادت علی نے پہلے تو فیصلہ کیا کہ وہ تخت ہی چھوڑ دے مگر بعد میں ارادہ تبدیل کر لیا اور انگریزی مطالبات مان لیے جس کے نتیجہ میں ریاست ریاست پر قبضہ کی ویلزلی کی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ مگر ویلزلی جو ہندستان آیا ہی کچھ مقاصد کے ساتھ تھا اس نے جلد ہی 1801 میں سعادت علی کو ایک ماتحت امدادی معاہدہ کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اس معاہدہ کے مطابق:

1. انگریزوں کی امدادی فوج کے اخراجات کے لیے روہل کھنڈ اور نچلے دوآب کا علاقہ ہمیشہ کے لیے انگریزوی مملکت میں شامل کر دیا۔
2. اودھ کا نواب کسی بھی دیگر ریاست سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔
3. اودھ کی حدود میں ایک انگریزیفوج متعین کر دی گئی۔
4. ایک انگریزی ریزیڈنٹ نواب کے دربار میں رکھا گیا۔

اس معاہدہ نے نہ صرف ریاست اودھ کا ایک حصول انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دیا بلکہ ریاست مکمل طور پر انگریزوں کی دست نگر بن گئی۔ وہ صرف نام کا حکمراں تھا انتظامی حقوق اسے حاصل نہیں تھے۔ نہ ان کی فوج تھی اور نہ اقتدار کی طاقت۔ انگریزی فوج اس کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ وہ کسی دیگر ریاست سے نہ تو کوئی معاہدہ کر سکتا تھا اور نہ ہی جنگ کرنے کے اختیار و وسائل اس کے پاس تھے۔ اس صورت حال میں اودھ کا نظم و نسق بد تر ہوتا چلا گیا۔ نواب اور اس کے تعلقہ داروں کے ہاتھوں عوام کا استحصال بڑھتا رہا کیوں کہ انھیں نہ تو اندرونی بغاوت کا ڈر تھا اور نہ ہی بیرونی حملہ کا۔ دونوں صورتوں میں انگریزان کی پشت پر حفاظت کے لیے موجود تھے۔ اسی سبب سے افسران وذمہ داران کے ظلم میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور انتظامی مسائل کی پیچیدگیاں بھی بڑھتی رہیں۔ صحیح معنی میں اگر دیکھا جائے تو بدانتظامی کی ساری ذمہ داری انگریزوں پر بھی تھی۔ ان کا دولت کا مطالبہ کسی صورت رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ صرف ان معاملات میں دخل اندازی کرتے تھے جن سے ان کا مفاد وابستہ تھا۔ ان حالات کو بہتر بنانا کسی بھی نواب کے بس کی بات نہیں تھی تھی چاہے اس میں کتنی بھی صلاحیت

کیوں نہ ہو۔انگریز بار بار نواب کو دھمکی دیتے تھے کہ اگرانتظامی معاملات ٹھیک نہیں کیے گئے تو ریاست چھین لی جائے گی۔ مگران میں سے کچھ نہیں ہوا ہوا کیونکہ نوابینِ اودھ کی انگریزوں سے غیر مشروط وفاداری قائم رہی۔ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے 'اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب بہت خراب حکمران تھے لیکن یہ بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اچھے دوست تھے۔انسانیت اور عوام کو دھوکا دینے کے بعد بھی وہ انگریزوں کے وفادار تھے۔'

21.8 نصیرالدین حیدر (Naseeruddin Haider)

انگریزوں کی یہ پالیسی نواب سعادت علی اور پھر اس کے جانشین نصیر الدین حیدر (1809-1837) کے عہد میں اسی طرح جاری رہی۔ عوام کا استحصال نواب اور اس کے افسران کے ہاتھوں ہو رہا تھا اور نواب کا خون انگریز حکام اور افسران جا و بے جا مطالبات اور رشوتوں کے ذریعے پی رہے تھے۔نواب کی بے بسی اور عوام کی خستہ حالی اسی پالیسی کی مرہون منت تھی۔انگریزوں کی دولت کی ہوس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ سالانہ ادائیگی کے باوجود لارڈ ہیسٹنگز نے 2 کروڑ روپے نواب سے اپنی جنگی مہمات کے لیے حاصل کیے جس کے بدلے اسے راجہ کا عہدہ تفویض کیا۔لارڈ ایمہرسٹ نے 50 لاکھ روپے لیے۔لارڈ ولیم بنٹنک نے 62 لاکھ روپے بھی وصول کیے اور نواب کو دھمکی بھی دی کہ اگر نظم و نسق میں سدھار نہیں ہوا تو ریاست ضبط کرلی جائے گی۔نواب نصیرالدین حیدر کے زمانے میں اس کے وزیر حکیم مہدی نے اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے انگریزوں سے مدد چاہی لیکن ولیم بنٹنک نے صاف انکار کر دیا جس پر حکیم مہدی نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کا مقصد نظم و نسق کو بہتر بنانا نہیں تھا بلکہ وہ تو اس بدانتظامی کو بہانہ بنا کر اودھ کو ہڑپنا چاہتے تھے۔

21.9 ناصرالدولہ اور واجد علی شاہ (Nasir-ud-Daula and Wajid Ali Shah)

1837 میں نصیر الدین حیدر کی موت کے بعد جانشینی کے مسئلے میں انگریزوں نے مداخلت کی اور ناصر الدولہ (1837-1847) کو تخت نشین کر دیا۔وہ بوڑھا اور کمزور تھا۔اس نے انگریزوں سے وعدہ کیا کہ نواب بننے کے بعد وہ انگریزوں کی مرضی کے مطابق کسی بھی طرح کے معاہدے پر دستخط کر دے گا اور ہوا بھی یہی۔نواب بننے کے بعد اس نے انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا جس کے مطابق نواب اپنی پرانی فوج کو ختم کر کے ایک نئی فوج بھرتی کرے گا جو انگریزوں کے ماتحت ہوگی مگر اس کے اخراجات نواب اٹھائے گا۔اس نے یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ وہ انگریز ریزیڈنٹ کی مدد سے نظم و نسق کو سدھارے گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کلی یا جزوی طور پر ریاست کا انتظام انگریزوں کو سونپ دے گا۔یہ معاہدہ اتنا غیر اخلاقی تھا کہ خود انگلینڈ کی حکومت نے بھی اسے مسترد کر دیا لیکن اس نے اسے منسوخ کرنے کا اختیار ہندوستان کی کمپنی حکومت کو دیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے اس کی منسوخی کی اطلاع کبھی نواب نہیں دی۔

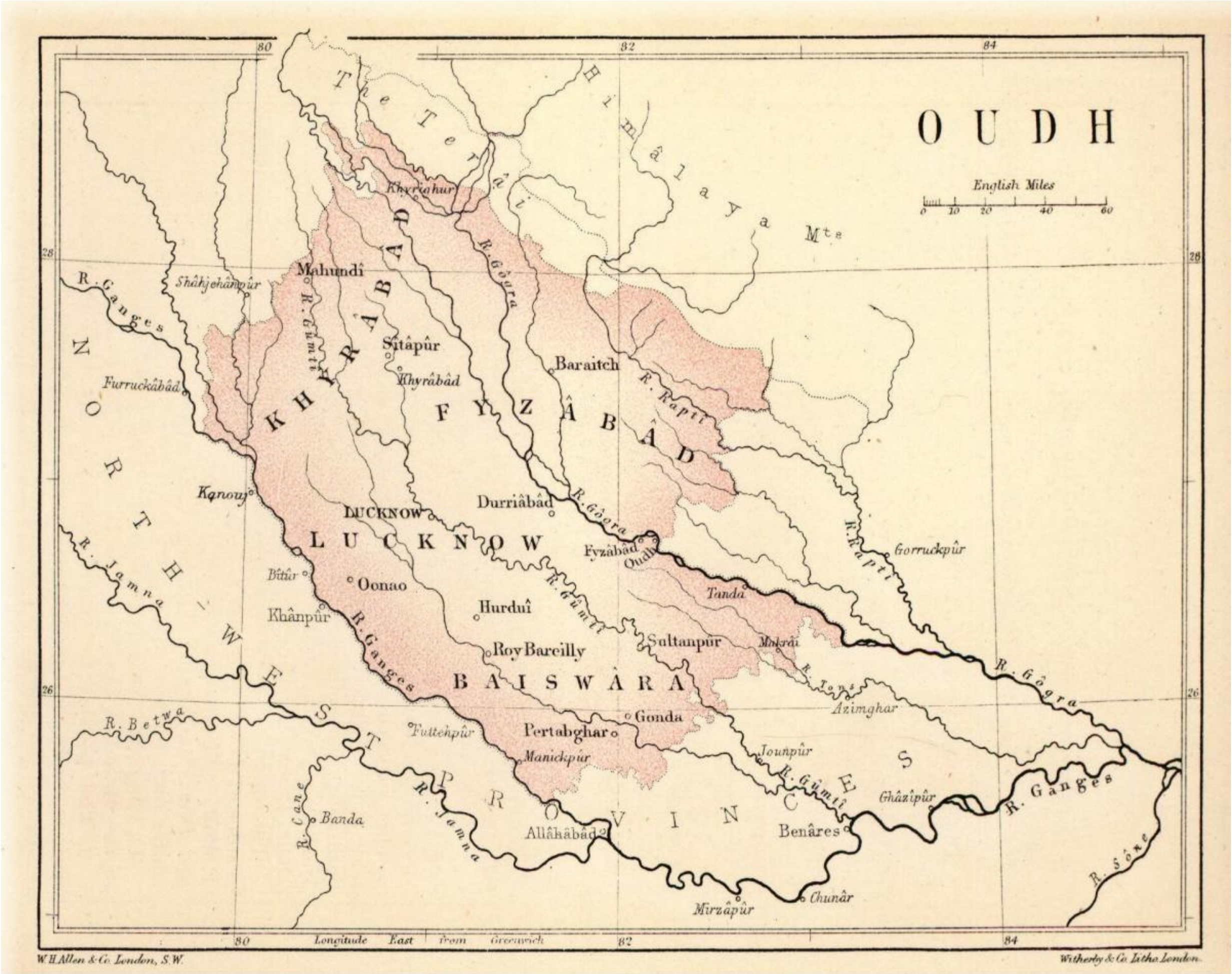

تصویر 21.2۔ نوابوں کے دور میں اودھ

(Source: Pope, G. U. (1880), Text-book of Indian History: Geographical Notes, Genealogical Tables, Examination Questions, London: W. H. Allen & Co. Pp. vii, 574, 16 maps)

اگلے دس سال تک انگریز پنجاب، افغانستان اور سندھ کی جنگوں میں مصروف رہے جس کی وجہ سے اودھ کو انہیں نظرانداز کرنا پڑا۔ چنانچہ اس دوران میں اودھ کی صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نواب، اس کے اہلکار اور عوام پرانی روش کے مطابق ہی زندگی گزارتے رہے۔ 1847 میں لارڈ ہارڈنگ نے دوبارہ اودھ کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی جو اسی پرانے ڈرنے پر چل رہی تھی۔ اس نے نواب واجد علی شاہ (1856-1847) کو متنبہ کیا کہ اگر دو سال کے اندر اندر ریاست کی حالت کو نہیں سدھارا گیا تو اودھ اس سے چھین لیا جائے گا۔ صورت حال میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن دوسری اینگلو سکھ جنگ کے آغاز کی بنا پر اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے بچ گیا۔

21.9.1 اودھ کا الحاق (Annexation of Awadh)

1856 میں لارڈ ڈلہوزی ہندوستان آیا۔ اس کے پاس بھی اودھ کو ہتھیانے کے لیے صرف ایک ہی بہانہ تھا یعنی نظم و نسق کی خراب صورتحال۔ اس نے اسی پر عمل کیا۔ ڈلہوزی نے سب سے پہلے اودھ کے انگریز ریزیڈنٹ ڈبلیو سلیمین کو حکم دیا کہ وہ ریاست میں

گھوم پھر کر نظم ونسق کا جائزہ لے اور اپنی رپورٹ دے۔ سلیمن کے استعفیٰ دینے کے بعد اسی کام کے لیے جنرل آؤٹرم کو ہدایات دی گئیں ۔اس نے رپورٹ تیار کی اور اسی کی بنیاد پر اودھ کے الحاق کا فیصلہ کر لیا گیا۔اودھ پر انگریزوں کا قبضہ کس طرح کا ہو یا انگریزی مملکت سے اس کے الحاق کی نوعیت کیا ہو اس پر مختلف آراء تھیں۔خود برطانوی ارباب حل وعقد میں اس موضوع کو لے کر دو گروہ تھے۔

پہلی رائے اعتدال پسند لوگوں کی تھی جن کے مطابق صرف اودھ کا نظم ونسق انگریز اپنے ہاتھ میں لے لیں، نواب کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس صورت میں انگریزوں کا حق صرف اودھ کی اتنی آمدنی پر ہوگا جو ریاست میں بہتر نظم ونسق قائم کرنے میں صرف کی جائے گی۔بقیہ حصہ نواب کا حق ہے۔خود سلیمن کی بھی یہی رائے تھی۔اس کا کہنا تھا کہ اودھ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لو لیکن اس ملک کی آمدنی پر قبضہ نہ جماؤ۔اودھ کی کل آمدنی نواب،اس کے خاندان اور فوج کے مفاد میں خرچ کی جانی چاہیے۔ سلیمن سیاسی نقطہ نظر سے اودھ یا کسی بھی دیگر ریاست کے انگریزی مملکت میں الحاق کے خلاف تھا۔اس کے مطابق یہ دیسی ریاستیں پانی پر لگے بند کی طرح ہیں، اگر یہ ختم ہو جائیں گی تو انگریز پوری طرح ہندوستانی افواج کے رحم وکرم پر ہوں گے اور ان فوجوں پر کلی اختیار ناممکن ہوگا۔ سلیمن کے علاوہ سر ہینری لارنس کا بھی یہی خیال تھا۔اس کی رائے تھی' اودھ کا نظم ونسق ایک فرد یعنی نواب کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی عوام کے مفاد میں بھی ہونا چاہیے۔' جہاں تک ممکن ہو حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ہی رہنا چاہیے۔ایک روپیہ بھی کمپنی کے خزانے میں نہیں آنا چاہیے۔ سلیمن،لارنس اور اسی خیال کے دیگر انگریز افسران سیاسی اور اخلاقی بنیادوں پر اودھ کے انگریز حکومت کے ساتھ الحاق کے خلاف تھے۔وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ نظم ونسق انگریز اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور اس میں سدھار کریں۔

دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اودھ پر انگریزوں کے مکمل قبضے کے حق میں تھے۔یہ سب استعماریت کے علمبردار تھے۔ ان کی نظر میں اس مسئلے کا حل صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اودھ کا مکمل الحاق ہونا چاہیے۔یہ لوگ برائے نام بھی نواب کو باقی رکھنے کے خلاف تھے۔ چنانچہ گورنر جنرل کے ان کے ہم خیال ہونے اور ان لوگوں کے دباؤ میں نواب واجد علی شاہ کو تخت سے ہٹا کر اودھ پر انگریزی قبضہ کا فیصلہ کر لیا گیا۔ 4فروری 1856کو انگریز ریزیڈنٹ نے نواب واجد علی شاہ سے ملاقات کی اور اس سے ایک معاہدے پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔اس معاہدے کی رو سے نواب سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے گدی چھوڑ دے اور اودھ انگریزوں کو سونپ دے۔اس موقع پر واجد علی شاہ نے ایک حکمراں کے شایان شان جواب دیا۔اس نے کہا کہ معاہدے برابر والوں میں ہوا کرتے ہیں،اس لیے میں اس حیثیت میں نہیں ہوں کہ اس پر دستخط کروں۔اس نے معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی پگڑی اتار کر برطانوی ریزیڈنٹ کے ہاتھوں میں دے دی۔انگریز اسے 12 لاکھ روپیہ سالانہ پنشن دینا چاہتے تھے اس نے وہ بھی قبول نہیں کی۔ اس نے کہا' انگریزوں نے اس سے اس کا وقار اور ملک چھین لیا ہے،اب وہ زندگی بسر کرنے کے لیے ان سے کچھ نہیں مانگے گا۔' اس طرح معاہدہ نہیں ہو سکا۔انگریزوں نے صرف ایک اعلان کے ذریعے ریاست اودھ کی قسمت پر مہر لگادی اور اس کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو پینشن دے کر کلکتہ جلاوطن کر دیا گیا۔

21.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اودھ کی آزاد اور خود مختار ریاست کا بانی نیشا پور سے تعلق رکھنے والا سعادت خاں تھا۔ 1720 میں وہ بیانہ کا فوجدار مقرر ہوا۔ اس نے مغل دربار کی سیاست میں سرگرم حصہ لیا اور بادشاہ گر کہے جانے والے سید برادران کے خلاف سازش میں شامل ہوا۔ دونوں بھائیوں کے زوال کے بعد مغل بادشاہ محمد شاہ کا وہ منظور نظر بن گیا۔ اسے پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب عطا ہوئے ساتھ ہی برہان الملک کا خطاب بھی ملا۔ 1720 سے 1722 تک وہ آگرہ کا گورنر رہا، جس کا انتظام اس نے اپنے نائب نیل کنٹھ کے ذریعہ چلایا۔ بعد میں وہ اودھ کا گورنر نامزد ہوا۔ جس پر جلد ہی اس نے خود مختاری حاصل کرلی۔ ایرانی بادشاہ نادر شاہ کے خلاف جنگ میں اس نے شرکت کی اور قید ہوا۔ نادر شاہ کو دلی پر حملہ کے لیے اکسانے میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ 20 مارچ 1739 کو اس کی موت ہوگئی۔ شبہ ہے کہ اس نے زہر کھالیا تھا۔ سعادت خاں کے بعد اس کا بھتیجہ صفدر جنگ تخت نشین ہوا، جسے محمد شاہ کا اعتماد حاصل تھا۔ بادشاہ نے اسے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا جس کے بعد اودھ کے حکمراں نواب وزیر کہلانے لگے۔ صفدر جنگ مغل سلطنت کا سب سے طاقتور اور بااختیار امیر تھا۔ مغل بادشاہ احمد شاہ سے اختلاف کے بعد وہ اودھ واپس آگیا اور یہیں اکتوبر 1754 میں اس کی موت واقع ہوئی۔ صفدر جنگ کے بعد اس بیٹا شجاع الدولہ حکمراں بنا۔ شاہ عالم ثانی نے اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ بنگال کی نوابی ہاتھ سے نکلنے کے بعد میر قاسم نے شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی۔ 22 اکتوبر 1764 کو بکسر کے مقام پر انگریزوں نے شجاع الدولہ، میر قاسم اور شاہ عالم ثانی کے متحدہ محاذ کو شکست دی۔ 16 اگست 1765 کو الہ آباد کا معاہدہ ہوا جس نے شجاع الدولہ اور اودھ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت کردیا۔

شجاع الدولہ کے عہد سے ہی انگریزوں کی گرفت اودھ پر مضبوط ہونے لگی جو بعد کے نوابوں کے زمانے میں مکمل ہوگئی۔ وارن ہیسٹنگز، کارنوالس، سر جان شور اور ویلزلی جیسے گورنر جنرلوں نے اودھ کے نوابوں کو وقتاً فوقتاً مختلف معاہدوں کے جال میں اس طرح جکڑا کے دھیرے دھیرے ریاست کے حکمراں بے دست و پا ہونے لگے۔ مختلف حیلوں اور طریقوں سے نوابوں کو مجبور کر کے ان سے کثیر رقم وصول کی جاتی۔ مالی طور پر اتنا نچوڑا گیا کہ ریاست متاثر ہونے لگی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اودھ کا نظم و نسق تباہ ہوگیا جس کی گونج ہر طرف سنائی دینے لگی۔ انگریزوں نے نواب پر صورتحال بہتر بنانے کے لیے دباؤ ڈالا لیکن اب یہ معاملہ نوابوں کے بس میں نہیں تھا۔ خود انگریزوں کی نیت بھی صاف نہیں تھی۔ وہ انتظامی معاملات کو بہانہ بنا کر اودھ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور بالآخر یہی ہوا۔ 1856 میں لارڈ ڈلہوزی نے آخری نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کا انگریزی حکومت میں الحاق کردیا۔

21.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

مسند نشیں	حکمراں ہونا
اوائل	شروعات،آغاز
میر بخشی	فوجی محکمہ کا افسرِ اعلیٰ
وطیرہ	طریقہ
سرکوبی	کچلنا، دبانا
ریشہ دوانی	چالیں چلنا، سازشیں کرنا

21.12 نمونۂ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

21.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ریاست اودھ کے بانی کا نام بتایئے؟
2. میر محمد امین کے والد کا نام کیا تھا؟
3. سعادت خان کا اصل نام کیا تھا؟
4. سعادت خان کے اجداد کا تعلق کہاں سے تھا؟
5. کرنال کی جنگ کب اور کس کے درمیان ہوئی؟
6. سعادت خان نے کس عہدے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا؟
7. نواب وزیر کس ریاست کے حکمرانوں کو کہا جاتا ہے؟
8. کس مغل بادشاہ نے صفدر جنگ کو میر آتش کا خطاب دیا تھا؟
9. شجاع الدولہ نے کس روہیلہ سردار کو شکست دے کر روہیل کھنڈ پر قبضہ کیا۔
10. اودھ کا الحاق کس سن میں ہوا۔

21.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سعادت خاں کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. نادر شاہ کے حملے کے دوران سعادت خاں کے کردار پر مختصر مضمون لکھیے۔
3. صفدر جنگ اور مغل بادشاہ کے تعلقات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. شجاع الدولہ کے روہیل کھنڈ پر قبضہ پر نوٹ لکھیے۔

5. نواب آصف الدولہ پر مختصر مضمون لکھیے۔

21.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سعادت علی خان کے کردار اور سیاسی سرگرمیوں پر ایک مضمون لکھیے۔
2. شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان تعلقات اور تصادم پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. اودھ کی ریاست کو کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملحق کیا گیا؟ تفصیلی بحث کیجیے۔

21.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar, *The Crisis of Empire in Mughal North India*: *Awadh and Punjab*, *1707–48*, Delhi, 1986.
2. Barnet, Richard B., *North India between Empires*: *Awadh, the Mughals and the British*, *1720–1801,* Berkely, 1980.
3. Basu, Purendu, *Oudh and the East India Company*, Lucknow, 1942.
4. Bhatnagar, G.D., *Oudh under Wajid Ali Shah*, Varanasi, 1968.
5. Jafri, SZH., *Awadh from Mughal to Colonial Rule*: *Studies in the Anatomy of a Transformation*, Gyan, New Delhi, 2016.

اکائی 22۔ میسور

(Mysore)

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22.2 ریاست میسور کا قیام

22.3 حیدر علی

22.3.1 ابتدائی حالات

22.3.2 حکمرانی کا آغاز

22.3.3 پہلی اینگلو میسور جنگ

22.3.4 مدراس کی صلح

22.3.5 دوسری اینگلو میسور جنگ

22.3.6 حیدر علی کی شخصیت کا جائزہ

22.4 ٹیپو سلطان

22.4.1 منگلور کی صلح

22.4.2 تیسری اینگلو میسور جنگ

22.4.3 سری رنگا پٹنم کا معاہدہ

22.4.4 چوتھی اینگلو میسور جنگ

22.4.5 ٹیپو سلطان کی شخصیت کا جائزہ

22.5 ریاست میسور کا نظم ونسق

22.5.1 مرکزی انتظامیہ

22.5.2 صوبائی ومقامی انتظامیہ

22.5.3 مالگزاری
22.5.4 صنعت و حرفت
22.5.5 فوجی تنظیم
22.5.6 جنگی راکٹ
22.5.7 بحریہ
22.5.8 سکے
22.5.9 سلاطین میسور کی مذہبی پالیسی
22.6 اکتسابی نتائج
22.7 کلیدی الفاظ
22.8 نمونہ امتحانی سوالات
22.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
22.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
22.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
22.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

22.0 تمہید (Introduction)

جنوبی ہندوستان میں وجے نگر سلطنت کے زوال کے بعد دیگر بہت سی ریاستیں وجود میں آئیں۔ان میں سے ایک ریاست میسور بھی تھی جس پر اٹھارہویں صدی میں ووڈیار خاندان کی حکومت تھی۔ حیدر علی نے اپنی صلاحیتوں اور حوصلہ کے سبب بہت معمولی عہدے سے شروعات کر کے وہ میسور کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔حیدر علی نے ووڈیار خاندان کی رسمی اطاعت جاری رکھی لیکن ٹیپو سلطان نے اس کو ختم کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا۔حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کی قیادت میں میسور نے ہندوستانی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔خاص طور پر ٹیپو نے جس طرح انگریزوں سے لوہالیا اور ان کا دست نگر بن کر رہنے سے انکار کر دیا وہ ہماری تاریخ کا زرّیں باب ہے۔ میسور کی پوری تاریخ انہیں باپ بیٹے کے گرد گھومتی ہے جو تاحیات انگریزوں اور دیگر مقامی ریاستوں سے دست بہ گریباں رہے اور بالآخر سازشوں نے انہیں شکست دے کر انگریزوں کو میسور کا مالک بنا دیا۔

22.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- حیدر علی اور اس کے عروج سے واقف ہو سکیں گے۔
- ٹیپو سلطان کے بارے میں واقف ہو سکیں گے۔
- انگریزوں سمیت جنوبی ہند کی مقامی ریاستوں کی آپسی کشاکش سے آگاہی ہوگی۔
- ٹیپو سلطان کی شخصیت اور انگریزوں کے خلاف اس کی جدوجہد کی جانکاری مل جائے گی۔

22.2 ریاست میسور کا قیام (Foundation of the Mysore State)

1565 میں تالی کوٹا کی مشہور جنگ میں جنوبی ہند کی مسلم ریاستوں کی متحدہ قوت نے وجے نگر سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے کھنڈرات پر جو ریاستیں وجود میں آئیں ان میں میسور کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس پر واڈیار خاندان کے حکمرانوں کا تسلط تھا جس کے آخری راجہ چِکا کرشنا راج واڈیار کا عہد 1734 سے 1761 تک رہا۔ اس کے دور میں حقیقی اختیارات دو بھائیوں دیوراج جو سپہ سالار تھا اور نندراج جو وزیر مالیات تھا، کے ہاتھوں میں رہے۔ یہ وہ دور تھا جب جنوبی ہند میں انگریز، فرانسیسی، حیدرآباد کا نظام اور مراٹھے ایک دوسرے کے خلاف صف آرائیوں میں مصروف تھے۔ مراٹھوں نے 1753 سے 1759 تک کئی بار میسور پر حملہ کیا۔ ایسے وقت میں حیدر علی نمودار ہوا جس نے 1761 تک میسور کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

22.3 حیدر علی (Haider Ali)

22.3.1 ابتدائی حالات (Early Conditions)

حیدر علی 1721 میں ریاست میسور کے بوندی کوٹ میں پیدا ہوا۔ اُس کے اجداد دلی سے گلبرگہ آئے تھے۔ اور کھیتی باڑی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ حیدر علی کے والد فتح محمد نے ریاست کی فوج میں ملازمت حاصل کر لی اور اپنی لیاقت و محنت کی بنیاد پر فوجدار کا عہدہ اور بوندی کوٹ کی جاگیر بھی حاصل کر لی۔ لیکن بد قسمتی سے جب حیدر علی صرف 7 سال کا تھا فتح محمد کا انتقال ہو گیا جس نے اس خاندان کو مشکلوں میں ڈال دیا۔ جوان ہو کر حیدر علی نے بھی فوج میں ملازمت حاصل کر لی اور اپنے خاندان کی حالت کو سنبھال لیا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُس میں فوجی و انتظامی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور ساتھ ہی وہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت کا بھی حامل تھا۔ کرناٹک کی جنگوں میں اُسے ابھرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ناصر جنگ کے قتل کے بعد جب مظفر جنگ حیدرآباد کا نظام بنا تو اُس دوران حیدر علی کو ناصر جنگ کے خزانہ کا کچھ حصہ مل گیا جس سے اُسے بڑی مدد ملی۔ اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر اُس کے عہدے میں ترقی ہوتی چلی گئی۔ اُس نے فرانسیسیوں کے جنگی طریقے سیکھے اور اپنی فوج کو بھی اُسی نہج پر تربیت دی۔ نندراج اُس کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا اور ترچناپلی پر حملہ کے وقت اُسے بھی فوج

کے ہمراہ لے گیا۔ جہاں کچھ انگریزی توپیں بھی حیدر علی کے ہاتھوں آگئیں۔ 1755 میں اُسے ڈنڈی گل کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ وہاں رہ کر اُس نے اپنی دولت و فوج میں اضافہ کیا جس کے سبب وہ مزید طاقتور ہو گیا۔ اگلے 5 سال سیاسی اعتبار سے حیدر علی کے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں اُس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ریاست میسور کے دربار میں اتنا رسوخ حاصل کر لیا کہ 1760 میں سارے انتظامی وانصرامی معاملات اُسی کے ہاتھوں میں سمٹ گئے۔ 1761 میں اُس نے نندراج کو برخواست کر دیا اور خود راجہ کا سرپرست بن گیا۔ یا یوں کہیے کہ اب ریاست میسور کا اصل حکمراں وہی تھا۔ تمام سیاسی وانتظامی اختیارات اب اُسی کے ہاتھ میں تھے۔

22.3.2 حکمرانی کا آغاز (Beginning of Rule)

اقتدار حاصل کرنے کے بعد حیدر علی نے فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو یوروپی طرز پر تیار کیا اور ڈنڈی گل میں فرانسیسی ہتھیار بنانے کی ایک فیکٹری لگوائی اسی طرح حیدرآباد و کرناٹک کی جانشینی کی جنگوں، پانی پت کی تیسری لڑائی میں مراٹھوں کی ہار اور جنوب میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی دشمنی نے حیدر علی کو اپنی طاقت بڑھانے کا مزید موقع دیا۔ 1761 سے 1763 کے درمیان اس نے سیرا، بدنور، حوضکوٹ سمیت کئی اہم علاقوں کو فتح کرنے کے علاوہ جنوب کے پولی گاروں کو بھی شکست دی۔ انگریزوں کے خلاف اسے فرانسیسیوں سے بہت مدد ملی۔ کاؤنٹ لالی نے 10000 روپیہ ماہانہ کے علاوہ بھنگور اور الادنسور کے قلعے بھی دیے۔ پانڈیچری پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد حیدر علی نے تقریباً 300 فرانسیسیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ اس نے فرانسیسی مدد سے ڈنڈی گل میں اسلحہ خانہ قائم کیا اور اپنی فوجوں کو ٹریننگ دلوائی۔

حیدر علی کو مراٹھوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ پیشوا مادھو جی کی قیادت میں مراٹھا فوج نے 1764-1766 اور 1771 میں میسور پر کامیاب حملے کیے۔ ان میں حیدر علی کو مالی تاوان کے علاوہ اپنے کچھ علاقوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ 1772 میں پیشوا مادھو جی کی موت کے بعد مراٹھوں میں اندرونی خلفشار پھیل گیا۔ جس کا پورا فائدہ حیدر علی نے اٹھایا۔ اس نے 1774 سے 1776 کے درمیان نہ صرف اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے بلکہ کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیان کے کئی اہم علاقوں بیلاری، کڈپّا، گوٹی اور کرنول وغیرہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ حیدر علی اور کرناٹک کے نواب محمد علی میں بھی کشیدگی تھی۔ کرناٹک کے کئی اضلاع ایسے تھے جن پر دونوں کا دعویٰ تھا۔ محمد علی نے ویلور میں جب انگریز فوجی دستوں کو رکھنے کی اجازت دی تو نہ صرف حیدر علی نے اس کی مخالفت کی بلکہ جواباً محمد علی کے حریف چندا صاحب کے بیٹے راجہ صاحب کو اپنی نوکری میں رکھ لیا۔ یہی نہیں بلکہ کرناٹک کے نواب کے دوسرے حریف اور بھائی محفوظ خاں کو بھی پناہ دی۔ جنوبی ہند کی سیاست میں انگریزوں کی مدراس حکومت کی دخل اندازی سے انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان ٹکراؤ کا آغاز ہوا جو اُس کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو نے انگریزوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں۔

22.3.3 پہلی اینگلو میسور جنگ (First Anglo-Mysore War, 1768-69)

جنوب میں فرانسیسیوں کے پیچھے ہٹنے اور بنگال پر انگریزوں کی فتح نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ اپنے اقتدار کو

وسعت دینے اور حیدر علی کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے مدراس کی حکومت نے حیدرآباد کے نظام سے 1767 میں ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے شمالی سرکاروں کے بدلے نظام کو 5 لاکھ روپیہ کا نذرانہ اور حیدر علی کے خلاف فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا گیا۔ انگریزوں نے نظام کو حیدر علی کے خلاف اکسایا۔ یہ صورت حال دیکھ حیدر علی نے مراٹھوں سے صلح کا معاہدہ کیا۔ پھر نظام کے ساتھ بھی محفوظ خاں (نواب کرناٹک کا بھائی) کی مدد سے معاہدہ کیا۔ دونوں طرف سے بے فکر ہو کر اس نے انگریزوں کے دوست کرناٹک کے نواب پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے حیدر علی اور نظام کو شکست دی جس پر نظام پھر انگریزوں سے جاملا۔ اب دوبارہ حیدر علی نے 1769 میں انگریزوں پر حملہ کر دیا اور انہیں مدراس تک ڈھکیل دیا۔ اپنے وجود کو خطرہ میں دیکھ کر انگریزوں نے 1769 میں حیدر علی سے مدراس کا معاہدہ کر لیا۔

22.3.4 مدراس کی صلح (Treaty of Madras, 1767)

انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان 14 اپریل 1769 کو ہونے والے صلح نامہ کی اہم شقیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1. فریقین نے ایک دوسرے کے جیتے ہوئے علاقہ واپس کر دیے۔
2. حیدر علی نے کرور کا ضلع کرناٹک کے نواب کو دے دیا جس پر بہت پہلے میسور نے قبضہ کر لیا تھا۔
3. انگریز اور حیدر علی اس بات پر متفق ہو گئے کہ اگر کوئی تیسرا ان میں سے کسی پر بھی حملہ کرے گا تو دوسرا فریق اس کی مدد کرے گا۔
4. حیدر علی نے جنگ کے دوران 205 انگریزوں کو قید کر لیا تھا وہ آزاد کر دیے گئے۔
5. انگریز حیدر علی کو جنگ کا تاوان اور جرمانہ بھی ادا کریں گے۔

اس طرح پہلی اینگلو میسور جنگ اپنے انجام کو پہنچی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی اور صلح کی شرائط بھی اسی کے مطابق تھیں۔ لیکن یہ معاہدہ دو دوستوں کے درمیان میں تھا۔ اس جنگ نے انگریزوں کے وقار کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ جس کے بعد ان کو اپنے مقاصد خطرہ میں نظر آنے لگے تھے۔ اس لیے وہ حیدر علی سے نہ تو صلح کے لیے تیار تھے اور نہ ہی اسے ضرورت پڑنے پر کسی طرح کی مدد دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ جنگ بندی عارضی تھی بلکہ دوسری جنگ کا پیش خیمہ تھی۔

22.3.5 دوسری اینگلو میسور جنگ (Second Anglo-Mysore War, 1780-84)

1770 میں پیشوا مادھو راؤ کی قیادت میں مراٹھوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ مدراس معاہدہ کی رو سے انگریزوں کو حیدر علی کی مدد کرنی چاہیے تھی مگر انہوں نے اس کی درخواست پر بھی کوئی مدد نہیں کی۔ اس وقت بمبئی پریسیڈنسی میں مراٹھا اور نظام انگریزوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ حیدر علی نے انگریزوں کی اس بد عہدی کو دیکھتے ہوئے بہتر سمجھا کہ وہ بھی نظام اور مراٹھوں کے ساتھ مل جائے۔ چنانچہ تینوں کا متحدہ محاذ تیار ہو گیا۔ انگریز ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے حیدر علی کے علاقہ میں واقع فرانسیسی بستی ماہی پر حملہ بھی کر دیا اور 1773 میں اس پر قبضہ کر لیا۔ جولائی 1780 میں حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ یہ دوسری اینگلو میسور جنگ کا آغاز تھا۔ حیدر علی نے انگریز جنرل بیلی کو کرناٹک کے میدان مین شکست فاش دی اور اکتوبر 1780 میں ارکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ انگریزوں کو اپنی

شرمناک ہار سامنے دکھائی دے رہی تھی۔اس وقت انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا وہ ایک منجھا ہوا سیاستداں و مدبر تھا۔اس نے ایک چال چلی۔نظام کو گنٹور کا علاقہ دے کر حیدر علی سے الگ کر دیا۔اور سندھیا و بھونسلے کو بھی اپنی طرف ملا لیا۔1780 میں نئے انگریز جنرل آئر کوٹ نے پورٹانودا، پولیلور،اور شولنگیلور میں تنہا رہ گئے حیدر علی کو کئی بار شکست دی۔لیکن حیدر علی نے ہمت نہیں ہاری اور ستمبر 1782 میں آئر کوٹ کو شکست دے دی۔7 دسمبر 1782 کو حیدر علی کی موت ہو گئی۔اس کی زندگی اور موت دونوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور محنت کی بنیاد پر اونچے مقام تک پہنچا تھا۔

22.3.6 حیدر علی کی شخصیت کا جائزہ (An Estimate of Hyder Ali's Personality)

1782 میں حیدر علی کی موت کے ساتھ ریاست میسور کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔یہاں بھی حیدر علی کی شخصیت اور اس ان صلاحیتوں کو بھی سمجھنا ضروری ہے جو نہ صرف اس کے عروج کا سبب بنیں بلکہ میسور کو ایسی ریاست کا درجہ عطا کر دیا جو انگریزوں کے لیے بڑی مزاحمت کا سبب بنی،ایک ایسا کانٹا جسے نکالنے میں انگریز صاحب بہادر کو دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور جس کے سقوط کے بعد بھی ہندوستان پر ان کے مکمل اقتدار کا خواب پورا ہوا۔یہی وجہ ہے کہ انگریز مورخین نے حیدر علی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔کچھ نے اسے غاصب و لٹیرا گردانا ہے تو کچھ نے دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے والا کہہ کر تحقیر کی ہے۔اس دور کے حالات اور مزاج کو نظر میں رکھتے ہوئے حیدر علی کا عروج اور اپنے لیے ایک ریاست کا قیام کسی بھی طور پر غیر منصفانہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔انگریزوں سے اس کی دشمنی وقت کا تقاضہ تھا نہ کہ اس کے کردار کا عیب۔

حیدر علی ہمہ جہتی صلاحیتوں کا مالک تھا۔وہ پیدائشی فوجی، بہترین شہ سوار، لائق سپہ سالار، اعلیٰ درجہ کا منتظم اور باشعور مدبر تھا۔ایک عام سے گھرانہ میں پیدا ہونے والا شخص جس نے ایک نائیک کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا بالآخر ریاست میسور کا حکمراں بن گیا۔جنگ کے دوران حوصلہ و ہمت کے ساتھ قیادت کا جو بے مثل نمونہ اس نے پیش کیا وہ قابل تعریف ہے۔سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور ان کے مطابق فیصلے کرنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس نے یوروپی طرز پر اپنی فوجوں کو ٹریننگ دینے کے لیے فرانسیسیوں کی مدد لی۔توپ خانہ کا بہترین استعمال سیکھا اور جنگ میں جدید تکنیک استعمال کی۔اس کے علاوہ اس میں مذہبی رواداری بھی بے انتہا تھی۔ہندو و دیگر مذاہب کے لوگ اس کی یاست میں خود کو محفوظ تصور کرتے تھے۔وہ مندروں کو عطیات دیتا اور سب کے ساتھ تعصب سے پاک سلوک کرتا۔ مسلسل جنگی مصروفیتوں کے سبب انتظامی امور میں وہ اپنے افسران پر منحصر ہونے کے باوجود انتظامی امور پر پوری نگاہ رکھتا لیکن اہل کاروں کی صلاحیتوں کو پرکھنے، وفاداروں کو انعام بخشنے اور مجرموں کو سزا دینے میں وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ایک بہترین فوجی، منتظم اور قائد کی حیثیت سے اس نے کمزور میسور ریاست کو وسعت دے کر اٹھارویں صدی کے نصفِ آخر کی مضبوط ترین سلطنتوں میں شامل کر دیا۔حیدر آباد، مراٹھوں اور انگریزوں کی مسلسل مخالفت اور ان کے ساتھ تصادم میں اس کی کامیابیاں حقیقتاً اس کی بے مثال شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

22.4 ٹیپو سلطان (Tipu Sultan)

حیدر علی کی موت کے بعد اس کے نامور بیٹے ٹیپو نے جنگ جاری رکھی۔ لیکن اب دونوں فریق تھک چکے تھے، دونوں جانتے تھے کہ ان حالات میں وہ دشمن کو زیر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ 1784 میں دونوں کے درمیان منگلور کا معاہدہ ہو گیا۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے جیتے ہوئے علاقے واپس کرنے پر راضی ہو گئے۔

22.4.1 منگلور کی صلح (Treaty of Mangalore, 1784)

انگریزوں اور میسور کے درمیان ہونے والے دوسرے تصادم کا اختتام 7/مارچ 1784 کے منگلور معاہدہ کے ساتھ ہو گیا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی فیصلہ کن برتری حاصل نہیں ہو سکی۔ اس معاہدہ کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

1. دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے فتح کیے ہوئے علاقے واپس کر دیے۔
2. دونوں نے جنگی قیدیوں کو چھوڑ دینے کا وعدہ کیا۔
3. انگریزوں نے اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی کہ وہ میسور کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ بھی عارضی ہی تھا۔ انگریز اور ٹیپو دونوں ہی جنگ کے طوالت سے تنگ آ چکے تھے اور دونوں ہی سمجھتے تھے کہ حالات کی نزاکت جنگ بندی کی متقاضی ہے۔ دونوں اپنی طاقت مجتمع کرنا چاہتے تھے تاکہ کچھ وقت مل جائے اور نئے سرے سے جنگ کا آغاز کیا جا سکے۔ خود انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز اس معاہدہ سے مطمئن نہ تھا لیکن مدراس سرکار کے دباؤ نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ دوسری جنگ کا اختتام اور معاہدہ دونوں میسور کی موافقت میں زیادہ تھے۔ اس سے انگریزوں کی ساکھ کو نقصان پہنچا تھا۔ جب کہ دوسری طرف میسور کے وقار میں اضافہ ہوا تھا۔

1786 میں لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل بنا۔ حالانکہ وہ 1784 میں ڈائرکٹروں کے ذریعہ دخل نہ دینے والی پالیسی کے موافق تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ ریاست میسور کے ساتھ ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اور ٹیپو کی طاقت کو کچلے بغیر انگریزوں کے سیاسی حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ٹیپو اس وقت بھی انگریزوں کے خلاف بیرونی ممالک سے مدد حاصل کرنے میں کوشاں تھا۔ اس نے جولائی 1787 میں فرانس اور ترکی میں اپنی سفارشیں بھیجیں۔ دونوں جگہ اس کے سفیروں کا گرجوشی سے استقبال ہوا مگر زبانی یقین دہانی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ ٹیپو کی ان سرگرمیوں سے اس کا یہ پختہ ارادہ ضرور ظاہر ہو گیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہر ممکن قدم اٹھانے کو تیار تھا۔ چنانچہ کارنوالس نے بھی اس کو تباہ کرنے کی کوششیں تیز کر دی اور مراٹھوں اور نظام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا۔ جولائی 1789 میں کارنوالس نے گنٹور ضلع سے متعلق نظام کے ساتھ ایک مستقل معاہدہ کیا لیکن اس میں ٹیپو کو شامل نہیں کیا، جس سے ٹیپو کو یقین ہو گیا کہ جلد ہی انگریزوں سے جنگ متوقع ہے۔

22.4.2 تیسری اینگلو میسور جنگ (Third Anglo-Mysore War)

میسور اور انگریزوں کے درمیان تیسری جنگ لارڈ کارنوالس کے عہد میں لڑی گئی۔ یہ بھی انگریزوں کے فریب اور سازشی ذہن کا نتیجہ تھی۔ 1788 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حیدرآباد کے نظام کو ٹیپو کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کی ترغیب کے لیے ایک خط لکھا۔ ٹیپو نے اسے معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دے کر ٹراونکور پر حملہ کر دیا۔ یہاں کا راجہ انگریزوں کا دوست تھا۔ ٹیپو کے اس اقدام کو بہانہ بنا کر انگریزوں نے مراٹھوں اور نظام سے معاہدہ کر لیا اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ٹیپو کا ٹراونکور کے راجہ سے پرانا جھگڑا تھا۔ اس نے ٹیپو کے ان دشمنوں کو پناہ دی تھی جو ٹیپو کی مالابار کی سرحدوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ دراصل یہاں اس کے دو بندرگاہیں ڈچ سے خریدی تھیں، جن کا کچھ حصہ ٹیپو نے اپنی حدود میں بانٹا تھا۔ اس قضیہ کو ٹیپو نے مدراس کونسل کے ذریعہ بھی کرانا چاہا تھا لیکن جب وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے ٹراونکور پر حملہ کر دیا۔ انگریز تو جنگ کے لیے بہانہ کی تلاش میں ہی تھے۔ اس حملہ کے ہوتے ہیں کارنوالس نے ٹیپو کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن وہ چاہتا تھا کہ مراٹھے اور حیدرآباد ٹیپو سے الگ ہی رہیں۔ اس کے لیے اس نے مذکورہ دونوں طاقتوں سے بات چیت شروع کر دی۔ دو برس کی کوششوں کے بعد وہ 1/جون 1790 کو مراٹھوں اور 4/جولائی 1790 کو نظام کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل امور طے کیے گئے۔

1. میسور کے خلاف جنگ میں نظام اور مراٹھوں دونوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔
2. جنگ کے بعد مفتوحہ علاقوں اور مال غنیمت کو کارنوالس، کمپنی، مراٹھوں اور حیدرآباد تینوں میں برابر تقسیم کر دے گا۔

حالانکہ اس جنگ میں نظام اور مراٹھوں نے انگریزوں کی بہت ہی معمولی سی مدد کی اور جنگ کا سارا بوجھ انگریزوں پر ہی رہا لیکن اس معاہدہ نے ٹیپو کی مدد یا نظام اور مراٹھوں کے اس کے ساتھ مل جانے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ اس طرح جنگ کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں انگریز جنرل مڈو تھا۔ مگر اسے ٹیپو کے خلاف کوئی کامیابی نہیں ملی۔ دسمبر 1790 لارڈ کانوالس کی قیادت میں جنگ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ مارچ 1791 تک انگریزوں نے ویلور اور امبور پر قبضہ کر لیا اور ٹیپو کی راجدھانی سری رنگا پٹنم کے قریب پہنچ گیا مگر برسات شروع ہو جانے سے اس کی مہم آگے نہیں بڑھ سکی اور وہ منگلور واپس لوٹ گیا۔ 1791 کی گرمیوں میں ٹیپو نے کوئمبٹور پر قبضہ کر لیا اور جنگ پھر شروع ہو گئی۔ یہ جنگ کا تیسرا مرحلہ تھا۔ اس میں کارنوالس کی مدد کے لیے مڈو، اسٹورٹ، میکسویل اور ہنٹر جیسے انگریز فوجی افسران آ گئے۔ ٹیپو نے بڑی بہادری سے جنگ لڑی مگر انگریزوں کی حیثیت مضبوط تھی۔ اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور مارچ 1792 میں دونوں فریقوں میں سری رنگا پٹنم کا معاہدہ ہو گیا۔

22.4.3 سری رنگا پٹنم کا معاہدہ (Treaty of Srirangapatnam)

مارچ 1792 میں ٹیپو اور کارنوالس کے درمیان میسور کی راجدھانی سری رنگا پٹنم میں ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق:

1. ٹیپو کی لگ بھگ آدھی سلطنت اس سے چھین لی گئی۔

2. ایک بڑا حصہ (شمالی مغرب میں دھارواڑاور جنوب مشرق میں کڑپا سے کرنول تک کا علاقہ) نظام حیدر آبا کو دے دیا گیا۔
3. مراٹھوں کو جو حصہ ملا اس سے ان کی ریاست کی حدود تنگ بھدرا تک پہنچ گئیں۔
4. انگریزوں کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا۔انہیں مالا بار، جنوب میں ڈنڈی گل پہاڑی راستے، حاصل ہوگئے۔ جس کے نتیجہ میں ان کی حدود کی توسیع بھی ہوئی اور فوجی، سیاسی اہمیت کے علاقے ان کے ہاتھ آگئے۔
5. کرگ کا راجہ بھی انگریزوں کے زیر نگیں آگیا۔
6. ٹیپو کو 30 لاکھ پونڈ (تین کروڑ روپیہ) تاوان کی صورت میں انگریزوں کو دینا پڑا۔
7. 4 مستقبل کی ضمانت کے طور پر ٹیپو کے دو بیٹے یرغمال کی شکل میں دے دیے گئے۔

اس معاہدہ کے لیے کچھ لوگ کارنوالس پر تنقید کرتے ہیں۔اس کے مطابق اس نے جلد بازی سے کام لیا۔یہ موقع تھا جب وہ ٹیپو کو مکمل طور سے ختم کرسکتا تھا۔لیکن بغائر نظر جائزہ لینے پر یہ معاہدہ کارنولس کی سوجھ بوجھ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔دراصل اس وقت انگریزی فوج میں بیماری پھیل رہی تھی۔ساتھ ہی یوروپ میں فرانس انقلاب سے ابھر رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ وہ ٹیپو کی مدد کرسکتا ہے۔اس کے علاوہ کمپنی کے ڈائرکٹر بھی اس وقت جنگ بندی کے حق میں تھے۔میسور پر قبضہ کرنے پر کارنوالس کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مراٹھوں اور حیدر آباد کو بھی زیادہ علاقے دینا پڑتے، جس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوجاتا اور یہ کسی بھی صورت انگریزوں کے حق میں نہیں تھا۔اسی لیے اس نے اس معاہدہ کے بعد کہا تھا 'ہم نے اپنے دوستوں کو بغیر زیادہ طاقتور کیے اپنے دشمن کو تباہ کردیا ہے۔' اس معاہدہ نے ٹیپو کی کمر توڑ دی۔ میسور مورخ بپن چندرا کے مطابق 'تیسری اینگلو میسور جنگ نے جنوب میں ٹیپو کی طاقت تباہ کرکے وہاں انگریزوں کی بالادستی قائم کردی۔' ٹیپو کمزور ہوگیا اور بالآخر انگریزوں کے اس سب سے بڑے دشمن کو لارڈ ویلزلی نے ختم کردیا۔

22.4.4 چوتھی اینگلو میسور جنگ (Fourth Anglo-Mysore War) (مارچ 1799 تا مئی 1799)

تیسری جنگ جس شرمناک معاہدہ پر ختم ہوئی تھی وہ ٹیپو کے لیے ناقابل برداشت تھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں سے اسے کوئی مدد نہیں ملنے والی اور حقیقتاً وہ تھے بھی ناقابل بھروسہ۔یہاں سے مایوس ہوکر انگریزوں کے خلاف اس نے ملک سے باہر اپنی امیدیں لگائیں۔ہندوستان میں تو فرانسیسی اس کے مددگار تھے ہی اس نے نپولین سے بھی مراسلت کی۔اس کے علاوہ اس نے عرب، ترکی، افغانستان اور ماریشس کے حکمرانوں سے بھی مدد کے لیے خط وکتابت کی۔اس نے حوصلہ کے ساتھ ایک بار پھر اپنی فوجوں کو منظم کیا۔انہیں فرانسیسی طرز پر تربیت دی۔غرض اس نے بازی کو پلٹنے کے لیے ہر جرأت آمیز کوشش کی۔اس نے قلعہ بندی کو مضبوط کیا۔اپنی گھڑ سوا اور پیدل فوج کی تعداد میں اضافہ کیا اور ان کی تربیت پر خصوصی دھیان دیا۔باغی سرداروں کو دبایا اور کھیتی کو بہتر کرنے کے لیے کوششیں کیں۔1796 میں برائے نام میسور کے واڈیار راجہ کی موت پر اس کے نابالغ بیٹے کو گدّی نشین کرنے سے انکار کردیا۔بیرونی امداد اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے بھی ہر ممکن جتن کیے۔اس نے سری رنگا پٹنم میں فرانسیسی رضاکاروں کے ساتھ شجر آزادی (Tree of Liberty) لگایا۔خود فرانس کے مشہور سیاسی گروپ، 'جیکوبن کلب' کا ممبر بنا۔اور اپنے کو شہری ٹیپو (Citizen Tipu) کہلوایا۔اپنی راجدھانی میں 99 فرانسیوں کو

اعزاز بخشا۔ وہ جانتا تھا کہ فرانسیسی انگریزوں کے سب سے بڑے مخالف اور فطری دشمن ہیں چنانچہ اس نے فرانس کی ہمدردی واعانت کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس کے نتیجہ میں ماریشس کے فرانسیسی گورنر نے ٹیپو کو 'میسور کا سلطان' خطاب دیا اور جس وقت لارڈ ویلزلی کلکتہ آیا اس اسی وقت فرانسیسی فوج کا ایک دستہ منگلور پہنچا۔ ٹیپو کی یہ سرگرمیاں استعماریت کے علمبردار ویلزلی کے لیے ناقابل برداشت تھیں ۔ ہندوستان سے فرانسیسی دخل کو ختم کرنے کے لیے ٹیپو کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اسی لیے اس نے سب سے پہلے اپنی توجہ میسور کی طرف مبذول کی۔ دوسری طرف انگریزوں نے مراٹھوں اور نظام سے اس شرط پر معاہدہ کیا کہ جنگ کا نفع تینوں میں مساوی تقسیم کر دیا جائے گا۔

جنرل ہیرس اور آرتھر ویلزلی کی قیادت میں ایک فوج 20۔ فروری 1799 کو مشرق میں ویلور سے چل کر مارچ 1799 میں میسور پر حملہ آور مغربی ساحل کے راستہ بمبئی سے جنرل اسٹورٹ کے ماتحت دوسری فوج نے میسور پر حملہ کیا۔ اسٹورٹ نے سداسیر اور ہیرس نے مالوپلی کی جنگ میں ٹیپو کو شکست دی جس کے بعد میسور کا سلطان سری رنگا پٹنم کے قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ جس کے بعد 17/اپریل 1799 کو انگریزی فوج نے سری رنگا پٹنم کو محصور کر لیا۔ ویلزلی نے ٹیپو سے ریاست میسور اور 20 لاکھ پونڈ تاوان جنگ کی مانگ جسے ٹیپو نے ٹھکرا دیا۔ نتیجتاً 4/مئی 1799 کو انگریزوں سے سری رنگا پٹنم پر حملہ کر دیا۔ ٹیپو بہت بہادری سے لڑا مگر دیر ہو چکی تھی انگریزوں نے اس کے کئی اہم افسران کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ چنانچہ وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ جنگ اسی دن ٹیپو کی شہادت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ ایک اہم ہندوستانی ریاست اور انگریزوں کے سب سے کٹر دشمن کا خاتمہ ہو گیا۔

انگریزوں نے زمین کے کچھ حصہ کو کچھ شرطوں پر پیشوا کو دینا چاہا مگر اس نے قبول نہیں کیا۔ نظام کو شمال مشرق میں اپنی حدود سے متصل کچھ علاقہ حاصل ہوا جس میں گوٹی، گروم کونڈا اور اس کے قلعہ کے علاوہ چتل درگ کا ضلع شامل تھے۔ انگریزوں کو مغرب میں کنارا، جنوب مغرب میں وائی ناڈ، اور داراپورم کے اضلاع اور سری رنگا پٹنم سمیت مشرق کے دیگر دو اضلاع ملے۔ ریاست میسور کا بچا کچھا علاقہ قدیم حکمراں خاندان واڈیار کے کمسن بیٹے کو دے دیا گیا جس نے انگریزوں سے ماتحت امدادی معاہدہ کر لیا۔ ٹیپو کے خاندان کو ویلور قلعہ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ قیدی کی طرح رہے۔ اس طرح ریاست میسور ختم ہو گئی اور انگریزوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ اس فتح کو انگلینڈ میں بہت سراہا گیا اور اس سے گورنر جنرل ویلزلی کے وقار میں اضافہ ہوا۔ اسے مارکوئیس اور ہیرس کو بیرن کا عہدہ ملا۔ ڈبن ہٹن نے اس فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا 'فوجی، معاشی اور قیام امن کے نقطہ نظر سے میسور کی فتح کلائیو کے بعد انگریزی طاقت کی سب سے اہم فتح تھی۔'

22.4.5 ٹیپو سلطان کی شخصیت کا جائزہ (An Estimate of Tipu Sultan's Personality)

شیر میسور ٹیپو سلطان کی پیدائش نومبر 1750 میں حیدر علی اور فاطمہ کے گھر ہوئی۔ ابتداء سے ہی اس کی تعلیم و تربیت کا خاص دھیان رکھا گیا۔ عربی، فارسی، کنڑ اور اردو زبانوں پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس کی فوجی تربیت بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ وہ ایک عظیم جنگجو اور حیرت انگیز حوصلہ کا مالک تھا۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا انگریزوں نے بھی مانا۔ جب میسور پر انگریز قابض ہوئے تو وہ حیران رہ گئے کہ میسور کا کسان خوشحال تھا اور زراعت انگریزوں کے علاقوں سے کہیں بہتر حالت میں تھی۔ ایک اچھی اور منظم فوج تیار کرنے میں ٹیپو نے بڑی

محنت کی۔اپنی فوجوں کی یوروپی طرز پر ٹریننگ کا انتظام کیا جس کے لیے فرانسیسی افسران کی مدد لی گئی۔لیکن ان یوروپی افسروں کو مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھا۔حیدر علی کی طرح ٹیپو نے بھی بحری فوج پر خصوصی دھیان دیا۔1796 میں بحری فوج کا محکمہ تشکیل دیا گیا۔22 جنگی جہازوں اور 20 بڑے بیڑوں کی تیاری کا منصوبہ بنایا گیا۔منگلور،واجد آباد اور مولد آباد میں تین بندرگاہیں قائم کی گئیں۔حالانکہ حالات نے اس کے منصوبوں کو مکمل نہیں ہونے دیا۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں ٹیپو کو خاص دلچسپی تھی اور ان کا وہ سرپرست تھا۔ٹیپو کو ہندوستان میں راکٹ تکنیک کا موجد سمجھا جاتا ہے۔اس نے ایک ملٹری مینول تیار کیا جس میں راکٹ سے متعلق تفصیل فراہم کی گئی تھی۔اس علاوہ میسور میں سب سے پہلے ریشم کی پیداوار شروع کی۔ٹیپو ایک خود مختار حکمراں تھا لیکن وہ جمہوریت کا بڑا علمبردار اور عظیم سیاست داں تھا۔1797 میں اس نے سری رنگا پٹنم میں فرانس کے طرز پر جیکوبن کلب قائم کیا۔خود اس کا ممبر بنا اور اس موقع پر سلامی کے لیے 2300 گولے اور 500 راکٹ داغنے کا حکم دیا۔وہ خود کو 'سٹیزن ٹیپو' کہلواتا۔علاوہ ازیں سری رنگا پٹنم میں ٹری آف لبرٹی لگایا۔

ایک حکمراں کی حیثیت سے انتظامی امور کی انجام دہی میں اس کا شمار کامیاب افراد میں ہوتا ہے۔لیفٹنٹ مور نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ 'جب ایک شخص ایک اجنبی ملک سے گذرتے ہوئے دیکھے کہ وہاں فصلیں عمدہ ہیں،ملک میں آبادی اور صنعتیں زیادہ ہیں،نئے نئے شہر بس رہے ہیں ، تجارت ترقی پذیر ہے اور ہر شے پر مسرت اور شادمانی چھائی ہوئی ہے ، تو وہ قدرتی طور پر یہی کہے گا کہ عوام ایک باصلاحیت انتظامیہ کے زیر انتظام ہیں جس سے انہیں ترقی اور پھلنے پھولنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ایسی ہی ٹیپو کی ریاست کی تصویر۔' سر جان شور ٹیپو کے بارے میں لکھتا 'ٹیپو کے کسان محفوظ ہیں۔محنت کرنے کے لیے انہیں ترغیب دی جاتی ہے اور اس کا پھل بھی انہیں ملتا ہے۔ٹیپو کو اپنے فوجیوں کی وفاداری اور اعتماد حاصل ہے۔'

ریاست میسور کے حوالے سے ولکنس کا یہ قول بہت مشہور ہے 'حیدر ریاست قائم کرنے کے لیے پیدا ہوا اور ٹیپو اسے کھونے کے لیے۔' یہ واقعہ تو ہے مگر اس میں ٹیپو کی کوئی کمی یا اس کی صلاحیتوں پر کوئی سوالیہ نشان نہیں ہے۔حقیقتاً اس نے جن حالات کا سامنا کیا اور جن مشکلات سے اسے گذرنا پڑا یا بحیثیت مجموعی جنوبی ہند کی جو سیاسی صورت حال تھی اس کا تجزیہ کیے بنا ٹیپو کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی اور جب ہم ان تمام عناصر پر منصفانہ نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار اس کے حوصلے،عالی ہمتی، جفاکشی اور بیدار مغزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔غیرت وحمیت کے اس پیکر نے اپنی خودداری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔خود فنا ہو گیا مگر انگریزوں کی ماتحتی قبول کر کے وطن سے غداری اور ضمیر فروشی کا مرتکب نہیں ہوا۔وہ پہلا محب وطن تھا اور وطن کے لیے ہی قربان ہو گیا۔

کچھ مورخین نے اس پر تعصب کا الزام لگایا ہے اور مذہبی بنیاد پر بھید بھاؤ کو اس سے منسوب کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔اس نے اگر ہندو کرگ اور نائروں کو کچلا تو دوسری طرف مسلم موپلاؤں کی طاقت بھی دبائی۔اپنے علاقوں میں مندروں کی سرپرستی کی۔شرنگیری کے مندر کی مرمت اور شارداد یوی کی مورتی لگانے کے لیے رقم دی۔یہ مورتی و مندر ہندو سوراجیہ کے علمبردار مراٹھوں کے حملے کے دوران ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ٹیپو نے پالکی کے استعمال کو صرف عورتوں اور معذوروں کے لیے محدود کیا۔اس کے علاوہ اس نے ایک نیا

کلینڈر شروع کیا۔ حقیقتاً ٹیپو کی شخصیت ہمہ جہتی تھی اور بلاشبہ اس کا شمار ہندوستان کے اہم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

22.5 ریاست میسور کا نظم و نسق (Administration of the State of Mysore)

ٹیپو سلطان بھی اپنے تمام ہمعصر حکمرانوں کی طرح مطلق العنان فرمانروا تھا۔ یعنی تمام فوجی و غیر فوجی، سپاہی و عدالتی تمام اختیارات اسی کے پاس تھے۔ وہ خود ہی سپہ سالار تھا اور خود ہی قانون بنانے والا۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والا اور عوام کے حقوق کا خیال رکھنے والا راجہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن اُسے اپنے تمام کاموں کا حساب دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نظم و نسق کی بنیاد عوام کی فلاح و بہبود پر تھی۔

22.5.1 مرکزی انتظامیہ (Central Administration)

ٹیپو نئی اصلاحات اور تجربات کا شوقین تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا ہندوستانی حکمراں تھا جس نے مغربی روایت کو ہندوستانی عوام پر لاگو کرنے کی کوشش کی۔ ہر محکمہ کا ایک علیحدہ افسر ہوتا تھا۔ جس کے تحت کئی دیگر چھوٹے افسران معاونت کرتے تھے۔ یہ سب مل کر ایک بورڈ کی شکل میں کام کرتے تھے۔ ہر مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہوتا۔ اختلاف ظاہر کرنے کا حق سب کو تھا۔ فیصلہ اکثریت کی رائے سے کیا جاتا۔ تمام میٹنگوں کا ریکارڈ رکھا جاتا لیکن یہ ذہن میں رہے کہ آخری فیصلہ سلطان ہی کرتا تھا۔ وزیر کا عہدہ نہیں ہوتا تھا۔ سب سے بڑا افسر میر آصف کہلاتا تھا جو سلطان کو جواب دہ تھا۔ اس کے ماتحت 7 محکموں کے افسران ہوتے تھے۔ یہ افسران تھے۔

1. میر سید آصف کچہری : مالیات محکمہ
2. میراں کچہری : محکمہ فوج
3. میر میراں کچہری : محکمہ زرہ
4. میر صدر کچہری : توپ خانہ اور قلعہ کا نگراں
5. ملک التجار : وزیر تجارت
6. میر بام کچہری : بحری شعبہ کا ذمہ دار
7. میر خزانہ کچہری : خزانہ اور ٹکسال کا ذمے دار۔
8. ان کے علاوہ کئی دیگر محکمے بھی تھے مثلاً ڈاک اور جاسوسی، مویشی وغیرہ۔

22.5.2 صوبائی و مقامی انتظامیہ (Provincial and Local Administration)

1784 کے بعد ٹیپو نے اپنی پوری مملکت کو سات صوبوں میں تقسیم کر دیا جو آصف ٹکڑی کہلاتے۔ بعد میں ان صوبوں کی تعداد بڑھ کر 17 ہو گئی۔ ہر صوبہ میں دو مرکزی افسر ہوتے۔ آصف (غیر فوجی گورنر) اور فوجدار (فوجی گورنر) یہ دونوں ایک دوسرے کے نگراں کے طور پر کام کرتے تھے۔ صوبے ضلعوں میں اور ضلعے گاؤں میں منقسم تھے۔ مقامی انتظامیہ کا کردار پنچائتیں ادا کرتیں۔

22.5.3 مالگزاری (Land Revenue System)

حالانکہ ٹیپو نے زمین سے متعلق طریقہ کار حیدر علی کے زمانے کا ہی رکھا لیکن اس کو فعال بنانے کی کوشش کی۔اس نے جاگیرداری نظام کو ختم کیا اور کسانوں سے براہ راست تعلق قائم کیا۔بنا لگان والی یعنی 'انعام' زمین کو حکومت نے اپنے قبضہ میں لیا۔پولیگاروں (زمینداروں) کا پشتینی حق ختم کر دیا۔کسانوں کو زیادہ سے زیادہ زمین جوتنے کی ترغیب دی جاتی۔ہل اور مویشیوں کے لیے کسانوں کو رقم یا تقاوی دی جاتی۔لگان 1/3 سے 1/2 تک وصول کیا جاتا جو زمین کی قسم اور سینچائی کے حالات کے مطابق ہوتا۔

22.5.4 صنعت و حرفت (Commerce and Industry)

ٹیپو نے اندرونی و بیرونی تجارت کے فروغ میں خاص دلچسپی دکھائی۔اس نے اپنے گماشتے ملک سے باہر اہم شہروں میں مقرر کیے۔برما اور چین سے بھی تجارتی روابط استوار کیے۔ٹیپو نے صندل، چھالیہ، کالی مرچ، الائچی، سونا اور چاندی کی تجارت اور ہاتھی دانت کی درآمد براہ راست حکومت کے زیر انتظام رکھی۔اس نے اپنی ریاست میں گولہ، بارود، چینی، کاغذ، ریشمی کپڑا اور چھوٹے اوزاروں کی تیاری کے لیے کارخانے قائم کیے۔

22.5.5 فوجی تنظیم (Military Organisation)

ٹیپو نے اپنی فوجی ساخت یوروپی طرز پر رکھی۔فرانسیسی کمانڈروں سے تربیت کا انتظام کیا۔فوج کی تعداد کبھی یکساں نہیں رہی۔حیدر علی اور ٹیپو دونوں بحری فوج کی اہمیت سمجھتے تھے اور انہوں نے اس میں دلچسپی بھی لی۔مگر یہ انگریزوں کے مقابلہ میں غیر اہم تھی۔حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو نے اپنی فوج تیار کرنے میں جدید ترین ٹکنیک کا استعمال کیا لیکن سیاسی حالات اور سازشوں نے اس کی عسکری طاقت کو کمزور کر دیا۔

22.5.6 جنگی راکٹ (War Rockets)

ٹیپو سلطان نے فوج میں ایک باقاعدہ راکٹ بردار فوجی دستہ قائم کیا تھا جس میں پانچ ہزار تک فوجی تھے۔حیدر علی نے اپنی فوج میں 1200 تربیت یافتہ افراد بھرتی کیے تھے جو راکٹ لاوئچ کر سکتے تھے۔نشانہ تک پہنچنے کے لیے زاویہ کا تعین ڈائی میٹر سے کیا جاتا تھا۔راکٹ کے دونوں سرے دھار دار ہوتے جو دشمن کو کافی نقصان پہنچاتے۔ٹیپو نے ان تربیت یافتہ فوجیوں کی تعداد بڑھا کر پانچ ہزار تک کر دی تھی۔ان کا بخوبی استعمال ٹیپو نے اپنی جنگوں میں کیا۔میسور کی راکٹ ٹکنالوجی کو بعد میں انگریزوں نے ترقی دی۔ہندوستان کے آنجہانی صدر، میزائیل مین ڈاکٹر اے۔پی۔جے۔عبدالکلام کے مطابق ٹیپو سلطان دنیا کے سب سے پہلے جنگی راکٹ کا موجد تھا۔ان میں کے دو راکٹ جو سری رنگا پٹنم میں انگریزوں کو ملے تھے لندن کے رائل آرٹیلری میوزیم میں رکھے ہیں۔ٹیپو کی فوجی اہلیت کے بارے میں مورخین کہتے ہیں کہ وہ میدان جنگ میں اتنی برق رفتاری سے اپنی حیثیت بدلتا کہ لگتا وہ ایک ہی وقت میں کئی مورچوں پر برسرپیکار ہے۔وہ ہندوستان کے ان چنندہ حکمرانوں میں سے تھا جن کے ہاتھوں انگریزوں کو شکست کا مزہ چکھنا پڑا۔

22.5.7 بحریہ (Navy)

حیدر علی نے بحری فوج پر دھیان دیا تھا جسے ٹیپو نے مزید وسعت دی۔1786 میں ٹیپو نے اپنی بحریہ میں 20 جنگی جہاز 72 توپیں اور 62 توپوں پر مشتمل 20 بیڑے شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔1790 میں ایک باصلاحیت افسر کمال الدین کو میر بحر مقرر کیا اور شاندار بندر گاہیں قائم کیں۔ ٹیپو کی بحری انتظامیہ میں 11 کمانڈروں پر میر یم ہوتا تھا۔علاوہ ازیں میر یم کے ماتحت 30 ایڈمرل ہوتے جن میں سے ہر ایک کے پاس دو جنگی جہاز ہوتے۔ٹیپو کے جہازوں کا نچلا حصہ تانبہ کا ہوتا جو اس کی مضبوطی اور عمر میں اضافہ کرتا۔

22.5.8 سکے (Coins)

حیدر علی اور ٹیپو کے جاری کردہ سکے خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔انہوں نے اٹھارھویں صدی میں رائج مسکوکات میں سب سے شاندار سکے جاری کیے۔پگوڈا جنوبی ہندوستان میں طویل عرصہ سے چلن میں تھا۔حیدر علی نے اس میں فارسی علامتیں شامل کیں ،اس نے چاندی کا روپیہ اور بہت ہی کمیاب کچھ سونے کی مہریں بھی جاری کیں ،جن پر مغل بادشاہ شاہ عالم دوم کا نام اور اپنے نام کا پہلا حرف 'ح' کنندہ ہوتا ٹیپو نے اپنے باپ کے ان تینوں اقسام کے سکوں کو نئی تبدیلیوں کے ساتھ جاری رکھا۔اس کے سکے مختلف ناموں سے جاری ہوئے۔ مثلاً احمدی، صدیقی، فاروقی وغیرہ سونے کے، کاظمی، جعفری، باقری، خضری وغیرہ چاندی کے اور قطب، اختر، مشتری وغیرہ تانبہ کے سکے تھے۔ ٹیپو نے اپنے سکوں پر ہجری سن کی جگہ مولودی سن (پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا سن ولادت) کنندہ کرائے۔اس کے علاوہ ٹیپو نے سونے اور چاندی کے بڑے سکوں پر ہندوستانی سن کا لکھنا بھی شروع کیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹیپو کے اختراعی ذہن نے سکوں کے جاری کرنے میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

22.5.9 سلاطین میسور کی مذہبی پالیسی (Religious Policy of the Sultans of Mysore)

حیدر علی اور ٹیپو دونوں اپنی ذاتی زندگی میں کٹّر مسلمان تھے خصوصاً ٹیپو مذہبی امور ادا کرنے میں سخت پابند تھا لیکن اپنے عوام اور مملکت میں انہوں نے مذہبی رواداری قائم رکھی۔ ٹیپو نے مسجدوں کے ساتھ ساتھ مندروں کو بھی عطیات دیے۔اس کے بہت سے اہم عہدہ دار ہندو تھے۔ کرشناراؤ اس کا خزانچی تھا۔ شامیہ آئنگر اس کا وزیر ڈاک و پولیس تھا۔ پنڈت پورنیا میر آصف کے عہدہ پر مامور تھا۔ مول چند اور سوجن رائے مغل دربار میں ٹیپو کے نمائندے تھے۔اس کا چیف پیشکار بھی ایک ہندو صوبہ راؤ تھا۔

22.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

میسور ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی جس پر واڈیار خاندان حکمراں تھا۔حیدر علی ایک فوجدار کا بیٹا تھا اور بچپن سے ہی باپ کی موت کے بعد مشکلات میں گھر گیا۔لیکن اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پہلے فون میں داخل ہوا پھر دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے دربار میں اہم مقام حاصل کر لیا۔اور بالآخر اتنا طاقتور ہو گیا کہ 1761 میں میسور کا تخت اسے مل گیا۔اس وقت جنوبی ہندستان میں مراٹھے، نظام اور انگریز اپنے سیاسی تسلط کے لیے بر سرپیکار تھے۔حیدر علی اور میسور بھی اس رسہ کشی میں شامل ہو گیا۔انگریز اپنی تمام تر ریشہ دوائیوں اور طاقت

کے باوجود حیدر علی کو نہیں روک سکے۔انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان دو جنگیں ہوئیں جس میں حیدر علی کو واضح برتری حاصل رہی اور دونوں مرتبہ انگریزوں کو دب کر قلم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔1782 میں دوسری جنگ کے دوران حیدر علی کی موت ہوگئی جس کے بعد باگ ڈور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں آئی۔اس وقت تک علاقائی سیاست میں انگریزوں کا پلہ بہت بھاری ہوچکا تھا۔انہوں نے نظام حیدرآباد اور مراٹھوں کو ساتھ ملا کر ٹیپو کے خلاف محاذ بنالیا۔دو جنگیں ہوئیں۔مگر ٹیپو تنہا انگریزوں کا دشمن رہ گیا۔اس کی تمام تر ہمت و حوصلے اور کوششوں کے باوجود انگریز اسے شکست دینے میں کامیاب ہوگئے۔ٹیپو نے بیرونی ممالک سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔دوسری طرف انگریزوں نے آخری معرکہ کے وقت اس کے کئی اہم افسروں کو اپنی طرف ملالیا جس کے نتیجہ میں چار 14 مئی 1799 کو ٹیپو کی شہادت کے ساتھ میسور کے انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

22.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

کشاکش	:	کھینچا تانی
اقتدار	:	حکومت
یرغمال	:	دشمن کے کسی فرد کو ضمانت کے طور پر رکھنا
فریقین	:	دو مخالف فرد یا گروہ
تقاوی	:	کسانوں کی مدد کے لیے دی جانے والی رقم
گماشتے	:	ایجنٹ
موجد	:	ایجاد کرنے والا
پشتینی	:	نسلی، خاندانی

22.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

22.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. حیدر علی سے پہلے میسور کا حکمراں کون تھا؟
2. حیدر علی کی پیدائش کہاں ہوئی؟
3. حیدر علی نے کس کی مدد سے اپنی فوج کو یوروپی طرز پر تیار کیا؟
4. پہلی اینگلو میسور جنگ کب سے کب تک ہوئی؟
5. مدراس کی صلح کب ہوئی؟
6. دوسری اینگلو میسور جنگ کب سے کب تک ہوئی؟

7. تیسری اینگلو میسور جنگ کب سے کب تک ہوئی؟
8. چوتھی اینگلو میسور جنگ سے قبل ٹیپو نے کن بیرونی حکمرانوں سے مدد کے لیے رابطہ کیا تھا؟
9. ہندوستان میں سب سے پہلے راکٹ تکنیک کا استعمال کس نے کیا؟
10. شرنگیری کے مندر کی مرمت کے اخراجات کس میسور کے حکمراں نے دیے؟

22.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ایک ریاست کے بانی کی حیثیت سے حیدر علی کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔
2. پہلی اینگلو میسور جنگ اور مدراس کی صلح پر نوٹ لکھیے۔
3. سری رنگا پٹنم معاہدہ کی شرائط کیا تھیں؟
4. ٹیپو سلطان کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔
5. ٹیپو کے ذریعے راکٹ تکنیک کے استعمال پر ایک نوٹ لکھیے۔

22.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ریاست میسور کے نظم و نسق پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. پہلی اور دوسری میسور کی جنگوں پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. چوتھی میسور کی جنگ اور ٹیپو سلطان کی شہادت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

22.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ali B. Sheik, *English Relations with Haidar Ali*, Mysore, 1963.
2. __________, *Tipu Sultan*, National book trust India, 1972.
3. Brittlebank, Kate, *Tiger*: *The Life of Tipu Sultan*, Juggernaut, New Delhi, 2016.
4. _________, *Tipu Sultan's Search for Legitimacy: Islam and Kingship in a Hindu Domain*, Delhi, 1997.
5. Guha, Nikhiles, *Pre-British State System in South India*: *Mysore*, *1761–1799*, Calcutta, 1981.
6. Hasan, Mohibbul, *History of Tipu Sultan*, Aakar Books, New Delhi, 2006.
7. Kareem, C.K., Kerala under Haider Ali and Tipu Sultan, Ernakulam, 1973.
8. Wilson, John, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon & Schuster, London/ New Delhi, 2016.

اکائی 23۔ حیدرآباد

(Hyderabad)

اکائی کے اجزا

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 پس منظر

23.3 صوبہ دکن

23.4 ریاست حیدرآباد

23.4.1 حیدرآباد اور مراٹھا

23.4.2 نادر شاہ کا حملہ اور نظام

23.4.3 نظام الملک کے جانشین

23.5 اکتسابی نتائج

23.6 کلیدی الفاظ

23.7 نمونہ امتحانی سوالات

23.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

23.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

23.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

23.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید (Introduction)

جب مغل حکمرانوں کی گرفت اپنے صوبوں پر سے کمزور ہونے لگی تو سلطنت کے مختلف حصوں میں باحوصلہ قسمت آزماوں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں۔ان میں دکن کی ریاست حیدرآباد نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سبب ایک اہم مقام حاصل کیا۔ حیدرآباد کے نظام کا میسور، مراٹھا اور انگریزوں سے مسلسل تصادم ہوتا رہا اور جنوب میں بالادستی کی جنگ میں حالات کروٹیں بدلتے رہے، تقریباً دو صدیوں کا سفر طے کر کے یہ ریاست آزادی کے بعد ہندوستان میں ضم کردی گئی۔

23.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- حیدرآباد کے تاریخی پس منظر سے واقف ہوسکیں گے۔
- ریاست حیدرآباد کے قیام پر تبصرہ کرسکیں گے۔
- جنوبی ہند کی سیاست میں ریاست حیدرآباد کے حکمرانوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رقابت میں نظام الملک کے جانشینوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

23.2 پس منظر (Background)

جنوب کے مرکز میں واقع حیدرآباد، ہندوستان کی شاہی ریاستوں میں سب سے بڑی تھی۔1687 تک یہ علاقہ گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاست میں شامل تھا جو بہمنی سلطنت کی ایک جانشین ریاست تھی۔ مغل بادشاہ اورنگزیب نے اسے مغل ریاست میں شامل کرلیا اور اس کے ذریعے مقرر کردہ گورنر کے ذریعہ اس کا انتظام وانصرام کیا گیا۔1723 میں دکن کے مغل گورنر میر قمرالدین یا چن قلیچ خان جو نظام الملک آصف جاہ کے نام سے مشہور ہوا، نے مغل سلطنت سے خود مختاری ظاہر کرتے ہوئے اپنی آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔اس کے بعد سے 1948 میں ہندوستان کی آزادی کے بعد تک یہ سیاسی اہمیت کی حامل ایک عظیم ریاست بنی رہی۔

23.3 صوبہ دکن (Deccan Province)

دکن کا علاقہ مغل سلطنت کے عروج کے زمانہ میں اکثر مغل شہزادوں کے زیرِ نگیں رہا۔خود اورنگ زیب اپنی تخت نشینی سے قبل دکن کا ہی گورنر تھا۔اورنگ زیب کی موت کے بعد اس کے بیٹے بہادر شاہ اوّل نے 1708 میں ذوالفقار خاں کو دکن کا وائسرئے مقرر کیا۔ ذوالفقار خاں کا شمار طاقتور امرا میں ہوتا تھا۔وہ دربار کے ایرانی گروپ سے متعلق تھا۔وہ شیعہ تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کے کھنڈرات پر ایک شیعہ ریاست قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مراٹھوں کے حملوں کے سبب اس نئے شامل کیے گئے صوبے پر مغل بادشاہ کی گرفت بہت مضبوط نہیں تھی۔اپنے خواب کو پورا کرنے کے لیے ذوالفقار خاں نے مراٹھوں سے خفیہ معاہدہ بھی کر

رکھا تھا لیکن دکن کا سارا انتظام وہ اپنے نائب داؤد خاں کے ذریعہ چلاتا رہا۔ یہ وہ دور تھا جب دربار میں امراء کے مختلف گروپ اپنے مفاد کے لیے بادشاہوں کو کٹھ پتلی بنانے کی کوشش میں مصروف تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے جال بنے جارہے تھے۔ اسی چپقلش میں 1713 میں فرخ سیر نے ذوالفقار خاں کو قتل کرادیا۔

23.4 ریاست حیدرآباد (Hyderabad State)

ذوالفقار خاں تو ختم ہوگیا لیکن ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنے کا خواب میر قمرالدین کے ہاتھوں پورا ہوا۔ یہ دربار کے تورانی گروپ کے امراء سے متعلق تھا اور تاریخ میں نظام الملک کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کا دادا خواجہ عابد شیخ الاسلام سترھویں صدی میں بخارا سے ہندوستان آئے اور مغل دربار سے منسلک ہوگیے۔ نظام الملک کا باپ غازی الدین فیروز جنگ بھی اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اس نے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ خود نظام الملک نے 13 سال کی کم عمری میں ایک چھوٹا عہدہ حاصل کرلیا۔ اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے انہوں نے جلدی ہی ترقی کی اور چین قلیچ خاں کا خطاب حاصل کرلیا۔ 1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے وقت وہ بیجاپور میں تھا اور جب اورنگزیب کے بیٹوں کے درمیان جانشینی کی جنگ چھڑی تو ہوشیار چن قلچ خاں قطعی طور پر غیر جانب دار رہا۔ بہادر شاہ اوّل نے تخت نشینی کے بعد 9 دسمبر 1707 کو اسے اودھ کا گورنر اور گورکھپور کا فوجدار مقرر کیا۔ کچھ عرصہ عوامی زندگی اور سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہا لیکن بہادر شاہ اول کے آخری دور میں وہ دوبارہ فعال ہوگیا۔ بہادر شاہ اول کی موت کے بعد مغل شہزادوں میں ایک بار پھر جانشینی کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اس بار چین قلیچ خاں نے جہاندار شاہ کے مقابلے میں فرخ سیر کی حمایت کی۔ اس کی کوشش رنگ لائیں تخت فرخ سیر کو ملا۔ اپنی طرفداری کے بدلے انعام کے طور پر بادشاہ نے چین قلیچ خاں کو خانخاناں اور نظام الملک بہادر جنگ کے خطابات سے نوازا۔ ساتھ ہی دکن کے 6 صوبوں کا گورنر مقرر کیا۔

یہ صوبیداری ایک چابی جس کے ذریعے چین قلیچ خاں کے بلند ارادوں اور عزائم نے آزاد ریاست قائم کرنے کے خواب کو پورا کیا۔ لیکن اسے دکن میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ دو سال بعد 1715 میں دہلی بلالیا گیا۔ لیکن اسی دو سال کے عرصہ میں اس نے جنوب میں اپنے سب سے مضبوط دشمن مراٹھوں کو قابو میں کرنے کی تدبیریں کیں۔ نظام بہترین سیاسی مدبر تھا وہ جانتا تھا کہ مراٹھے اس کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہیں وہ ان کی کمزریوں سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے ان میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیریں کیں۔ مراٹھا سرداروں کو ساہو کے خلاف بھڑکایا۔ چوتھ کی رقم روک دی۔ لیکن اسی درمیان اسے دہلی واپس جانا پڑا۔ جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب امراء حکمرانوں پر غالب آرہے تھے۔ مختلف گروپ اپنی مرضی سے کٹھ پتلی بادشاہ کو تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔ مغل دربار سازشوں کا اڈا بن کر رہ گیا تھا۔ نظام الملک بھی اسی کا شکار ہوا۔ حسین علی کو جو مشہور سید برادران میں سے ایک تھا۔ اس کی جگہ دکن کا گورنر بنایا گیا۔ نظام الملک کو پہلے مرادآباد بھیجا گیا لیکن جلد ہی اسے بہار بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ابھی فیصلہ پر عمل درآمد ہوا بھی نہیں تھا کہ دہلی کی سیاست نے پھر رنگ بدلا اور فرخ سیر کی حکومت ختم ہو گئی۔ دربار میں سید برادران کا طوطی بولتا تھا۔ اب اسے مالوہ جانے کو کہا گیا۔ لیکن اس نے یہ شرط رکھی کہ اسے مالوہ سے کہیں اور نہیں بھیجا جائے

گا۔ یقین دہانی کے بعد وہ مالوہ پہنچ گیا۔ مالوہ میں اس کو اپنے عزائم دکھانے کا موقع ملا۔ اس کی سر گرمیوں سے سید برادران حسد محسوس کرنے لگے وہ اس کی طاقت سے بھی خوفزدہ تھے۔ انہوں نے نظام الملک کو مالوہ سے واپس بلایا اور دلاور خاں کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا۔ نظام الملک نے فیصلہ کی مخالفت کی۔ دلاور خاں اور عالم خاں کو الگ الگ جنگوں میں قتل کر دیا۔ پہلے اسیر گڑھ پر قبضہ کیا پھر برہان پور بھی فتح ہو گیا۔ اب حسین علی خود فوج لے کر دکن جانے کے لیے نکلا لیکن راستہ میں 8 اکتوبر 1723 کو خنجر گھونپ کر قتل کر دیا گیا۔ اس کا بھائی سید عبداللہ بھی شکست کھا کے مارا گیا۔ اس طرح نہ صرف دو طاقتور امیر سید برادران کا دور ختم ہوا بلکہ نظام الملک کے لیے بھی دکن کا راستہ صاف ہو گیا۔

تصویر 23.0۔ چن قلیچ خان آصف جاہ اول

Source: https://en.wikipedia.org/wiki/Nizam-ul-Mulk,_Asaf_Jah_I#/media/File:Asaf_Jah_1.jpg

1723 میں نظام الملک دوبارہ دکن کا صوبیدار مقرر ہو گیا۔اس بار بھی وہ تقریباً دو سال تک دکن میں رہا اس پورے عرصے میں وہ اپنی طاقت کو بڑھانے مراٹھوں کو کمزور کرنے اور ریاست کی معاشی فلاح کے لیے کام کرتا رہا۔1722 میں امین خاں کی موت پر اسے مغل دربار میں وزیر مقرر کر دیا گیا۔اور وہ دکن سے دلی منتقل ہو گیا۔ یہاں کا حال خراب تھا۔ نظام الملک نے اصلاح کی کوششیں کیں لیکن اس کے سخت نظم وضبط اور حالات کو سبز بنانے کی سعی رائیگاں گئی۔ بادشاہ اور اس کے خوشامدی درباریوں نے اسے بددل کر دیا۔وزیر کی حیثیت سے اس نے دکن کی صوبیداری میں مالوہ اور گجرات کا اضافہ کر دیا تھا۔حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی دیکھ کر نظام الملک بادشاہ کو بتائے بغیر دکن واپس لوٹ گیا۔اس عمل سے محمد شاہ کو غصہ آیا اور اپنی توہین سمجھ کر اس نے فوراً مبارز خاں کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ نظام الملک کو زندہ یا مردہ دربار میں بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے۔لیکن نظام الملک زیادہ طاقتور تھا اس نے اکتوبر 1724 میں شکور کھیڑا کی جنگ میں مبارز خاں کو شکست دے کر مار ڈالا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی محمد شاہ کے پاس بھجوا دیا۔ بادشاہ بے بس تھا حالات پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا ۔ناچار اس نے اپنی حیثیت بنائے رکھنے کے لیے نظام الملک کو آصف جاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا صوبیدار مقرر کر دیا۔اس طرح دکن میں آزاد ریاست حیدر آباد کی بنیاد پڑی۔ شہر حیدر آباد اس کی راجدھانی قرار پایا۔ یہ زور بازو سے قائم کی ہوئی ریاست بیسوی صدی میں ہندوستان کی آزادی تک نظام الملک کے خاندان کی سربراہی میں رہی۔

23.4.1 حیدرآباد اور مراٹھا (Hyderabad and the Marathas)

نظام الملک کے سامنے جنوبی ہند کی سب سے بڑی طاقت مراٹھا ایک ایسا مسئلہ تھے جن سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ پیشوا باجی راؤ کی قیادت میں مراٹھا افواج کے حوصلے بلند تھے وہ ہر ممکن طور پر حیدر آباد سے چوتھ اور سردیس مکھی وصول کرنا چاہتے تھے۔حیدر آباد کی طاقت کو بڑھنے سے روکنا ان کے لیے تھا بھی ضروری،دوسری طرف نظام بھی ان سب حالات سے واقف تھا۔دکن کی صوبیداری کے اپنے پہلے اور دوسرے دور میں اس نے مراٹھوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔اب بھی وہ اسے ایک کارگر ہتھیار سمجھتا تھا۔ساتھ ہی وہ طاقت کا استعمال کر کے مراٹھوں کا زور توڑنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔اپنی خود مختاری اور آزادی کے راستہ میں رکاوٹ سمجھ کر ان کا سد باب کرنا بھی اس کے لیے اہم تھا۔ چنانچہ اس نے تدبیر اور طاقت دونوں کا استعمال کیا۔اس نے مراٹھوں کو چوتھ اور سردیس مکھی دینے سے انکار کر دیا۔اور مراٹھا سپہ سالار ترمبک راؤ کو پیشوا باجی راؤ کے خلاف بھڑکایا یہ جانتے ہوئے کہ وہ مراٹھا سرزمین پر فتح حاصل نہیں کر سکتا اس نے کولہا پور کیمپ کو اکسا کر مراٹھوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کی۔جب 26-1725ء میں باجی راؤ اول کرناٹک گیا ہوا تھا تو اس نے سمبھوجی کو فوجی مدد دی اور ساہو کو اپنی بالادستی قبول کرنے کے لیے لگ بھگ تیار کر لیا تھا کہ پیشوا نے واپس آکر حالات کو سنبھال لیا۔ نظام الملک اور پیشوا کے درمیان 7،مارچ 1728 کو پال کھیڑا کے قریب جنگ ہوئی جس میں حیدر آباد کی فوجوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔دونوں فریقوں میں منگی شوگاؤں کا معاہدہ قرار پایا معاہدہ کے مطابق:

1. نظام ساہو کو سردیس مکھی اور چوتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا
2. مستقبل میں کبھی شمبھوجی کو مدد نہ دینے کا وعدہ کیا۔

3. جیتے ہوئے مراٹھا علاقے واپس کرنے ہوں گے۔

4. دونوں ایک دوسرے کے قیدی چھوڑنے پر راضی ہو گئے۔

پال کھیڑا کی جنگ اور منگی شوگاؤں کے معاہدہ نے مراٹھوں کو فوقیت بخش دی اور مشرق اور جنوب میں ان کے آگے بڑھنے کے راستے کھل گئے یہی نہیں ان کا اندرونی خلفشار بھی ختم ہو گیا۔ سمبھوجی جو ابھی تک پر اُمید تھا اور اقتدار کے لیے مسلسل سازشیں و کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی ساہو کا اقتدار قبول کر لیا چنانچہ دونوں میں اپریل 1731 میں وارنا کا معاہدہ ہو گیا۔ جس کے بعد اندورنی رسہ کشی تھم گئی۔ پیشوا باجی راؤ اول اپنی شمالی مہم میں اچانک دہلی پہنچ گیا۔ محمد شاہ نے نظام کو دکن سے بلایا اور وہ جولائی 1737 میں دہلی پہنچا۔ محمد شاہ نے اسے انعام سے نوازا اور مالوہ کی طرف بھیج دیا لیکن بھوپال کے نزدیک باجی راؤ اول نے اسے کراری شکست دی اور جنوری 1738 میں دونوں میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے مطابق نظام نے ایک بار پھر سردیس مکھی اور چوتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ وہ مالوہ کی صوبیداری اور نرمدا اور چنبل کے درمیان کا علاقہ باجی راؤ کو دینے پر راضی ہو گیا۔ ان سب واقعات نے باجی راؤ کو بڑا حوصلہ بخشا۔ کیوں کہ اس نے نہ صرف ایک اچھے سیاست داں کی حیثیت میں اپنا لوہا منوایا بلکہ فوجی قوت کا بھی سب سے اعتراف کرا لیا۔

23.4.2 نادر شاہ کا حملہ اور نظام (Nadir Shah's Invasion, and the Nizam)

نادر شاہ ایران کا حوصلہ مند حکمراں تھا جس نے اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ ملک کو افغانوں کی گرفت سے آزاد کرایا تھا۔ 1738 میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ اس اچانک حملہ سے گھبرا گیا اس نے حیدر آباد سے نظام کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ نظام مدد کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ 24 فروری 1739 کو محمد شاہ اور نادر شاہ کے درمیان کرنال کی جنگ ہوئی۔ جو صرف تین گھنٹے چلی اور مغل فوج کو شکست ہوئی۔ محمد شاہ نے نادر شاہ سے بات چیت اور صلح نامہ پر گفتگو کے لیے نظام الملک کا انتخاب کیا۔ ایک طرح سے اس نے امن کا سفیر بن کر نادر شاہ سے بات چیت شروع کی۔ نظام الملک کی کوششوں سے نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ مغل بادشاہ اسے 50 لاکھ روپیہ دے 20 لاکھ فوراً اور 10-10 لاکھ کی تین قسطیں نادر شاہ کی واپسی کے سفر میں لاہور، اٹک اور کابل میں دی جائیں گی۔ نادر شاہ نے نظام الملک سے پوچھا تھا کہ تم جیسے بہادروں کے ہوتے ہوئے مراٹھوں نے کس طرح مغل سلطنت کے اتنے بڑے حصّے پر قبضہ کر لیا تو اس نے جواب دیا تھا کہ درباری گروہ بندی اور امراء کی مفاد پرستی نے حکومت کو اس حال تک پہنچا دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ انہی حالات سے بددل ہو کر وہ دہلی چھوڑ کر دکن چلا گیا تھا۔ نظام الملک کے اس جواب نے مغل سلطنت کی سیاسی کمزوری نادر شاہ پر واضح کر دی تھی اور اس کا ثبوت بھی اسے جلد ہی مل گیا۔

نادر شاہ کے ساتھ جس خوش اسلوبی سے نظام الملک نے معاملات طے کرائے تھے۔ نظام الملک کی بڑی کامیابی تھی جس سے مغل بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً نظام الملک کو میر بخشی کا عہدہ بخش دیا کیونکہ کرنال کی جنگ میں خاں دوراں کی موت سے وہ خالی ہو گیا تھا۔ لگ رہا تھا کہ حالات پرسکوں گذر جائیں گے مگر مغل امراء کی اخلاقی گراوٹ خود غرضی اور سازشی ذہنیت نے دلی کو تباہی کے دھانے میں دھکیل دیا۔ سعادت خاں جو خود میر بخشی کا عہدہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس نے جب دیکھا کہ یہ منصب بادشاہ نے نظام الملک کو دے دیا ہے تو اس

نے نادر شاہ سے کہا کہ اگر وہ دلی پر حملہ کر دے تو 23 لاکھ نہیں 23 کروڑ روپیہ ملے گا۔ یہ سنہرا موقع نادر شاہ نے نہیں گنوایا اور فوراً اپنی فوجوں کو دلی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جس کے بعد دلی میں قتل عام کا واقعہ ہوا۔

نظام الملک دو مرتبہ نادر شاہ سے ملا۔ نادر شاہ کو ہندوستان کے تخت کی بھی پیش کش کی جسے اس نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ واپس دکن چلا گیا اور اپنی موت 1748 تک حیدر آباد میں ہی رہا جس کا وہ اب آزاد و خود مختار حکمراں بن چکا تھا۔ نظام الملک ایک ذہین سیاسی مدبر اور جرات مند فوجی سپہ سالار تھا اپنے ہمعصروں میں ذاتی لیاقت، حکمرانی کی اہلیت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں میں وہ سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے ہمیشہ مغل بادشاہ سے اپنی وفاداری کا نہ صرف اعلان کیا بلکہ مختلف مشکل مواقع پر اس کی مدد کے لیے حیدر آباد سے دلی کا سفر بھی طے کیا۔ اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں سے اس نے اپنے حکمرانی والے علاقوں میں امن و چین قائم کیا اس نے ایک طرف ڈاکوؤں پر قابو پایا تو دوسری طرف سرکش سپہ سالاروں اور خود غرض افسران پر بھی لگام لگائی۔ زراعت و تجارت کی ترقی اور فلاح میں ذاتی دلچسپی لی اس کا ٹیکس سسٹم بہت متوازن تھا جس کے سبب کسانوں کو خوشحالی ملی اور عوام کا معیارِ زندگی بہتر ہوا۔ مذہبی رواداری اس کے بہترین خصائص میں سے ایک تھی اس نے پورٹ چند کو اپنا دیوان مقرر کیا اور ہندوؤں کے ساتھ مساوی سلوک کیا۔

23.4.3 نظام الملک کے جانشین (Successors of Nizam-ul Mulk)

2 مئی 1748 کو حیدر آباد میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ناصر جنگ تخت نشین ہوا لیکن اس میں اور اس کے بھتیجے یعنی نظام الملک کے پوتے مظفر جنگ میں گدی کے لیے جد وجہد شروع ہوگئی۔ ناصر جنگ کے خلاف مظفر جنگ مدد حاصل کرنے کے لیے مراٹھوں کے پاس گیا۔ وہاں اس کی ملاقات چندا صاحب سے ہوئی جو کرناٹک کے نواب کا داماد تھا۔ اور خود اس وقت مراٹھوں کی قید میں تھا وہ خود کو کرناٹک کا نواب بننے کا خواہش مند تھا یہاں مظفر جنگ اور چندا صاحب نے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سمجھوتہ کیا۔ مراٹھوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر چندا صاحب آزاد کر دیا۔ ان دونوں کی مدد فرانسیسی کرنے کے لیے تیار ہوگئے اور ڈوپا کی مدد سے چندا صاحب نے اپنا مقصد پورا کیا۔ اس صورتِ حال کو بھانپ کر انگریزوں نے فوراً حیدر آباد میں ناصر جنگ اور کرناٹک میں محمد علی کو مدد دینی شروع کردی، یہ واقعہ تاریخ میں دوسری کرناٹک جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس میں انگریز اور فرانسیسی آمنے سامنے تھے۔ دونوں کا مقصد علاقہ میں اپنی بالادستی قائم کرنا تھا اور دونوں نے اس کے لیے مقامی حکمرانوں کو آلہ کار بنایا تھا۔ یعنی تخت کے دعویداروں کی مدد کر کے اپنے لیے فائدہ اُٹھانا۔

چنانچہ اسی کے تحت فرانسیسی افواج نے مظفر جنگ جو حیدر آباد کا تخت حاصل کرنا چاہتا تھا، کی مدد کی تو انگریزوں نے اس کے حریف ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ ناصر جنگ نے انگریزوں کی مدد سے کرناٹک پر حملہ کر دیا اور چندا صاحب و مظفر جنگ جن کی مدد فرانسیسی فوجیں کر رہی تھیں شکست دی۔ مظفر جنگ نے ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن جنرل ڈوپلے نے ہمت نہیں ہاری اور ایک بار پھر مظفر جنگ کی حمایت میں ہتھیار اُٹھا لیے۔ 1750 میں اسی جد وجہد میں ناصر جنگ مارا گیا اور مظفر جنگ کا راستہ صاف ہوگیا۔ مظفر جنگ کو مغل بادشاہ نے بھی دکن کا صوبیدار

تسلیم کر لیا۔ فرانسیسوں کی اس مدد کے بدلے میں انعام کے طور پر مظفر جنگ نے جنرل ڈوپلے کو کرشاندی کے جنوب سے کرنول تک کے علاقے کا گونر بنا دیا۔ ساتھ ہی اسے ظفر جنگ بہادر کے خطاب سے بھی نوازا۔ مچھلی پٹنم سٹم اور کرائکل پر بھی فرانسیسی قبضہ منظور کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں حیدر آباد کی طرف سے ڈوپلے کو 23 ہزار روپیہ اور 16 ہزار روپیہ ماہانہ آمدنی کی جاگیر بھی دی گئی۔ مظفر جنگ کی مدت حکمرانی ایک سال ہی رہی اور وہ 1751 میں ایک حادثے میں مارا گیا۔ جس کے بعد نظام الملک کا ایک دیگر پوتا صلابت جنگ تخت نشین ہوا۔

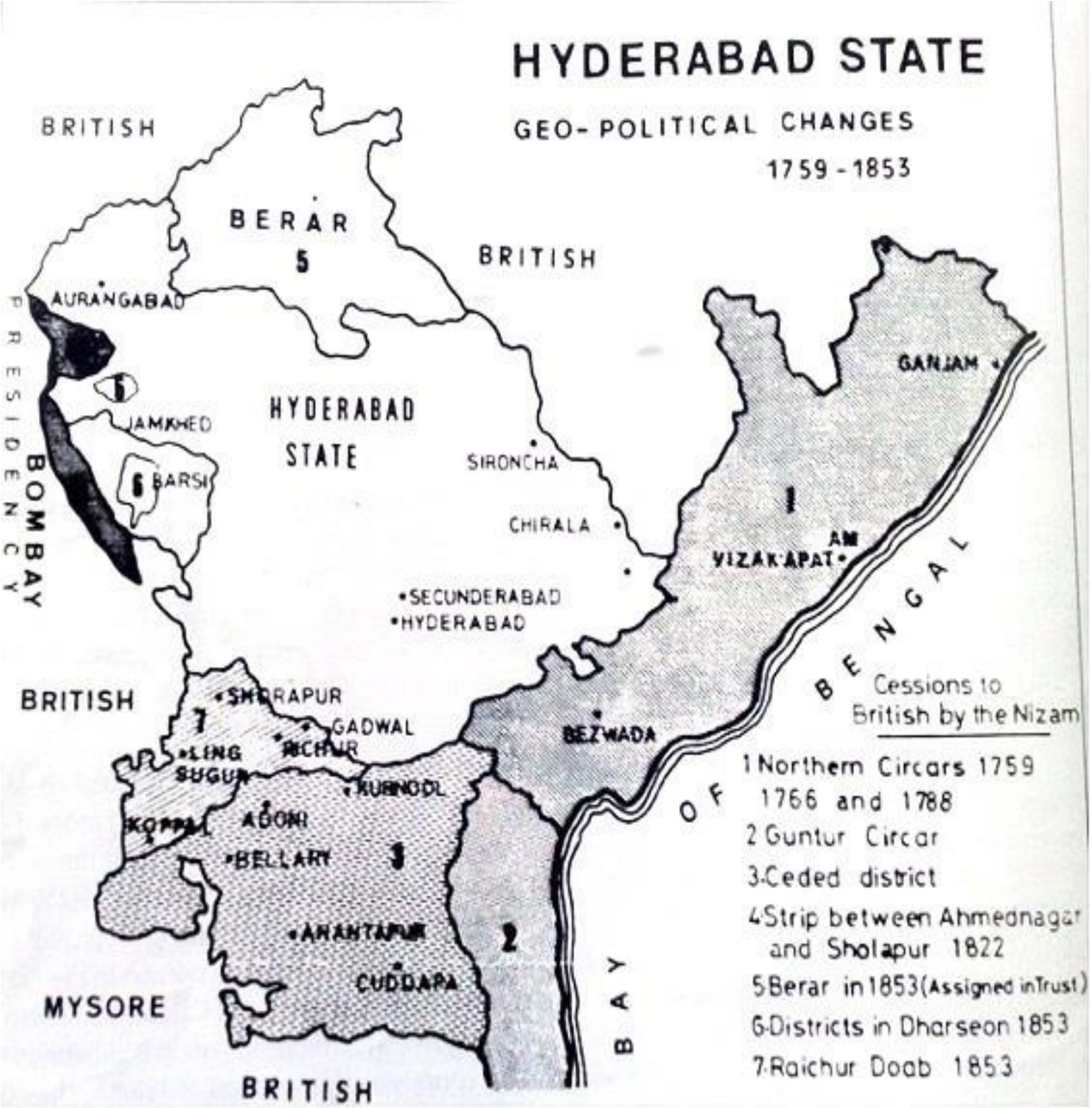

تصویر 23.1۔ حیدرآباد ریاست، زمینی سیاسی تبدیلیاں 1795 تا 1853۔

Source: https://www.facebook.com/jewelofnizamhyd/photos/a.104097338147443/185642476659595/?type=3https://www.facebook.com/jewelofnizamhyd/photos/a.104097338147443/185642476659595/?type=3

23.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دکن مغلوں کے زیر نگیں ایک اہم صوبہ تھا فرخ سیر نے چین قلیچ خاں نظام الملک آصف جاہ کو دکن کے 6 صوبوں کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد 1748 میں اپنی موت تک درمیاں کے کچھ عرصہ کو چھوڑ کر نظام الملک کا تعلق دکن کے ساتھ رہا۔ علاقہ میں ہونے والی بالادستی کی جنگ میں اس کا مراٹھوں کے ساتھ ٹکراو ہوا، کئی جنگیں ہوئیں اور بالآخر دونوں میں صلح ہوگئی۔ نظام نے حیدرآباد شہر کو راجدھانی بنا کر ریاست حیدرآباد میں امن وامان قائم کیا۔ اور علاقہ کا اچھا انتظام وانصرام کیا۔ دکن کی سیاست میں نظام اور مراٹھوں کے علاوہ انگریز بھی بہت فعال تھے، جس نے سیاست کی رسہ کشی میں اضافہ کر دیا تھا۔ نظام الملک دہلی کے مغل بادشاہ کا ہمیشہ وفادار رہا اور ہر مشکل وقت پر اس کی مدد کو پہنچا۔ نظام الملک کی موت کے بعد اس کے وارثین میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ جس میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مداخلت نے ان دونوں یورپین طاقتوں کو آپس میں متصادم کر دیا اور آخر کار انگریز اپنے پیر جمانے میں کامیاب ہوگئے۔

23.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

نادر شاہ	:	ایران کے صفوی بادشاہ کا جنرل جو بعد میں حکمراں کو ہٹا کر خود بادشاہ بنا۔
میر بخشی	:	مغل انتظامیہ میں وزیر جنگ
سید برادران	:	سید حسین علی اور سید عبد اللہ طاقتور مغل امراء میں سے تھے اور مغل بادشاہ فرخ سیر کے عروج اور زوال میں انہیں کا ہاتھ تھا۔
پیشوا	:	مراٹھا وزیر اعظم جو بعد میں اصل اقتدار کے مالک بن گئے۔

23.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. حیدرآباد بہمنی سلطنت کی کس جانشین ریاست کا حصہ تھا؟
2. اورنگزیب نے حیدراباد پر کس سال میں قبضہ کیا؟
3. حیدرآباد کی خود مختار ریاست کے بانی کا نام بتائیے۔
4. نظام الملک نے حیدرآباد کی خود مختار ریاست کی بنیاد کب ڈالی؟
5. پال کھیڑ کی جنگ کب ہوئی؟
6. نادر شاہ کہاں کا حکمراں تھا؟
7. میر بخشی سے کیا مراد ہے؟

8. سید برادران کے نام بتائیے۔

9. کس بادشاہ نے چین قلیچ خاں کو خانخاناں اور نظام الملک بہادر ختم جنگ کے خطابات سے نوازا؟

10. حیدرآباد کے کس حکمراں نے جنرل ڈوپلے کو کرشناندی کے جنوب سے کرنول تک کے علاقے کا گورنر بنادیا؟

مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مراٹھوں اور نظام کے درمیان ہوئی منگی شوگاؤں کے معاہدہ کی شرائط بیان کیجیے۔

2. نظام الملک کی شخصیت کی تین اہم خصوصیات بتائیے۔

3. چین قلیچ خاں کی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کیجیے۔

4. نادر شاہ کے حملہ کے دوران نظام الملک کا کیا کردار رہا؟ وضاحت کیجیے۔

5. حیدرآباد کے تعلق سے فرانسیسیوں اور انگریزوں کا تعلق بیان کیجیے۔

طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. حیدرآباد اور مراٹھوں کے تعلقات کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

2. نظام الملک نے حیدرآباد کی آزاد ریاست کس طرح قائم کی؟ تفصیلی روشنی ڈالیے۔

3. مئی 1748 کے بعد حیدرآباد کی سیاسی سرگرمیوں پر روشنی ڈالیے۔

23.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bawa, Vasant Kumar, *The Nizam between Mughals and British*, Chand, Delhi, 1986.
2. Regani, Sarojini, *Nizam-British Relations, 1724–1857*, Concept Publishing Company, New Delhi, 1963.
3. Ray, Bharati, *Hyderabad and British Paramountcy, 1858–1883*, OUP, Delhi, 1988.
4. Sherwani, H.K., *History of the Qutb Shahi Dynasty*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 1974.
5. Sherwani, H.K., *History of the Deccan, (1295–1724)*, Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 1973.
6. Yazdani, Zubaida, with Mary Chrystal, *The Seventh Nizam: The Fallen Empire*, Cambridge University Press, Cambridge, 1985.

اکائی 24۔ سیاست، سماج اور معیشت

(Polity, Society, and Economy)

اکائی کے اجزا

24.0 تمہید
24.1 مقاصد
24.2 پس منظر
24.3 سیاسی حالات
24.3.1 کمپنی کا نظم ونسق
24.4 معاشی حالات
24.4.1 زراعت
24.4.2 زرعی مالگزاری
24.4.3 تجارت اور صنعت
24.4.5 طرز زندگی
24.5 سماجی حالات
24.5.1 ہندو سماج
24.5.2 مسلم سماج
24.6 ثقافتی حالات
24.6.1 تعلیم
24.6.2 ادب اور دیگر فنون لطیفہ
24.7 مذہبی حالات
24.7.1 ہندو
24.7.2 مسلم

24.8 اکتسابی نتائج
24.9 کلیدی الفاظ
24.10 نمونہ امتحانی سوالات
24.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
24.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
24.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
24.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید (Introduction)

اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں مختلف صوبے مغلوں کے مرکزی اقتدار سے آزاد ہو رہے تھے اور خود مختار ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ان سیاسی تبدیلیوں نے مذکورہ علاقوں کے نظم ونسق اور سماجی و معاشرتی صورت حال کو بھی متاثر کیا۔ ساتھ ہی ان نئی ریاستوں نے معاشی سرگرمیوں پر بھی اثر ڈالا۔ حیدرآباد، میسور اور مراٹھوں کے آپسی تصادم، بنگال اور اودھ کا انگریزوں سے ٹکراو، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے، ان سب نے مل کر سماج کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ لیکن اس کے باوجود جو معاشرتی ڈھانچہ اور معاشی تگ و دو مغلیہ دور کی پہچان تھیں ان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ اس دور میں جو آزاد ریاستیں ہندوستان کے نقشے پر ابھریں وہ تنظیمی ڈھانچے کے اعتبار سے کچھ الگ خصوصیات کی حامل بھی تھیں۔ اس اکائی میں ہم ان ریاستوں کے بنیادی نظم ونسق کے ساتھ ساتھ حکمرانوں اور عوام کے تعلقات، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور ذرائع روزگار وغیرہ جیسے اہم موضوعات سے واقفیت حاصل کریں گے۔

24.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- علاقائی خود مختار ریاستوں کے انتظامی ڈھانچے کو سمجھ سکیں گے۔
- ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق اور انتظامی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس دور کے سماجی و معاشرتی حالات سے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔
- اس دور کی معاشی سرگرمیوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس دور کے ثقافتی اور مذہبی حالات پر روشنی ڈال سکیں گے۔

24.2 پس منظر (Background)

مغل حکمرانوں کا نظم و نسق اپنی ساخت کے اعتبار سے بڑی حد تک مرکزیت رکھتا تھا۔یعنی بادشاہ تمام اختیارات کا مالک ہوتا۔پورا ریاستی نظم اسی کے گرد گھومتا۔منصب اور عہدے اسی کی منشا اور مرضی پر منحصر ہوتے تھے۔اس صورت حالمیں کامیابی کا سب سے بڑا دار و مدار بادشاہ کی ذات ہوتی۔اس کے علاوہ امراء، جاگیر دار، منصب دار اور علاقائی گورنر اس تنظیمی ڈھانچے کی بنیاد ہوتے۔بادشاہ کے ساتھ ان کے مراسم،ایک دوسرے کے حقوق و اختیارات اور فائدے نقصانات کا توازن کامیابی و ناکامی میں اہم کردار ادا کرتا۔1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد یہ توازن بگڑ گیا۔جس کے سبب مغل بادشاہ کی طاقت اور اختیارات کم ہو گیے۔درباری گروہ بندی امراء کی آپسی چپقلش اور مالیاتی مسائل وغیرہ وہ اسباب تھے جن کے سبب بادشاہ اپنے گورنروں کی اس طرح سرپرستی، حفاظت کر سکے۔جس طرح 1707 سے پہلے تک کی جاتی تھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد ریاستیں قائم ہونے لگیں۔ان کے حکمراں اکثر مغل بادشاہوں کو نذرانہ پیش کرتے اور اپنی وفاداری کا اظہار کرتے تھے حقیقتاً وہ خود مختار تھے۔ان نئی ریاستوں کے تنظیمی ڈھانچے اور سماج میں وہ عناصر کارفرما تھے جو مغلیہ دور کی وراثت تھے اور اسی عہد کی عکاسی کرتے تھے۔

24.3 سیاسی حالات (Political Conditions)

اٹھارہویں صدی کی ریاستیں بڑی حد تک مغلوں کی مرکزی حکومت سے مشابہت رکھتی تھیں۔جس طرح مغل بادشاہ اپنی سلطنت کا مطلق العنان فرمانروا ہوتا تھا،اسی طرح ان ریاستوں کے نوابین و حکمراں اپنی اپنی ریاستوں کے مالک و مختار ہوتے تھے۔وہ اپنے دربار منعقد کرتے، شہری اور فوجی سربراہ کی حیثیت سے ریاست کی حفاظت اور امن وامان قائم کرتے، فوجوں کی سپہ سالار ہوتے اور نظم و نسق کے لیے مکمل ذمہ دار ہوتے تھے۔ان حکمرانوں نے شہری اور فوجی نظم و نسق میں اپنی ضرویات اور حالات کے مطابق کچھ تبدیلیاں ضرور تھیں۔مگر بحیثیت مجموعی مغلیہ دور کا ہی عکس رہا۔یہ ریاستیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین طرح کی تھیں۔پہلی وہ جو مغلوں کی براہ راست ماتحتی سے آزاد ہوئیں جیسے اودھ، بنگال، اور حیدرآباد، دوسری وہ آزاد ریاستیں جو مغلوں کے اپنے صوبوں پر سے کنٹرول کی کمی کا نتیجہ تھیں جیسے میسور اور تیسری قسم ان ریاستوں کی تھی جو مغلوں کے خلاف بغاوت کے سبب وجود میں آئی تھیں۔اسی لیے ان کے حکمرانوں کا مغل بادشاہوں سے تعلق بھی جداگانہ تھا۔ان کے ذریعہ قائم کیے گئے سیاسی نظم و نسق میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔

جیسا کے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مغل بادشاہ کی اہمیت کو ان ریاستوں نے تسلیم کیا تھا۔یہاں تک کہ مراٹھا بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکے۔لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ریاستی معاملات میں مکمل اختیارات ان کے حکمرانوں کے ہاتھ میں ہی ہوتے تھے اور اس میں مغل بادشاہ کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ان حکمرانوں کے تحت جو سیاسی ڈھانچہ تشکیل ہوا وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے علاقائی تھا اور زمینداروں، تاجروں، مقامی جاگیر داروں اور سرداروں کے تعاون سے کام کرتا تھا۔یہ ریاستیں سرکاروں یا ضلعوں میں منقسم ہوتیں جن کے نظم و نسق کی ذمہ داری فوجدار پر ہوتی۔سرکار پرگنوں میں تقسیم ہوتی اور ہر پرگنہ میں شق دار، پوتدار، عامل اور بنکچی ہوتے تھے۔شق دار انتظامیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔

شہروں میں امن وامان کے ذمے دار کوتوال ہوتے تھے۔ صدر مذہبی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا اور عامل و قاضی اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ محصول کی ذمہ داری عامل پر ہوتی اور بتیکچی اس کے ساتھ منسلک تھا۔ پوتدار یا خزاندار کاشتکاروں سے رقم وصول کرکے خزانہ میں جمع کرتا تھا جب کہ وقائع نویس واقعات وحالات کا ریکارڈ رکھتا تھا۔

24.3.1 کمپنی کا نظم ونسق (Company's Administration)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے ساتھ جب سیاسی اقتدار ہاتھ میں لیا تو نظم ونسق میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انتظامیہ کی تشکیل اس طرح کی گئی جس سے انگریزی مفاد کے حصول میں آسانی ہو۔ آغاز میں ہندوستان کی حکومت چلانے کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹروں کا ایک بورڈ تھا جو برطانیہ سے ہی ہندوستانی حکومت کی نگہداشت کرتا تھا۔ ہندوستان میں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں گورنر مقرر ہوتے تھے۔ 1773 میں برطانوی پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا جس کے تحت بنگال کے گورنر کو گورنر جنرل کا عہدہ دے کر کلکتہ اور مدراس کے گورنر اس کے ماتحت کردیے گئے۔ اور اس کی مدد کے لیے 4 رکنی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ 1784 میں انگریزوں نے پٹس انڈیا ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل کے ممبران کی تعداد گھٹا کر 3 کردی گئی۔ ساتھ ہی برطانیہ میں ایک بورڈ آف کنٹرول قائم کیا گیا جو ہندوستان میں کمپنی کی حکومت پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اُس کے ممبر برطانوی کیبینٹ کے ممبر ہوتے۔ (سکریٹری برائے ہند اور وزیر معاشیات) 1793 کے چارٹر ایکٹ نے ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جب کہ 1813 کے چارٹر ایکٹ کے ذریعہ کمپنی کو ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے 1 لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنے کی ہدایت دی گئی۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ نے صوبوں سے قانون بنانے کا اختیار چھین لیا۔ 1853 کے ایکٹ کے ذریعہ بنگال میں ایک نائب گورنر اور گورنر جنرل کی کونسل میں 6 زائد ممبران مقرر ہوئے۔ 1858 میں کمپنی کا بورڈ آف ڈائیرکٹرس ختم کردیا گیا اور اس کی جگہ انگلینڈ میں سکریٹری برائے ہند اور ہندوستانی کونسل کے تحت ہندوستان کی حکومت آگئی۔ ہندوستان میں مرکزی حکومت، گورنر جنرل اور اس کی کونسل پر مشتمل تھی جبکہ صوبوں میں گورنر اور اس کی کونسل حکومت کے ذمہ دار تھے۔

عدلیہ: انگریزوں نے ہندوستان میں ایک جدید عدالتی نظام قائم کیا جس کے تحت چھوٹی و بڑی دیوانی و فوجداری کی عدالتیں وجود میں آئیں۔ انگریزوں نے اپنے زیر نگیں علاقوں میں 'قانون کی حکومت' کو نافذ کیا۔ اس میدان میں وارن ہیسٹنگز کی خدمات قابل ستائش ہیں جنہیں ہم مندرجہ ذیل نکات کی روشنی میں بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

1. 1772 میں ہر ضلع میں ایک دیوانی اور ایک فوجداری عدالت قائم کی گئی۔ دیوانی عدالت نے کلکٹر، چیف جسٹس کے فرائض انجام دیتا تھا جب کہ فوجداری عدالت ایک ہندوستانی افسر کے ماتحت ہوتی جس کی مدد کے لیے ایک قاضی اور ایک مفتی کی تقرری کی جاتی تھی۔
2. کلکتہ میں ایک صدر دیوانی عدالت اور ایک صدر فوجداری عدالت قائم کی گئی۔ ضلع کی دیوانی و فوجداری عدالتوں کے مقدمے آخری فیصلوں کے لیے صدر عدالتوں میں جاتے تھے۔

3. دیوانی مقدمات کے فیصلے فریقین کے مذہب و عقیدے کے بنیاد پر ہوتے۔یعنی مسلم کے لیے اسلامی قانون اور ہندوؤں کے لیے ہندو قانون کی پیروی کی جاتی تھی لیکن فوجداری مقدمات اسلامی قوانین کے مطابق فیصل کیے جاتے۔
4. ججوں کی تنخواہیں مقرر کردی گئیں اور تحائف و نظرانے لیناان کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔
5. اس کے علاوہ عدالتوں کی کاروائی رکھنے کاانتظام کیا گیا۔فیصلوں کے لیے کچھ مدت مقرر کی گئی اور سخت جرمانے بند کیے گئے۔
6. قرض داروں کے مفاد کو مد نظر رکھ کر قانون بنائے گئے اور ہندو مسلم دونوں طبقوں کے قوانین کے مجموعے تیار کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

1773 میں ریلویلیٹنگ ایکٹ کے ذریعہ کلکتہ میں سپریم کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ہیسٹنگز کے بعد کارنوالس نے بھی اس میدان میں اصلاحات کیں ۔اس نے مختلف نوعیت کے قوانین کے الگ الگ مجموعہ تیار کرائے ،انتظامیہ اور عدلیہ کے دائرہ اختیار کو علاحدہ کیا اور سرکاری ملازمین کواپنے کاموں کے لیے عدلیہ کے سامنے جوابدہ بنایا۔

پولیس: پولیس کے نظام کا آغاز وارن ہیسٹنگز کی دین ہے۔اس نے سب سے پہلے تھانہ داروں کی تعیناتی کی۔لیکن اسے کامیابی نہیں ملی اور 1781 میں اس نے منصوبہ ترک کر دیااور پہلے ہی کی طرح مقامی زمین دار یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے۔بعد میں کارنوالس نے مختلف علاقوں میں داروغہ کی سربراہی میں تھانے قائم کیےاور ہر تھانے میں 15 سے 20 سپاہی مقرر کیے۔لیکن کارنوالس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی جس کا بڑاسبب سپاہیوں کی کمی تھی اور مزید برآں داروغہ بد عنوان اور رشوت خور ثابت ہوئے۔چنانچہ 1807 میں پولیس کا کام پھر سے مقامی زمین داروں کو ہی دے دیا گیا۔اس نظام کو سب سے پہلے کامیابی سے نافذ کرنے کا سہرا چارلس نیپیر کے سر ہے جس نے 1843 میں سندھ میں اس کی شروعات کی۔اس نے مجسٹریٹوں اور پولیس سپریٹنڈنٹ کے کاموں کوالگ الگ کیا۔سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کیااوران میں ڈسپلین قائم کیا بعد میں دوسرے علاقوں میں بھی یہ نظام قائم کر دیا گیا۔یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ چاہے حکومت ہو یاانتظامیہ اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار وسیع ہو، مضبوط ہو اور معاشیات سمیت دیگر تمام شعبہ برطانیہ کے مفاد میں کام کریں۔ہندوستانی باشندوں کی فلاح وبہبود کو نظر انداز کیا گیا۔یہ الگ بات ہے کہ انگریزی نظام نے بالآخر ہمارے ملک میں انتظامی ترقی کی راہ ہموار کی۔

24.4 معاشی حالات (Economic Conditions)

اٹھارویں صدی کا ہندوستان متضاد معاشی حالات کا شکار تھا۔ایک طرف امرا کا دولت مند طبقہ عیش پرستی کی زندگی جی رہا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی آبادی غربت کی اس حالت میں زندگی گذار رہی تھی جہاں بنیادی ضرورتیں بھی پوری کر پانا مشکل ہو رہا تھا جاگیر دار وسائل سے مالامال تھااور کسان ظلم واستحصال سے پریشان تھا۔عام انسان کی زندگی بے حد مشکل تھی۔فوجوں کی مستقل نقل وحمل اور مختلف سیاسی قوتوں کے آپسی ٹکراؤ سے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر خراب اثرات مرتب ہوئے تھے لیکن سب سے زیادہ معیشت کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔اٹھارویں صدی کے اواخر تک شہری مرکز زوال پذیر تھے۔مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی نے آگرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بے روزگاری

بے انتہا بڑھ گئی تھی۔ غریبوں کی جھونپڑیوں پر چھتیں نہیں تھیں۔ کاریگر اور مزدور ہنر مند ہوتے ہوئے بھی بیکار بیٹھے تھے۔ دکاندار خالی دکانون میں بیٹھے رہتے۔ دکانوں پر دھول چڑھ گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ چوروں کو جیل میں لائین سے بٹھا دیا گیا ہو لیکن یہ تصویر کا ایک ہی رخ ہے۔ یوروپ کے تاجر جو ہندوستان کے ساحل پر آ چکے تھے۔ تجارت میں مثبت تبدیلی لا رہے تھے۔ انہوں نے سونے اور چاندی کے عوض ہندوستانی اشیا خریدیں۔ جس سے صنعت و تجارت میں ترقی ہوئی۔ شہنشاہ روس پیٹر اعظم کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تجارت عالمی تجارت ہے۔ اس پر جس کا قبضہ ہو جائے یوروپ بھی اس کے زیر نگیں آ جائے گا۔

24.4.1 زراعت (Agriculture)

ہندوستانی معیشت کی بنیادی اکائی گاؤں تھا۔ یہ گاؤں خود مکتفی ہوتے یعنی اپنی ضروریات کی سبھی اشیاء پیدا کرنے کے اہل تھے۔ زرعی پیداوار کے وسائل پہلے ہی جیسے تھے۔ پیداوار میں اس دور میں کوئی اضافہ نظر نہیں آیا۔ لیکن اپنے شہریوں کی ضروریات پوری کرنے میں محنتی کسان نے کامیابی حاصل کی۔ گو کہ خود کی حالت بہت اچھی نہیں تھی اور اکثر زمینداریوں جاگیرداریوں اور ٹھیکداریوں کے استحصال کا شکار ہونا پڑا۔ ریاست سے اس کا تعلق لگان جمع کرنے تک محدود تھا۔ حکمرانوں کی تبدیلی سے اس کی حالت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ حکمرانوں کی آپسی کشاکش اور بیرونی حملے اس کی تکلیفوں میں اضافہ ضرور کر دیتے۔ پیداوار کا بچا حصہ لگان کی شکل میں حکمرانوں کو دینے کے بعد صنعتی اشیا خرید نے کے لیے اس کے پاس بہت ہی کم رقم بچتی مختصر ضروریات اور کم خواہشات ہندوستانی کسان کی اصل طاقت تھے۔ اور انھیں کے سہارے وہ اپنی زندگی کا سفر طے کرتے۔ گیہوں اہم زرعی پیداوار تھا۔ جنوب میں چنا، چاول، مکا اور باجرا بویا جاتا تھا۔ کپاس اور گنا شمالی ہند کی اہم فصلیں تھیں۔ بنگال میں شمالی ہند کے مقابلہ میں اناج سستا تھا۔ جب کہ گجرات میں یہ مہنگا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند کے مطابق اٹھارویں صدی کے کسان کی حالت انیسویں صدی کے کسان سے بہتر تھی۔

24.4.2 زرعی مالگزاری (Land Revenue)

ہندوستانی سیاست پر انگریزوں کی گرفت جیسے جیسے مضبوط ہوتی گئی ملک کی معیشت پر بھی ان کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ صنعت و تجارت یا زراعت ہر میدان میں اسی وجہ سے ملک کھوکلا ہونا شروع ہو گیا۔ انگریزوں نے سارے قوانین اور اصول برطانیہ کے زیادہ سے زیادہ معاشی فوائد کے لیے بنائے۔ اپنے دور حکومت میں انہوں نے لگان کے لیے جو مختلف بندوبست کیے وہ بھی انگریزوں کے مفاد میں تھے اور ہندوستان کے لیے نقصاندہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ آمدنی کے لیے انہوں نے ہر چال آزمائی۔ کیونکہ انہیں جنگیں لڑنے اور انتظامیہ چلانے اور برطانیہ بھیجنے کے لیے رقم چاہیے تھے۔ انگریزی پالیسیوں کے نتیجہ میں مقامی صنعتیں تباہ ہو گئیں اور کسان برباد ہو گئے۔ بیروزگار کاریگر بھی گاؤں میں جمع ہونے لگے۔ جس سے زمین پر افراد کا دباؤ بڑھا اور فی کس آمدنی گھٹ گئی۔

لگان کا بندوبست اس وقت انگریزوں کے ہاتھ میں آیا جب 1765 میں مغل بادشاہ سے انہیں بہار بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل ہوئی لیکن اس وقت انہوں نے انتظامیہ براہ راست اپنے ہاتھ میں نہیں لیا بلکہ 2 نائب دیوان مقرر کر کے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی

کوشش کی۔اس دوہری حکومت کا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔1772 میں وارن ہیسٹنگز نے اسے ختم کر کے لگن کی ذمہ داری براہ راست کمپنی کے ہاتھ میں لے لی۔اس نے زمین کو 5 سال کے لیے ٹھیکہ داروں کو دینا شروع کر دیا۔اس شرط کے ساتھ کہ وہ کسانوں کو اسے پٹے پر دیں۔ہر ضلع میں ایک کلکٹر کا تقرر کیا۔ایک ضلع میں 6 ڈویژن بنائے گئے اور ہر ڈویژن میں ایک لگان بورڈ قائم کیا گیا۔لگان کے حساب کتاب کے لیے ایک رائے رایاں نامی افسر کا تقرر ہوا جس کے ساتھ ایک آڈیٹر جنرل بھی مقرر کیا گیا۔1778 میں ٹھیکہ کی مدت 5 سال سے گھٹا کر سالانہ کر دی گئی۔1790 میں بنگال میں یہ مدت 10 سال طے کی گئی لیکن یہ سارا انتظام کسانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ٹھیکہ دار زیادہ سے زیادہ کسانوں سے وصول کرتے تاکہ اپنا فائدہ بڑھایا جاسکے پھر بھی بہت سے ٹھیکہ دار مقررہ رقم دینے سے قاصر رہتے تھے۔اوران سے ٹھیکہ چھین لیا جاتا۔یہ صورت حال انگریزوں کے لیے بھی مسئلہ بنی ہوئی تھی۔چنانچہ کارنوالس نے 1793 میں دوامی بندوبست نافذ کیا۔

دوامی بندوبست: لگان کا بندوبست انگریز افسروں میں اختلاف کا سبب بنا۔لیکن بالآخر کمپنی کے ڈائرکٹرز نے واضح ہدایت دی کہ گزشتہ سالوں کے لگان کی بنیاد پر زمین داروں سے متعینہ مدت کے لیے معاہدہ کیا گیا اور اسے مستقل طور پر رکھا جائے۔بنگال میں دوامی بندوبست اسی بنیاد پر نافذ کیا گیا۔لگان سے متعلق تین اختلافی مسائل تھے جنہیں طے کرنا تھا۔

1. معاہدہ کس سے کیا جائے۔زمین دار سے یا کسان سے۔
2. پیداوار کا کتنا فیصد حصہ لگان کی شکل میں وصول کیا جائے۔
3. معاہدہ کچھ عرصہ کے لیے کیا جائے یا مستقل۔

لگان بورڈ کے صدر سر جان شور، آڈیٹر جنرل جیمس گرانٹ اور گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے مفصل بحث و مباحثہ اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کی توثیق کے بعد مندرجہ ذیل شکل میں دوامی بندوبست کا خاکہ پیش کیا۔زمین پر زمین داروں کے مالکانہ حقوق تسلیم کیے گئے اور 1790 میں ان سے 10 سال کے لیے معاہدہ ہوا۔جسے ڈائرکٹروں کی توثیق کے بعد 1793 میں مستقل کر دیا گیا۔یہ دوامی بندوبست کہلاتا ہے۔زمین داروں اور ان کے جانشینوں سے مستقل اسی شرع سے لگان دینا طئے کیا گیا۔لگان کا 8/9 حصہ انہیں کمپنی کو دینا تھا جب کہ 1/9 حصہ وہ خود اپنی خدمات کے عوض رکھ سکتے تھے۔اس میں مندرجہ ذیل باتیں طے کی گئیں۔

1. زمین پر زمین داروں کے مالکانہ حقوق تسلیم کر لیے گئے جو پشتینی مانے گئے۔انہیں اس وقت تک ان کی زمین سے محروم نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ متعینہ لگان ادا کرتے رہیں۔
2. ملکیت کے حقوق کی بنا پر زمین دار کو زمین کی خرید و فروخت کا اختیار مل گیا۔
3. حکومت کا کسانوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔
4. زمین داروں سے لگان کا تعین مستقل طور پر کر دیا گیا۔

1793 میں نافذ ہونے والے اس دوامی بندوبست کے متعلق مورخین میں بہت اختلاف ہے۔کچھ کے نزدیک اس کے ذریعہ

زراعت میں بہتری اور آبادی میں اخافہ ہوا وہیں کچھ دوسرے دانش وران کے مطابق یہ ایک افسوسناک غلطی تھے اس سے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بحیثیت مجموعی اس نظام سے فائدہ اور نقصانات دونوں ہوئے جنہیں ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

فوائد: اس بندوبست سے پہلے زمیندار کی حیثیت کمپنی کے نمائندہ یا ملازم کی سی تھی جو کسانوں سے لگان کی وصولیابی میں حکومت کو مدد دیتے اور بدلہ میں سرکار سے لگان کا کچھ حصہ حاصل کرتے۔ لیکن زمین کے مالک بن جانے سے ان کو دو اہم فائدے ہوئے۔ پہلا سیاسی نقطہ نظر سے اس نظام کے تحت زمینداروں کی شکل میں انگریزوں کو ایک وفادار طبقہ مل گیا جو ہر حالت میں ان کا بہی خواہ تھا اور جس کے سبب انگریزی حکومت کو پائیداری حاصل ہوئی۔ دوسرا معاشی اعتبار سے اس بندوبست کے بعد زمینداروں نے زراعت میں مزید دلچسپی لینا شروع کردی۔ کیوں کہ پیداوار میں اضافہ سے انہیں براہ راست فائدہ حاصل تھا۔ اس صورت میں وہ کسانوں سے اضافی لگان وصول کرسکتے تھے۔ اس سے نہ صرف زرعی ترقی ہوئی بلکہ صنعت و تجارت میں بھی مثبت تبدیلی آئی۔ کارنوالس سے پہلے بنگال کی قابل زراعت زمین کا آدھا حصہ جنگلوں میں تبدیل ہوگیا تھا کیوں کہ کسان فائدہ نہ ہونے کے سبب زمین چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن اس بندوبست نے دوبارہ کھیتی میں اضافہ کیا اور زمینداروں کی معاشی حالت بھی مستحکم ہوئی۔

نقصانات: دوامی بندوبست کے نقصانات بھی کم اہم نہیں ہیں۔ اس نے بالائی سطح پر جاگیر داری نظام اور نچلی سطح پر غلامی کو جنم دیا۔ وہیں اس میں کسانوں کے مفاد کو نظر انداز کردیا گیا تھا۔ زمین پر ان کا کوئی حق نہیں رہا اور لگان کے معاملہ میں وہ پوری طرح زمیندار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے تھے کیوں کہ حکومت نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ زمیندار، کسان سے کتنا لگان وصول کرے گا۔ اس کے علاوہ ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوئی کہ اکثر زمینداروں نے شہروں میں جاکر رہنا شروع کردیا اور زمین بچولیوں کو پٹہ پر دے دی جنہیں کھیتی کے بہتری کی جگہ زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے میں دلچسپی تھی۔ اس طرح کسان ہر طرف سے استحصال کا شکار ہوا اور سرکار کو بھی مالی اعتبار سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

اس نظام نے زمینداروں کے لیے بھی کافی مشکلات پیدا کیں، کیونکہ حکومت کا پیداوار میں 9/8 فی صد حصہ تھا اس لیے محصول کی وصولیابی میں بھی بہت سختی برتی جاتی۔ زمینداروں کو مقررہ دن سورج غروب ہونے سے قبل ہی سرکاری خزانے میں محصول جمع کرنا ہوتا۔ ایسا نہ ہونے پر ان کی زمینیں ضبط کرلی جاتی تھی۔ ایک جائزے کے مطابق 1797-98 میں ہی 17 فیصد زمینداروں کی زمین نیلام ہو گئیں۔ صورتحال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ زمینوں کی نیلامی کے وقت کوئی ان کی بولی لگانے والا بھی نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی زمیندار ہی تھے جنہیں اس نظام نے مضبوط کیا۔ مشہور مورخ بیورج نے لکھا ہے کہ 'کسانوں کے حقوق نظر انداز کرکے صرف زمینداروں سے معاہدہ کرنا ایک فاش غلطی اور ناانصافی ہے۔'

رعیت واڑی بندوبست: جنوبی ہند میں بڑے بڑے اراضی کے قطعات کے مالک زمین داروں جیسا کوئی طبقہ نہیں تھا۔ وہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ کس کے ساتھ معاہدہ کیا جائے۔ ویسے بھی دوامی بندوبست سے کمپنی کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ کسانوں کا استحصال زراعت کے

لیے سراسر نقصان دہ ہی تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے پہلے مدراس اور ممبئی کے کچھ حصوں میں ریت واری بندوبست لاگو کیا گیا۔اس کے تحت کسانوں سے براہ راست لگان کا معاہدہ کیا گیا۔گاؤں میں پہلے سے چلے آرہے پشتینی افسروں کے ذریعے لگان وصول کرنے کا انتظام کیا گیا۔ایسے تمام کسان جن کے زمینیں رجسٹرڈ تھیں،ان کو مالک مان کر حکومت کو لگان ادا کرنے کی ذمے داری دے دی گئی اور ان پر 50 فیصد لگان مقرر کیا گیا۔لگان جمع کرنے کی مدت متعین تھی۔اگر اس مدت میں کسان اپنا لگان جمع نہیں کر پاتا تو اس کی زمین ضبط کر لی جاتی۔حکومت کو لگان کی رقم بڑھانے کا پورا اختیار تھا۔اس نظام کے تحت حکومت ہی زمیندار تھی اور کسان کو لگان بھی زیادہ دینا پڑتا تھا جو کہ نقد کی شکل میں ہوتا تھا۔اس طرح اس طریقے میں بھی نہ کسانوں کو کوئی مالی فائدہ ہوا اور نہ ہی ان کے حقوق محفوظ رہ سکے۔

محل واری بندوبست: دوامی بندوبست سے کمپنی کے معاشی مقاصد حسب منشا پورے نہیں ہو رہے تھے۔اس لیے موجودہ مغربی اتر پردیش گنگا جمنا دوآب، وسطی ہند کا کچھ حصہ اور اس دور کے پنجاب میں لگان کی وصولیابی کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا، جسے محل واری بندوبست کہا گیا۔اس کے تحت حکومت نے ایک گاؤں یا کئی گاؤں کے مجموعے (محل) کے زمیندار یا لگان وصول کرنے والے پشتینی افسروں کو یہ ذمے داری دی۔ یہ افراد مجموعی طور پر لگان جمع کرنے کے اہل قرار پائے گئے اور ان سے ایک متعینہ مدت کے لیے یہ معاملات طے کیے گئے۔اس نظام میں انفرادی سے زیادہ اجتماعی ذمے داری تفویض کی گئی۔ یہ لوگ اپنے علاقے سے لگان وصول کرتے۔لیکن ان کا یہ حق حکومت جب چاہے ختم کر سکتی تھی۔اگر کوئی کسان اپنی زمین چھوڑ دیتا تو وہ گرام سماج کے قبضے میں آجاتی۔ محل واری بندوبست بھی کسانوں کے مسائل حل نہیں کر سکا اور نہ ہی انہیں اس سے مالی فائدہ حاصل ہوا۔یہ زمیندارانہ نظام کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل تھی اور اس میں کسانوں پر لگان کا بوجھ زیادہ تھا۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کے ذریعے لگان کے بندوبست کرنے والے سارے طریقے ہی کسان مخالف تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ان کا استحصال کرتے رہے۔

24.4.3 تجارت اور صنعت (Commerce and Industry)

اٹھارویں صدی کے آغاز نے ہندوستان میں تجارت کی منظم، شکل دیکھی، بحر احمر اور خلیج فارسی سے ہندوستانی تاجر بڑے پیمانہ پر مختلف اشیاء درآمد و برآمد کر رہے تھے۔افغانستان، ایران اور وسطی ایشیاء ہندوستانی تجارت کے اہم مراکز تھے۔علاوہ ازیں چین، جاپان، برما اور سلایا وغیرہ ممالک میں ہندوستانی اشیاء بیچ رہی تھیں۔ سیاسی الٹ پھیر اور بیرونی حملوں نے امن وامان اور نظم و نسق پر منفی اثرات ضرور ڈالے تھے۔جس کا اثر بیرونی و ملکی تجارت پر بھی پڑا۔صنعت و حرفت متاثر ہوئے اور تجارت کی رفتار دھیمی ہوئی۔مختلف آزاد ریاستوں کے وجود میں آنے سے قیمتیں بھی متاثر ہوئیں۔کیونکہ یہ اپنی حدود میں ٹیکس لیتے جس سے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں اشیاء کی منتقلی میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور ان کی مجموعی قیمت بھی بڑھ جاتی تھی۔دوسری طرف بیرونی حملہ آوروں نے شہروں کو لوٹا۔مقامی حکمرانوں کی آپسی جنگوں نے بھی ہندوستانی شہروں کی خوشحالی پر تباہ کن اثرات ڈالے۔مراٹھوں نے جنوبی ہند، گجرات اور مالوہ وغیرہ سے چوتھ کی جبراً وصولی کی جس کے سبب معیشت کو نقصان پہنچا۔جاٹوں اور سکھوں نے بھی شمالی مغرب کے آسودہ شہروں کو خوب لوٹا۔غرض چاروں طرف سے اس سیاسی و

سماجی یلغار نے معیشت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ملکی صنعتیں اور تجارت اچھی خاصی بہتر شکل میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

صنعت و زراعت میں استعمال ہونے والی مشینیں اور اوزار ملک میں ہی بنائے جاتے۔ سوداگروں کے لیے جہاز اور کشتیاں، کالی کٹ، گوا، سورت، ڈھاکہ، الہ آباد اور لاہور کے شہروں میں تیار کی جاتیں۔ صنعتی پیداوار نہ صرف ملکی ضرورتوں کو پورا کرتی بلکہ زائد مال بیرونی ممالک برآمد کیا جاتا۔ اپنے سوتی کپڑوں کے لیے ہندوستان ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ یہ صنعت سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی، بہترین قسم کے ہندوستانی رنگین و سفید سوتی کپڑوں کی مانگ دنیا بھر تھیں۔ ڈھاکہ، سورت، مرشد آباد اور بنارس، لکھنؤ وغیرہ اس کے بڑے مرکز تھے۔ اس دور میں سوتی کپڑے کے ساتھ ساتھ ریشمی کپڑے کی بھی دوسرے ملکوں میں مانگ تھی اور اس کا سبب بیچار کاریگروں کی فنی مہارت تھی۔ برآمد کی جانے والی دوسری اشیاء میں تیل، لوہا، اسپات تھے، باہر سے جو اشیاء درآمد کی جاتیں ان میں قیمتی پتھر، سونا، چاندی، موتی، دوائیں، ہاتھی دانت، سنگ مرمر، ریشم، اور ہینگ وغیرہ اہم تھیں۔ لاہور، دلی اور آگرہ تجارت کے جانے مانے مرکز تھے، پنجاب میں ملتان، سندھ میں سکھر، بنگال میں مالوہ رنگ پور اور قاسم بازار اور راجستھان میں اجمیر، جودھپور، جیسلمیر وغیرہ ملکی و بیرونی تجارت میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ سوداگر اور ساہوکار، تاجروں کی مالی ضرورت پوری کرتے وہ انھیں قرض دیتے، ہنڈیاجاری کرتے۔

ہندوستان کی بیرونی و اندرونی تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت اٹھارویں صدی میں بھی خاص بہتر تھی۔ بلاشبہ گذشتہ صدیوں کے مقابلہ میں یہ زوال پذیر دکھائی دیتی ہے۔ مگر اب بھی معیشت میں توازن برقرار تھا۔ اس دور میں بھی مختلف یورپی ممالک ہندوستان کے ساتھ تجارتی روابط قائم کر رہے۔ ہندوستان کے بنے سمندری جہازوں کے یوروپی ممالک بھی خریدار تھے۔ حقیقتاً اُس وقت بھی بیرونی تجارت ہندوستان کے موافق ہی تھی۔

24.4.5 طرز زندگی (Life Styles)

اس دور کی ہندوستانی معیشت کی بڑی خامی اس کی معاشی ناہمواری تھی مختلف طبقات کے وسائل کے درمیان ایک بڑا فرق دکھائی دیتا ہے۔ حکمراں، امراء، جاگیردار، صنعت کار اور تاجر آسودہ حال طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خصوصاً امرا عیش و عشرت کی زندگی گزارتے۔ دوسرا طبقہ کسانوں، مزدوروں، درمیانی درجہ کے اہل حرفہ اور عام انسانوں پر مشتمل تھا۔ ان کی غربت بھری زندگی کا نقشہ بہت سے مورخین نے کھینچا۔ انسانی زندگی میں استعمال ہونے والی تمام اشیاء کی پیداوار کی ذمہ داری ان کی تھی اور یہ اسے پورا بھی کرتے تھے، مگر اس سے ہونے والی آمدنی کا معمولی سا حصہ ہی انھیں مل پاتا۔ اسی لیے ان کی زندگی مشکل بھری ہوتی۔ بنیادی ضرورتیں پوری کرنا بھی ان کے لیے آسان نہ تھا۔ ان کی غربت کا اندازہ کپڑوں کی کمی، مکانوں کی خستہ حالت، برتنوں و دیگر اشیاء کا ضرورت بھر نہ ہونا سے لگایا جا سکتا ہے حالانکہ کھانے کے سامان کی انھیں کمی نہ تھی۔ ڈاکٹر تارا چند کے مطابق اناج کی ضرورت ملک کی پیداوار سے پوری ہو جاتی۔ حالانکہ وہ لوگ مشکل وقت کے لیے کچھ بچا کے رکھنے کے اہل نہ تھے۔ جس سے ایسے کسی برے دور میں عوام کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا 1595 سے 1792 تک تقریباً 24 مرتبہ قحط اور

سو کھاپڑا۔ جس نے بہت تباہی مچائی۔ لیکن قحط اور سوکھے کے علاوہ عوام کو کبھی کھانے پینے کی اشیاء کی کمی نہ ہوتی۔ دوسری طرف اعلیٰ طبقہ جس پر سیاسی تبدیلیوں نے تو اثر ڈالا مگر معاشی طور پر وہ اب بھی مضبوط تھا۔ اس کی دولت کا بڑا حصہ نوکر، علاقوں، غیر ملکی پھلوں، شادی بیاہ و دیگر سماجی تقریبات میں اور رہن سہن میں خرچ ہوتا۔ ان کے گھر قلعہ کی طرح ہوتے جہاں وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ، قیمتی ملبوسات اور دیگر فضول خرچوں کے ساتھ زندگی گزارتے۔ دونوں طبقوں کا یہ تضارت ملک کی معیشت کی کمزوری اور خامی کی علامت تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مغلوں کی سیاسی زوال اور آزاد ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد جو تبدیلیاں آئیں۔ انہوں نے زراعت و تجارت سمیت تمام معاشی سرگرمیوں کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کیا۔ مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس زوال کے دور میں بھی ان شعبوں میں توازن برقرار رہا۔

24.5 سماجی حالات (Social Conditions)

یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی سماج میں مختلف قسموں کی ناہمواری اور تفاریت کا شکار تھا۔ تہذیب و ثقانت کا یہ اختلاف بہت واضح تھا۔ ملک کی آبادی دو بڑے حصوں ہندوؤں اور مسلمانوں پر مستمل تھی جو الگ الگ روایتوں کے امین تھے۔ صدیوں کے اختلاط کے باوجود ان کی تہذیبی شناخت مختلف تھی۔ پھر یہ دونوں یعنی ہندو اور مسلم بہت سی ذیلی ذاتوں اور طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک طویل عرصے سے ساتھ رہنے اور تہذیبی لین دین کے نتیجہ میں بہت سے رسم و رواج اور قدریں مشترک ضرور ہوتی تھیں مگر ہنوز فرق واضح تھا۔ مختلف مذہبوں اور ذاتوں زبانوں اور علاقوں میں بٹے ہوئے ہندوستانی سماج کی تہذیب، طالب علموں اور محققین کی دلچسپی کے بہت سے عناصر رکھتی ہے۔

24.5.1 ہندو سماج (Hindu Society)

ہندو سماج کی چار ذاتوں میں تقسیم بہت پہلے ہو چکی تھی پھر یہ چاروں ذاتیں برہمن، چھتری، دیش اور شودر، بہت سی ذیلی ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ذات پیدائشی کی بنیاد پر طے ہوتی اور سختی سے نافذ ہوتی۔ دولت کی کمی بیشی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ عموماً پیشہ بھی ذات پر منحصر ہوتا۔ ذاتوں پر محیط پنچایتیں قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیتیں۔ برہمنوں کو پہلے اعلیٰ تصور کیا جاتا۔ یہ ہر دبت، پجاری مذہبی مبلغ اور استاد کی ذمہ داری نبھاتے۔ قدیم مذہبی کتابوں پر ان کی اجارہ داری تھی۔ حکمراں اور فوجی چھتریوں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تجارت اور زراعت دیش کی ذمہ داری تھی۔ یہی لوگ سود پر روپیہ قرض دیتے۔ شودر تعداد میں بہت تھے۔ یہ صرف تین اعلیٰ طبقوں کی خدمت کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ سماج میں ان کی حیثیت بہت خراب تھی، ہادی، ڈوم اور چنڈال شودروں سے بھی نیچے تھے۔

مختلف ذاتوں کے لوگ ایک دیوی دیوتا کی پوجا کر سکتے تھے۔ یکساں رسم و رواج کے پابند ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا ممنوع تھا۔ صرف سکھوں کے لنگر سب کے لیے کھلے تھے۔ برہمن عموماً گوشت اور شراب کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ جینوں کے علاوہ عموماً سبھی اور خاص طور پر چھتری راجپوت، جاٹ گوشت کھاتے تھے۔ مختلف پیشوں کی بنیاد پر ذاتیں قائم تھیں۔ سماجی پابندیوں کے باوجود مختلف طبقوں میں آپسی تعلقات استوار تھے۔ صنعت و حرفت سے وابستہ افراد کو سماج میں ایک متعینہ حیثیت حاصل تھی۔ نائی، رنگریز، جولاہے، مالی، کمہار، ہاتھی دانت کا کام کرنے والے اور بڑھئی وغیرہ اپنے اپنے کاموں کے لیے تنخواہ پاتے تھے۔ زراعت، تجارت اور فوجی

خدمات کے دروازے سب کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے۔ گاؤں میں پنچایتیں سزا دیتیں، جرمانے لگاتیں اور قانون کا نفاذ کرتیں۔ نیچی ذات کے اونچا مقام حاصل کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ہولکر کے طاقت اور منصب حاصل کرنے کے بعد پوری ذات ہی بلند مقام پر پہنچ گئی۔

باپ خاندان کا سربراہ ہوتا اور نسل اسی سے چلتی صرف کیرالہ میں یہ مقام ماں کو حاصل تھا۔ عموماً عورتوں کی حیثیت ماں اور بیوی کی ہوتی ذاتی طور پر انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ عورتوں کی اپنی سیاسی و سماجی حیثیت کی مثالیں بہت کم تھیں۔ بیٹی کہلاتی تو لکشمی تھی لیکن اس کی پیدائش خوشی کا سبب نہیں ہوتی بھائی اور باپ کی جائیداد میں انھیں کوئی حصہ نہیں ملتا، شادی کا رواج عام تھا۔ راجستھان، بنگال اور وسطی ہند میں شوہر کے مرنے پر ستی کا رواج تھا۔ اتر پردیش اور بنگال میں امراء کے طبقہ میں اکثر ایک سے زیادہ شادی کرتے تھے۔ بیوہ کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اٹھارویں صدی کے اوائل تک عورت سماجی حد بندیوں میں اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ اس کی اپنی کوئی نجی یا قابل احترام حیثیت نہیں تھی۔ اتر پردیش اور بنگال کے طبقہ امراءمیں مرد کے ذریعے ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج تھا۔ بیوہ کی دوسری شادی اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ پیشوا نے اس کے سدباب کے لیے ایک محصول 'پدنم' لگایا تھا۔ بیوہ عورتوں کی سماج میں خراب حالت تھی۔ وہ تاعمر سادہ کپڑے، سادہ غذا اور سادہ رہن سہن اختیار کرنے پر مجبور تھیں۔

راجا سوائی جے سنگھ اور مراٹھا سردار پر سورام بھاؤ نے بیواؤں کی شادی کے لیے کوششیں کیں لیکن انہیں کامیابی نہیں ملی۔ اچھوتوں کو اب بھی زندگی کے بہت سے حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ انہیں تالاب، کنویں، سرائے اور اسکول استعمال کرنے یا جانے کا حق حاصل نہیں تھا۔ عوامی مقامات اور مندروں میں تو ان کے داخلے کا تصور ہی نہیں تھا۔ توہم پرستی عام تھی۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ دیوی کالی انسان کی قربانی مانگتی ہے۔ خود کو ہلاک کرنا بھی اسی قبیل کی رسم تھی۔ گناہوں کے کفارے کے طور پر بھی اپنی جان قربان کی جاتی۔ اولاد نرینہ کے حصول کے لیے گنگا کی لہروں میں اپنی جان کی قربانی دی جاتی۔ خود کو تکلیف پہنچا کر اچھے پھل کی توقع جاتی تھی۔ غلامی کا رواج بدستور جاری تھا۔ یہ دو طرح کے ہوتے۔ گھروں میں رہنے والے اور زمینوں پر کام کرنے والے۔ دوسری قسم کے غلام زمین کے بکنے پر ہی بک جاتے راجپوت، کانستھ، اور چھتریوں میں باندیاں یا کنیزیں رکھنے کا چلن بھی تھا۔ معاشی تنگی، قدرتی آفات نعت یا دیگر اسی طرح کے اسباب کی بنا پر والدین بچوں کو فروخت کر دیتے۔ امریکہ اور یورپ کے مقابلے میں ہندوستانی غلاموں کی زندگی بہتر تھی۔ دوسری طرف یورپی اقوام کی آمد نے غلامی کے رواج کو بڑھاوا دیا۔ مدراس کلکتہ اور سورت کے غیر ملکی باشندے ابی سینیا (حبشہ، افریقہ) سے غلام خرید کر لاتے تتھے اور گھروں میں رکھتے تھے۔

24.5.2 مسلم سماج (Muslim Society)

مسلمان ہندوستانی سماج کا اہم حصہ تھے۔ اسلام کے منع کرنے کے باوجود بھی ذاتوں بٹے ہوئے تھے جو عموما پیشوں کی بنیاد پر طے ہوتیں۔ مذہبی افکار کے اختلاف نے بھی ان میں کئی فرقے پیدا کر دیے تھے لیکن ایک بڑی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں اور غیر ملکی مسلمانوں کی تھی ہندوستان سے باہر سے آنے والے ایرانی، تورانی، افغانی اور عرب مسلمان خود کو ہندوستانی مسلمانوں سے افضل کہتے تھے۔ یہ تفرقہ کبھی

کبھی یہی سیاسی کشمکش کی بنیاد بھی بن جاتا۔ صدیوں سے ساتھ رہنے کے سبب ہندو اور مسلمانوں میں بہت مماثلت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر بھی مسلمان اپنی ایک الگ پہچان رکھتے تھے باپ خاندان کا سر براہ ضرور ہوتا مگر ماں کو بھی قابل عزت مقام حاصل تھا۔ شادی سماجی سمجھوتہ سمجھی جاتی شادی کے لیے لڑکی کی مرضی اہم تھی۔ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں طلاق کا رواج نہیں تھا۔ مرد چار تک شادیاں کر سکتے تھے۔ مگر پہلی بیوی گھر میں سب سے اہم مانی جاتی۔ مسلم امراء بھی غلام، باندیاں اور کنیزیں رکھتے۔ بیٹے کو یہاں بھی اہمیت حاصل تھی۔ پردہ کا عموی رواج تھا۔ شادی کے وقت بیٹیوں کو حیثیت سے زیادہ جہیز دیا جاتا۔ سب بچوں کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ بیوی کو مہر لینے کا حق تھا۔ خوشی اور غم کے مختلف مواقع پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہت کی رسومات یکساں تھیں جو ایک طویل قربت کا نتیجہ تھیں۔

24.6 ثقافتی حالات (Cultural Conditions)

24.6.1 تعلیم (Education)

اس دور میں تعلیم کی عمومی صورت حال اچھی نہیں تھی یہ نہ تو معیاری تھی جو وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکتی اور نہ ہی عوام کے سبھی طبقوں تک اس کی رسائی تھی۔ مغربی دنیا کی علمی ترقی سے ہندوستانی بخوبی واقف بھی نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کے لیے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ ساحلی شہروں اور بندرگاہوں پر یوروپین جہاز آکر ٹھہرتے جس سے مقامی لوگ ان کے ربط میں آتے مگر انہوں نے سائنس و دیگر جدید علوم میں ہونے والی ترقی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

یوں تو گاؤں اور شہروں میں تعلیمی ادارے کافی تعداد میں موجود تھے مگر وہ صرف روایتی تعلیم کا مرکز تھے۔ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی تعلیم گاہوں پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ حقیقتاً یہ درس گاہیں تہذیب و ثقافت کی علمبردار تھیں۔ ہندوؤں کی ابتدائی تعلیم کے لیے گاؤں میں پاٹھ شالائیں قائم تھیں جہاں کھیتی باڑی اور دیگر کاروباری ضرورتوں کی مناسبت سے مضامین پڑھائے جاتے خطوط اور مختلف قسم کی درخواستیں لکھنا سکھائی جاتیں اور ضروری حساب و کتاب کی جانکاری دی جاتی۔ اس طرح کے طریقہ تعلیم میں بچوں کے ذہنی ارتقاء کی گنجائش نہ کے برابر ہی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کی صورت حال زیادہ خراب تھی یہاں پڑھانے اور پڑھنے والے دونوں بھی برہمن ہوتے یہاں صَرف و نحو (گرامر)، فلسفہ، قانون اور ادب کی تعلیم دی جاتی۔ سنسکرت کی تعلیم اہمیت رکھتی تھی۔ بنارس، بہار، بنگال اور اڑیسہ میں اس کے بڑے بڑے مطالعاتی مرکز تھے۔ انھیں ٹول یا چتشٹھاپی کہا جاتا۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ اس لیے اسے بھی سیکھتے۔

مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال بھی خراب تھی۔ حکمران ہونے کے باوجود عام طور پر صرف اعلیٰ طبقہ کے افراد ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے۔ مکتب ابتدائی تعلیم کے ذمہ دار تھے جو اکثر مسجدوں سے ملحق ہوتے۔ مذہبی تعلیم کی بہت اہمیت تھی۔ ابتدائی سطح پر یہ صرف قرآن کے ناظرہ پڑھنے تک ہی محدود تھی یعنی بغیر مطلب سمجھے بچوں کو پڑھایا جاتا اور حفظ کر دیا جاتا۔ اعلیٰ درجات میں عربی زبان، حدیث، فقہ اور دیگر متعلقہ علوم کا درس دیا جاتا۔ اس کے علاوہ فارسی زبان و ادب اور حساب کی تعلیم مسلمانوں میں رائج تھی۔ طب اور علم نجوم بھی پڑھائے جاتے۔ طب کی تعلیم پوری طرح سے کتابی تھی۔ تجربہ گاہوں اور عملی درس کا فقدان تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسپین، اٹلی اور فرانس کے تعلیمی

اداروں میں مسلمانوں کے مختلف علوم پڑھائے جاتے مگر مسلمان یورپ کے جدید سائنسی علوم سے تقریباً بے بہرہ تھے۔اس عدم دلچسپی کا بڑا سبب مذہب کی غلط تفسیر اور بے حد مداخلت تھی جس نے مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات کو بھی ان سے محروم رکھا۔

24.6.2 ادب اور دیگر فنون لطیفہ (Literature and Fine Arts)

مغل بادشاہ علم وادب اور فنون لطیفہ کے بڑے قدردان تھے۔ان کی سرپرستی میں ادب وفن کی تمام شاخیں بخوب سرسبز وشاداب ہوئیں اور ہر میدان میں بہترین شاہکار وجود میں آئے۔مرکزی سلطنت کے زوال کے بعد علاقائی ریاستوں کے حکمرانوں نے یہی کردار بخوبی ادا کیا۔دہلی کے سایہ عاطفت سے نکل کر مختلف علوم وفنون کے ماہرین حیدر آباد اودھ اور دیگر ریاستوں میں پناہ گزیں ہوئے۔اُردو وجود میں آچکی تھی۔اپنی الگ شناخت کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں کی مجلسوں میں یہ بولی جانے لگی تھی۔اس دور کے تخلیق کردہ ادب میں جذبات کے ساتھ یاسیت اور قنوطیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔علاقائی زبانوں میں بھی ادب پارے تخلیق ہورہے تھے۔وارث شاہ نے پنجابی میں ہیر رانجھا لکھی۔شاہ عبداللطیف اس دور کا سندھی کا بڑا شاعر تھا۔گجراتی اور جنوبی ہند کی زبانیں بھی پھل پھول رہی تھیں۔عیسائی مشنریوں نے 18 ویں صدی میں پرنٹنگ مشین لگا کر مختلف علاقائی زبانوں میں بائبل(The Bible)چھاپی۔اس دور میں مختلف زبانوں میں بہت سے ایسے سے ادیب اور دانشور ہوئے جنھیں زبان کے اسلوب اور بیان دونوں پر قدرت حاصل تھی۔انہی کے سبب زبان کی نشوونما اور ترقی ہوئی۔ان کی تخلیقات اس دور کی سماجی و معاشی کیفیت کی عکاسی کرتی ہیں ۔ دلی سے سرپرستی کے خاتمے کے سبب بہت سے فنکار حیدر آباد،اودھ،مرشدآباد اور جے پور پہنچے۔1784 میں آصف الدولہ نے امام باڑہ تعمیر کروایا۔پرسی براؤن کے مطابق اس میں صرف ظاہری خوبصورتی ہے۔بھرت پور کی راجدھانی ڈیگ(بھرت پور سے 32 کلومیٹر دور)میں آگرہ کے محلات کے مقابلے میں ایک عظیم تعمیری منصوبہ ترتیب دیا گیا۔حالانکہ یہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکے ہیں علاقائی ریاستوں کے والیان نے مختلف فنون میں ذاتی دلچسپی لی۔جس سے انھیں ترقی کرنے کا موقع ملا۔فن کاروں نے حیدر آباد، لکھنو، کشمیر، پٹنہ اور جے پور میں رہ کر اپنے جوہر دکھائے۔منفرد خصوصیات کے ساتھ مصوری کے نئے اسکول وجود میں آئے۔موسیقی نے تو حیرت انگیز مقبولیت حاصل کی۔فن تعمیرات کے لیے بھی یہ دور بڑا فائدہ مند رہا۔صرف سائنس و ٹکنالوجی ہی ایک ایسا میدان تھا جس میں ہندوستان نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ہندو اور مسلمان دونوں کی بے رغبتی اور حکمرانوں کی عدم دلچسپی نے ملک کو یوروپی اقوام سے بہت پیچھے کردیا۔جس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔یہ ایسی کمی تھی جس نے ذہنی ارتقا کو بھی متاثر کیا۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اس میں بھی دلچسپی نہیں تھی کہ یوروپی اقوام اس میدان میں کیا کررہی ہیں۔چنانچہ سیاسی، سماجی اور معاشی کسی بھی میدان میں نئے راستے ہمارے لیے نہیں کھل سکے۔

24.7 مذہبی حالات (Religious Conditions)

مذہب کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑا تنوع تھا۔ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی، بودھ اور جین مذاہب کے علاوہ بے شمار

چھوٹے بڑے فرقے ایسے تھے جن میں عقیدہ کا اختلاف تھا۔

24.7.1 ہندو (Hindu)

ہندوستان میں سب سے بڑی تعداد ہندو مذہب کے ماننے والوں کی تھی۔ برہما، وشنو اور مہیش ان کے تین بڑے دیوتا تھے۔ عام طور پر شیو اور ان کی بیوی پاروتی اور وشنو ان کی بیوی لکشمی کی پوجا کی جاتی۔ شیو کے عقیدت مند زیادہ تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بلند پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور سنسان علاقوں میں رہتے ہیں۔ بیشتر راجپوت اس سے عقیدت رکھتے تھے پتھر سے تراش کر شیو لنگ بنایا جاتا اور اس کی پوجا کی جاتی۔ گھریلو زندگی گزارنے والے لوگوں میں وشنو کی پوجا مقبول تھی۔ ان کی بیوی لکشمی اہم دیوی سمجھی جاتی۔ ایک دیگر دیوی مہادیوی کی بے شمار ناموں کے ساتھ عبادت کی جاتی۔ شکتی، درگا، بھوانی، ہمت اور طاقت کی علامت تھیں سورج بھی لائق عبادت تھا۔ اس کے علاوہ گنگا اور جمنا دونوں ندیوں کی پوجا بہت اہم تھی۔ پیپل اور تلسی کے پیڑ بھی مقدس سمجھے جاتے۔ ہولی، تیج، بھیا دوج، رکشا بندھن، دسہرا، دیوالی ہندوؤں کے مشہور تیوہار تھے۔ ہولی میں مسلمان بھی شامل ہوتے۔ ورنداون اور متھرا کی ہولی مشہور تھی۔

24.7.2 مسلم (Muslim)

مسلمان شیعہ اور سنی دو اہم فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پھر ان دونوں کے بہت سے ذیلی فرقے تھے۔ جن میں عقیدوں کا کافی اختلاف تھا۔ تصوف کے لیے ہندوستان کی سرزمین بڑی سازگار تھی روحانیت کے جو عناصر ہندوستانی مذاہب میں پہلے سے تھے، مسلم صوفیاء نے ان کو جلا بخشی۔ صوفیوں نے انسانیت اور مساوات کا سبق پڑھانے کے لیے خانقاہیں سب کے لیے پرکشش تھیں۔ چشتیہ اور قادریہ سلسلے زیادہ مقبول تھے۔ عوام وخواص سب ان خانقاہوں کی طرف کھینچے چلے جاتے۔ مسلمان ہندوؤں کی طرح بہت سے تیوہار نہیں مناتے تھے۔ رمضان کے بعد عیدالفطر اور حج کے دنوں میں عیدالاضحیٰ دو اہم تیوہار تھے۔ اس کے علاوہ 10 محرم کو پیغمبر کے نواسے کی شہادت کو بڑے زور وشور سے یاد کیا جاتا۔ خاص طور سے شیعہ افراد اس کو مناتے۔

24.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغلوں کی مرکزی حکومت کمزور ہو جانے کے بعد وجود میں آنے والی آزاد ریاستوں نے نہ صرف نئی سیاسی راہیں متعین کیں بلکہ اس دور کی سماجی، معاشی، تنظیمی، معاشرتی، مذہبی اور علمی کیفیت اور حالت کو بھی متاثر کیا۔ نظم ونسق کے بنیادی عناصر تو مغلیہ دور کے ہی رہے لیکن مقامی اثرات نے تنظیمی ڈھانچے پر اثر ڈالا۔ تہذیب وثقافت کے اعتبار سے یہ ہندو مسلم اختلاط کا دور تھا۔ دونوں طبقات نے ایک دوسرے پر اپنے نقوش مرتب کیے۔ جس کے نتیجے میں انڈو اسلامک کلچر وجود میں آیا۔ معاشی طور پر ہندوستان کی حالت خراب ہوئی، سیاسی ہلچل نے زراعت اور تجارت دونوں پر خراب اثرات ڈالے۔ بیرونی حملوں نے ملک کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ کسان کی حالت اور بدتر ہوئی۔ عوام الناس کے مقابلہ میں امراء اور جاگیرداروں کا طبقہ خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کرتا رہا۔ کسان بھرپور اناج پیدا کرتا رہا لیکن اصل فائدہ سے وہ خود محروم رہا۔ سماج کا طبقاتی تفاوت پہلے کی طرح برقرار رہا۔ مختلف مذاہب تہذیبوں اور زبانوں سے وابستہ افراد کے میل جول نے

ہندوستانی تہذیب کو انفرادیت بخشی۔ ذات پات کا نظام ہند اور مسلمان دونوں پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا تعلیمی صورت حال اچھی نہیں تھی۔ کمزور اور نچلے طبقہ تک اس کی رسائی آسان نہیں تھی۔ عورتیں بھی اس میدان میں بہت کمزور تھیں۔ مذہب اور زبان وادب کی تعلیم کا ہی زیادہ رواج تھا۔ سائنس کے میدان میں تو ہندوستانی اچھی طرح سے قدم بھی نہیں رکھ پائے۔ ایسی کمزوری نے یوروپ کو وہ بالا دستی بخشی جس نے ملک و قوم کو برس ہا برس تک مغربی ممالک کا دست نگر رکھا۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مغل عظمتوں کے زوال کا یہ دور سیاسی، سماجی، معاشرتی اور علمی اعتبار سے ہندوستان کا کمزور عہد تھا۔ سیاسی کشاکش نے معیشت کو بھی کمزور کیا اور سماجی تانے بانے کا ڈورا بھی ڈھیلا پڑ گیا۔

24.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

مطلق العنان	:	تمام اختیارات کا مالک ہونا
وقائع نویس	:	رپورٹ لکھنے والا
خود مکتفی	:	کسی دوسرے پر انحصار نہ ہونا
برآمدات	:	دوسرے ممالک کو اپنی اشیاء بھیجنا (Export)
درآمدات	:	دوسرے ممالک سے اشیاء کا آنا (Import)
اختلاط	:	میل جول
ستی	:	شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کو شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلانا
فنون لطیف	ہ :	شاعری، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، فن تعمیرات وغیرہ

24.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

24.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مطلق العنان سے کیا مراد ہے؟
2. وقائع نویس کسے کہتے ہیں؟
3. خود مکتفی سے کیا مراد ہے؟
4. برآمدات کسے کہتے ہیں؟
5. درآمدات کسے کہتے ہیں؟
6. اختلاط سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
7. ستی کی رسم کے بارے میں بتائیے۔

8. فنون لطیفہ سے کیا مراد ہے؟
9. ہندوستان کی اہم فصلیں کون کون سی تھیں؟
10. اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی تین اہم برآمدات کیا تھیں؟

24.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برطانوی عدلیہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. برطانوی پولیس نظام پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ملک کی صنعت وحرفت پر ایک مضمون لکھیے۔
4. تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
5. مسلم سماج پر ایک نوٹ لکھیے۔

24.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. انگریزوں کی زرعی مالگزاری اور بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. اس دور کے ثقافتی حالات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

24.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ali B. Sheik, *English Relations with Haidar Ali*, Mysore, 1963.
2. Barnet, Richard B., *North India between Empires*: *Awadh, the Mughals and the British*, *1720–1801,* Berkely, 1980.
3. Basu, Purendu, *Oudh and the East India Company*, Lucknow, 1942.
4. Bhatnagar, G.D., *Oudh under Wajid Ali Shah*, Varanasi, 1968.
5. Brittlebank, Kate, *Tiger*: *The Life of Tipu Sultan*, Juggernaut, New Delhi, 2016.
6. Guha, Nikhiles, *Pre-British State System in South India*: *Mysore*, *1761–1799*, Calcutta, 1981.
7. Hasan, Mohibbul, *History of Tipu Sultan*, Aakar Books, New Delhi, 2006.
8. Jafri, SZH., *Awadh from Mughal to Colonial Rule*: *Studies in the Anatomy of a Transformation*, Gyan,
9. Sherwani, H.K., *History of the Deccan*, *(1295–1724)*, Government of Andhra Pradesh, Hyderabad, 1973.
10. Wilson, John, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon & Schuster, London/ New Delhi, 2016.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم
Bachelor of Arts بیچلرآف آرٹس
Subject Code : BAHS401CCT
Subject : History of India (1526-1750)
پرچہ: تاریخ ہندوستان(1526تا1750)
4th Semester Examination ، چوتھا سمسٹر امتحان
Time : 3 hours وقت : 3 گھنٹے Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔حصہ اول می ں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500)لفظوں پر مشتمل ہے۔ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. مغل سلطنت کا بانی کون تھا۔

ii. فرید خان کو شیر خان کا خطاب کس نے دیا تھا۔

iii. شیر شاہ کا مقبرہ کہاں ہے؟

iv. شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں کس رسم کو ختم کیا تھا؟

v. کس کی قیادت میں راجپوتوں نے اورنگزیب کے فیصلے کی مخالفت کی؟

vi. جہاندار شاہ کی تخت نشینی کب ہوئی؟

vii. زور طلب "زمیندار کون تھے؟

viii. ہوموہائرارکِکس کس کی تصنیف ہے؟
ix. کس حکمران نے اپنے فن تعمیر میں پچی کاری (Pietra Dura) تکنیک کو متعارف کرایا۔
x. مجمع البحرین کس نے لکھی؟

حصہ دوم

2. بابر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
3. شیر شاہ کے عدل وانصاف پر نوٹ لکھیے۔
4. 'دین الٰہی' کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیں۔
5. شاہجہاں کی تاج پوشی کے بارے میں بتائیے۔
6. اورنگزیب اور شواجی کے بعد مراٹھوں سے جنگوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
7. نادر شاہ کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
8. مغل سلطنت کے زوال میں فوجی نظام کس حد تک ذمہ دار ہے۔ وضاحت کریں۔
9. صدر الصدور کی اہم ذمہ داریوں پر نوٹ لکھیں۔

حصہ سوم

10. ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کا ایک تفصیلی تجزیہ کیجیے۔
11. شیر شاہ سوری کی فوجی کارروائیوں اور فتوحات کا جائزہ لیں۔
12. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اکبر کے مذہبی ہم آہنگی اور شمولیت کے نظریات کی عصری ہندوستان کے لیے اشد ضرورت ہے؟ اگر ہاں / نہیں، تو کیوں؟
13. اورنگزیب کی مذہبی پالیسی کے حوالے سے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔
14. پہلی جنگ آزادی میں بہادر شاہ کے کردار، ان کی گرفتاری اور مقدمہ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

اہم نکات